خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماھنامہ
ستمبر 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
عید مبارک
www.urdunovelspk.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

انشائیہ

جون ایلیا

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پست و پیش، چپ و راست اور پس و بلندی کی صورت گری کرنے میں، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر پچھتانا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے پپوٹے دکھنے لگے ہیں۔

ہم سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آ کر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سربلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی اگلی ہی رو میں ادھڑنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جا سکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفترداری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفتروں کے کام نہ آئے۔

تمہارے شہروں کے باہنر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو للچائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔

ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

"میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہل ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے۔ میرے اہل دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت گار قرار پائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمائے گا اور یہ ذلت، ندامت اور نکبت کی کمائی ہو گی۔ وہ اپنے وجود سے دستبردار ہو جائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔"

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو کبھی کبھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سہی تو کل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں وہ بھی فضول ہیں اور جو ان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امید رکھی ہیں وہ سب گھاٹے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ بپھر کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہو گا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہو گا، انصاف ہو گا، عدل ہو گا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آ گئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ......

اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جوہردار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کشکولوں کی بھیک اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے، دولتی ہے ہاں، اے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔

آپ کے خط

عزیز قارئین!

تسلیمات!

ماہِ ستمبر 2012ء کا سسپنس پیش خدمت ہے۔ رب کائنات سے امید ہے کہ اہل وطن رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کے ساتھ عیدالفطر کی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ ماہ ستمبر تلخ و شیریں کئی حوالوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی ماہ کی گیارہ تاریخ مسلمانانِ عالم اور پاکستانیوں کے لیے الم ناک تاریخ ہے کہ 11 ستمبر 1948ء کو ہم اپنے عظیم لیڈر، بابائے قوم، قائداعظم محمد علی جناحؒ سے محروم ہو گئے اور لیڈر شپ کا یہ خلا تا حال پُر نہیں کیا جاسکا۔ جبکہ 9/11 کا ڈراما آج بھی یادگار سانحہ قرار دیا جاتا ہے جس کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر ایک بین الاقوامی پروپیگنڈا مہم چلائی گئی۔ 6 ستمبر 1965ء...... دفاعِ وطن کی یادیں آج بھی زندہ ہیں۔ ملک کا سیاسی منظر نامہ بھی ہنوز ویسے کا ویسا ہی ہے۔ سیاسی بیان بازی کا بازار گرم ہے۔ ملک مشکل صورت حال سے دوچار ہے...... تمام چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے ریاست کے تمام اداروں کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی ضروری ہے...... جانتے سب ہیں کہ کہاں کیا ضروری ہے مگر صرف باتیں اور بیان بازیاں ہو رہی ہیں۔ خواب و خیال سے بھی آگے کے نکتے کھود کر اچھالے جا رہے ہیں لیکن عمل ناپید ہے...... یہ رونا اب کا نہیں برسوں کا ہے...... دیکھیں ہماری قیادت کی کب کایا پلٹ ہوتی ہے۔

پچھلے دنوں میکسیکو میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی تقریری مقابلے میں پاکستانی ہونہار طالب علموں نے 45 ممالک کے دو سو سے زائد طالب علموں میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پاکستان کا نام سربلند کیا۔ تقریری مقابلے میں عنوان تھا ''گوانتاناموبے جیل فوری بند ہونا چاہیے''۔ پاکستانی ٹیم کی قیادت زینب حمید، کراچی گرامر اسکول نے کی۔ دوسری خوشخبری یہ ہے کہ گورنر سندھ اور سی پی ایل سی کی کوششوں سے صومالی قزاقوں کی 20 ماہ قید کے بعد بحری جہاز کا پاکستانی عملہ اپنے پیاروں تک پہنچ گیا یوں متعلقہ خاندانوں کی عید اپنے پیاروں کی دید سے دوبالا ہو گئی۔ ان خوشخبریوں کے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں۔ اپنے خط کے پیاروں راج دلاروں کی محفل میں...... جہاں شور ہے اور شوخی بھی......

✠ **ساحر ناز لدھیانوی، کوئٹہ** سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل کی زینت بنے ہیں ''سسپنس سے ہماری شناسائی تو دس سال سے ہے جب پہلی بار اپنی کزن جو ہماری ماہا ایمان ہی کی طرح ناک بھوں چڑھانے میں کسی طور کم نہیں...... کے خوب صورت ہاتھوں میں گل رنگ رنگوں سے مزین اپنی خوب رو آنکھوں سے دیکھا (لیکن آپ کی کزن نے شاید ہماری محفل میں کبھی شرکت نہیں کی) نگاہ شناس تو تھے ہی، شوق دید بھی پیدا ہوا تو بصد شوق ملاحظہ کیا...... تاریخی تحریروں کو رسالے کی جان جانا اور دیگر منفرد سلسلوں کو اس کی انفرادیت گردانا...... لفظ بہ لفظ سحر زدہ پڑھا اور عشق سسپنس میں ایسے مجنوں ہوئے کہ آج تک پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ شاید یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا اور ہم صرف قاری کے قاری ہی رہتے لیکن ہمارے گونگے قلم کو زبان اس خیال نے دی جو بدستور محفل میں ایک صاحب ذوق، پائے دانش تبصرہ نگار کی کمی کو برابر محسوس کر رہا تھا...... پس اسی خلا کو پورا کرنے آن وارد ہوئے...... امید ہے محور نگاہ بنایا جائے گا، سر آنکھوں پہ بٹھایا جائے گا (چشم ما روشن، دل ماشاد) سسپنس بلاشبہ ایک معیاری تخلیق ہے...... اور ایسے ناموافق حالات میں جبکہ...... سکون بجلی کی طرح ناپید اور ڈپریشن مہنگائی کی طرح بڑھتا ہی جا رہا ہے، سسپنس آنکھوں کی ٹھنڈک، فرحت دھنک اور ذہنی استراحت سمیت معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔ ماہ اگست کے حصول سسپنس میں پسینا پسینا ہو گئے، سینہ بہ سینہ ملنے تک...... سرورق خوش رنگ تتلیوں کے صراحی کے گرد منڈلانے اور حسینہ کی صراحی دار گردن کے اوپر پری لیکن سنجیدہ چہرہ جو ہمیں ہویدا کیے جا رہا تھا کا خوب صورت منظر پیش کر رہا تھا۔ انشائیہ نے ہمیں ہمارے ذہنوں سے مٹتی تاریخ کی تلخ مزاجی اور اس کی اہمیت کا ادراک کرایا...... ماضی کی کڑوی آزمائشوں سے جو سیکھ لیتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں وہ سنبھل لیتے ہیں۔ ایلیا صاحب کے خوب صورت الفاظ اور انداز بیاں سے دل ناداں کو سکور و سرور پایا، وہیں کڑوے کسیلے معنی و مفہوم سے نادم و ناداں رہ گئے۔ اداریہ بلکتے عوام کی فکر میں ہلکان اور حکمرانوں کے بے حس رویے سے پریشان نوحہ کناں تھا، پر یہ پکار بھی صدا بہ صحرا اور رائگاں جانے والی ہے۔ محفل میں صنف نازک کی، ان کے سوچنے کی صلاحیت ہی کی طرح قلت...... اور صنف کرخت کی عقل و خرد سے مالا مال ہونے کی طرح فراوانی نظر آئی۔ بزم جاناں کی بنے جان، نہایت تزک و احتشام سے براجمان، مسند صدارت کے ایک مہینے کے مہمان، گستاخ انجم...... اپنی چست فقرے بازی اور تیز و نوکیلے جملوں سے سرفہرست رہے، اپنے بھاری نام کی طرح ان کا تبصرہ بھی بھاری پڑ گیا...... مبارک باد۔ مانسہرہ سے مس جویریہ کی معصومیت بھی بھلی لگی۔ ویسے عرض ہے کہ آپ کچھ زیادہ نہیں بلکہ بہت کچھ...... کم بول گئیں، یہاں تو ایسے ایسے چرب زباں اور باتوں کے بادشاہ بھی موجود ہیں جن کی چلتی زبانیں بڑھتی مہنگائی کی طرح کبھی نہیں تھمتیں۔ سرگودھا سے عمران حیدر بلوچ! دعا ہے تمہیں جلد از جلد جیل سے رہائی ملے۔ ریاض شاہد، حسنین عباس بلوچ اور ردائے قیصر عباس کھرل کی اسیری بھی رہائی میں بدلنے کے لیے دعا گو ہوں۔ شیر علی خان آپ شاید رمضان المبارک میں شہر شہر مجبوروں کی ریز می لگاتے ہیں جو نام تو لکھا لیکن مقام نہیں لکھا...... تبصرہ پسند آیا۔ حکیم سید محمد رضا شاہ صاحب آپ کے مختصر تبصرہ لکھنے والی بات پر میں بھی متفق ہوں، تبھی تو میں نے اپنا خط بھی فقط دو چار لائنوں ہی پر مشتمل رکھنے پر اکتفا کیا (ماشاءاللہ...... اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو) راجا ثاقب نواز ثاقب حسب معمول سیدھا سا اور سنجیدہ سا تبصرہ لے کر آئے۔ کراچی سے این آر مدثرا آپ کے خطوط ایسے آتے ہیں جیسے سرکاری نلکے سے پانی...... رک رک کر آتا ہے۔ عبدالرؤف عدم

راولپنڈی سے اور محفل میں زبردستی گھسے محمد قدرت اللہ نیازی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ کہانیوں میں حسب معمول ابتدا دیہاتی پس منظر لیکن اعلیٰ سوچ نظر کے تناظر میں لکھی گئی چاند ادکر دار نگاری اور شاندار مکالمے بازی سے آراستہ و پیراستہ مسافر سے کی...... شہرے کی تلخ ایام میں گزرتی و سیکھتی زندگی۔ خالد عرف کھالے کی دو آتشی اور میڈم شکیلہ جیسے دل فریب، گل ریز کرداروں کی ڈور سے نہایت مہارت و مشاقی سے بنی گئی ایک دل آویز تحریر۔ کہانی کی آخری لائنیں ہمارا اضطراب بڑھا گئیں۔ الگ انداز تحریر لیے اور منفرد کرداروں سے مزین کشکول بھی بلاشبہ ہمارے پسندیدہ سلسلوں میں سے ہے، طاقت کے زعم میں چور چور شیخ حامد کے خلاف اورنگ زیب پوری تاب سے برسرِ پیکار ہے۔ آخری صفحات کی زینت پانچواں آدمی گو کہ ویسی تحریر ہرگز نہیں رہی جیسی ایچ اقبال جیسے بڑے مصنف کا نام دیکھ کر ہمارے ذہن رسا نے سوچی تھی لیکن بہرحال اچھی تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد بادشاہوں کی شان و شوکت کی بلندیوں میں چھپی سوچ کی پستیوں، جن کی تباہ کاریوں سے شہر کے شہر ویران اور شہریوں کا بحران ہونے کو تھا...... کو اجاگر کرتے نظر آئے، مشاق قلم کار کا ماضی کے دریچوں سے ہم کنار کرانے کا انداز ہمیں بھا گیا...... ملک صفدر حیات کی تحریر پردہ نشیں میں پردہ نشیں کے پردے چاک کیے تو در پردہ جو شخص برآمد ہوا وہ ہمارے سان و گمان میں بھی نہیں تھا، انسانیت کے لبادے میں حیوانیت سے بھی بدتر انتقام کی آگ میں جلتا چودھری الٰہی بخش سمجھ رہا تھا کہ وہ قانون کو بھی جل دے کر نکل جائے گا۔ مختصر کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح مغربی و مشرقی ادب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر آمادہ تھا...... آغاز ایم اے راحت کی تحریر قرض حسنہ سے کیا...... زندگی کو محض خواب گراں سمجھ لینے، بنت خوابوں میں الجھے، کبھی نہ سیکھنے والے ایک بے وقوف کا ماجرائے خاص۔ ثمر عباس کی تحریر وارث میں ہمیں لگا کہ عیار ہال کی عیاری و مکاری اسی پر بھاری پڑ جائے گی لیکن ایسا بہرحال نہیں ہوا...... لطافت آمیز تحریر آدم خور لنگڑ بھگا لطیف احساس میں جکڑے، روانی سے چلتی اچانک ہمارے اشرف المخلوقات ہونے پر طمانچا جھڑ گئی۔ ویلنا کے وحشی میں وجودزن نے اپنی تخریب کاری دکھاوی، ٹونی کا جذبہ اور قربانی لائق تحسین ہے...... بابر نعیم کی تحریر امانت جس میں گھر کے بھیدی نے ہی خیانت کر دی، ایک تجسس آمیز تحریر رہی۔ کاشف زبیر کی نئی دنیا نے بھی بور نہیں کیا۔ تنویر ریاض کی تحریر جنت مفاد پرستی پر مبنی حرص و لالچ میں گھرے مغرب کی خوب غمازی کر رہی تھی...... نجمہ شکور کی تحریر چھوٹا بخش چہرے پہ تبسم بکھیر گئی۔ سب سے آخر میں حضرت سلیمانؑ کے سبق آموز، ایمان افروز شب و روز سے فیروز ہوئے اور یوں یہ شمارہ بھی اپنی تمام تر رعنائی و دلکشی سے قلب و ذہن کو منور کرتا تمام ہوا۔ اب جبکہ میں یہ خط تحریر کر رہا ہوں تو رمضان المبارک کی ابتدا ہے، جب شائع ہوگا تو عنقریب اس بابرکت مہینے کا اختتام ہوگا اور عید کا ذکر سرِعام ہوگا، آزادی کا دن بھی ہمارا منہ چڑائے ہمیں کچھ یاد دلائے گا کہ...... ہم بھی چند دہائیوں پہلے آزاد ہوئے تھے اور بہ ظاہر اب بھی آزاد لکھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ میری طرف سے ادارے اور تمام قارئین کو رمضان کی رحمتیں، برکتیں، عید کی خوشیاں اور آزادی مبارک ہو۔''

✠ **رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی** سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''سسپنس مل گیا، اگست 2012ء کا سرورق، حسین اور جاذب نظر، اشتہارات بیزار کن۔ انشائیہ تحر دا یچ، آپ کے خط، تبصرہ نگاروں کی رزم گاہ۔ فیصلے فقیروں کے، اندرونی واقعات سے آگاہی۔ نئی دنیا، ماضی بعید کا دل سوز قصہ۔ آدم خور لنگڑ بھگا، ایک طویل و عریض لطیفہ۔ کشکول، معرکہ نیکی و بدی۔ قرض حسنہ، دن کو خواب دیکھنے والے احمق کا شاخسانہ۔ جنت، جرائم کے پاداش میں ملی ہوئی بہشت۔ محفل شعر و سخن، شعر و شاعری سے بھرا پرا نگزار۔ ویلنا کے وحشی، زمانہ قدیم کی دلخراش داستان۔ مسافر، کٹھن راستوں کا سفر پر خطر ابھی باقی ہے۔ امانت، خیانت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ حضرت سلیمانؑ، ایمان تازہ کرنے والا قصہ۔ چھوٹا بخش، ایک لمبی چوڑی گپ۔ وارث، پسند نہیں آئی۔ پانچواں آدمی، دی اسٹوری آف دی منتھ۔ کتر نیں، بہت عمدہ۔ سسپنس کا عملہ، قابل داد افراد۔ مدیر اعلیٰ، سنسر کے ماہر۔ آخری بات، سسپنس میں کام کرنے والے ہنرمندوں اور قلم کاروں کو دعائیں اور تسلیمات...... اور رمضان مبارک۔'' (بہت عمدہ...... مختصر مگر جامع تبصرہ)

✠ **سعدیہ بخاری، ضلع اٹک** سے چلی آ رہی ہیں ''میرے خط کی دو چار لائنیں شائع کر کے آپ نے احسان عظیم کیا ہے اس کے لیے میں بے حد مشکور ہوں اور امید رکھتی ہوں کہ یہ والا خط ضرور شامل محفل کریں گی کیونکہ اگلے ماہ عید کی وجہ سے خط نہیں لکھ سکوں گی (کبھی کبھی جگہ کی قلت ایسا کرواتی ہے) اب آتی ہوں رسالے کی طرف، اگست کا سسپنس بلا تاخیر پہلے کی طرح 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق بلاشبہ ہماری آزادی کے سال کی عکاسی کر رہا تھا اور سرورق کی حسینہ اس بات پر اترا رہی ہے کہ پاکستان 65 سال کا ہو چکا ہے۔ آپ سب کو اکٹھی ہی مبارک باد دے دوں۔ اللہ کرے سب امیر و غریب کو عید کی خوشیاں برابر ملیں' آمین۔ جون ایلیا، حسب حال آزادی کی بات کر رہے تھے، 65 برس گزر گئے لیکن ہم جہاں کے تھے وہیں رہ گئے کیونکہ ہم نے جسمانی آزادی تو حاصل کر لی لیکن ذہنی آزادی حاصل نہ کر سکے۔ اداریے میں مدیر اعلیٰ جن خیالات کا اظہار کر رہی تھیں میں ان سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں۔ خطوط میں اس بار پہلے ہی نمبر پر ایک گستاخ صاحب تشریف فرما تھے جو ثقیل اردو میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ ویسے گستاخ انجم صاحب آپ کا نام انجم گستاخ ہے یا گستاخ انجم ویسے بات تو ایک ہی ہے، ناک کو چاہے ادھر سے پکڑ و۔ اس بار تو طاہرہ یاسمین نے اپنا ریکارڈ توڑ دیا، کدھر ہو بھئی؟ چودھری نذیر صاحب آپ کے شمالی علاقہ جات والے دوستوں نے آپ کو خشک میوہ جات کھلا کھلا کر آپ کے دماغ کو بھی خشک کر دیا ہے مجھے نہ بھجوائیں بادام۔ کچھ نیازی صاحب کو بھجوا دیں وہ ان کا لیپ اپنے سر پر لگا لیں، کھانے سے شاید فائدہ نہ ہو لگانے سے ہی ہو جائے ان کی یادداشت کو۔ سب سے پہلے ملک صفدر حیات کی ڈائری سے انتخاب کہانی پردہ نشین پڑھی، بہت سنسنی خیز کہانی تھی۔ قتل کی واردات میں اتنا سسپنس نہیں تھا جتنا ملک صاحب کے کوارٹر پر ہونے والی پراسرار دستک میں تھا۔ قتل کا معما تو حل ہو گیا پر دستک والی بات ہنوز سسپنس ہے ہمارے لیے۔ دوسرے نمبر پر پڑھی مسافر۔ کہانی میں باقاعدہ ایکشن کا آغاز ہو چکا ہے، میڈم شکیلہ اور شہریار کے درمیان آنکھ مچولی اچھی جا رہی ہے اور حیدر خان کی پروین کے اغوا سے لاتعلقی پتا نہیں کیا رنگ دکھائے۔ کشکول اچھے انداز میں رواں دواں ہے۔ سیٹھ حامد کو ناکامی پر ناکامی ہو رہی ہے۔ ایچ اقبال آخری صفحات پر ایک شاہکار لے کر آئے، پانچواں آدمی، پاکستان دشمنوں کو بے نقاب کرتے ہوئے بابر بہت بری طرح پھنسا پر اس کی قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔ تاریخی کہانی میں تغلق خاندان کے ایک بادشاہ کی ظلم و زیادتی کے واقعات بیان کیے گئے اور نئے بادشاہ فیروز تغلق کی تاریخ کا آغاز بھی ہو گیا۔ اسلامی تاریخ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی روداد حیات اختتام پذیر ہوئی۔ ایمان افروز واقعات دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے۔ مختصر کہانیوں کا ذکر ہو جائے۔ نجمہ مودی ہمیشہ ہی مختصر کہانی کے ساتھ آتی ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے انسان شکاری اور لنگڑ بھگا کے درمیان مکالمے سے انسان کی ازلی مطلب پرستی کو پر مزاح انداز میں اجاگر کیا۔ نئی دنیا کی سیر بہت پر خطر اور پر عزم رہی۔ زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد آخر دم تک کی جاتی ہے۔ چھوٹا بخش میں کنجوسوں کا مذاق اڑایا گیا۔ قرض حسنہ میں ایم اے

راحت جاگتی آنکھوں کے خوابوں کی کرشمہ سازیاں بیان کر رہے تھے جن کا تعلق شاید بے روزگاری جیسے سنگین مسئلے سے ہے۔ جنت میں لیونارڈ کا فیصلہ قطعی غلط تھا، اس کا جزیرے پر رہ جانے کا فیصلہ بالکل سمجھ نہیں آیا۔ ویلنا کے وحشی سب سے بہترین کہانی تھی۔ ٹونی کا بھائی سے اور محبوبہ سے محبت کا انوکھا انداز بہت اچھا لگا۔ امانت میں سراغ رساں کی پھرتیاں قابل داد ہیں، ایک ہی دن میں کیس حل کر دیا۔ وارث میں ہال کی چالاکی ہمیں حیران کر گئی۔ کترنیں بس سوسو تھیں۔ اشعار میں یمنیٰ احمد اور مسز ضیا القمر سلطانہ کا انتخاب بے حد پسند آیا۔“

✠ **محمد قدرت اللہ خان نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سب سے پہلے ادارہ اور قارئین کو عید کی مبارک باد قبول ہو۔ روزے کی وجہ سے سرورق سے نظر بچاتے ہوئے انشائیہ پر جا پہنچے جو پاکستان اور بھارت کی دشمنی پر لب کشائی کرتے نظر آئے جو گزشتہ 65 سالوں سے دونوں ممالک کے بجٹ کا بڑا حصہ دفاع کے نام پر ہڑپ کرتی آئی ہے۔ گستاخ انجم اپنے مودب تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر کانپ رہے تھے۔ پوتے پوتیوں کی شادیوں کے بعد موصوف پھر سسپنس کو رونق بخشنے آئے ہیں، خوش آمدید اور مبارکاں۔ جویریہ نعیم ڈرتے ڈرتے محفل میں چلتی نظر آئیں اور کمال دیکھیں 2 جولائی کو شمارہ وصول کیا حالانکہ 17 جون کو ہی شمارہ آ جاتا ہے اور اتنا لیٹ خط لکھ کر بھی شامل محفل ہیں۔ اس خصوصی مہربانی کا آنٹی جی کو تھینکس ضرور کہہ دینا۔ شیر علی خان! ماہا کی عمر کا اندازہ کیلکولیٹر سے نہیں انٹرنیٹ کی مدد سے لگانا پڑے گا۔ ریاض شاہد بھائی سب اسیروں کے لیے دعا ہے کہ اللہ بے گناہوں کو رہائی عطا فرمائے“ آمین۔ عبدالرؤف عدم! بھئی آپ ابھی تک وجود میں نہیں آئے؟ نیازی کے جانے سے تو حسینہ نے کھل جانا تھا ہم تو گئے ہی نہیں، ہمارے نہ جانے سے اس کی کیا حالت ہوئی یہ آپ ہمایوں سعید سے پوچھیے گا کیونکہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والی ایلفی لے کر وہ وہاں پہنچے ہوئے ہوں گے۔ غالباً بابر عباس اپنے فرزندوں کے ساتھ شامل محفل ہیں، واپسی مبارک ہو۔ سعدیہ، چوہدری احمد خان کی پیشکش سے فوری فائدہ اٹھائیں اور مفت میں بادام کھائیں اور یادداشت بڑھائیں۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی، اورنگ زیب کے جارحانہ اقدامات پسند آئے۔ لیاقت حسین کے سرسالٹ بھی مزہ دے گئے۔ شیخ حامد کو گھیرنے کے اقدامات میں تیزی آ رہی ہے۔ پرتاب کی واپسی سے لیاقت حسین کی مزید روحانی صلاحیتیں سامنے آئیں گی۔ ناصر ملک مسافر کو سرپٹ دوڑائے جا رہے ہیں، حالات میں بڑی تیزی سے تبدیلی ہو رہی ہے۔ میڈم کچھ زیادہ ہی مہربان ہو چکی ہے شہریار پر۔ ڈاکٹر شاہ کا غیاب پسند نہیں آیا۔ آخری صفحات پر ایچ اقبال پانچواں آدمی لے کر آئے، ہماری سیاست میں غیر ملکی عناصر کا عمل دخل شروع سے ہی موجود ہے تاہم پارکنز نے تو حد ہی کر دی۔ شوکت باجوہ کو مار کر اس کی جگہ لے بیٹھا۔ صحافیوں کے کردار کے بارے میں جان کر حیرت ہوئی کہ کیسے کرپٹ سیاستدانوں کی حمایت میں کالم لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت قرض حسنہ لے کر آئے۔ پاکستان کے اکثر نوجوانوں کی ترجمانی کرتی کہانی اچھی لگی۔ شیراز کے خواب واقعی مکمل کہانی محسوس ہوتے تھے تاہم آخری بار حقیقت ہی رہی اور یہی اکثریت کی کہانی کا اینڈ ہوتا ہے۔ نذیر احمد بزمی اور جاوید راؤ کے اشعار پسند آئے۔“

✠ **بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس**، ہرگیانہ روڈ کمالیہ سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ”سرپتی سسپنس کا نیا شمارہ کافی انتظار کے بعد 17 جولائی کو اپنا دیدار کروانے میں کامیاب ہوا۔ سرورق دیکھ کر منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ دراصل اس بار ڈاکٹر صاحب نے جانے انجانے میں سرورق پر اریبہ بخاری اور بشریٰ افضل آنٹی کو اکٹھا پیسٹ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو عرض کرتا چلوں کہ گدھے اور گھوڑے کو ایک جگہ جمع نہ کریں۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ جس کا موضوع اس بار آزادی تھا، آزادی بھی خدا کی عطا کردہ ایک نعمت ہے، آزادی کی قدر و قیمت جیل میں بند ان قیدیوں سے پوچھیں جو اپنے پیاروں سے دوران کال کوٹھریوں میں بند ہیں۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے (بے شک) سر جی آپ کی تلخ باتوں کا اثر ان حکمرانوں پر نہیں ہو گا یہ سب اپنا ہی خون جلانے والی باتیں ہیں۔ اس بار کرسی صدارت پر گستاخ انجم صاحب حد سے بڑھ کر گستاخیاں کرتے نظر آئے، اپنے قول و فعل سے دور، مجبور و بے قصور گستاخ کو اس کی گستاخیوں پر داد دینے پر بے طرح مجبور فرشی سلام پیش کرتا ہے۔ جویریہ بنت ڈاکٹر نعیم اکبر سحر صاحب ارے بی بی آپ کی سحر کب طلوع ہوئی چونکہ آپ ہماری پیاری سی محفل میں پہلی بار حاضر ہو رہی ہیں تو ایک سینئر ہونے کے ناتے میں اور میرے دیگر ساتھی آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ارے یہ کیا جویریہ جی، آپ نے میرے خط کا ذکر کیا ہی نہیں۔ عمران حیدر بلوچ خوش رہو خدا تم سب کو ان کال کوٹھریوں سے نجات دلائے، آمین۔ باقی کراچی کے حالات پر ہر دردمند دل حیران و پریشان ہے، ہر کوئی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ شیر علی خان صاحب آپ بھی مجھے جعلی شیر ہی لگے ہیں اصلی شیر بھی بھاگتے ہوئے اپنا پتا نہیں بتاتا اور آپ نے بھی جگہ کا نام نہیں لکھا، بھایا اب بھلا ایسی بھی کیا بدحواسیاں۔ رائے قیصر عباس کھرل صاحب ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔ مجھ ناچیز کو بھی یاد کر لیا کریں، میں پیارا سا بندہ ہوں۔ حکیم سید محمد رضا صاحب، اور سنائیں کیا حال ہے، حکمت کیسی چل رہی ہے، اس گورکن کا پتا چلا جس سے آپ کا معاہدہ ہوا تھا آخر کو آپ حکیم ہیں۔ عبدالغفور خان خٹک صاحب خط پسند کرنے کا شکریہ۔ سید محی الدین اشفاق بھائی آپ مجھے اور جعفر حسین کو مسکا لگا رہے ہیں یا پھر واقعی خطوط مانند تھے بہر حال خوش رہیں، جیتے رہیں۔ حسنین عباس بلوچ، بیٹا میری تمام تر نیک دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں، خدا آپ سب کو جلد از جلد ان عقوبت خانوں سے رہائی دلائے، آمین۔ قدرت اللہ نیازی صاحب کبھی ہمارا قومی کھیل ہاکی ہوا کرتا تھا اب ہمارا قومی کھیل احتجاج بن گیا ہے، کوئی بات ہوئی نہیں احتجاج شروع اور ہمارے حکمران ایسے کھیل کروانے میں ماہر ہیں۔ N.S.R. مدثر بھائی ہماری پولیس کے کرتوت ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ہر کوئی ان سے نالاں ہے۔ چودھری احمد خاں صاحب بادام کھانے کی ضرورت تو آپ کو بھی ہے ارے بھائی میرے بادام جہاں دماغ کے لیے ضروری ہیں وہاں آنکھوں کے لیے بھی ضروری ہیں۔ جناب چودھری صاحب آپ کو میرا خط نظر نہیں آیا۔ واہ جی واہ کیا خوب، زبردست ہمایوں سعید راج صاحب کیا لکھتے ہیں آپ، دل کرتا ہے آپ کا خط فوٹو اسٹیٹ کروا کے لوگوں میں بانٹوں! میری طرف سے ماہ رمضان کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خدا کرے اس ماہ رمضان میں ہمارے حکمران زیادہ سے زیادہ نیکیاں کریں جس کا اثر ہم عوام پر بھی ہو اور دوسری بات 21 جولائی کو میری سالگرہ بھی ہے، اب جلدی سے محفل کے دوست تالیاں بجائیں شاباش شاباش! ارے خواتین کی تالیوں کی آواز نہیں آ رہی، جل رہی ہیں شاید۔ اب بات ہو جائے ذرا کہانیوں کی، ارے بھلا کون سی کہانیاں ابھی تو کوئی پڑھی ہی نہیں۔“ (کمال ہے..... آپ بھی کام کی بات بھول جانے کے عادی ہیں)

✠ **محمد اسماعیل اجاگر**، پنڈی گھیب، ضلع اٹک سے چلے آ رہے ہیں ”کافی دنوں بعد محفل میں شریک ہو رہا ہوں۔ ستمبر 2011ء میں آپ سے ہونے والی ملاقات کی مہک ابھی تک باقی ہے۔ اگست 2012ء کا سرورق بہت پسند آیا۔ خاص کر خوب صورت گلدان اور تتلیاں۔ لیکن اگر گلدان پہ چند خوب صورت پھول ہوتے تو تتلیاں بھی خوش ہو جاتیں اور ہم بھی۔ انشائیہ کافی پر فکر رہا۔ جون ایلیا صاحب حقیقت تو یہ ہے کہ ہم آزادی کے قابل ہی نہیں تھے۔ وہ قربانیاں وہ سب رائگاں گیا۔ جون ایلیا صاحب یہ سزا ہے اس عہد کو بھلانے کی جو ہم نے قیام پاکستان کے وقت کیا تھا۔ ملک صفدر حیات کی تحریر ہمیشہ عمدہ

چاہتوں کا سفر

✠ **طاہر احمد یوسف زئی**، گلبرگ، لاہور کا محبت نامہ ”ویسے مجھے ایک خاموش قاری کی حیثیت سے کئی سال ہو گئے ہیں مگر خط لکھنے کی جرأت و جسارت پہلی مرتبہ کر رہا ہوں، ویسے مجھے خط لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں مزہ آتا ہے اور اس خط کے لکھنے کی جو حسین وجہ ہے وہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ ہیں جنہیں میں بذریعہ سسپنس پروپوز کرنے والا ہوں۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ میرے موبائل نمبر پر ایک انجانے نمبر سے good morning کا میسج آتا ہے۔ جس کا صرف last digit چینج تھا باقی نمبروں کی ترتیب میرے نمبر کی تھی اور شاید یہ پیغام صبح بھی میری زندگی کی ہر مارننگ کو گڈ کرنے کے لیے تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دوستی بڑھتی رہی اور بالآخر محبت کے خوب صورت آغاز میں ڈھل گئی۔ معلوم نہیں تھا کہ اس سے میری زندگی میں ایک نیا موڑ آئے گا۔ جب واپسی کی خاطر یو اے ای ابوظہبی کے لیے فلائٹ میں بیٹھا تو مجھے لگا کہ میں یہاں کچھ چھوڑے جا رہا ہوں۔ وقت نے احساس دلایا کہ یہ دل کس اہم شخصیت کو لاہور کینٹ میں چھوڑ آیا ہے بس پھر کیا تھا میں نے کچھ ماہ بعد واپسی کا ارادہ کیا اور فلائٹ لی اور سیدھا شہر قائد عروس البلاد میں آ گیا۔ شاید قدرت کی طرف سے انہیں پروپوز کرنے میں کچھ وقت باقی تھا، میں نے سوچا کہ میں ہر دلعزیز سسپنس کے ذریعے ہی اپنی عزیز شخصیت کو پروپوز کروں لیکن شب برات کے دنوں میں میرا ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور کئی دن تک اسپتال میں بھی رہا اور میں اب الحمدللہ خیریت سے ہوں۔ مگر اس دل ناداں کو کون سمجھاتا جو عرب کی اتنی عظیم و شان سرزمین کو چھوڑ کر اپنے وطن عزیز پاک سرزمین پر واپس آ گیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے بس پھر کیا تھا ہم نے بھی فلمی ڈائیلاگ مارا ”کہ دل بھلے سے لیفٹ میں ہوتا ہے مگر ہمیشہ رائٹ ہوتا ہے“ کے مصداق ہم نے ان سے اظہار محبت کر ڈالا۔ بس پھر ہم نے اس حسینہ و ماہ جبینۂ لاہور سے اظہار محبت کیا تو وہی ہوا جس کا دل کو یقین تھا کہ انہوں نے بھی دل کی منشا کے مطابق جواب دیا اور اب میں اپنے گھر والوں کو عنقریب تمام تر لوازمات کے ساتھ ان کے ہاں رشتہ لینے بھیجنے والا ہوں مگر اس سے پہلے سسپنس کے ذریعے انہیں باقاعدہ پروپوز کرتا ہوں۔ ان کا نام نامی اسم گرامی، شبانہ حسن (لاہور کینٹ) جن کا خط جولائی 2012ء میں آپ نے پڑھا۔ اے میرے خدا یا یہ تو نے کیسی نرالی جوڑی بنائی کہ موبائل نمبر بھی ایک، عادت و اطوار بھی ایک، علاقہ بھی ایک۔ اے میرے رب کائنات عزوجل مجھے ان کے حق میں اور انہیں میرے حق میں بہتر فرما اور ہماری جوڑی کو سدا سلامت رکھنا (تمام محفل کے دوست پرزور آمین کہہ رہے ہیں) ایک بات اور ہم نے اب تک ایک دوسرے کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ اب ہم ان کو اسی دن دیکھیں گے جب وہ ہمارے عقد میں تشریف لائیں گی۔ اب کچھ باتیں اپنی جان سے پیاری شبو جی سے بھی کہ آپ نے جس طرح میری محبت کو قبول کیا اور میرے لاابالی مزاج کو نکیل ڈالنے کا ارادہ کیا ہے تو میں ان سب قارئین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ انشاء اللہ آپ کو میری طرف سے کبھی تکلیف و پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، آپ صرف ہمارے دل ہی کی ملکہ نہیں بلکہ ہماری حسین دنیا کی بھی راجکماری ہوں گی۔ خیر دل کے جذبات الفاظ کے نہیں اخلاص کے متقاضی ہوتے ہیں۔ بقول شاعر

بس ہر گھڑی قیامت تھی یہ نہ پوچھ کب گزری
بس یہی غنیمت ہے تیرے بعد شب گزری

اب دیکھنا یہ ہے کہ میرا یہ پرخلوص محبت نامہ جو کہ میری زندگی کا پہلا خط ہے، کہاں تک کامیابی کے زینے کو چھوتا ہے اور اب میں جناب عزت مآب، رونق محفل، جان یاراں و دوستاں محمد حسنین عباس بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا کا تہ دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ جنہیں ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ کا نہ صرف خط پسند آیا بلکہ آپ نے نہایت جامع و مختصر الفاظ میں لکھا کہ ”شبانہ حسن جی نے مختصر لیکن خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا۔“ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ان تمام دوستوں کو جو کردہ اور ناکردہ آزمائشوں کی وجہ سے اسیری کی زندگی گزار رہے ہیں، باعزت آزادی نصیب فرمائے اور اب میں سسپنس کی پوری ٹیم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جن کی اس شب و روز لازوال محنت و کاوشوں کے سبب اپنی مادری اور قومی زبان اردو میں اتنا کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔ سسپنس اپنی محبوبہ کے کہنے پر مسافر کی پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا تھا لیکن ہم ٹھہرے لکیر کے فقیر جس کو پہلے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ڈائجسٹ کے شروع میں محبت نامے بھی ہوتے ہیں پھر ہماری اصلاح جناب ثمر عباس صاحب نے کی اور ارشاد فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو خط لکھا کریں اور میں نے سب سے پہلا خط جو کہ ماہا ایمان جی کا تھا، پڑھا۔ اتنا اچھا لگا کہ میں ماہا جی آپ کا فین ہو گیا اور اب میرے اس love letter کے بارے میں کوئی کچھ لکھے نہ لکھے مگر مجھے آپ کے ریمارکس کا انتظار رہے گا کہ آپ ہماری محبت کے بارے میں کیا ارشاد فرماتی ہیں۔ سسپنس میں تاریخ اور تصوف کے صفحات بے حد پسند آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعر و سخن اس کی لاجواب سلسلے وار کہانیاں مسافر اور کشکول جانے آگے کیا رنگ لاتی ہیں۔ مجموعی طور پر سسپنس ایک معیاری پرچہ ہے اور اب میں آخر میں معراج رسول انکل، عذرا آنٹی، ذاکر انکل اور پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آخرکار آپ سب نے مجھے بھی خط لکھنے والا اور کسی سے محبت کرنے والا بنا دیا۔“ (آپ کا محبت نامہ منفرد جگہ لیے ہوئے ہے.... شبانہ حسن سے امید ہے کہ وہ ہمارے اس نٹ کھٹ قاری کا پروپوزل ضرور قبول کر لیں گی۔ ہمیں آپ کی منگنی کا بھی انتظار رہے گا.....)

ہوتی ہے۔ آدم خور لگڑ بھگا اور قرض حسنہ طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھی گئی کافی دلچسپ تحریریں تھیں۔ نئی دنیا کاشف زبیر صاحب کی بہترین کہانی رہی۔ ان کو یہ کمال حاصل ہے کہ یہ اپنی تحریروں میں منظر کشی کمال کی کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سامنے کوئی فلم چل رہی ہے۔ آخری صفحات پر پانچواں آدمی پڑھ کر اپنے ملک کے سیاست دانوں کے عروج و زوال کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ چھوٹا بخش بھی اچھی کہانی تھی، مختصر مگر پر اثر۔ اس کہانی کے ساتھ بنا پورٹریٹ خوب صورت ہے۔"

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں "اگست کے سرورق پر ہم نے دو خصوصی مہینوں یعنی رمضان المبارک اور ماہ آزادی کی خفیف جھلک بھی نہ دیکھی۔ کھاریاں کا کھارا پانی پینے والے گستاخ انجم کے تبصرے میں گستاخیاں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں۔ ریاض شاہد کے خط نے بے تحاشا افسردہ کیا۔ کاش میں آپ سب کے لیے کچھ کرسکتا۔ عمران برادر! 03329731930 میرا سگا نمبر ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی بھی وقت بذریعہ میسج رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ شیر علی برادر! لڑکیاں عجیب کامپلیکس کا شکار رہتی ہیں۔ ان کو اگر توجہ دو تو ان کی گردن اکڑ جاتی ہے اگر نہ دو پھر اس غم میں گھلتی رہتی ہیں لہٰذا اگنور پالیسی اپناؤ۔ حسنین برادر! آئیڈیا تو اچھا ہے مگر میری ہمت ابھی جواں ہے اور ریڈی میڈ ماجن کی تلاش بلاناغہ جاری ہے۔ عباس کھرل صاحب ماہا کی یادوں میں بے حال نظر آئے۔ جیل انتظامیہ نے آف دی ریکارڈ انکشاف کیا ہے کہ کھرل صاحب کھانا پینا تقریباً چھوڑ چکے ہیں۔ ثاقب برادرز! اگر پاپی پیٹ کی صبر و شکر نامی اشیا سے ٹیوننگ کی جائے تو حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں۔ سی این این ایم آر ایس ٹی ایم ایم مدثر صاحب! تمہارے لیے جاوید اختر صاحب کا مصرعہ عرض ہے "ہم تو بھئی جیسے ہے ویسے رہیں گے۔" ناصر ملک کی مسافر اتنی اچھی لگتی ہے، اتنی اچھی لگتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ حضرت سلیمانؑ کی داستان کا آخری حصہ نہایت جوش و خروش اور مذہبی عقیدت و احترام کے ساتھ پڑھا۔ یہ قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ اس نے تمام نبیوںؑ پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کی تردید کی اور انبیا کو ہر قسم کے گناہ سے معصوم قرار دیا۔ چھوٹا بخش دلچسپ ترین اور عبرت انگیز کہانی ثابت ہوئی۔ اتنے حساس اور وسیع موضوع کو مصنفہ نے دو صفحوں میں سمیٹ کر کمال کر دیا۔ کاشف زبیر کی بیشتر مغربی کہانیوں میں ایڈونچر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ نئی دنیا بھی حسب توقع نہایت شاندار رہی۔ آدم خور لگڑ بھگا ایک دلچسپ تجسیم کی خوب صورت کہانی تھی۔ ایم اے راحت کی خوابوں میں رہنے والے شخص کی کہانی بھی لاجواب رہی جن کا آخری خواب ایک بھیانک حقیقت کے طور پر سامنے آیا۔ ملک صاحب ایک پردہ نشین کو بے حجاب کرنے میں کامیاب رہے۔ آخری صفحات پر ایچ اقبال ملکی حالات کا احاطہ کرتی سنسنی خیز کہانی لیے حاضر تھے۔ بے روزگاری نوجوان نسل کو کس راہ پر لے جارہی ہے ہمارے آقاؤں کو اس کی مطلق فکر نہیں۔ محفل شعر و سخن میں حسنین اور ریاض شاہد کے اشعار نے دکھی کیا۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اگست کا شمارہ اپنے وقت پر مل گیا۔ سرورق کو تعارفی اور تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے انشائیہ میں جا وارد ہوئے۔ حسرت اور امید کے ساتھ آزادی کا ذکر کیا گیا۔ اکیسویں صدی میں تقریباً ہماری دنیا بدل گئی مگر ہندوستان اور پاکستان کے مسائل وہی ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی حالت ہے۔ 65 سال ہوگئے ہندوستان پاکستان کو آزاد ہوئے یہ سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ آسانیاں عوام کو فراہم ہونا چاہئیں۔ معاشی ترقی ہوگی تو دیگر مسائل ثانوی ہیں۔ عوام کو بے وقوف بنانے کا یہ سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے اور اب محفل کی طرف چلتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا خط تلاش کیا مگر بے سود۔ دیگر دوستوں کے تیکھے اور رنگین تبصرے پڑھ کے محظوظ ہوئے۔ گستاخیاں کرنے پر پہلا نمبر آنے پر ہماری مبارک باد۔ ریاض شاہد پینٹر تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اتفاق سے میں بھی پینٹر ہوں، کمپنیوں کا ایڈورٹائزنگ ورک کرتا تھا اسی سبب سات سال پہلے ایک بورڈ لکھتے ہوئے ہائٹ سے نیچے گر گیا تھا جس کے سبب ریڑھ کی ہڈی کا فریکچر ہوگیا تھا۔ تب سے صاحب فراش ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہمت دی، تھوڑا چل پھر لیتا ہوں (اللہ آپ کو شفائے کلی عطا فرمائے۔ آپ کی ہمت اور جذبے کے ہم قائل ہوگئے) سعدیہ بخاری شعر پسند کرنے کا شکریہ اور بھائی بابر عباس آپ کی بات صحیح ہے، جب اللہ نے دل دیا ہے تو دل کے معاملات درپیش آتے ہیں۔ آگے بڑھے تو مسافر کے ہم سفر ہوگئے جہاں مسافر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ نت نئے معرکے سر ہو رہے ہیں۔ ناصر ملک صاحب کو مبارک باد۔ دوسری کہانی کی طرف بڑھے، کشکول میں بھی نئے نئے واقعات اور حالات نظر آرہے ہیں۔ نئے نئے لوگ بھی متعارف کرائے جارہے ہیں۔ تیسری کہانی تاریخ کے دریچوں سے آشکار کرنے والی فیصلے فقیروں کے بھی اچھی تھی اور دلچسپی سے پڑھی گئی۔ اللہ کے ولی بھی اپنی مملکت کے بادشاہ ہوتے ہیں جو بغیر کسی طمع و لالچ کے کسی جاہ و حشم کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ کو دنیا پر حکومت کرتے ہیں مگر اللہ کے ولی دین و دنیا دونوں پر حکومت کرتے ہیں۔ آدم خور لگڑ بھگے نے بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ لانے پر مجبور کیا کہ آج کے دور میں ہنسی بھی ایک نعمت ہے۔ ایم اے راحت کی قرض حسنہ بھی کہنہ مشقی کا ثبوت تھی۔ خواب دیکھنے والا اپنے خواب کی تکمیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ پردہ نشین بھی بس ٹھیک ہی تھی، جنت گوارا رہی کیونکہ دل کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ جس کو ہم زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں وہی اجنبی ہو جاتا ہے۔ محفل شعر و سخن اور کترنوں نے مزہ دیا۔ ویلنا کے وحشی اچھی لگی کہ محبت کرنے کے باوجود مرے ہوئے بھائی کی محبت کا احترام کیا۔ امانت بھی بہتر انداز لیے تھی۔ روح کو بالیدگی اور تازگی بخشنے والے حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات و واقعات نے روح کو سرشار کیا۔ چھوٹا بخش نے بھی ہنسنے پر مجبور کیا۔ ایچ اقبال جیسے منجھے ہوئے قلم کار کی کہانی پانچواں آدمی بھی خوب صورت کہانی تھی۔"

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے تشریف لائے ہیں "اب کی بار سسپنس 18 جولائی کو شہر دل کی زینت بنا۔ انتظار کی شدت اور فراق لمحوں کی حدت...... سے دوشیزۂ سرورق کی مغموم و اداس آنکھوں میں سفید لمحوں کی اذیت...... قابل دید ہے۔ جب...... آس کو یاس کی دیمک لگ جاتی ہے، جب ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں کی پتلیوں کو لہولہو...... اور انگلیوں کی پوروں کو زخمی کر دیتی ہیں تو یہی ہوتا ہے۔ سسپنس کا معیار اور محبت...... ذوق مطالعہ کو جلا بخشتی ہے، متزلزل حوصلوں کو مہمیز دیتی ہے۔ ماہر نباض...... جون ایلیا کا پر مغز انشائیہ...... آزادی...... اہم سوال ہے اور لمحۂ فکریہ بھی کہ آزاد و خود مختار ہونے کے بعد ہم نے ایسا کیا تیر مارا ہے کہ...... آزادی کے 65 سال مکمل ہونے پر فخر کرسکیں؟ ہم نے اس کی بقا، استحکام، سالمیت اور معیشت کی مضبوطی کے لیے کیا کیا؟

آپ کے خط میں آپ کی فکر انگیز گفتگو، ہم تو اس ضمن میں یہی مشورہ مفت عنایت کرسکتے ہیں کہ سیاسی گفتگو سے احتراز و اجتناب جزو لازم ہے کہ پتھر کے پہاڑ کب کسی کی صدائیں سنتے ہیں...... (شاید کہ ترے دل میں اتر جائے......) مسند صدارت پر دھنی سیداں سے گستاخ انجم کا بہترین، مفصل و جامع اور ثقیل و طویل تبصرہ...... بصد شوق ملاحظہ کیا۔ بہترین کاوش اور کامیاب کوشش کے لیے ڈھیروں دفعہ مبارک باد...... مانسہرہ سے جویریہ بنت نعیم اکبر سحر کی پہلی آمد پرتہ دل سے خوش آمدید۔ آپ نے ہماری محنت اور محبت کو پسند کیا ہمیں ازحد خوشی ہوئی۔ سرگودھا سے عمران حیدر بلوچ کی زندہ دلی قابل داد ہے اور ہم دعاگو ہیں کہ رب عظیم آپ کو کربلا کے بے جرم و خطا اسیروں کے صدقے...... صعوبت و تنگی دوراں سے رہا کردے، آمین۔ سرگودھا سے ریاض شاہد آپ سے متعلق یہ جان کر ازحد افسوس ہوا کہ آپ سزائے موت کے قیدی ہیں، کاش کہ...... دست تقدیر کوئی معجزہ دکھائے اور آپ زندگی اور کائنات کی خوب صورت فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ کراچی سے این ایس آر مدثر نے کافی دنوں بعد درشن عطا کیے۔ آپ نے ہمارا نمبر شاید ڈیلیٹ کردیا۔ اٹک سے سعدیہ بخاری، آپ نے یقیناً درست فرمایا ہوگا، آپ کے پرانے زمانے کے پرانے شاعروں کی بات ہی کیا تھی۔ کھاریاں سے بہت پیارے بھائی بابر عباس جنہوں نے قارئین کے مابین رابطوں کی بنیاد رکھی، محبتوں کو فروغ دیا۔ اس بار اپنے شہزادوں کے ساتھ شریک بزم ہوئے ہیں، خوشی ہوئی۔ تازہ ترین خبروں میں ماہا ایمان کا فرار باعث تشویش ہے گمشدہ احباب میں محمد جاوید بلوچ، آغا فرید احمد خان، تصویر العین، دلنشین بلوچ اور پشاور سے ہماری بہت پیاری بہن...... طاہرہ گلزار، آپ تمام لوگ اچھے بچوں کی طرح واپس آجائیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے...... سب سے آخری تحریر ایچ اقبال کی دلچسپ، سسپنس و تجسس سے بھرپور کہانی پانچواں آدمی پڑھی۔ بے شک کہ سیاست دان غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلیوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ بابر بال بال بچا۔ بہترین مصنف ناصر ملک کی لازوال تحریر...... مسافر اپنی مثال آپ ہے جو کہ براہ چشم سرزمین قلب تک آن پہنچی ہے لہٰذا اسے بصد شوق و اہتمام ملاحظہ کیا جاتا ہے۔ میڈم شکیلہ کا جنونِ عشق...... خالد لوہار کی اندھی محبت، شہریار کی مجبوریاں اور اسما کا پاورفل اور اثر انگیز کردار۔ نہایت دلچسپ سلسلہ ہے۔ کشکول کی پراسراریت کا سفر جاری و ساری ہے کہانی بہتر سے بہترین کی جانب گامزن ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی تحریر و تحقیق...... ماضی کے آئینے میں۔ فیصلے فقیروں کے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ ظلم کی حکومت کچھ عرصے پر محیط ہوسکتی ہے لیکن منافقت کا نظام تہ و بالا و زیر و زبر ہو کر نمونۂ عبرت بن جاتا ہے۔ اوراق تواریخ پر رقم...... سلطان محمد تغلق کے دو روپ۔ عہد حاضر کے ارباب اقتدار و اختیار کے لیے مقام عبرت و دعوت فکر ہے۔ کاشف زبیر کی دل گداز تحریر...... نئی دنیا نے بے حد متاثر کیا۔ موبی کی نیت کا خلوص، اس کی مشکلوں کا حل ثابت ہوا۔ نجمہ مودی کی شکاریات پر مبنی دلچسپ تحریر نے دعوت فکر دی۔ ایم اے راحت کی قرض حسنہ الجھے ہوئے ریشم کی طرح تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور حد سے زیادہ مسائل کے ساتھ...... بڑھتی ہوئی آبادی لمحۂ فکریہ ہے۔ ملک صفدر حیات کا ایک اور دلخراش واقعہ...... پردہ نشین، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ تنویر ریاض کی دلگداز تحریر جنت کے دلکش انجام نے بہت مطمئن کیا۔ نسیم اقبال کی سنسنی خیز تحریر ویلنا کے وحشی خیر و شر، حق و باطل اور محبت و نفرت کی ازلی کشاکش کا...... پراثر و چشم کشا ماجرا۔ اسٹوری آف دی منتھ...... وائنا کے خوب صورت کردار نے متاثر کیا، انجام خلاف توقع ہوا۔ بابر نعیم کی امانت...... دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ نجمہ شکور کا چھوٹا بخش بھی خوب رہا۔ بے شک کہ جیسی کرنی...... ویسی بھرنی...... ثمر عباس کی پراثر اور دلچسپ تحریر...... وارث نے بھی بور نہیں کیا۔ بزم شعر و سخن، قارئین کے بہترین ذوق کا آئینہ ہے۔ عظیم الشان پیغمبر...... حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایمان افروز واقعات و دلچسپ حالات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ آخر میں آپ کو آپ کے اسٹاف کو اور تمام قارئین کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے...... عید مبارک۔" (آپ کو بھی عید مبارک)

✠ **بشیر احمد بھٹی**، فوجی بستی بہاولپور سے محفل میں آئے ہیں "خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ سسپنس ڈائجسٹ اگست 2012ء کا شمارہ اپنی آن، بان اور شان کے ساتھ مقررہ تاریخ کو نظر آیا۔ جون ایلیا کی آزادی کے بعد آپ کے خط چھوڑ کر تاریخی کہانی فیصلے فقیروں کے پڑھی۔ نظام الدین اولیاؒ کے دور کی یہ کہانی ہنوز دلی دور است خوب رہی۔ نئی دنیا موبی کی کہانی لاجواب رہی۔ آدم خور لگڑ بھگا پر مزاح تحریر تھی۔ کشکول کی قسط نمبر 13 کے بعد ایم اے راحت صاحب کی قرض حسنہ ایک خیالی خاکہ تھی، اچھی رہی۔ ملک صفدر حیات کی پردہ نشیں کھیت میں لڑکی کا قتل، سسپنس سے بھرپور رہی۔ تنویر ریاض کی جنت، مغربی تحفہ سیاہ قیمتی موتیوں کی اسمگلنگ اچھی رہی۔ بزم سخن کے بعد ویلنا کے وحشی بہت زبردست کہانی ہے۔ مسافر کی قسط نمبر 6 پڑھی۔ پیا، عقیل کھالے کو ملنے والی لاش کس کی ہے؟ ایک سنسنی خیز موڑ پر کہانی پہنچی ہے، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ امانت اور حضرت سلیمان علیہ السلام پڑھی۔ چھوٹا بخش مختصر مگر جامع تحریر ہے۔ وارث، آخر بال کیتھرین کی انشورنس کا مالک بن گیا۔ ایچ اقبال صاحب کی پانچواں آدمی آخری صفحات کی ایک اچھی اور خوب صورت کہانی ہے۔ محفل شعر و سخن کے اشعار زبردست ہوتے ہیں۔"

✠ **محمد زبیر ساگر**، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے چلے آرہے ہیں "دو ماہ بعد خط لکھ رہا ہوں پہلے کئی خط لکھے لیکن آپ نے شائع نہیں کیے غصہ بہت آیا مگر پھر بھی رہ نہ سکا۔ اگست کا سسپنس دیکھا تو ٹائٹل دیکھتے ہی خط لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ سسپنس سے دلی محبت ہے اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں سسپنس کے لیے کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔" (اگر آپ کی تحریر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور حوصلہ افزائی ہوگی)

✠ **عمران حیدر بلوچ**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں "سرورق پر موجود ڈریم گرل اور نازک تتلیوں نے سماں باندھ دیا۔ محفل کی جانب پیش قدمی کی تو گستاخ انجم کو کرسی صدارت ملنے پر مبارک باد دینے کی گستاخی کی۔ جویریہ، ہم آپ کے لیے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے نوازیں۔ شیر علی خان برائے مہربانی کیلکولیٹر رکھ دیں کیونکہ ماہا ایمان بھی شارقہ کو بلاتے بلاتے خود بھاگ چکی ہیں۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، عبدالغفور خان دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ حسنین عباس بلوچ، کھسیانی بلی کھمبا نوچے کیونکہ موصوف کو سخت قید نے دماغی توازن سے محروم کر دیا ہے۔ سعدیہ بخاری کونے میں بیٹھ کر صنف نازک کی نگی دوڑیں دیکھ کر پریشان لگ رہی تھیں۔ چودھری احمد خان بھائی، ہمارا فیملی بزنس کافی وسیع ہے جس کی وجہ سے ہمارے علاقے کے ایک

بدمعاش نے ہم سے بھتہ مانگنا شروع کردیا، ہم نے انکار کردیا تو فائرنگ کی اور ہمارے رشتہ دار جو بھی اس کے ہتھے چڑھ جاتے تشدد معمول بن گیا مجبوراً ہم نے بھی اسلحہ اٹھایا اور میدان میں آگئے۔ اس کے گروہ کا ایک آدمی میرے کزن کے ہاتھوں فائرنگ کے دوران مارا گیا جو کہ ہمیں ہراساں کرنے آیا تھا تو میرے خلاف بھی ایف آئی آر درج کروادی گئی کیونکہ میری شہرت مخالف پارٹی سے ہضم نہ ہورہی تھی۔ پولیس نے تفتیش میں بے گناہ کردیا مگر صرف جھوٹی گواہیوں کی بنا پر جج صاحب نے سزا دے دی اب سزائے موت کی قید کاٹ رہا ہوں۔ 2014ء کے آخر تک ہائی کورٹ میں کیس ساعت ہوجائے گا۔ بڑی امید ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے کہ بری ہوجاؤں گا۔ تمام دوستوں اور تمام اسٹاف کو تہہ دل سے عید مبارک! مسافر کی یہ قسط بھی زبردست رہی۔ میڈم شکیلہ کی حکمت عملی کی وجہ سے دشمن کو منہ کی کھانا پڑی۔ کشکول میں لیاقت حسین تیزی سے کامیابی حاصل کررہا ہے، خوش آئند ہے۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی بھی کامیاب ہے۔ شیخ حامد ٹریپ ہوتا جارہا ہے۔ رضوانہ ساجد کی بیان کردہ حضرت سلیمانؑ کی روداد حیات میں اس دفعہ کے واقعات دلچسپ اور ایمان افروز تھے۔ نجمہ شکور کی چھوٹا بخش مختصر مگر دلچسپ روداد تھی۔ چھوٹے بخش کا ٹھکانا آخر دوزخ ہی ہوا۔ بابر نعیم کی امانت، مسٹر ہولڈر کو میری پر بہت بھروسا تھا اور اسی نے اس کا نقصان کیا۔ ثمر عباس نے وارث میں ہال کی چالاکی بیان کی۔ نئی دنیا کاشف زبیر کی ہمیشہ کی طرح عمدہ تحریر تھی۔ محفل شعروسخن میں سدیہ منظور اور محمد جاوید راؤ کا انتخاب اچھا تھا۔''

✠ **روشنی رشید**، راولپنڈی، دھمیال کیمپ سے محفل میں شریک ہوئی ہیں ''تقریباً 2 سال کے بعد حاضر ہوں، اس عرصے میں مجھے کسی نے بھی یاد نہیں کیا (یہی تو آپ کی بھول ہے) لیکن روشنی کسی کو بھی نہیں بھول سکی۔ ہر ماہ باقاعدگی سے سسپنس پڑھتی تھی۔ سب پرانے ساتھی بہت یاد آتے ہیں۔ این ایس آر مدثر آپ کا کیا حال ہے؟ فیملی کا کیا حال ہے؟ انکل جی آپ کی وجہ سے ہی مجھے اتنے پیارے دوست ملے۔ اتنی خوب صورت محفل خط آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ عبدالرؤف عدم آپ کی محفل خط میں بہت کمی محسوس کی۔ میں ہر ماہ محفل خط میں آپ کا خط تلاش کرتی تھی۔ اس بار خطوط کی محفل دیکھی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، عبدالرؤف عدم محفل خط کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اے جے کسانہ، لیاقت بلوچ، رانا ادیب الرحمن، رائے قیصر عباس کھرل، حسنین عباس بلوچ، عمران حیدر بلوچ آپ سب کی رہائی کے لیے روشنی رشید ہر وقت دعا کرتی ہے۔ میں آپ سب کی رہائی کے لیے آیت کریمہ کا سوا لاکھ ورد کروں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان ہوگی۔ دل کرتا ہے کہ آپ سب کو اپنے ہاتھ سے بنا ہوا کھانا بھیجوں خصوصاً بریانی (واہ واہ نیکی اور پوچھ پوچھ...... دیر نہ کریں جی) اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف۔ سب سے پہلے اپنے پیارے مصنف طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی غیر ضروری پڑھی جس میں معاشرے کا چھپا ہوا رخ نظر آیا۔ کافی دیر اسی کہانی کے بارے میں سوچتی رہی کہ دنیا کیسے کیسے رنگ میں ہے، اعتماد کا خون کیسے لوگ کرتے ہیں یہ کہانی پڑھ کر بہت دکھی ہوئی۔ اس کے بعد مسافر پڑھی۔ مصنف نے ایک دم سے شہریار کو دیہاتی ماحول سے نکال کر جرائم کی دنیا میں ڈال دیا ہے۔ مصنف کو ابھی دل جیت شاہ کو نہیں مارنا چاہیے تھا، اس کردار سے بہت تجسس تھا کہ [illegible] ابھی آستانے [illegible] اور کیا کچھ برآمد ہوگا۔ ابھی شہریار کو چار یا پانچ اقساط میں گاؤں کے ماحول میں رہنے دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس کے بعد محفل شعروسخن میں حاضری دی جہاں تمام اشعار اپنے انتخاب میں بہت بہترین تھے۔ اختر شاہ عارف جہلم کی کترنیں اور اقوال زریں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ اپنی محنت اور لگن سے ہمیشہ فرسٹ پوزیشن پر رہے گا۔ یہ سب تمام اسٹاف کی محنت شاقہ کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سسپنس، سرگزشت، جاسوسی اور پاکیزہ کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔ رجنی پٹیل کی کہانی بہت اچھوتی اور پیاری ہوتی ہے رجنی پٹیل کو خوش آمدید! انور یوسف زئی کو محفل خط میں خوش آمدید۔ عمران حیدر بلوچ، روشنی رشید آپ کو سالگرہ کا کیا تحفہ بھیجے؟ اگلے خط میں ضرور بتانا۔ حاجی عبدالحکیم صاحب آپ کے خطوط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں فیس بک پر روشنی رشید کے نام سے ہی آتی ہوں۔ محفل کے دوست فیس بک پر ضرور رابطہ کریں۔''

✠ **عبدالرؤف عدم**، راولپنڈی سے تبصرہ کررہے ہیں ''سرورق کی دوشیزہ نے اک ادائے دلربائی سے ہمیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ہم نے یہ کہہ کر اس کی کوشش ناکام بنادی کہ ''مجھ سے مت کر گفتار، میں روزے سے ہوں'' جون ایلیا کی آزادی کے بارے میں کڑوی مگر سچی باتیں پڑھنے کے بعد محفل کا رخ کیا، مگر وہاں کرسی صدارت پر کسی گستاخ کو بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس گستاخی کے لیے انہوں نے ثقیل اردو کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زنی کے جوہر دکھائے ہیں۔ جویریہ، خوش آمدید۔ اللہ آپ کو امتحان میں شاندار کامیابی عطا فرمائے۔ ریاض شاہد، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ رمضان کریم کے صدقے تمام بے گناہ قیدیوں کو آزادی کی نعمت سے نوازے۔ سب سے پہلے فیصلے فقیروں کے پڑھے یا پڑھی۔ یہ فقیر لوگ بھی اپنی دنیا کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ سلطان محمد تغلق کی بے تحاشا قتل و غارت گری نے ہمیں حیرت و افسوس کے سمندر میں غرق کردیا۔ کاشف زبیر کی نئی دنیا ایک الگ طرز کی خوب صورت تحریر ہے۔ موبی اور اس کے مختصر ساتھیوں کی جدوجہد نئی دنیا بسانے والوں کے لیے عملی نمونہ ہے۔ آدم خور نگر بھوگا میں نجمہ مودی نے اپنے مخصوص ظرافت بھرے انداز میں ایک منفرد شکاری مہم کا تذکرہ بیان کیا۔ کہانی کا آخری جملہ ہماری قوم کے مجموعی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ قرض حسنہ میں ایم اے راحت نے دلچسپ انداز میں خوابوں کی دنیا میں رہنے والے ایک نادان شخص کا تذکرہ بیان کیا۔ ملک صفدر حیات ہمیشہ کی طرح ایک الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہوئے نظر آئے۔ جانے برے لوگ برا کام کرتے ہوئے برے نتیجے کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ تنویر ریاض کی جنت بہت سنسنی خیز اور دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ امانت بہت خوب صورت تحریر ہے۔ بعض اوقات ہم جن رشتوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں وہی ہمیں دھوکا دے جاتے ہیں۔ چھوٹا بخش بے سروپا تحریر لگی جسے کہانی بنانے کی کوشش کی گئی۔ پانچواں آدمی آخری صفحات کو جگمگاتی ہوئی تحریر ہے جسے ایچ اقبال نے اپنے زور بیاں سے خوب صورتی بخشی۔ کہانی کی بعض سچویشنز فلمی ٹائپ کی محسوس ہوئیں اور اب اس خوب صورت بات کے ساتھ اجازت کہ ''جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤ۔'' لیبا انصاری صاحبہ سے کہیں کہ وہ ڈائریکٹ یا آپ کے ذریعے ہم سے رابطہ کریں، انشاء اللہ ان کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' (اگر آپ رابطے کے لیے نمبر بھی عنایت کردیتے تو بہتر ہوتا)

✠ **عمر علی**، گجرات سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''18 تاریخ کو تیسرے چکر میں اگست کا شمارہ ملا تو جان میں جان آئی۔ اس دفعہ سرورق اچھا لگا۔ ڈاکر انکل آپ سے بس ایک گلہ ہے کہ آپ نے شاید خوب صورت مرد (میرے جیسے) دیکھے نہیں ورنہ آپ ان حسیناؤں کی جگہ ہماری تصویر بناتے۔ سب سے پہلے محفل یاراں میں انٹری دی۔ گستاخ انجم کو مسند اقتدار پر براجمان پایا، مبارکاں جی۔ باقی تبصرے بھی اچھے ہوں گے کیونکہ ہم نے کون سا پڑھے تھے (بہت بری بات ہے) جون ایلیا مرحوم آزادی کا رونا رو رہے تھے۔ مسئلہ ہمیشہ بھارت کی ہٹ دھرمی رہی ہے ہماری طرف سے مثبت ردعمل ہی آتا ہے۔ کہانیوں میں مسافر اور کشکول دونوں بہت تیز جارہی ہیں۔ اس کے بعد چھوٹا بخش پڑھی، بہت مزہ آیا۔ حضرت سلیمانؑ کی زندگی کے حالات و واقعات پڑھے۔ بنی اسرائیل نے کسی بھی پیغمبر کو نہیں چھوڑا۔ قرض حسنہ اس مہینے کی ٹاپ کی کہانی لگی۔ ویل ڈن ایم اے راحت صاحب۔ پردہ نشیں اور پانچواں آدمی نارمل سی کہانیاں تھیں۔''

✠ **راشد حبیب تابش**، چھب، ضلع اٹک سے چلے آرہے ہیں ''بوجہ مجبوری کچھ ماہ سے محفل سے رابطہ منقطع رہا کیونکہ میں آج کل ایسی جگہ پر ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں جہاں پر نہ تو وقت پر سسپنس ملتا ہے اور نہ ہی ڈاک کا نظام ہے۔ میں ناران شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر کی دوری پر ہوں کبھی کبھار ناران آنا ہوتا ہے (واقعی وادی ناران بہت ہی خوب صورت ہے ساتھ ہی نزدیکی وادیوں شوگران و دیگر بھی حسین قدرتی مناظر سے بھرپور ہیں) مگر پہلا شہر دیکھا جہاں سسپنس نہیں ملتا۔ اس دفعہ چھٹی پر گھر گیا تو دعا مانگی کہ اللہ کرے 20 کو شمارہ آچکا ہو کیونکہ 20 کو میری واپسی تھی۔ پنڈی پہنچ کر سب سے پہلے شمارے کا پتا کیا اور بے انتہا خوشی ہوئی کہ شمارہ آچکا تھا۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی کشکول پڑھی کہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ آکٹوپس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے شاید وہ اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب اک نیا کردار پرتاب سامنے آرہا ہے جانے وہ کیا گل کھلاتا ہے۔ محفل شعروسخن میں معیاری اشعار پڑھنے کو ملے۔ سعدیہ بخاری، ریاض بٹ، بزمی اور ماریہ علی کے اشعار پسند آئے۔'' (آپ کی محبت کے کیا کہنے)

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور، لیہ سے محفل میں شرکت کررہے ہیں ''اس مرتبہ ٹائٹل کچھ خاص نہ تھا۔ جون ایلیا اور انکل معراج رسول صاحب کے سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ آزادی کی قدروقیمت کا احساس ہمارے ہاں کسی کو نہیں۔ گستاخ انجم صاحب آپ کی باتیں سچ اور تلخ ہیں۔ عمران حیدر بلوچ صاحب آپ کی رہائی کے لیے خدا سے دعاگو ہوں۔ سعدیہ بخاری کو ناک بری لگی لیکن شکر ہے کچھ تو اچھا لگا۔ رمضان پاشا آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ مسافر میں شہرے اور کھالے کی خان زادی کی وجہ سے خوب لڑائی ہوئی۔ میڈم پر شہرے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اختتام پر ملنے والی لاش شہرے کی بہن کی ہوسکتی ہے مگر ہونی نہیں چاہیے۔ ناصر ملک صاحب کا قلم جوبن پر ہے، ویلڈن سر۔ کشکول میں لیاقت حسین معصومیت سے اپنے تبدیل ہونے والے صاحبان کی جان بچاتا جارہا ہے۔ تبدیلی جو پسند آئی وہ پرتاب گھوش کی وجہ سے ہے۔ وہ شاید اپنا جاپ مکمل کرکے آیا ہے۔ ایچ اقبال کی پانچواں آدمی بازی لے گئی۔ آج پاکستان کی سیاست میں بھی شوکت رباجوہ جیسے لوگ ہیں جو کبھی بھیس بدل کر تو کبھی ایمان بیچ کر اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کررہے ہیں۔ کاشف زبیر کی نئی دنیا اور نجمہ مودی کی آدم خور نگر بھوگا پسند آئیں۔ اشعار اور کترنیں زبردست تھیں۔ تمام دوستوں اور انکل آنٹی کو ایڈوانس عید مبارک۔''

✠ **کول رباب**، لاہور سے تبصرہ کررہی ہیں ''ارے بھئی رکیے تو تھوڑی سی جگہ تو دے دیں پلیز۔ اوہو پیچھے مڑ کر تو دیکھیے ما بدولت اتنے موٹے بھی نہیں کہ تھوڑی سی جگہ میں نہ آسکیں دیکھیے مانا کہ ہمارا نام آپ سب کے لیے نیا ہے (تو نیا کیوں نہ ہوتا جب آپ پہلی بار محفل میں شرکت کررہی ہیں، خوش آمدید) لیکن ہم تو سسپنس کو ایک مدت سے پڑھ رہے ہیں (ہمیں تو آج معلوم ہوا لیکن کہانیوں پر مختصر تبصرہ کیوں؟) ارے جویریہ ذرا ہاتھ پکڑنا میں بھی تمہاری طرح پہلی بار ہی لکھ رہی ہوں ارے بچا کر روی کی نوکری کی نظر پڑ گئی تو خیر نہیں۔ جی جناب ٹائٹل گرل زیادہ اچھی نہیں تھی، بس آنکھیں خوب صورت تھیں۔ تبصرے بھی کے اچھے تھے۔ اللہ تعالیٰ عمران حیدر بھائی اور تمام قیدیوں کو رہائی دیں، آمین۔ ویسے بھی میں تو عمران علی جھنگ کی جگہ لے رہی ہوں وہ کچھ مصروف تھے۔ محفل شعروسخن میں سب کے اشعار اچھے تھے لیکن حاجی محمد زاہد، رضوان، لاہور۔ محمد اقبال، کراچی۔ محمد رشید سیال، قاری محمد رمضان، محمد لطیف ساحل کے سب سے اچھے رہے۔ لطائف بھی اچھے تھے، خوف خدا، جنت میں داخلے کا سبب، بدصورتی اور میک اپ۔ کہانیاں صرف دو ہی پڑھی ہیں، باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ سب کو رمضان مبارک اور عید بھی۔ اچھا میں اب افطاری کرلوں۔''

✠ **حسنین عباس بلوچ**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''دل کی گہرائیوں سے عید کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ انشائیہ میں جون انکل آزادی کے پہلو پر روشنی ڈال رہے تھے۔ گستاخ انجم صاحب کرسی صدارت پر براجمان تھے مبارک ہو جی۔ حکیم محمد رضا شاہ محترم واقعی انکل بابر عباس محفل کی جان ہیں۔ ماہا ایمان شاید بہت زیادہ معروف ہیں۔ حمیرا رضا بہن بھی محفل میں شامل ہونے سے قاصر رہیں سب سے پہلے نمبر پر موسٹ فیورٹ کاشف زبیر کی نئی دنیا پڑھی۔ کشکول اور مسافر حقیقت میں بے حد اچھی اسٹوری ہیں اپنی اپنی جگہ کی بے مثال اسٹوری ہیں۔ مسافر میں ناصر ملک صاحب جس جگہ کی آج کل سیر کروا رہے ہیں وہ جگہ میں نے دیکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد، فیصلے فقیروں میں نمودار ہوئے۔ ماضی کی لازوال تحریر تھی۔ دیگر تمام اسٹوریز سسپنس کی شان و شوکت کی عکاسی کررہی تھیں۔'' (آپ کا خوب صورت عید کارڈ بھی ملا جو اسی خط پر آپ نے بنایا، بہت شکریہ)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی۔ عبدالرحمان، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ رائے قیصر عباس کھرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ صوبیہ تفسیر، اوکاڑہ۔ جمال اعزاز، تربت۔ جویریہ، مانسہرہ۔ دلدار احمد چٹھہ، حیدرآباد۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ جمال اعزاز، تربت۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگ۔ رانا حبیب الرحمن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد ہمایوں تنولی، مانسہرہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔

*

بقول راجا رائے سی ہرس "جس راجا کی پرجا اس سے خوش ہو، اس کی طرف کوئی دوسری قوم میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتی" اگرچہ یہ اقتدار کا ایک سنہرا اصول ہے مگر اسے اپنایا چیدہ چیدہ شاہوں نے تھا... میدانِ جنگ میں گھمسان کا رن پڑے یا سازشوں سے پانسا پلٹا جائے، توازن اور ذہانت کا امتزاج نہ ہو تو کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ جیسے کہ تلوار کی جنگ تدبیر سے جیتنے والا راجا "چچ" کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ جس نے چالیس سال انتہائی کروفر سے حکومت کی اور پھر چتا کی آگ میں جل بجھا۔ سندھ کے حصے میں باب الاسلام کا اعزاز ملنے تک جانے کتنی داستانیں رقم ہو چکی تھیں... تاریخ کے اوراق پلٹتے پلٹتے جب چچ کے بیٹے راجا داہر کا نام آتا ہے تو ایک لمحے کو ہاتھ یوں رک جاتے ہیں جیسے اس کے شرمناک فعل پر کائنات کو سکتہ ہو گیا تھا... جو محض جاہ و حشم کی طمع میں عہد گزشتہ میں ناپسندیدہ شخصیت ٹھہرایا گیا۔ دن اور رات کے تسلسل میں جانے کیا جادو ہے کہ زمین پر جتنے انسان اتنی ہی داستانیں جنم لیتی ہیں... مقدر کی لوح پر کسے فقیری اور کسے سلطانی عطا ہو، یہ تو ایک رمز ہے جسے آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

سندھ ابھی سندھ تھا۔ اس خطۂ زمین کو باب الاسلام کا اعزاز ملنا تھا لیکن ایک صدی درمیان میں تھی۔ اس ایک صدی میں اسے کئی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔

اسلام کا سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن اس کی کرنیں ابھی مدینہ منورہ کے گلی کوچوں کو منور کر رہی تھیں۔ باقی دنیا گہرے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سندھ کی زمین بھی کفر و ضلالت کے قدموں سے آباد تھی۔ یہاں جو راجا حکومت کرتے تھے وہ رائے کہلاتے تھے اور عقیدتاً بدھ مذہب کے پیرو تھے۔

جب رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، اس وقت جو راجا یہاں حکومت کر رہا تھا اس کا نام رائے سی ہرس تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت شہر اروڑ (الور) کو بنایا تھا۔ یہ شہر پچھلے تین حکمرانوں کے دورِ حکومت دیکھ چکا تھا اس لیے خوب ترقی یافتہ تھا۔ عالی شان عمارتیں، سرسبز باغات، ہری بھری کھیتیاں، خوش حال لوگ۔ کیا تھا جو یہاں نہیں تھا۔ رائے سی ہرس نہایت دولت مند تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیاض اور سخی بھی تھا۔ اس نے دولت کو خزانے میں بند کر کے نہیں رکھا تھا بلکہ عمارتوں میں اضافہ اور باغوں کو کشادہ کیا تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

جواب میں اس کی رعایا بھی اس کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتی تھی۔ پھر فتنہ و فساد کیسا، شور و ہنگامہ کیسا۔

رائے سی ہرس کی حدودِ حکومت بہت وسیع تھیں۔ اس کی حکومت مشرق میں کشمیر، مغرب میں مکران، جنوب میں دریائے محیط اور دیبل اور ساحلِ سمندر تک اور شمال میں کوہ کردان اور کیکانان تک پھیلی ہوئی تھی۔

وہ ایک اچھا منتظم تھا لہٰذا اتنی وسیع مملکت کے انتظام کو درست رکھنے کے لیے اس نے اپنی مملکت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان چاروں صوبوں میں چار صوبے دار مقرر کیے تھے۔

یہ چاروں صوبے، صوبہ برہمن آباد، صوبہ سیوستان، صوبہ اسکندرہ اور صوبہ ملتان کے نام سے موسوم تھے۔

آخری صوبے کی سرحد کشمیر سے جا ملتی تھی۔

راجا خود اروڑ میں رہتا تھا اور صوبوں کی نگرانی کرتا تھا۔ اس نے ان صوبوں کے صوبے داروں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہمیشہ مسلح جتھے تیار رکھا کریں تا کہ کوئی دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔ یہ بھی تاکید تھی کہ رعایا کے مفاد کو ہر حال میں پیشِ نظر رکھا جائے۔

اس کا قول تھا کہ جس راجا کی پرجا اس سے خوش ہو،

کوئی دوسری قوم اس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکی۔

وہ خود بھی اپنے اس قول پر عمل پیرا تھا۔ اپنے راج کنوروں کو اس نے فنونِ جنگ سے بہ خوبی واقف کیا تھا۔ لڑائی کے لیے انہیں ہر وقت تیار رکھتا تھا اور ہر قسم کا سامان جنگ، اسلحہ اور گھوڑے ان کے لیے موجود رہتے تھے۔ رعایا کو بھی ہمیشہ راضی رکھتا تھا اور جابہ جا عالی شان عمارتیں تعمیر کراتا تھا۔

سلطنت میں فتنہ جو اور باغی لوگ نہ تھے کہ جھگڑے پیدا ہوں اور رعایا کے امن و امان میں خلل پڑے۔ یہ امن و امان ایک مدت سے قائم چلا آرہا تھا کہ ناگہاں بادشاہ نیم روز سندھ پر چڑھ دوڑا۔ بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا اور خوب لوٹ مار مچائی، (تاریخ سندھ کے مولف عبدالحلیم شرر کے مطابق بادشاہ نیم روز سے مراد ساسانی تاجدار عجم ہے)

راجا کو جب معلوم ہوا کہ کوئی دشمن سندھ میں داخل ہوا ہے تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے فوراً اپنے راج کنوروں کو طلب کیا۔ نہ فوج کی کمی تھی نہ گھوڑوں اور سامان حرب کی۔ طویل امن و امان کے دور نے جنگی تیاری کا خوب موقع دیا تھا۔ سپاہی بھی ایسے کہ راجا پر جان دینے کے لیے بے چین۔ راجا نے پکارا تو دوڑے چلے آئے۔ راجا ان سورماؤں کو لے کر اروڑ (الور) سے نکلا اور ایک کھلے میدان میں پہنچ گیا جہاں سے دشمنوں کی صفوں کو آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

راجا نے اپنی فوج کو مخاطب کیا۔ ”سندھ کے باسیو! میرے بچو! میں نے حکمرانی اس لیے حاصل نہیں کی تھی کہ تمہیں جلتی زمین پر دھوپ برساتے آسمان کے نیچے لا کر کھڑا کردوں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ امن و امان کے باغوں میں رکھا۔ کسی اور کے علاقے پر کبھی کوئی بری نظر نہیں ڈالی کہ تمہیں تلواروں کے منہ دیکھنے پڑیں، تمہارا خون میرے نزدیک اتنا سستا نہیں تھا کہ اسے جنگوں میں بہاتا پھرتا لیکن اب مجبوری ہے۔ شاہ نیم روز نے مجھے مجبور کردیا کہ میں تمہیں یہاں لے کر آؤں۔ سندھ دھرتی ہماری ماں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔ یہ جنگ میں اپنی حفاظت کے لیے نہیں، سندھ کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہوں۔ اگر مجھے اپنی جان کی پروا ہوتی۔ تو میں تمہارے ساتھ نہ آتا۔ دیکھ لو میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایک سپاہی کی طرح تمہارے شانہ بشانہ لڑوں گا، آخر دم تک لڑوں گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی اضافی انتظام نہیں کیا ہے۔ وہی ہتھیار میرے پاس ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔ ہم دشمن کو یہاں سے بھگا کر ہی دم لیں گے۔“

اس کی اس تقریر سے اس کے آدمیوں میں بے حد جوش و جذبہ پیدا ہوگیا۔ اسی وقت اس کا بیٹا ساہسی ہجوم سے نکلا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

”پتاجی، ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ آپ اس جنگ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ لڑائی میں حصہ نہ لیں، کسی محفوظ جگہ بیٹھ کر سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہیں۔ لڑائی میں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کی جان کو کوئی نقصان پہنچا تو سب کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ آپ کو زندہ رہنا چاہیے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہاری یہ بات مان لوں گا۔ میرے سپاہی مرتے رہیں اور میں کسی جگہ محفوظ بیٹھا رہوں یہ تم نے سوچا بھی کیسے۔ میرا باپ آج اس دنیا میں نہیں، اس کی جگہ میں پوری کررہا ہوں۔ جب میں نہیں رہوں گا تو میری جگہ تم لے لوگے۔ پھر مجھے فکر کس بات کی۔ جاؤ لڑائی کی تیاری کرو۔“

ساہسی مایوس لوٹ آیا۔

راجا اس وقت مکران میں تھا جہاں شاہ نیم روز لوٹ مار مچا رہا تھا۔ مکران کا علاقہ رائے سی ہرس کے ماتحت تھا۔ اس لیے اس کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ یہ خطرہ بھی صاف نظر آرہا تھا کہ مکران میں لوٹ مار مچانے کے بعد وہ سندھ کی طرف آئے گا۔

شاہ نیم روز کو جب معلوم ہوا کہ رائے سی ہرس مقابلے کے لیے نکلا ہے تو اس نے بھی تیاری پکڑی۔ اب تک وہ محض لوٹ مار کرتا رہا تھا۔ کسی باقاعدہ فوج سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن اب لشکرِ جرار سے مقابلہ تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو اچھی طرح ترتیب دیا اور خوب تیاری سے مقابلے پر آگیا۔

دونوں طرف کے بہادر جب آپس میں نبرد آزما ہوئے تو نہایت گھمسان کا رن پڑا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی۔ دونوں طرف کے سورما ایسی شجاعت کا مظاہرہ کررہے تھے کہ جنگ کا فیصلہ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ دونوں حریفوں کے سیکڑوں سپاہی قتل ہوگئے تھے لیکن کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ شاہ نیم روز اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمیوں کو اپنے حضور طلب کیا اور حکم دیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نئی حکمتِ عملی ترتیب دی جائے۔

”یاد رہے کہ یہ حملہ آخری ہونا چاہیے۔ اس حملے کے بعد فتح یا شکست مجھے دونوں قبول ہوں گی۔ میں یہ

برداشت نہیں کرسکتا کہ میرے آدمی کٹ کٹ کر گرتے رہیں اور کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ میں سندھیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

یہ تقریر ہی ایسی تھی کہ اس کے جنگ آزماؤں نے جان پر کھیل کر ایک بڑا حملہ کردیا۔ وہ فیصلہ کرچکے تھے کہ مرنا ہے یا فتح یاب ہونا ہے۔

ایرانی فوج کا یہ حملہ ایسا زبردست تھا کہ ایک طویل کشمکش کے بعد سندھ کے سپاہی تاب نہ لاسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ رائے سی ہرس ابھی تک اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنی فوج کو بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن اس کے قدموں کو جنبش نہ ہوئی۔ اس کا بیٹا ایک مرتبہ پھر اس کے قریب آیا اور مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے ہاتھ کھینچ لے لیکن راجا نے بڑی حقارت سے اس کا مشورہ ٹھکرادیا۔ بہت تھوڑی فوج رہ گئی تھی جو راجا کے ساتھ تھی اور ابھی تک حقِ وفاداری ادا کررہی تھی۔ راجا نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا کہ ناگہاں دشمن کی جانب سے ایک تیر آیا اور اس کے گلے میں پیوست ہوگیا۔ تیر ایسا کاری تھا کہ وہ فوراً گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ اس کے گرتے ہی باقی ماندہ فوج بھی پریشان ہوکے بھاگنے لگی۔ اس کا بیٹا ساہسی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور باپ کی لاش کو اپنے گھوڑے پر لے لیا۔

شاہ نیم روز کے لشکر میں فتح کے نقارے بجنے لگے۔ ایرانی لشکر نے بھاگتے ہوئے سندھیوں کا دور تک تعاقب کیا۔ خوب لوٹ مار مچائی اور پھر علاقہ نیم روز کی طرف واپس لوٹ گیا۔

سندھی لشکر اِدھر اُدھر منتشر ہوگیا تھا۔ دوسرے دن خطرہ سر سے ٹلا تو منتشر لشکر ایک جگہ جمع ہوا شکست خوردہ سندھی مضطرب و حیران اس قیامت خیز سانحے کی خبر لے کر دارالحکومت میں داخل ہوئے۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ ہر جانب صفِ ماتم بچھ گئی۔ راجا ایسا ہر دلعزیز تھا کہ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جس نے آنسو نہ بہائے ہوں۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ راجا کے محل کے سامنے سوگواروں کا ہجوم تھا۔ ان کی آہوں اور سسکیوں کا شور آسمان تک جارہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شور کبھی نہیں تھم سکے گا۔ جیسے اروڑ کے رہنے والوں کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں آسکے گی۔

شہر کے رہنے والوں کو دہرے صدمے سے واسطہ تھا۔ شکست کا دکھ بھی تھا اور راجا ہاتھ سے چلا گیا تھا یہ صدمہ بھی تھا۔

غم و اندوہ کی اسی فضا میں راجا کی آخری رسومات ادا

کردی گئیں۔

راجا کا محل غم کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ امرا اور وزرا کو یہ فکر تھی کہ تخت ابھی تک خالی پڑا ہے۔ یہی حال رہا تو ملکی معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔ کوئی غنیم اس طرف آنکلا تو لشکر کس کے حکم کی پاسداری کرے گا۔ راجا کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ لیکن دنیا تو اپنی جگہ چلتی ہی رہتی ہے۔ تخت پر کسی کو تو بیٹھنا چاہیے۔ لیکن کس کو؟ راجا کا بیٹا ساہسی سب سے مضبوط امیدوار تھا۔ وہ راجا کی زندگی ہی میں اپنی دونوں خوبیوں کی بدولت عوام میں بہت مقبول تھا۔ امرا بھی اسے بہت عزیز رکھتے تھے لہٰذا اسی کا نام پیش کیا گیا۔ کسی طرف سے بھی مخالفت کی آواز بلند نہ ہوئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کسی طرح ساہسی کو تیار کیا جائے جو اپنے باپ کے سوگ میں محل چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھا تھا۔

امرا میں سے چند با اثر لوگ اس کے پاس گئے تاکہ اسے تخت نشینی کے لیے آمادہ کرسکیں۔ ساہسی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب پانی کا ایک برتن رکھا تھا۔ امرا نے اس پر تاسف کیا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

''کنور ساہسی، شہزادوں کو یوں فقیری لینا اچھا نہیں لگتا۔ اٹھ اور راج پاٹ سنبھال۔''

''دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ گدی جس کو جی چاہے دے دو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''کیا تمہیں راجا کی وصیت یاد نہیں۔ شاہ نیم روز سے مقابلے کے وقت ہم قریب ہی کھڑے تھے جب اس نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں نہ رہا تو میری جگہ تم سنبھالو گے۔ پرلوک سدھارنے والوں کی وصیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ جگ میں اندھیرا ہے۔ تم تخت پر بیٹھو تو لوگوں کی ڈھارس بندھے۔''

اس کے بعد بھی ساہسی نے بہت حیل و حجت کی لیکن امرا کی ضد سے مجبور ہو گیا۔ وہ سب اسے شہر میں لے آئے۔

وہی خلقت جو راجا کے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی، ساہسی کے جلوس کو دیکھ کر خوشی سے نعرے بلند کرنے لگی۔

دربار میں تخت نشینی کے ساتھ ہی عیش و عشرت کے شادیانے بجنے لگے۔ بہت بڑا جشنِ طرب منعقد کیا گیا۔ زر و جواہر نچھاور ہوئے۔ پورے شہر میں خوشیوں کا وہ رقص ہوا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔

تخت نشینی کے ایک سال بعد وہ ملک کے دورے پر نکلا۔ ہر شہر میں پہنچا۔ وہاں کے لوگوں سے ملا۔ ان کے دکھ درد کو معلوم کیا۔ مفسدین اور باغیوں کا قلع قمع کیا۔

ملک کے حالات سے جب اچھی طرح واقف ہو گیا تو واپس آیا اور حکومت کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے ضوابط اور قواعد مرتب کیے۔

پہلا ضابطہ لشکریوں سے متعلق تھا۔ وہ یہ جان چکا تھا کہ لشکریوں کی مدد و تعاون کے بغیر کوئی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ انہیں خوش رکھنا اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس نے ضابطہ جاری کیا کہ فوجیوں کی جو بھی تنخواہ مقرر ہے وہ انہیں بروقت ملنی چاہیے۔

دوسرے ضابطے میں تحریر کیا کہ رعایا سے جو بھی خراج وصول کیا جاتا ہے وہ تین قسطوں میں وصول کیا جائے تاکہ ان پر بوجھ نہ پڑے۔

تیسرے ضابطے کے مطابق اس نے ملک کے تاجروں کو حکم دیا تھا کہ حکومت کی جانب سے جو ان پر ٹیکس عائد ہے وہ کسی مطالبے کے بغیر بروقت ادا کرنا چاہیے۔

چوتھا ضابطہ اہلِ صنعت و حرفت سے متعلق تھا۔

یہ ضابطے جب روبہ عمل ہوئے تو ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ ملک کے چاروں صوبوں میں بھی چین ہی چین تھا۔ سب کام اپنی اپنی جگہ بہ خوبی چل رہا تھا۔ نہ کہیں کوئی شکایت تھی نہ سرکشی۔ فرصت کے یہ لمحات میسر آئے تو راجا ساہسی عیش و عشرت میں مشغول رہنے لگا۔ مملکت کے تمام کام رام نامی وزیر کے سپرد کر دیے جو نہایت لائق اور ایماندار تھا۔ ساہسی کو اس پر بھروسا بھی بہت تھا۔ رام تمام گتھیاں خود سلجھا رہا تھا البتہ جب مشورے کی ضرورت ہوتی تو رام محل میں حاضر ہوتا اور احکام وصول کر لیتا، وزیر رام نے بہت سے لائق فائق لوگ اپنے گرد جمع کر لیے تھے جن کی مدد سے وہ امورِ مملکت چلا رہا تھا۔ دربار شاہی پر وہ اس قدر حاوی تھا کہ اس کی وساطت کے بغیر نہ تو کوئی شخص راجا کی ملازمت میں داخل ہو سکتا تھا اور نہ اس کی منظوری کے بغیر برطرف کیا جاتا تھا۔ خود راجا کا یہ حال تھا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ اہلِ سندھ میں مشہور ہو گیا تھا کہ اصل راجا تو رام ہے۔ اس سے ملے بغیر راجا تک پہنچنا محال ہے۔

☆☆☆

وزیر رام اپنے محل میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے پنڈت اور لائق فائق لوگ مؤدب بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے کہ کسی نوجوان کی آمد کی اطلاع ملی۔ دوستوں نے کہا بلایا جائے ملا جائے۔ دیکھا تو جائے کیوں آیا ہے، کیا چاہتا ہے؟

وہ نوجوان سامنے آیا تو سب کی نگاہیں یک بہ یک

اٹھیں۔ وہ نہایت خوب صورت تھا۔ قد لمبا، اعضا متناسب اور رخسار چمک دار تھے۔ پیشانی سے خوش قسمتی ظاہر تھی۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اجنبی تھا مگر واقف کار لگتا تھا۔ رام کے لیے انجانا تھا مگر رام بڑا سیانا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ آنے والا کوئی قابل ہے۔ عقل مندوں میں شامل ہے۔ بیٹھنے کو کہا اور تعارف کے لیے زبان کھولی۔

''اے شخص تو کون ہے؟''

''میں اپنے باپ کی بدولت مشہور ہوں ورنہ گم نام ضرور ہوں۔ پھر بھی ہر انسان کا ایک نام ہوتا ہے میرا نام چچ ہے۔ میرے والد کا سیلاج ہے جو اسی الور میں ایک مندر کے پجاری ہیں جناب.... ان کی تربیت نے مجھے کندن بنایا ہے۔ اتنا حوصلہ بڑھایا ہے کہ اس وقت آپ کا ہم صحبت ہوں۔ اس رام کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے رام سے ملایا ہے۔''

''اہل سندھ تیرے باپ کے فضل و کمال کے معترف ہیں یقیناً تو ان صفات سے آراستہ ہوگا۔ یہ بتا یہاں تک آنے کی غرض کیا ہوئی؟''

''آپ جس خوبی سے مملکت کا نظام چلا رہے ہیں کیا اس کے بعد بھی آپ سے نہ ملا جاتا۔ غرض یہی تھی کہ اس شخص کو دیکھوں، اس کی باتیں سنوں جو پتھر کو سونا بناتا ہے، جو غریبوں کو دھنوان بناتا ہے۔ اس کو دیکھا، راجا کو دیکھا برابر ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جو علم میں نے اپنے باپ سے حاصل کیا ہے اس علم سے ملک و قوم کی خدمت کروں۔''

چچ نے یہ باتیں کچھ ایسے ڈھنگ سے کہیں۔ ایسی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کیا کہ رام اس کی قابلیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت جو لوگ رام کے پاس بیٹھے تھے، وہ بھی اش اش کر اٹھے۔

رام نے اسے مخاطب کیا۔ ''تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم غیر معمولی صلاحیت و ذہانت رکھتے ہو۔ بلاشبہ تمہاری فصاحت میں شک نہیں لیکن کیا تم قانون اور اخلاق سے بھی واقف ہو؟''

چچ نے جواب دیا۔ ''میں چاروں ویدوں کا حافظ ہوں اور معنی و مفاہیم سے بہ خوبی واقف ہوں، ہر مسئلے کا حل ویدوں سے تلاش کر کے دکھا سکتا ہوں اور وہ بھی زبانی، ویدوں کو ہاتھ لگائے بغیر۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ جو بھی خدمت میرے سپرد کی جائے گی۔ میں اس کو ذمے داری، خلوص، دیانت اور احتیاط کے ساتھ انجام دوں گا۔''

اتفاق سے جب یہ دونوں باتیں کر رہے تھے، دیبل سے چند ضروری خطوط جواب طلب موصول ہوئے۔ رام نے وہ خطوط اس کی طرف بڑھا دیے کہ ان کو پڑھ کر سنائے۔ چچ نے بہترین طریقے پر ان خطوط کے مضامین کو پڑھ کر سنایا۔ رام نے فرمائش کی کہ ان خطوط کے جواب بھی وہی لکھے۔ چچ نے اسی وقت نہایت اچھے الفاظ میں ان کے جواب لکھ کر رام کے سامنے رکھ دیے۔ رام نے جوابات کو ملاحظہ کیا تو بہت خوش ہوا۔

''تم اس قابل ہو کہ میرے نائب بن کر کام کرو۔''

چچ نے اس کی یہ پیش کش قبول کر لی اور باقاعدگی سے دربار میں آنے لگا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، رام اس کی تحریروں سے مرعوبیت کی حد تک خوش رہنے لگا اور بیش قیمت انعامات سے نوازنے لگا۔ کار بہ کثرت کے مصداق اسے اپنے کام میں مہارت حاصل ہوتی چلی گئی۔ اپنے حسنِ اخلاق سے بھی اس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا یہاں تک کہ وہ وزیر مراسلات کے نام سے پکارا جانے لگا۔ شہر میں اس کی قابلیت کے چرچے ہونے لگے۔ اس کی ہر دل عزیزی نے یہ حالت کر دی کہ ملک بھر میں تمام لوگ اس کے والہ و شیدا ہو گئے۔ رام وزیر کا نام ہی لوگوں کے صفحہ دل سے مٹ گیا۔

چچ کا اقبال روز بہ روز ترقی کرتا جا رہا تھا کہ ایک دن راجا کا دربار سجا ہوا تھا۔ اکابر و امرا سب جمع تھے کہ سیوستان سے کچھ ضروری کاغذات آئے جن کا اسی وقت جواب دینا ضروری تھا۔ راجا نے فوراً رام کو طلب کیا۔

رام اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔ چچ کے آجانے کے بعد رام کچھ بے فکر سا ہو گیا تھا۔ اسے بھروسا تھا کہ چچ اس کی غیر موجودگی میں ہر کام سنبھال لے گا۔

راجا کے قاصدوں نے جب رام کی بابت دریافت کیا تو چچ سامنے آگیا۔ ''رام تو اس وقت موجود نہیں۔ میں اس کا نائب ہوں۔ اگر کوئی ضروری اور فوری کام ہے تو میں حاضر ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''کیا خبر راجا کو تمہاری ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ پہلے ہم راجا سے پوچھ لیں۔ اگر وہ کہے گا تو ہمیں تمہاری حاضری پر اعتراض نہیں۔''

راجا کے آدمیوں نے راجا کو ساری کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ راجا کو خود بھی چچ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ چچ حاضر ہو۔

چچ دربار میں پہنچا تو راجا نے سیوستان سے آئے ہوئے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اسے ان کاغذات کو پڑھنا تھا اور جواب تحریر کرنا تھا۔

چچ نے جواب لکھا اور نہایت عمدگی سے راجا کے

سامنے پیش کر دیا۔ راجا خود بھی خوش خطی سے انس رکھتا تھا اور بلاغت کے اصولوں سے واقف تھا۔ اس نے چچ کی قابلیت کی تعریف کی اور اسے عزت و تکریم سے رخصت کیا۔

رام کو جب معلوم ہوا کہ راجا نے اسے طلب کیا تھا اور اس کی جگہ چچ نے جوابات تحریر کیے ہیں تو اسے یہ فکر ہوئی کہ راجا کو چچ کا کام پسند بھی آیا یا نہیں۔ وہ اپنی غیر موجودگی کا عذر پیش کرنے راجا کے سامنے حاضر ہوا اور اس بات کی خواہش کی کہ اگر جوابات روانہ نہیں ہوئے ہیں تو وہ انہیں دوبارہ تحریر کر دے لیکن وہ اس وقت حیران ہوا جب راجا کی زبان پر چچ کی تعریف کے سوا کچھ نہ تھا۔

''تمہارا نائب نہایت ذہین اور خوش قلم ہے۔ یہ عقل مند انسان تمہیں ملا کہاں سے؟''

''حضور، یہ سیلاج پنڈت کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے انہی خوبیوں کی بدولت اپنا نائب بنایا ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا انتخاب آپ کو پسند آیا۔''

''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کا خاص خیال رکھنا اور اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔ ایسے قیمتی لوگ روز روز نہیں ملتے۔''

رام نے جب راجا کی مہربانی کو دیکھا تو بے خوف ہو کر تمام امورِ مملکت جنہیں وہ اب تک خود انجام دیتا تھا، اس کے سپرد کر دیے۔ چچ ان امور کو سرانجام دینے لگا۔ راجا جب بھی دربار منعقد کرتا چچ کو حاضر ہونا پڑتا اور ہر مرتبہ اس کی ایک نئی خوبی راجا پر ظاہر ہوتی۔ وہ خوش ہو کر اسے انعامات سے نوازتا رہتا تھا۔

راجا اس کی کارگزاریوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا۔

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان سے ہمارے ملک کی انتظامی حالت درست ہوگی اور یہ شخص ملک کی کوئی اہم خدمت انجام دے گا۔''

چچ ہاتھ باندھ کر عرض کرتا۔ ''نوکر اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ آقا کی خدمت کرتے رہیں لیکن نوکر اس سے بھی ڈرتا رہتا ہے کہ خدمت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔''

رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ رام بالکل ہی گمنام ہو گیا۔ پھر وہ بیمار بھی پڑ گیا تھا۔ اس کا دربار میں جانا بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ اس کی نمائندگی چچ کر رہا تھا۔ وہ نائب وزیر تھا۔ راجا کی خواہش تھی کہ رام کو ہٹا کر اسے اپنا وزیر بنائے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار چچ کے سامنے بھی کیا لیکن چچ نے اس کی مخالفت کی۔

''آپ سے پہلے رام نے مجھے اپنی ملازمت میں رکھا تھا۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس کا عہدہ اپنے پاس رکھوں۔ آپ مجھ پر مہربانی فرماتے ہیں، آپ کا یہ حسنِ ظن میرے لیے وزارت کے عہدے سے بھی زیادہ ہے۔ اگر آپ نے مجھے یہ عہدہ دیا تو آپ کے انصاف پر حرف آئے گا۔ عام لوگوں کو یہ تاثر ملے گا کہ میں نے کوئی ساز باز کر کے اپنے آقا رام کو نیچا دکھایا ہے اور خوشامد سے یہ عہدہ حاصل کر لیا ہے۔ کیا آپ اپنے بارے میں یہ سننا پسند کریں گے کہ آپ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں اور عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔'' راجا کو بھی رام کی خدمات یاد آئیں اور اس نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا۔

راجا نے اپنا ارادہ منسوخ کر دیا تھا لیکن چچ کی قسمت میں وزارت کا عہدہ لکھا جا چکا تھا۔ رام وزیر بیمار تو تھا ہی، ایک دن اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ رام کے انتقال کے بعد رائے ساہسی نے چچ کو بلوایا اور باقاعدہ قلم وزارت اس کے سپرد کر دیا۔ اب چچ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے اس عہدے کو قبول کیا اور نہایت عمدگی سے امورِ وزارت انجام دینے لگا۔

ایک دفعہ راجا اپنے محل میں تھا۔ اس کی رانی اس کے پاس ہی بیٹھی تھی کہ چچ کسی ضروری مشورے کے لیے محل میں آیا اور راجا سے ملاقات کا متمنی ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو راجا اس سے بھی ملاقات نہ کرتا لیکن وہ تو چچ تھا، اس کا منظورِ نظر وزیر۔ اس نے فوراً چچ کو اجازت باریابی دے دی اور رانی سے کہا، چچ آ رہا ہے وہ پردے میں چلی جائے۔

''چچ تو برہمن ہے اس سے پردہ کیسا؟''

''کیا تمہیں یہ پاس نہیں کہ تم رانی ہو؟''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ میں رانی ہوں اور وہ ہمارا نوکر ہے اور پھر برہمن ہے۔''

راجا کو بھی چچ پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ اسے اندر بلا لیا۔ وہ اندر آتے ہی رانی کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور ایسی شائستگی سے اپنا مطلب بیان کیا کہ راجا محظوظ ہوا۔

رانی کا حال وہی ہوا جو چچ کو دیکھ کر سب کا ہوتا تھا۔ اس کی خوب صورتی نے رانی کی آنکھیں چکا چوند کر دیں اس کی بامحاورہ گفتگو سن کر تو جیسے دل ہی ہار بیٹھی، اس وقت راجا سامنے بیٹھا تھا لہٰذا رانی نے پلکوں کی جھالر آنکھوں پر ڈال لی۔ جتنی دیر وہ بیٹھا رہا اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی بھی رہی لیکن دل میں سوچ ضرور رہی ہوگی کہ یہ طوطی مقال کاش صرف اس سے مخاطب ہو۔

راجا نے اسے خلعت سے سرفراز کیا اور یہ اجازت خاص بھی مرحمت فرمائی کہ جب کوئی ضروری امر پیش آئے وہ بے تکلف محل میں حاضر ہو کر عرض کر دیا کرے۔

اب رانی سے تو پردہ رہا ہی نہیں تھا، وہ بے تکلف محل میں آنے جانے لگا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ راجا محو خواب ہوتا اور رانی اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اس کی گفتگو سے اپنا دل بہلاتی۔ اس قربت نے رانی کی آتشِ عشق کو ایسا فروزاں کر دیا کہ دل پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ راتوں کی نیند جاتی رہی۔ اپنا مقام و مرتبہ بھول کر ایک وزیر کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

اس روز راجا محل سے باہر کہیں گیا ہوا تھا کہ چچ آ گیا۔ ملازموں نے بتا دیا تھا کہ راجا محل میں نہیں ہے اس لیے وہ واپس جانے کے لیے مڑ گیا تھا، اسی وقت رانی کا پیغام آ گیا کہ وہ رانی سے ملے بغیر واپس نہ جائے۔ چچ کو اس کا حکم ماننا پڑا۔ دل میں یہ بھی سوچا کہ شاید کوئی اہم بات ہو گی اسی لیے رانی نے اسے بلایا ہے۔ وہ اسی کمرے میں آ کر بیٹھ گیا جہاں راجا سے ملاقات کیا کرتا تھا۔

رانی اس روز خوب اچھی طرح تیار ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا اور اٹھلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ چچ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”چچ پیارے، یہ کیا کرتے ہو۔ راجا نے تم سے کہا تھا بے تکلف محل میں آیا جایا کرو۔ اول تو تم آتے ہی بہت کم ہو، اوپر سے یہ تکلیف کرتے ہو۔“

”آپ رانی ہیں اور میں معمولی وزیر۔ آپ کا ادب تو مجھ پر لازم ہے۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم تم غیر ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بالکل اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ چچ نے گھبرا کر اٹھنا چاہا لیکن رانی نے اس کے کندھے پر زور دے کر دوبارہ بٹھا دیا۔

”رانی جی، ہم غیر نہ سہی لیکن اپنے بھی نہیں ہیں۔“

”تم کتنے کٹھور ہو۔“ رانی نے کہا۔ ”ویسے تو اتنے عقل مند ہو لیکن میرے دل کی بات اب تک نہیں سمجھے۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تم پر مرنے لگی ہوں۔ میری محبت کا جواب محبت سے دو۔“

”رانی جی، مجھے جانے دیں۔ میں نے راجا جی کا نمک کھایا ہے۔“

”تم دیکھ رہے ہو راجا اس وقت محل میں نہیں ہیں۔ وہ ابھی دو دن نہیں آئیں گے۔ رات کو بھی نہیں۔ کیا سمجھے، رات کو بھی نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم رات کو یہیں رہ جاؤ۔ تم دیکھ رہے ہو راجا مجھ سے عمر میں کتنے بڑے ہیں۔ تم میرے ہم عمر ہو۔ راجا کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ خوش قسمت ہو کہ تم پر میرا دل آیا ہے۔“

”یہ میری خوش قسمتی نہیں۔“

”کیا میں خوب صورت نہیں؟“

”آپ بہت خوب صورت ہیں۔“

”میں جوان نہیں؟“

”آپ جوان بھی ہیں۔“

”آپ مرد نہیں؟“

”مجھے پرماتما نے مرد بنایا ہے۔“

”تم ایک رات میرے ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“

”تمہیں اس حکم عدولی کی جرأت کیسے ہوئی۔“

”اس لیے کہ میں برہمن ہوں۔ میرا باپ اور بھائی اب بھی پجاری ہیں۔ وہ اس وقت بھی خدا کی عبادت میں مصروف ہیں۔ مجھ سے آپ کو کسی نمک حرامی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میں اس بدنامی کا داغ اپنے دامن پر نہیں لے سکتا۔“

”کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔“

”بھگوان دیکھ رہا ہے۔“

”وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہوں۔“

”تم کسی کی بیوی ہو۔“ چچ نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں چاہوں تو تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

”آپ کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”اگر میں شور مچا دوں کہ تم نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔“

”مجھے تو معلوم ہو گا کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کے بعد مجھے موت کی سزا بھی سنا دی جائے تو مجھے افسوس نہیں ہو گا کیونکہ میرا ضمیر صاف ہو گا۔“

”چچ پیارے، میں شور نہیں مچاؤں گی۔ میں تمہیں سزا ہوتے نہیں دیکھ سکتی لیکن یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔“ رانی نے کہا اور بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کو یہ کڑوی دوا پینی پڑے گی۔“ چچ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی رانی اپنے بستر پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسے ٹھکرائے جانے کا افسوس تھا جو اسے رلا رہا تھا۔

کوئی معمولی درجے کی عورت بھی ہوتی تو اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیتی لیکن وہ چچ کے عشق میں گرفتار تھی۔ اسے سزا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس رات اس کے بستر پر کانٹے بچھے تھے کہ کسی کروٹ چین ہی نہ آتا تھا۔

دوسری رات بھی اسی طرح جاگ کر گزار دی۔ تیسرے دن راجا واپس آیا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

”سوہن دیوی، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑ گیا ہے؟“

”دو رات دن سے سوئی جو نہیں ہوں۔“

”کیوں، نیند کیوں نہیں آئی؟“

”آپ کے بغیر کیسے نیند آتی؟“ وہ تصور ہی تصور میں یہ سب کچھ چچ سے کہہ رہی تھی۔

”کیا تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو؟“

”آپ کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں کر سکتی لیکن آپ اتنے کٹھور ہیں کہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ ویسے تو بہت عقل مند ہیں لیکن میرے دل کی بات نہیں سمجھتے۔“ رانی نے تقریباً وہی جملے دہرائے جو وہ چچ سے کہہ چکی تھی۔ وہ تصور میں راجا سے نہیں چچ سے مخاطب تھی۔

”یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔“

”محبت کرتے ہیں تو پھر ہاتھ کیوں جھٹک دیا۔ آگے بڑھتے اور مجھے گلے سے لگا لیتے۔“

”سوہن دیوی، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ نہ تم نے ہاتھ پکڑا نہ میں نے جھٹکا۔ تم جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔“

رانی کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے بہانہ بنایا۔

”کل رات تھوڑی دیر کو میری آنکھ لگی تھی۔ میں نے سپنے میں دیکھا تھا کہ تم میرا ہاتھ جھٹک رہے ہو۔“

”سپنوں پر یقین کرتی ہو۔ سپنے میں جو کچھ دیکھو اس کا الٹ ہوتا ہے۔“ راجا نے کہا اور رانی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

رانی اب بھی پُرامید تھی کہ چچ کو کسی نہ کسی دن راہ پر لے آئے گی۔ وہ برہمن ہے مگر انسان بھی تو ہے۔ میں اسے مجبور کر ہی دوں گی۔

وہ بڑی بے چینی سے چچ کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ راجا سے ملاقات کے لیے ضرور آئے گا لیکن کئی دن گزر گئے چچ نہیں آیا۔ رانی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے خفا ہو کر گیا ہے۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کسی دن وہ سب کچھ راجا کو نہ بتا دے۔ اس سے ملنا ضروری تھا۔ راجا سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے آنا کیوں چھوڑ دیا۔

وہ آتشِ فراق میں جلتی رہی لیکن موقعے کی تاک میں لگی رہی۔ جلد ہی اسے موقع مل گیا۔ راجا برہمن آباد گیا ہوا تھا۔ محل کے بہت سے نوکر چاکر بھی اس کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ایک نوکر کو چچ کے بلانے کے لیے بھیجا۔ اس سے کہہ دیا کہ راجا ایک پیغام چھوڑ گیا ہے۔ چچ سے کہنا وہ پیغام آ کر سن جائے۔ نوکر نے یہی جا کر چچ سے کہہ دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ رانی نے اسے دھوکے سے بلایا ہے لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رانی سے ملنے محل پہنچ گیا۔ رانی بن سنور کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”چچ پیارے، آخر تمہیں میری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟“

”رانی جی، آپ جو کچھ چاہتی ہیں وہ پاپ ہے۔ میں آپ کو اچھا لگتا ہوں اس میں کوئی برائی نہیں لیکن اس سے آگے جو کچھ ہو گا وہ راجا سے نمک حرامی ہو گی۔ مجھ سے اس پاپ کی امید نہ رکھیں۔“

”اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

”دیکھو رانی جی، اس زبردستی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جس سے عشق کرتے ہیں اس کی خوشی کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے عشق کی دعویدار ہیں تو مجھے وہ حکم دیں جس پر میں بہ خوشی تیار ہو جاؤں۔“

رانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چچ اسے سمجھاتا رہا اور وہ روتی رہی۔ بڑی دیر بعد رانی نے سر اٹھایا۔

”اگر تم کو یہ پسند نہیں تو کم از کم مجھے ہر روز اپنے دیدار سے مشرف کرتے رہو۔ میں اس پر بھی خوش ہو جاؤں گی۔ تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”میں آپ کے بے جا مطالبے سے ڈرتا تھا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ آتا رہوں گا۔ اگر مجھے دیکھنے سے آپ کے من کو خوشی ملتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس سے آگے کچھ نہیں۔“

رانی اس پر راضی ہو گئی۔ چچ ضرورت بے ضرورت محل میں آنے جانے لگا۔ رانی سے اس کا پردہ ختم ہو ہی چکا

تھا۔ اب راجا کی موجودگی غیر موجودگی سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ رانی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ اکیلے میں چچ کے بارے میں سوچ سوچ کر آہیں بھرتی رہتی تھی۔ وہ سامنے آجاتا تو کھل اٹھتی۔

یہی شب و روز تھے۔ محبت کی منزلیں طے ہو رہی تھیں کہ راجا بیمار پڑ گیا۔ امرا اور وزرا اس کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔ چچ کا تو یہ حال تھا کہ راجا کے سرہانے سے اٹھنا ہی بھول گیا تھا۔ وید اور حکیم پریشان تھے کہ کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا ہے۔ رانی کو یقین ہونے لگا تھا کہ راجا کا مرض، مرض الموت ہے۔ اب وہ بچے گا نہیں اس نے راجا کو ایک کوٹھری میں منتقل کر دیا۔ امرا پر پابندی لگا دی کہ کوئی راجا کے پاس نہ جائے۔ چند با اعتبار وید تھے جو علاج کی غرض سے راجا کے پاس جا سکتے تھے۔

ایک دن رانی نے چچ کو خلوت میں بلوایا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ رائے کی بیماری کس قدر طول پکڑ چکی ہے۔ مجھے اس کی موت کا یقین ہو چلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مستقبل کی فکر ستانے لگی ہے۔ چچ پیارے! میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ راجا کے کچھ رشتہ دار ہیں۔ ان کی آنکھوں کی ہوس بتا رہی ہے کہ ادھر راجا کا دیہانت ہوگا اُدھر وہ تخت پر جھپٹ پڑیں گے۔ یہ لوگ راجا کی زندگی ہی میں مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد مجھے کیا پوچھیں گے۔ ایک تم ہی میرے ہمدرد ہو۔ اگر تم مجھے یقین دلاؤ کہ مجھ سے شادی کر لو گے تو میں تمہارے لیے تخت نشینی کی تدبیر کروں۔ اسی پر میرے اور تمہارے تعلقات کا انحصار ہے۔''

چچ ابھی تک رانی سے کوئی تعلق رکھنے سے انکار کرتا رہا تھا لیکن تخت و تاج کا سن کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ رانی کی آرزو پوری کرے گا۔ رانی نے بھی وعدہ کر لیا کہ وہ اپنی تدبیر پر عمل کرے گی۔

رانی کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ کل دربار منعقد ہوگا۔ سب امیر و کبیر جمع ہوں۔

ہرکاروں اور چوب داروں نے اس خبر کو عام کر دیا۔

دوسرے دن جب دربار منعقد ہوا تو رانی نے نیم بے ہوش راجا کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اسے لے کر دربار میں آئی اور امرا سے مخاطب ہوئی۔

''راجا کی حالت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ ضعف کی وجہ سے دربار میں حاضر نہیں ہو سکتے ورنہ جو اعلان میں کر رہی ہوں وہ خود کرتے۔ انہوں نے حکم دیا ہے میں تم سے کہوں کہ چچ کو تخت نشیں کر کے اس کے حکم پر چلیں [illegible] کے طور پر اپنی انگوٹھی مجھے دی ہے کہ میں اسے چچ کی [illegible] میں پہنا دوں۔''

راجا اور چچ کے تعلقات ہی ایسے تھے کہ رانی [illegible] بات کا سب کو یقین آ گیا۔ راجا کا کوئی بیٹا تھا نہیں جو د[illegible] کرتا۔ تمام درباریوں نے اسی وقت چچ کو راجا تسلیم کر [illegible] سرِ نیاز جھکا دیا۔

اس تخت نشینی کو دو چار روز ہی گزرے تھے کہ راجا فو[illegible] ہو گیا۔ عقل مند رانی نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی [illegible] راجا مر گیا ہے۔ صرف چچ کو اس کی موت سے باخبر کیا۔

''کیا میں اب بھی اس لائق نہیں ہوں کہ تم میری [illegible] پوری کرو؟''

''اب راجا اس دنیا میں نہیں رہا تو تمہیں اپنا [illegible] میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''پھر مجھے وہ کرنے دو جو میں کروں۔''

''تم کیا کرنے والی ہو؟''

''راجا کے عزیز و اقارب کو جیسے ہی معلوم ہوگا کہ ر[illegible] اب اس دنیا میں نہیں وہ فتنہ پیدا کریں گے اور اپنا [illegible] جتائیں گے۔ میں ان فتنوں کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند [illegible] دینا چاہتی ہوں۔''

''تم کیا کرو گی؟''

''دیکھتے جاؤ میں کیا کرتی ہوں۔''

دوسرے دن رانی نے پچاس طوق و سلاسل منگوا[illegible] اور نہایت راز داری سے حرم سرا کی مختلف کوٹھریوں میں ر[illegible] دیے۔ اس کے بعد راجا کے ہر عزیز کو چوبدار بھیج کے بلو[illegible] کہ مہاراج نے آپ کو آخری وصیت کے لیے بلایا ہے۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اب راجا اس دنیا میں رہا [illegible] نہیں لہٰذا ان میں سے ہر ایک بڑی بڑی امیدیں لے کر [illegible] کے سامنے پہنچ گیا۔ بعض کو تو یہ بھی امید تھی کہ اسے ولی ع[illegible] مقرر کیا جائے گا۔

رانی نے یہ انتظام کیا تھا کہ ان سب کو شاہی محل [illegible] باہر ہی روک لیا جائے اور ایک ایک کر کے اندر بھیجا جا[illegible]

خاندان شاہی کے یہ ارکان محل کے باہر قطار بنا[illegible] کھڑے تھے۔ چوبدار باہر آیا اور قطار میں جو سب [illegible] آگے تھا، اسے لے کر اندر چلا گیا۔ اندر آتے ہی اسے ایک [illegible] کوٹھری میں پہنچا دیا گیا کہ راجا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ ا[illegible] نے جیسے ہی کوٹھری میں قدم رکھا اسے زنجیروں میں جکڑ د[illegible] گیا۔ باہر والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

چوبدار باہر آیا اور دوسرے کو لے کر اندر چلا گیا۔ اس طرح باری باری سب کو اندر بلا لیا گیا اور زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

پچاس اقربا وہ تھے جو بااثر اور دولت مند تھے۔ راجا کے کچھ عزیز وہ تھے جنہیں راجا نے بھی نظر انداز کر رکھا تھا، یہ لوگ نہایت غریب تھے۔ رانی نے ان سب کو بھی بلوا لیا اور انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے دولت مند رشتہ داروں کے پاس لے کر گئی۔

''دیکھو، یہی وہ لوگ ہیں جو تمہارے خلاف راجا کے کان بھرتے رہتے تھے۔ تمہیں غریب رکھا اور خود دولت مند بن گئے۔ میں نے ان سب کو قید کر لیا ہے۔ میں ان سب کا مال و اسباب تمہیں دوں گی مگر شرط یہ ہے کہ جو جس کو قتل کرے گا وہی اس کا مال پائے گا۔''

رانی کا حکم پاتے ہی ان غریبوں نے اپنے مالدار رشتہ داروں کو قتل کر ڈالا اور پھر ان کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار شروع کر دی۔

رانی کی تدبیر نے راجا کے بااثر رشتہ داروں کا خاتمہ کر دیا۔ غریب لوگ مال و دولت لوٹ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رائے ساہسی کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ پورے ملک میں سوگ ہوا اور شاہی اعزاز کے ساتھ راجا کی ارتھی اٹھائی گئی۔

راجا کی موت کے بعد چچ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور رانی سوہن دیوی سے شادی کر لی۔

رانی کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اس کا محبوب اسے مل گیا تھا اور وہ بھی راجا کے روپ میں۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ راجا کا کوئی رشتہ دار اس قابل نہیں تھا کہ تخت کا دعویٰ کرتا۔ رانی کی تدبیر نے سب کے منہ بند کر دیے تھے۔

❊❊❊

چتوڑ کا راجا مہرت راج سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔ اس کے درباری ہاتھ باندھے افسردہ کھڑے تھے۔ خبر ہی ایسی آئی تھی کہ داسیوں نے اپنے بال کھول لیے تھے اور تخت کے پائے پکڑے بیٹھی تھیں۔ راجا مہرت نے اپنی قلمرو میں سوگ منانے کا اعلان کر دیا تھا۔

راجا مہرت رائے ساہسی کا بھائی تھا۔ اسے بھائی کی موت کی خبر بہت بعد میں ہوئی تھی۔ یہ خبر بھی آئی تھی کہ رانی نے بڑی چالاکی سے رائے ساہسی کے رشتہ داروں کو قتل کرا دیا ہے اور ایک برہمن چچ نامی کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ راجا مہرت نے اس خبر کی تصدیق کے بعد اپنے امرا کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔

''میرے بھائی کا دہیانت ہو گیا ہے اور اس کی بیوی نے حکومت کو رائے ساہسی کے خاندان سے نکال کر اپنے عاشق چچ کے حوالے کیا ہے جبکہ اسے چاہیے تھا کہ وہ مجھے اطلاع کرتی۔ بھائی کے مرنے کے بعد میں اس کا وارث تھا۔ اب آپ لوگ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

سب نے بہ یک آواز مشورہ دیا کہ اروڑ پر چڑھائی کر کے اپنا حق حاصل کر لے۔

راجا خود بھی یہی چاہتا تھا۔ تین دن تک بھائی کا سوگ منانے کے بعد اپنی فوجوں کو اکٹھا کیا اور چچ کو سبق سکھانے کے لیے چل دیا۔

جب اروڑ تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تو راجا مہرت خیمہ زن ہوا۔ اس نے ایک خط لکھا اور ایک وفد کے ذریعے یہ خط چچ تک پہنچا دیا۔

''میں اس تخت کا جائز وارث ہوں جس پر تم قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔ یہ تخت ہمارے آبا و اجداد کی ملکیت ہے۔ اگر تم یہ تخت میرے حوالے کر دو گے تو میں تم سے اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

تم ذات کے برہمن ہو۔ جنگ اور لڑائی تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ لڑائی سے باز آؤ، تخت میرے حوالے کر دو اور خود کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرو۔ مفت میں اپنی جان نہ گنواؤ۔''

چچ واقعی ذات کا برہمن نکلا۔ اسے جنگ و جدل سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ایک چڑیا تک کبھی نہیں ماری تھی۔ تخت پر بیٹھنے سے قبل اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجاؤں کو لڑنا بھی پڑتا ہے۔ یہ خط ملا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بھاگا ہوا رانی کے پاس پہنچا اور اسے وہ خط دکھایا۔

''ساہسی کا بھائی آ گیا ہے اور تخت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ جنگ سر پر کھڑی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ تم ہی مجھے اس مشکل سے نکال سکتی ہو۔''

''جنگ لڑنا عورتوں کا کام نہیں، تم مرد ہو۔ شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے نکلو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔''

''تم جانتی ہو یہ میرا کام نہیں۔''

''تو پھر ایسا کرو، میری ساری تم باندھ لو اور اپنے کپڑے مجھے دے دو تاکہ میں مرد بن کر نکلوں اور دشمن سے مقابلہ کروں۔''

یہ سن کر چچ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مارے غیرت کے

اس کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رانی کو اس کی حالت پر ترس آیا اور سمجھانا شروع کیا۔

''بھگوان نے بے شمار دولت آپ کو دی ہے۔ لوگوں پر اپنی دولت کو نثار کیجیے تاکہ لوگ آپ کے جھنڈے تلے جمع ہوں۔ حوصلے سے کام لیں۔ جب تک آپ کے وفادار زندہ ہیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

چچ نے اس مشورے کو قبول کیا۔ اس نے سردارانِ فوج کو بلایا اور ان میں روپیہ تقسیم کیا۔ تمام افسر اور سپاہی اس کے جھنڈے کے نیچے آئے اور جان دینے پر آمادہ ہوگئے۔ چچ نے فوج کو ساتھ لیا اور لڑائی کے لیے اروڑ سے نکلا۔ دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ دونوں طرف کے جوان مرد کٹ کر گر رہے تھے۔

چچ کے فوجی افسر جانتے تھے کہ چچ میدانِ جنگ کا مرد نہیں اس لیے یہ لوگ اسے دور دور رکھ رہے تھے اور بہت سے جوان اسے گھیرے ہوئے چل رہے تھے۔

جب بہت سے سپاہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو راجا مہرت نے چچ کے پاس پیغام بھیجا۔

''سپاہیوں کی جان لینا اور ان کو اپنے فائدے کے لیے کٹوانا مردوں کا شیوہ نہیں۔ یہ جھگڑا میرا اور تمہارا ہے، کیوں نہ ہم سواری سے اتر کر آپس میں مقابلہ کرلیں جو زندہ بچے گا وہی سندھ کے تخت کا مالک ہوگا۔''

برہمن چچ کے لیے یہ پیغام افتادِ ناگہانی کی طرح تھا۔ اس قسم کے مقابلوں کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے سرداروں نے بھی منع کیا کہ وہ اس مقابلے سے انکار کردے اور سپاہیوں کو لڑنے دے۔

چچ سپاہی نہ تھا لیکن عقل و فہم میں تو بے مثال تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے کہا۔ ''جب میں مہرت سے دوبدو مقابلے کے لیے نکلوں تو تم اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ میرے پیچھے لانا اور مجھ سے قریب رہنا۔'' نوکر نے یہی کیا۔ مہرت اپنے لشکر سے پیدل نکلا۔ چچ بھی اسے دیکھ کر اپنے گھوڑے سے اترا اور مہرت کی طرف چلنا شروع کیا۔

مہرت دل میں یہ سوچتا ہوا آرہا تھا کہ ایک برہمن جس کا واسطہ کبھی تلوار سے نہیں پڑا میرا مدِمقابل کس طرح ہوسکتا ہے۔ میں تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا سر، تن سے جدا کردوں گا۔

چچ کے ذہن میں وہ ہدایت گردش کر رہی تھی جو وہ اپنے نوکر کو دے کر مہرت کی طرف چلا تھا۔ میں تلوار کا دھنی نہ سہی لیکن جو ترکیب میں نے اختیار کی ہے اس کے بعد مہرت کی موت یقینی ہے۔

جب مہرت اور چچ بالکل قریب پہنچ گئے تو چچ کے نوکر نے گھوڑا چچ کے برابر لا کر کھڑا کردیا۔ چچ اچک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور جھپٹ کر مہرت پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کا سر اس کے تن سے جدا ہوگیا۔

یہ سب ذرا سی دیر میں ہوگیا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوسکا کہ چچ نے کیا ہوشیاری کی تھی۔ لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ مہرت مارا گیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی چچ کی فوج نے مہرت کی فوج پر بھرپور حملہ کردیا۔ مہرت کی فوج میں ایسی بے دلی پھیلی کہ مقابلے کی سکت ہی جاتی رہی۔ ایک بڑا حصہ تہ تیغ ہوگیا۔ کچھ بھاگ گئے اور کچھ معافی کے طلب گار ہوئے۔

چچ فاتحانہ شان سے چلتا ہوا اروڑ پہنچا تو شہر کے لوگوں نے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ رانی سوہن محل کی چھت سے اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، چچ نے برہمن ہوتے ہوئے کیسی بہادری کا کام کیا ہے۔ رائے ساہسی کا آخری رشتہ دار بھی رخصت ہوا۔

اس جنگ کے بعد چچ کے حوصلے بڑھ گئے۔ اسے یہ بھی یقین ہوگیا کہ اب اسے واقعی حکمرانی کرنی ہے۔ اس حکمرانی میں حریفوں سے نمٹنا بھی پڑے گا۔ اس کے لیے ضروری انتظامات درکار ہیں۔ بھروسے کے آدمیوں کی بھی ضرورت ہے۔ اس کا دھیان اپنے بھائی چندر پر گیا۔ اس نے ایک آدمی کے ذریعے اس کے پاس پیغام بھیجا۔

''ہمارے بزرگوں کا طریقہ پوجا پاٹ ہے اور ہم بتوں کی پوجا میں خاص رغبت رکھتے ہیں۔ ہمارے باپ نے بھی اپنے بزرگوں کی طرح اس پر عمل کیا ہے لیکن ہند کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی روح کی اصلاح کرتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہوکر کسی بادشاہ کے گھر میں اس کی اولاد کی صورت میں دوسرا جنم لیتی ہے یا کسی بڑے آدمی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جس کے جسم میں وہ ہر طرح کی راحت اور آرام حاصل کرتی ہے چنانچہ ہمارے باپ سیلاج کے خدا نے ہم پر رحمت کی ہے اور ہمیں تاج و تخت سے سرفراز کیا ہے۔ ایک بڑا ملک ہمارے زیرِ نگیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اروڑ کے شہر کا حاکم بنادوں اور اپنے بعد تمہیں اپنا ولی عہد مقرر کروں۔''

چندر اگرچہ عبادات میں مصروف رہتا تھا۔ عہدے اور مناصب سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی لیکن بھائی کا حکم نہ ٹال سکا اور بھائی کے پاس چلا آیا۔ چچ نے اروڑ کا تمام نظم و نسق اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

پورے شہر میں فرمانِ شاہی پڑھ کر سنایا گیا۔

''ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ملک کے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں اور عدل و انصاف سے ان کو خوش رکھیں تاکہ خدا کے یہاں ہم سے ظلم و بے انصافی کا مواخذہ نہ ہو۔ اس لیے میں اپنے بھائی چندر کو جو راہبوں کا سردار ہے یہ اہم کام سپرد کرتا ہوں۔ وہ ہماری موجودگی اور عدم موجودگی میں تمام امور کا ذمے دار ہے۔ تمام امرا اور رعایا پر اس کی اطاعت واجب ہے۔''

رائے ساہسی کے فوت ہوجانے کے بعد اس کی حدودِ مملکت کا بہت سا حصہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ساہسی نے مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کرکے وہاں حاکم مقرر کردیے تھے۔ اب یہ حاکم بھی بغاوت پر اتر آئے تھے، نظم و نسق منتشر ہوکر رہ گیا تھا۔ چچ کو ان حاکموں کی سرکشی کو بھی رفع کرنا تھا اور ہاتھ سے نکلے ہوئے حصوں کو بھی مملکت میں شامل کرنا تھا۔ اسی لیے اس نے چندر کو اروڑ کا حاکم بنایا تھا تاکہ وہ باہر نکلے تو چندر شہر کی دیکھ بھال کرسکے۔

چچ نے بھاری لشکر جمع کیا اور شہر بھاٹیہ پر حملہ آور ہوا۔ یہ شہر اروڑ اور ملتان کے درمیان دریائے بیاس کے جنوبی کنارے پر تھا۔ یہاں کے حاکم نے چچ سے سرکشی کی تھی۔ چچ اسے سزا دینے کے لیے بھاٹیہ پہنچا تھا۔

دونوں کی فوجوں میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ چچ کی اقبال مندی اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ چچ کو فتح ہوئی۔ حاکم بھاٹیہ فرار ہوکر دریائے راوی کے جنوبی کنارے پر ایک مضبوط قلعے ''اسکلندہ'' میں پناہ گزیں ہوگیا۔

چچ اس کا پیچھا کرتا ہوا اسکلندہ پہنچ گیا اور قلعے کے باہر اپنا خیمہ لگا کر بیٹھ گیا۔ چچ کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا اور مسائل کا حل دریافت کرلیتا تھا۔ چند روز خیمہ زن رہنے کے بعد اس مسئلے کا حل بھی دریافت کر ہی لیا۔

اس قلعے میں شجاع نام کا ایک بااثر شخص تھا۔ اس شخص کو اہلِ فوج اور معززین اپنا رہبر اور صاحب رائے خیال کرتے تھے۔ چچ نے اس کے پاس ایک خفیہ پیغام بھیجا۔

''اگر تم بھاٹیہ اور اسکلندہ کے حاکم کو قید یا قتل کروادو گے تو میں تمہیں ان قلعوں کا سردار بنادوں گا۔''

شجاع کی طرف سے پیغام آیا کہ اسے قبول ہے۔ اپنے بیٹے کو بہ طور ضمانت چچ کے پاس بھیج دیا اور پھر چند ہی روز میں حاکم کو قتل کرکے اس کا سر بھی چچ کی خدمت میں پیش کردیا۔ چچ نے وعدے کے مطابق بھاٹیہ اور اسکلندہ پر اسے حاکم مقرر کیا۔

ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں کا حاکم بجھرا نامی ایک شخص تھا جو راجا ساہسی کا قرابت دار تھا۔ یہ حکمران نہایت طاقتور اور دانا تھا۔ ایک وسیع سلطنت اس کے قبضۂ اقتدار میں تھی۔

بجھرا نے جب چچ کی آمد کی خبر سنی تو جنگی ہاتھیوں اور ایک زبردست فوج کو لے کر چچ کے مقابلے کے لیے نکلا۔

(ان دنوں دریائے راوی ملتان کے گرد بہتا تھا)

بجھرا اس قدر تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ مست جنگی ہاتھیوں پر ایسا ناز تھا کہ صفیں ترتیب دینے کا انتظار بھی نہیں کیا اور حملہ آور ہوگیا۔ چچ بھی پوری طرح تیار تھا۔ بجھرا کے سپاہیوں کی تلواریں، ڈھالوں کا منہ دیکھ کر چنگاریاں

ڈاکٹریٹ

ڈاکٹر صاحب۔ ''جب سے آپ نے میرے دل کا آپریشن کیا ہے، میرا دل ہر وقت ٹک ٹک کرتا رہتا ہے۔''

''اوہ تبھی تو میں سوچ رہا تھا کہ میری گھڑی کہاں گئی؟''

☆......☆......☆

ناراضگی

میاں بیوی میں بول چال بند تھی۔ گھر میں کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔

ایک دن میاں نے ایک پرچی پر لکھا۔ مجھے صبح چھ بجے جگا دینا اور پرچی بیوی کے سرہانے کے نیچے رکھ دی لیکن جب صبح خود ہی میاں کی آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔

بیوی باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ وہ سیدھے وہاں گئے اور غصے سے بولے۔ ''میں نے تمہارے سرہانے کے نیچے لکھ کر پرچی رکھی تھی۔''

بیوی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بول اٹھی۔ ''میں نے بھی پرچی پر لکھ کر آپ کے سرہانے کے نیچے پرچی رکھ دی تھی کہ چھ بج چکے ہیں، اٹھ جائیے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

اڑانے لگیں۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔

بجھڑا کے سپاہیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ چچ کامیابی کی امید کھو بیٹھا تھا لیکن اس کی قسمت کے ستارے عروج پر تھے۔ کئی گھنٹوں کی لڑائی کے بعد دشمن کے قدم اکھڑنے لگے۔ پھر یہ موقع بھی آیا کہ بجھڑا فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔ وہ قلعۂ ملتان میں محصور ہوگیا۔

قلعہ ملتان میں داخل ہوتے ہی بجھڑا نے اپنے قاصد کو ایک خط دے کر کشمیر کے راجا کے پاس دوڑایا۔ اس خط میں تحریر تھا ''ایک برہمن اروڑ پر قابض ہوکر دولت سندھ کا تاجدار بن گیا ہے۔ وہ ایک لشکر کے ساتھ ہمارے ملک پر حملہ آور ہوا ہے۔ اطراف ونواح کے مضبوط قلعے فتح کر لیے ہیں اور کوئی راجا بھی اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس وقت وہ ملتان پر حملہ آور ہے۔ مجھ میں اس سے مقابلے کی سکت نہیں۔ آپ ہی مدد کیجیے ورنہ خیریت نہیں۔''

بجھڑا نے قاصد کو روانہ کیا اور قلعے کے حفاظتی انتظامات مضبوط کر کے قاصد کا انتظار کرنے لگا۔

قاصد منزلیں سر کرتا ہوا کشمیر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا راجا کشمیر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا نابالغ لڑکا تخت پر بیٹھا ہے۔

وزرا اور امرا نے معذوری ظاہر کردی کہ راجا کی موت کے بعد ہمارے ملک میں تو خود آثار بغاوت پائے جا رہے ہیں ہم کسی کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

قاصد نے واپسی کی راہ لی اور ملتان پہنچ گیا۔ بجھڑا اس کی نامراد واپسی سے سخت پریشان ہوا۔ مقابلے کی تاب نہیں تھی، صلح کی درخواست کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے چچ کی خدمت میں عرض گزاری کہ اس کی جاں بخشی کی جائے اور اجازت دی جائے کہ وہ اہل وعیال کے ساتھ جہاں چاہے چلا جائے۔

چچ نے اس درخواست کو قبول کرلیا اور وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کشمیر کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ چچ قلعے میں داخل ہوکر ملک پر قابض ہوگیا۔

بجھڑا کو مغلوب کرنے کے بعد اس کی دھاک ایسی بیٹھی تھی کہ کئی حکمرانوں نے سر اطاعت جھکا دیا۔ اب وہ آگے بڑھا اور کشمیر کی طرف چلا۔ یہاں تک کہ شاکلہا کے قلعے پر پہنچا جو کمیا کے نام سے مشہور تھا اور ہندوستان کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں ایک مہینے تک پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ گردونواح کے سردار اس کی اطاعت کا دم بھرنے آئے اور وفاداری کا عہد کیا۔ گویا اپنی سلطنت کو یہاں تک وسیع کرلیا۔ ایک چشمے کے کنارے پر جو پنجاب کہلاتا تھا قلمرو اور مملکت کشمیر کے درمیان سرحد قائم کرنے کے لیے بڑے درخت نصب کرائے۔ جب اتنا زمانہ گزر گیا دونوں درخت بڑھے اور ان دونوں کی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئیں تو وہ اروڑ کی طرف واپس آیا۔

رانی کی صحبت میں دن رات بسر کرتے ہوئے جب ایک سال گزر گیا تو ایک دن اس نے اپنے وزیر کو بلا کر کہ اب میں مشرق کی طرف سے مطمئن ہوگیا ہوں۔ طاقت میں اب اتنا حوصلہ نہیں کہ میرے خلاف سر اٹھا سکے مغرب اور جنوب میری توجہ کا منتظر ہے۔

برہمنوں کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر تھا کہ ذات مندروں میں پوجا پاٹ کے لیے پیدا ہوئی ہے، اسے راج پاٹ اور تلواروں کی دنیا سے کیا واسطہ لیکن چچ نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دور دور تک اس کی بہادری کے چرچے سنے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے جابر حکمران اس کی اطاعت اختیار کر رہے تھے یا شکست کھا کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھپ رہے تھے۔

چچ نے مغرب کی طرف یلغار کرنے کا عندیہ دیا تو اس کے وزیر نے بھی اس کی حمایت کی۔

''آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ جنوبی امرا بے قابو ہو گئے ہیں کہ راجا کے ساہسی کے بعد اب ان سے خراج وصول کرنے والا کوئی نہیں۔''

وزیر کی تائید ملتے ہی چچ نے بدھیہ اور سیوستان کا رخ کیا۔ بدھیہ، قدیم سندھ کا شمال مغربی صوبہ تھا اور موجودہ پورے ضلع لاڑکانہ اور ضلع جیکب آباد کے مغربی حصے پر مشتمل تھا۔

سیوستان کے قلعے میں مٹا نامی حاکم متعین تھا۔ چچ دریائے سندھ عبور کر کے بدھیہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں کا حاکم بھندر گوبھا گو تھا اور اس کا دارالسلطنت کا کا راج تھا۔ وہاں کے لوگ سیویس کہلاتے تھے۔ بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ ''کا کا راج'' کو وہاں کے لوگ سیویس کہتے تھے۔

چچ نے حملہ کیا اور سیویس کو فتح کرلیا۔ یہ دیکھ کر اس طرف کے دوسرے حاکم کا کا کے لڑکے وکیہ بن کا کا نے خراج ادا کرنے کا عہد کر کے اطاعت قبول کرلی۔

اس مہم سے عہدہ برآ ہونے کے بعد وہ سیوستان پہنچا۔ سردار مٹا اس سے مقابلے کے لیے نکلا لیکن شکست کا منہ دیکھنے کے بعد قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ چچ کی فوج نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

سردار مٹا اس محاصرے کی تاب نہ لاسکا اور صرف ایک ہفتے بعد ہی اس کے حواس گم ہوگئے۔ اس نے امان طلب کی اور قلعے کی چابیاں چچ کے پاس بھیج دیں۔ چچ نے اس پر مہربانی کی۔ نہ صرف اسے معاف کردیا بلکہ بہ دستور سے وہاں کا حاکم مقرر رکھا۔

اپنے ایک افسر کو اس کی نگرانی پر متعین کیا۔

برہمن آباد کے حاکم آکھم لوہانہ نے خراج دینا بند کردیا تھا اس کی گوشمالی بھی ضروری تھی لہٰذا چچ برہمن آباد کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ برہمن آباد کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کی فوج کو ایک شخص تیزی کے ساتھ سیوستان کی طرف جاتا نظر آیا۔ چند سپاہیوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے ایک خط برآمد ہوا۔ یہ خط آکھم لوہانہ کی جانب سے سردار مٹا کے نام لکھا گیا تھا۔ سپاہیوں نے یہ خط چچ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چچ نے خط پڑھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

خط میں لکھا تھا۔ ''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ مخلصانہ طریقے سے پیش آیا ہوں اور کبھی تمہارا مخالف نہیں رہا ہوں۔ میں تمہارے خط کی جو تم نے مجھے لکھا ہے رسید بھیج رہا ہوں۔ تم میں اور ہم میں مکمل اتحاد ہے۔ تمہیں اجازت ہے کہ تم برہمن آباد سے دیبل تک جہاں بھی تم مناسب سمجھو اپنا ٹھکانا بنا سکتے ہو۔ جب تم کسی جگہ پہنچ کر مطمئن نہ ہو جاؤ تو میں تمہیں مالی اور فوجی ہر طرح کی مدد دوں گا۔''

اس خط نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آکھم لوہانہ، سردار مٹا کو اکسا رہا ہے۔

چچ نے اسی وقت آکھم لوہانہ کے نام خط لکھوایا۔

''تم خاندانی نسب کے لحاظ سے بادشاہ ہونے کے دعویدار ہو جبکہ مجھے یہ دولت، قوت وعزت ورثے میں نہیں بلکہ ایشور کی مہربانی سے ملی ہے۔ اس سبب سے میں ہر حال میں اسی کی مدد پہ بھروسا کرتا ہوں۔ اسی کی مدد سے میں سب لڑائیوں میں کامیاب ہوا۔ تمہیں چونکہ ایشور کے سوا اپنے خاندان اور اپنی قوت پر بھروسا ہے اس لیے ان سب چیزوں کو کھو بیٹھو گے اور اسی بنا پر میں تمہاری جان لینے کو جائز سمجھتا ہوں۔''

خط آگے روانہ ہوا اور چچ اس کے پیچھے پیچھے برہمن آباد پہنچ گیا۔ آکھم لوہانہ اس وقت برہمن آباد میں نہیں تھا اس نے سنا کہ چچ حملہ آور ہوا ہے تو راستے سے پلٹ آیا۔

برہمن آباد کے قریب معرکہ دار وگیر گرم ہوا۔ جب برہمن آباد کی فوج پسپا ہونے لگی تو آکھم نے بھاگ کر جان بچائی اور قلعے میں محصور ہوگیا۔

کسی کا قلعے میں محصور ہوجانا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا چچ کو یہ نئی بات لگنے لگی کیونکہ بے پناہ طاقت کے باوجود قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا۔ اب چچ کا فکرمند ہونا جائز تھا۔ کوئی ایسی نادیدہ طاقت تھی کہ قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے سپاہی رات کے وقت قلعے کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس نے اردگرد کے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی آسیب ہے؟ کسی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ اسی تگ ودو میں اسے ایک آدمی ملا۔ اس نے ایک عجیب بات بتائی۔ اس نے بتایا کہ ایک بودھ راہب ہے جو بدھرکو کے نام سے مشہور ہے۔ وہ آکھم کے لیے جاپ کر رہا ہے۔ یہ اس کی روحانی طاقت ہی کا اثر ہے کہ قلعہ فتح نہیں ہو رہا ہے۔

چچ کو اس راہب پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ اگر یہ قلعہ فتح ہوگیا تو میں اس راہب کی کھال کھنچواؤں گا۔

چچ کی اس قسم کا حال ''بدھرکو'' تک پہنچا تو وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور آکھم سے کہا۔ ''چچ کی یہ مجال نہیں کہ وہ مجھے ہلاک کر سکے۔''

اس راہب کو ہر چیز پر اختیار ہو سکتا تھا لیکن موت اور زندگی تو اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ ایک رات اچانک آکھم کا انتقال ہوگیا۔ راہب کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ایشور، چچ کے ساتھ ہے۔ ایسے اسباب مہیا ہوتے جا رہے ہیں کہ چچ کا قبضہ قلعے پر ہو جائے گا۔

اس نے حساب کتاب لگایا تو معلوم ہوگیا کہ یہ ملک یقیناً چچ کے قبضے میں چلا جائے گا۔ اس نے قلعہ چھوڑ دیا اور اپنے بنائے ہوئے مندر میں جا کر بیٹھ گیا۔

راہب کا قلعے سے جانا تھا کہ آکھم کا بیٹا جو باپ کی جگہ اس کا جانشیں ہوا تھا، مغلوب ہوگیا۔

برہمن آباد کے برجوں پر چچ کا جھنڈا بلند ہوگیا۔

چچ نے آکھم کے لڑکے سرِیند کو وہیں رہنے کی اجازت دے دی اور خود بھی برہمن آباد ہی میں قیام اختیار کرلیا۔

اس قیام کے دوران اس نے آکھم کی بیوہ سے شادی کرلی اور تقریباً ایک سال تک اسی شہر میں رہنے کو ترجیح دی۔

وہ اپنی قسم بھولا نہیں تھا کہ راہب کی کھال کھنچوائے گا۔ صرف وقت گزار رہا تھا تاکہ لوگ بھول بھال جائیں۔

ایک روز اس نے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ وہ بڑا منتر کرنے والا پنڈت کہاں رہتا ہے۔ لوگوں نے اس کے مندر کا پتا بتا دیا، چچ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا۔ ان جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں اس راہب سے ملوں گا۔ اس سے باتیں کروں گا اور جب اشارہ کروں تو جھپٹ پڑنا اور بلا تامل اس کا سر اڑا دینا۔

چچ جب راہب کے مندر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا راہب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی عبادت میں مشغول ہے۔ اس کے ہاتھ میں گندھی ہوئی مٹی تھی۔ اس مٹی سے وہ بت بنا رہا تھا اور ایک مہر جیسی چیز اس پر لگاتا جاتا تھا، جس کی وجہ سے بتوں پر گوتم بدھ کی تصویر نقش ہو جاتی تھی۔

چچ اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے راہب کی عبادت میں دخل نہیں دیا۔ اس کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ راہب نے بھی اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے سر اٹھا کر چچ کی طرف دیکھا۔

''سیلاج بھگت کا بیٹا آیا ہے۔'' راہب نے کہا۔

''ہاں اے عبادت گزار پروہت۔''

''کیوں آئے ہو؟''

''میں تم سے عقیدت رکھتا ہوں اور تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔''

''صاف صاف بتاؤ کیا کام ہے؟''

''میں چاہتا ہوں تم قلعے میں واپس آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنا مشیر بناؤں اور بعض کام تمہارے سپرد کروں۔''

''مجھے تیری حکومت سے کیا سروکار۔ مجھے حکومتی کاموں سے کوئی رغبت نہیں۔''

''اگر رغبت نہیں تو برہمن آباد کے قلعے میں میرا مقابلہ کیوں کیا تھا؟''

''میں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ صرف صبر کی تلقین کرتا رہا اور طرفین کے درمیان صلح کی دعا کرتا رہا۔ اس کے سوا میرا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ دنیاوی کاموں سے بہتر عبادت اور نجات کی طلب ہے۔ تو کیوں مجھے پریشان کرنے آ گیا؟''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' چچ نے کہا۔ ''بدھ کی بندگی زیادہ بہتر ہے۔ تمہاری کوئی حاجت ہو تو مجھ سے بیان کرو۔ میں اسے پورا کرنا سعادت سمجھوں گا۔''

''میری کوئی دنیاوی غرض نہیں۔''

''کوئی دینی خدمت؟''

''میرا مندر جیسا کہ تو دیکھ رہا ہے بہت قدیم اور خستہ ہے، اس کی عمارت از سر نو تعمیر کرا دے۔''

''میں بہت جلد اپنے آدمی بھیج کر اس کی مرمت کراؤں گا۔''

چچ نے اپنے آدمیوں کو کوئی اشارہ نہیں کیا کہ وہ راہب کو قتل کرتے۔ راہب کے پاس سے اٹھ کر باہر آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

اس کے وزیر نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''آپ تو اس راہب کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے مگر ملاقات ہوتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے۔ اس کی عبادت گاہ تک تعمیر کرانے پر راضی ہو گئے۔''

چچ نے چلتے چلتے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور وزیر سے مخاطب ہوا۔ ''اگر تو کسی سے نہ کہنے کی قسم کھائے تو میں تجھ پر ایک بھید ظاہر کروں؟''

''کیسا بھید عظیم راجا۔''

''جس وقت میں راہب سے باتیں کر رہا تھا میں نے وہاں ایک ایسی چیز دیکھی جسے میں جادو کہوں یا اس راہب کی کرامت۔ اس راہب کی پشت پر مجھے ایک دیو نظر آیا جو اپنا آبدار برچھا میری طرف تانے کھڑا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر میں نے جنبش کی تو وہ یہ برچھا میرے سینے میں اتار دے گا۔ مجھے راہب کو قتل کرنے سے زیادہ اپنی جان کی فکر پڑ گئی تھی۔''

چچ نے اس ہیبت ناک واقعے کے بعد راہب کا پیچھا چھوڑ دیا اور قلعے میں واپس آ کر رعایا کو مطیع بنانے کے لیے بعض اہم قدم اٹھائے۔

جاٹوں اور لوہانوں میں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کو مغلوب کرنے کے لیے قوانین جاری کیے۔ حکم نامہ جاری کیا کہ مصنوعی تلوار کے سوا اصلی تلوار کوئی نہ باندھے۔ ریشم کے زیر جامے نہ پہنیں۔ اوپر کے کپڑے ریشمی پہن سکتے ہیں لیکن صرف سرخ یا سیاہ رنگ کے ہوں۔ گھوڑوں پر زین نہ رکھیں، ننگی پیٹھ پر سوار ہوں۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں رہا کریں۔ آکھم کے بیٹے سربند کی ہمیشہ اطاعت کریں۔ ملک پر غنیم حملہ کرے تو سربند کے ساتھ مل کر لڑیں۔

ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ کرمان کی طرف بڑھا۔ کرمان پر ایرانیوں کا قبضہ تھا اور اس سے دولت سندھ کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔

ایران کا بادشاہ کسریٰ بن ہرمز مر چکا تھا اور زمامِ حکومت ایک عورت کے ہاتھوں میں تھی۔ اس عورت کا نام

پوران دخت بتایا جاتا ہے۔ یہ عورت تخت پر بیٹھ ضرور گئی تھی لیکن اس میں انتظامی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ امرا اور ارا کین حکومت کے کام چلا رہے تھے جن میں ہمیشہ آپس میں اختلافات رہتے تھے۔ آپس کے تنازعات نے سلطنت کو آخری ہچکیاں لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چچ کو کرمان کی اس نازک حالت کا علم ہوا تو اسے یقین ہو گیا کہ دولت عجم اس کی مزاحمت نہیں کر سکتی اگر وہ حملہ کردے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔

رانی سوہمن دیوی اب تین بچوں کی ماں بن گئی تھی لیکن چچ سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ راجا بننے کے بعد چچ کو اروڑ میں رہنے کا بہت کم موقع مل سکا تھا۔ رانی اس پر بجا طور پر فخر کر رہی تھی کہ اس نے نہ صرف رانی کے سابق شوہر کی حکومت کی حفاظت کی تھی بلکہ اسے وسیع بھی کر دیا تھا۔ وہ تو ساری دنیا کی طرح یہ سمجھ رہی تھی کہ چچ ایک برہمن ہے، وہ حکومت کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکے گا لیکن چچ نے سب کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ ناقابلِ شکست راجا بن کر ابھرا تھا۔ گرد و نواح کا کوئی راجا اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا تھا، منتظم بھی ایسا تھا کہ جو علاقے اس نے فتح کر لیے وہاں دوبارہ کسی کو بغاوت کا خیال تک نہیں آیا۔ یہ فخر و اعزاز اپنی جگہ لیکن اس کی محبت کا تقاضا تھا کہ چچ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس کی آنکھیں چچ کے دیدار کی عبادت میں مصروف رہیں لیکن اب وہ یہ سن رہی تھی کہ چچ کرمان کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اسے روک نہیں سکتی تھی لیکن اس سے گلہ تو کر سکتی تھی۔

''چچ پیارے، تمہیں یاد ہے میں نے کتنی محنت سے تمہیں حاصل کیا تھا۔''

''حاصل کیا تھا یا فتح کیا تھا؟''

''فتح تو تم نے مجھے کیا ہے۔ اپنی شرافت اور نیکی سے۔''

''چلو، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو فتح کیا ہے لیکن اس وقت کون سا موقع ہے یہ بات چھیڑنے کا۔''

''میں سوچتی ہوں میں رانی نہ ہوتی اور تم راجا نہ بنے ہوتے تو ہم کتنے خوش ہوتے۔ تم جب سے راجا بنے ہو میرے ساتھ کتنا کم وقت گزارا ہے۔''

''کیا تم اس سے خوش نہیں کہ آج میں ناقابلِ شکست راجا ہوں۔ پورا سندھ ایک راجا کے ماتحت ہے اور وہ میں ہوں۔''

''تم ناقابلِ شکست ہوئے لیکن میں تو شکست کھا گئی۔''

''رائے ساہسی سے تمہارے کوئی اولاد نہیں تھی۔ میں نے تمہیں دو شہزادے دیے ہیں جو میرے بعد تخت نشیں ہوں گے اور تم رانی ماں کہلاؤ گی، یہ تمہاری شکست نہیں فتح ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اروڑ میں یہاں میرے پاس رہو۔ اب کہیں باہر نہ جاؤ مگر تم یہاں کیوں رہو گے۔ برہمن آباد میں آکھم لوہانہ کی بیوہ سے بیاہ جو رچا لیا ہے۔''

''مجھے طعنے مت دو سوہمن دیوی۔ راجاؤں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ محل کی مٹی بنے رہیں۔ مزدور، مزدوری کرتا ہے تو روٹی کھاتا ہے۔ راجا علاقے فتح کرتا ہے تو راجا کہلاتا ہے۔''

''اب سنا ہے تم کرمان جا رہے ہو۔''

''ایران کی حکومت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھانا ہی دانش مندی ہے۔ ایران والے سندھ کے قدیم راجاؤں پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ اب ان سے بدلہ لینے کا اچھا موقع ہے۔''

''اگر آپ کا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ مجھ سے اب آپ کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔''

''ایسا کبھی ہوا ہے۔ جنگ میں عورتوں کا کیا کام؟''

''ایران میں ایک عورت حکومت کر سکتی ہے، تو کیا میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔''

''سندھ میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے البتہ میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم سے واپسی کے بعد کبھی اروڑ سے باہر نہیں جاؤں گا۔''

''آپ اس جنگ سے واپس آئیں تو کیا خبر آپ سے میری ملاقات ہی نہ ہو۔''

''ایشور جو کرے گا اچھا کرے گا۔ ابھی تو مجھے خوشی خوشی رخصت کرو۔''

راجا چچ نے ایک زبردست فوج ہمراہ لی۔ پنڈتوں سے مبارک گھڑی دریافت کی اور اروڑ سے نکلا۔ رانی نے بھیگی آنکھوں سے اسے رخصت کیا۔

اس کی فوج کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ چچ ایسے نامور حکمران نے انہیں مالا مال کر دیا تھا۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ چچ کے ہمراہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اسے ہر معرکے میں فتح یاب کرتی ہے۔ یہی فتح کا نشہ انہیں اروڑ سے دور لیے جا رہا تھا۔

سب سے پہلے چچ ارمابیل (ارمن بیلہ) پہنچا۔ یہ موجودہ لسبیلہ کا ایک مشہور شہر تھا جو سامونڈی کے ساحل کے قریب تھا۔ یہاں کا راجا بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ یہ

ہندوستان کے راجا سی ہرس رائے کے حاکموں کی اولاد میں سے تھا جسے اس کی دیانت داری کی وجہ سے وہاں متعین کیا گیا تھا لیکن بعد میں وہ سرکشی اختیار کر کے خود مختار ہو گیا تھا۔ اس راجا کو چچ کی آمد کا علم ہوا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ شہر سے باہر نکل کر چچ کا استقبال کرے اور اس کے احترام میں سواری چھوڑ دے۔ چچ کو بھی اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ چچ اس سے اتحاد باہمی اور موانست کا عہد لے کر آگے بڑھا۔ راستے میں جو سردار ملے انہوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔

آگے بڑا دشوار گزار راستہ تھا۔ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنا تھا۔ بھول بھلیوں کی طرح بکھرے ہوئے راستے تھے۔ سر اٹھائے نوکیلے پتھروں پر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ دھوپ ان راستوں پر آنا بھول گئی تھی۔

ان پہاڑوں سے بہ وقت تمام گزرنے کے بعد وہ ایک پرانے قلعے میں پنجا کنٹر پور پہنچا جسے عرب فنز پور کہتے ہیں اور عبدالحلیم شرر نے اس کا تلفظ کنار پور کیا ہے۔

اس پرانے قلعے کو اس نے ازسرنو تعمیر کرایا اور ہندوستانی رواج کے مطابق اس میں نوبت رکھوائی یعنی پانچ سازوں والی نوبجو ہندوانہ رسم کے مطابق شام کو اور صبح صادق کے وقت بجائی جاتی تھی۔

اس سے آگے بڑھ کر اس دریا کے کنارے خیمہ زن ہوا جو کرمان و کربان کے درمیان بہتا ہے۔ یہاں کھجور کے درخت لگا کر اپنی مشرقی سرحد قائم کی جو ایران و سندھ کو علیحدہ کرتی تھی۔ یہاں ایک تختی لگوائی جس پر تحریر تھا۔

''یہ چچ بن سیلاج بن بساس کے زمانے میں قائم ہوئی۔

یہی حد اس وقت تک قائم ہے۔

کھجور کے یہ درخت اس کی قائم کردہ سرحد کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ پھر ارمابیل واپس آیا۔ علاقہ توران کو طے کرتا ہوا ریگستانی سرزمین میں پہنچا۔ اب کسی میں اس سے مقابلے کی جرأت نہیں تھی یہاں سے وہ قندابیل (جس سے قندھار عبارت ہے) ہوتا ہوا دریائے سیتی کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ وہ اس شہر پر دفعتاً حملہ آور ہونا چاہتا تھا مگر اس شہر کے رہنے والے قلعہ بند ہو گئے۔ اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینے کے محاصرے کے بعد ان لوگوں نے مجبور ہو کے اطاعت قبول کی۔ چچ نے سالانہ سو خچر اور ایک لاکھ درہم سالانہ خراج دینے کا وعدہ لیا۔ ان لوگوں نے ایک سال کا خراج پیشگی ادا کیا اور جان چھڑائی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھا۔ اس معاہدے کی تکمیل کے بعد وہ اروڑ واپس آ گیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ آگے کیوں نہیں بڑھا تھا۔ پورا شہر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی عاشق اس کی رانی سوہن دیوی اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ''آپ اس جنگ سے واپس آئیں تو کیا خبر ملاقات ہی نہ ہو۔''

اس کے جواب میں چچ نے کہا تھا، اس مہم کے بعد اروڑ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس نے بھی اپنا عہد پورا کیا، وہ پھر کبھی اروڑ سے باہر نہیں گیا اور ایک مدت کے بعد چالیس سال کروفر سے حکومت کرنے کے بعد 660ء میں وہ بھی اپنی رانی کے پاس پہنچ گیا۔

یہی وہ چچ تھا جس کی اولاد میں سندھ کا مشہور راجا داہر ہو گزرا ہے۔

❁❁❁

چچ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی چندر کو اروڑ کا حاکم بنا دیا تھا (آج اس نام کا ایک گاؤں قصبہ روہڑی سے جنوب مشرق میں پانچ میل کے فاصلے پر اسی قدیم جگہ پر آباد ہے)

چچ کی وفات ہوئی تو چندر کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ چچ کے دونوں بیٹے دھرسینہ اور داہر چچا کے احترام میں خاموش تھے۔ امرا کو یہ خیال تھا کہ چچ کی وفات کے ساتھ ہی چھپے ہوئے دشمن سامنے آ جائیں گے۔ جگہ جگہ سرکشی اور بغاوت سر اٹھائے گی۔ ان فتنوں سے نمٹنے کے لیے ایک تجربہ کار راجا کی ضرورت ہے۔ یہ اوصاف چندر میں ہیں۔ وہ ایک مدت سے اروڑ کا حاکم چلا آ رہا ہے۔ اس کے انتظامات سے سب متفق تھے لہٰذا انہوں نے بھی یہی چاہا کہ چندر کو راجا تسلیم کر لیا جائے اور چندر تخت نشیں ہو گیا۔

اس کے تخت پر بیٹھتے ہی امرا کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ چچ نے جب سیوستان پر حملہ کیا تھا، وہاں کا حاکم سیوستان سے بھاگ کر ہندوستان کے راجا کے پاس چلا گیا تھا۔ چچ کے خوف سے وہ اب تک خاموش تھا لیکن اس نے جیسے ہی سنا کہ چچ کا انتقال ہو گیا ہے تو اسے چچ سے اپنی شکست یاد آئی۔ وہ اب تک چھپا بیٹھا تھا لیکن اب سامنے آیا۔ اسے کسی ایسے راجا کی تلاش ہوئی جو اس کی مدد کر سکے۔ وہ قنوج کے راجا سی ہرس کے دربار میں پہنچ گیا اور سندھ کے حالات سے اسے واقف کیا۔

''میں اب تک چچ کے خوف سے روپوش تھا لیکن اب وہ مر چکا ہے۔ اس کی جگہ اس کا بھائی چندر تخت نشین ہوا ہے۔ چندر میں ہرگز اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی راجا کا مقابلہ کر سکے۔ وہ ایک تارک الدنیا شخص ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت مندروں میں کتابیں پڑھنے میں گزرتا ہے۔ اس وقت سندھ پر قبضہ کر لینا آسان ہے۔ اگر آپ اس ملک پر قبضہ کر کے میرے حوالے کر دیں تو میں اس ملک کا سالانہ خراج وصول کر کے آپ کے خزانے میں داخل کراتا رہوں گا۔''

''سالانہ خراج کا میں کیا کروں گا؟'' سی ہرس نے کہا۔ ''میں تمہیں مفتوح ملک میں سے ایک ضلع دے دوں گا۔ باقی سارے ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کروں گا۔ اگر تم اس پر تیار ہو تو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری مدد کو تیار ہوں۔''

''مجھے تو یہ سوچ کر خوشی ہو گی کہ چچ کا غرور خاک میں مل گیا اور مجھے اپنا ملک واپس مل گیا۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔'' سی ہرس نے کہا۔ ''چچ بھی تو ایک برہمن تھا۔ جدی پشتی راجا نہیں تھا پھر اس سے ایسی بہادری کے کارنامے کیسے سرزد ہو گئے اور چندر سے کیوں نہ ہوں گے؟''

''چچ کی پشت پر رانی موجود تھی جواب نہیں رہی۔ دوسری بات یہ کہ چندر کا رجحان بدھ مذہب کی طرف ہے۔ اس نے لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا ہے کہ وہ بدھ مذہب اختیار کریں۔ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں۔ چچ نہایت سخی تھا۔ لوگ انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اس کے لیے جان دینے پر آمادہ تھے۔ چندر کا اٹھنا، بیٹھنا پجاریوں کے ساتھ ہے۔''

ان باتوں کو سننے کے بعد سی ہرس کے دل میں سندھ کو فتح کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنے بھائی کسائسن کے بیٹے ہرماس کو سپہ سالار بنایا اور سندھ کی مہم پر روانہ کیا۔ یہ فوج چندر کے علاقے پر حملہ کرنے کے لیے دریائے ہاسی کے کنارے خیمہ زن ہوئی اور چندر کے ایک قلعہ دیوپورہ پر بہ آسانی قبضہ کر لیا۔ اس قلعے میں جو تھوڑی سی فوج تھی، وہ لشکر عظیم دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے آگے بڑھے اور ایک مقام ''بندکا ہویا'' پر پہنچ کر راجا چندر کے پاس ایک سفارت بھیجی۔

''فوراً حاضر ہو کر اطاعت قبول کرو۔''

چندر نے اس کے باوجود کہ اسے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا، اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور قلعہ بند ہو کر مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چچ کے بیٹے دھرسینہ کو نہایت عجلت میں برہمن آباد کی طرف بھیجا اور چچ کے چھوٹے بیٹے داہر کے ساتھ مل کر قلعہ اروڑ کی حفاظت کا

بندوبست کیا۔

سی ہرس کی فوج کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ چندر کی فوجی تیاریوں کو دیکھ کر ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ حملہ آور ہوتے۔ چچ کا خوف غالباً اس کے مرنے کے بعد بھی طاری تھا کہ یہ فوج لڑے بغیر ہی واپس ہوگئی۔

اگلے سات برسوں تک کسی کی ہمت نہ ہوئی جو چندر پر حملہ آور ہوتا۔ حملہ کیا تو موت نے۔ چندر اس حملے سے بچنے کے لیے کوئی تیاری نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر پرلوک سدھار گیا۔

چندر کے مرتے ہی چچ کی چھوڑی ہوئی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اروڑ میں چچ کا لڑکا داہر تخت نشیں ہوا (اروڑ شمالی سندھ میں روہڑی کے قریب تھا)

برہمن آباد میں داہر کے بڑے بھائی دھرسینہ نے تخت پر قبضہ جمالیا۔

داہر نے تخت سنبھالتے ہی سندھ کا دورہ شروع کیا تاکہ ملکی حالات سے واقف ہوکر انتظامات کی دیکھ بھال کرسکے۔ پہلے وہ مشرقی سرحد تک گیا پھر مغربی سرحد پر پہنچا۔ برہمن آباد بھی گیا اور دھرسینہ کی حکومت کی توثیق کی۔ اس کی بہن مائیں رانی برہمن آباد میں دھرسینہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ داہر نے دھرسینہ کو ہدایت کی کہ وہ مائیں رانی کی شادی کی فکر کرے۔

''ہم دونوں بھائی اپنے اپنے تخت کے وارث ہوچکے۔ یہ کسی طرح بھی اچھا نہیں لگتا کہ دو بھائیوں کے ہوتے ہوئے مائیں رانی کنواری بیٹھی رہے۔ تم اس کی شادی کا بندوبست کرو۔''

یہ ہدایات دے کر داہر مکران پہنچا۔ یہاں چند دن ٹھہر کر کرمان کے بادشاہ سے، جس کی سرحد سندھ سے ملتی تھی، خیرسگالی کے معاہدے کیے۔ کھجور کے ان درختوں کو دیکھا جو چچ نے سرحد کے نشانی کے طور پر لگوائے تھے۔

ان انتظامات سے فارغ ہوکر وہ اروڑ آ گیا۔

مائیں رانی بڑے بھائی دھرسینہ کے پاس برہمن آباد میں تھی کہ بھاٹیہ کے راجا کا مائیں کے لیے شادی کا پیغام آیا۔ اس سے اچھی کیا بات تھی کہ وہ ایک راجا سے بیاہی جارہی تھی۔ دھرسینہ نے یہ پیغام قبول کرلیا۔

بھاٹیہ نے جہیز میں ایک قلعہ طلب کیا تھا۔ دھرسینہ نے اس کا یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ سامان جہیز تیار کیا اور داہر کے پاس مائیں کو سات سو گھوڑوں اور پانچ سو ٹھاکروں کے ساتھ بھجوادیا۔ داہر کو یہ بھی لکھا کہ وہ مائیں کو بھاٹیہ کی طرف روانہ کردے اور ایک قلعہ بھی بھاٹیہ کے حوالے کردے جس کا دینا شادی کے موقعے پر طے ہوچکا ہے۔

مائیں کے اروڑ پہنچنے پر داہر بہت خوش تھا۔ اس سے بھی زیادہ خوش اس بات پر تھا کہ مائیں کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے نجومیوں کو بلوایا تاکہ بہن کا زائچہ بنوائے۔ نجومیوں نے زائچہ بنایا۔

''مائیں رانی کے زائچے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اس سے شادی کرے گا وہ سندھ کے تاج و تخت کا مالک ہوگا اور ہمیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مائیں رانی سندھ سے باہر نہیں جائے گی۔''

یہ سن کر داہر سخت پریشان ہوگیا۔ اس نے اپنی پریشانی نجومیوں پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ انہیں انعام واکرام عطا کرکے رخصت کیا۔

نجومیوں کو رخصت کرتے ہی اس نے وزیرِ مملکت طلب کیا اور اپنی پریشانی اس پر ظاہر کی۔

''زائچے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مائیں کی شادی جس شخص سے ہوگی وہ سندھ کا مالک بن جائے گا۔ شاید ہو کہ وہ میرے تخت پر قبضہ کرلے گا۔ کیا میں اتنی بڑی سلطنت چھوڑ دوں۔ میں کسی دوسرے کو اس ملک کا بادشاہ بنتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اب تو ہی بتا مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنی سلطنت کیسے بچاؤں؟ وہ جس سے شادی کرے گی وہی سندھ کا مالک ہوگا۔ زائچہ تو یہی بتاتا ہے۔''

وزیر نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔ ''مہاراج! بادشاہ اپنے تخت سے جدا ہوکر قطعی اچھا نہیں لگتا، میں آپ کو مشورہ نہیں دوں گا کہ مملکت سے جدا ہوجائیں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' داہر نے کہا۔ ''زائچہ تو یہ کہتا ہے کہ جو اس سے شادی کرے گا وہی سندھ کا بادشاہ ہوگا۔ اس کی شادی نہ ہونے دوں تو بھی اندیشہ ہے میری سلطنت جاتی رہے۔ اس کی شادی کردوں تو اس کا شوہر تخت کا مالک ہوگا۔ دونوں صورتوں میں نقصان تو میرا ہی ہے۔''

''مہاراج! ایک مشورہ دوں لیکن تحمل سے سننے کا۔ اگر ناپسند ہو تو مجھے معاف کردیجیے گا۔ مشورہ یہ ہے کہ آپ دنیا کو دکھانے کے لیے اپنی بہن سے شادی کرکے اس کو اپنے ساتھ تخت نشیں کرلیں لیکن ازدواجی تعلقات قائم نہ کریں۔ دنیا کے سامنے وہ آپ کی بیوی اور خلوت میں بہن ہو، اس طرح وہ آپ کی بیوی کہلائے گی اور سندھ کا تاج وتخت آپ کے پاس رہے گا۔''

وزیر سے بات کرنے کے بعد داہر نے اسے [illegible] سرداروں اور امرا کو طلب کیا اور ان کے سامنے نجومیوں کا زائچہ اور وزیر کی رائے بیان کی۔

وزیر کی رائے کو سن کر امرا نے بڑی ناگواری کا اظہار کیا اور داہر کا ادب بالائے طاق رکھ کر اس کو اس برے ارادے سے روکنے کی کوشش کی۔

''یہ بہت بڑا پاپ ہے جو آپ کرنے جارہے ہیں۔ ہمارا مذہب بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سارے ملک میں بڑی بدنامی ہوگی۔ ہر طرف فتنے برپا ہوجائیں گے۔ سندھ میں آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لوگ اسے تعجب اور غصے سے دیکھیں گے۔''

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وزیر، داہر کو قائل کرنے کے لیے کیا چال چل رہا ہے۔ اس نے ایک بھیڑ کے بالوں میں مٹی ڈال کر رائی ڈالی اور اس پر دو تین روز تک خوب پانی چھڑکتا رہا، پانی ڈالنے سے اس رائی کی کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ اس نے اس بھیڑ کو بازار میں چھوڑ دیا۔ اس عجیب و غریب بھیڑ کو دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ وہ جدھر سے گزرتی، لوگوں کا مجمع اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ بچوں کو بھی خوب تماشا ہاتھ لگ گیا۔ لوگوں میں چرچے بھی خوب ہوئے لیکن یہ چرچا چند روز ہی رہا۔ لوگوں کے لیے یہ عام سی بات ہوگئی۔ پھر وہ بھیڑ بازاروں میں ماری ماری پھرتی تھی، کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

وزیر، داہر کے پاس گیا اور بھیڑ کا پورا واقعہ سنا کر اس نے کہا۔ ''دنیا میں کتنا ہی غیر معمولی واقعہ ہوجائے، لوگ اسے چند روز ہی یاد رکھتے ہیں پھر اسے بھول کر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ آپ اگر مائیں رانی سے شادی کرلیں گے تو چند روز ہی چرچا ہوگا اور پھر لوگ اسے بھول جائیں گے لہٰذا میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی بہن سے شادی کرکے اپنی سلطنت بچالیں۔''

راجا داہر کی نیت میں پہلے ہی فتور آچکا تھا، وزیر کی دی ہوئی اس مثال نے اسے اپنے ارادے میں مزید پختہ کردیا۔ اس نے پنڈتوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ میرے اور مائیں کے درمیان گٹھ بندھن کی رسم ادا کردی جائے۔

راجا کا حکم تھا، نہ پنڈت انکار کرسکے نہ مائیں نے انکار کیا۔ داہر کی دھوتی کے کونے سے مائیں کی اوڑھنی کا پلو باندھ دیا گیا۔ اس طرح نجومیوں کی بات رہ گئی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

شادی کی یہ رسم خاموشی سے ادا کی گئی تھی لیکن پورے ملک میں اس کا چرچا ہوگیا۔ جس نے بھی سنا وہ سر جھکا کر خاموش ہوگیا کہ داہر سے ایسا شرمناک فعل سرزد ہوا ہے۔

یہ خبر برہمن آباد پہنچی تو اس کے بھائی دھرسینہ کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے فوراً داہر کے نام خط لکھا اور اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا۔

''تم نے یہ کام اتنا برا کیا ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔ تمہارے لیے یہ ہرگز مناسب نہ تھا۔''

داہر نے اس خط کے جواب میں اپنے اس فعل کی وضاحت کی۔

''یہ شادی میں نے رسمی طور پر نجومیوں کے کہنے سے کی ہے، ورنہ خدا جانتا ہے کہ میں آج بھی مائیں کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔''

دھرسینہ کی طرف سے پھر جواب آیا۔

''تم شاید اس تدبیر سے تقدیر کو بدلنا چاہتے ہو لیکن جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ توبہ کرکے اس بدنامی کو دور کرو۔''

داہر نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اب طے کرلیا کہ داہر پر حملہ کرے گا۔ وہ ایک فوج لے کر داہر کے مقابلے کے لیے اروڑ کی طرف روانہ ہوا۔ داہر کو اطلاع ہوئی تو اس نے بھی لشکر تیار کیا اور دھرسینہ کا انتظار کرنے لگا۔

دھرسینہ یلغار کرتا ہوا اروڑ پہنچ گیا۔ دھرسینہ کے پہنچتے ہی قلعے کے دروازے بند کردیے گئے۔ دھرسینہ قلعے کے دروازے پر پہنچا اور دربانوں کو حکم دیا کہ دروازہ کھولو لیکن دربانوں نے یہ کہہ کر دروازہ بند رکھا کہ داہر کا حکم نہیں ہے۔

دھرسینہ نے داہر کو پیغام بھیجا کہ میں جنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم بھی جنگ سے گریز کرو اور قلعہ میرے حوالے کردو۔

داہر کی طرف سے پیغام آیا۔ ''تم قلعے کے اندر نہیں آسکتے۔ باہر جاکر خیمہ زن ہوجاؤ اور اپنے قابلِ اعتماد لوگوں کو بھیجو تاکہ میں ان سے بات چیت کروں۔''

دھرسینہ نے جب دیکھا کہ داہر جنگ کے لیے تیار ہے اور اسے یہ مروت قطعی نہیں ہے کہ میں اس کا بھائی ہوں تو اس نے دریائے سندھ کے اس طرف جاکر پڑاؤ ڈال لیا اور اپنے معتمدین سے مشورہ کرنے لگا کہ داہر کو گرفتار کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہیے۔

دوسری طرف داہر اپنے وزیر سے مشورہ کررہا تھا کہ اسے بھائی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟

وزیر نے اس کی مخالفت کی۔

''آپ کو دھرسینہ کی نرم گفتاری پر یقین نہیں کرنا

چاہیے۔ وہ یہ چالیں آپ کی گرفتاری کے لیے چل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں جائیں اور آپ کو نقصان ہو۔ میرا مشورہ ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ آپ اس کے پاس جائیں۔''

ابھی داہر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ دھرسینہ نے اس کی خدمت میں پھر ایک پیغام بھیجا۔

''میں تمہارے اعتماد کی خاطر قلعے کے دروازے پر تنہا آؤں گا اور تم لشکر کے ساتھ قلعے سے باہر آنا۔ ہم دونوں بھائی ہیں۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

دوسرے دن وعدے کے مطابق دھرسینہ نے قلعے کے دروازے پر پہنچ کر اطلاع دی۔ داہر نے حکم دیا کہ قلعے کا دروازہ کھول کر دھرسینہ کو اندر لایا جائے۔

جب دھرسینہ قلعے کے اندر آچکا تو وزیر نے ایک مرتبہ پھر داہر کو بھڑکایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دونوں بھائی آپس میں مل جائیں۔ داہر نے مائیں سے شادی چونکہ اس کے مشورے سے کی تھی اس لیے وہ خوف زدہ تھا کہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد کہیں اسے سزا نہ دی جائے۔ اس نے داہر کو مشورہ دیا کہ دھرسینہ کو قتل کرا دیا جائے۔

''مجھے دھرسینہ کے لشکر سے خبریں مل رہی ہیں کہ وہ آپ کو دھوکا دینے کی فکر میں ہے۔ اب جبکہ وہ قلعے میں آچکا ہے اور تنہا ہے تو اسے قتل کرا دیں یا کم از کم قید کرلیں اور کسی مناسب معاہدے کے بعد رہا کریں۔''

داہر نے وزیر کا مشورہ نہیں مانا۔

اس عرصہ میں دھرسینہ داہر کے محل کے دروازے تک آ گیا۔ داہر اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور اسے محل کے اندر بلانا چاہا۔

''میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہارے محل میں قدم نہیں رکھوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم میرے ہاتھی پر سوار ہو جاؤ، ہم ایک ہی ہاتھی پر سوار ہو کر باہر چلیں گے تو خاص و عام کو تاثر ملے گا کہ ہم دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی جگہ بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں کریں گے۔''

داہر نے اس کی تجویز کو بہ خوشی قبول کرلیا۔

دھرسینہ کے فیل بان نے ہاتھی کو آگے بڑھایا۔ داہر ہاتھی پر سوار ہو گیا۔ دونوں ایک ہی ہاتھی پر روانہ ہوئے۔ داہر کا وزیر گھوڑے پر سوار ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

داہر اپنی خوشی سے ہاتھی پر سوار ہوا تھا لیکن جب [illegible] کے دروازے کے قریب پہنچا تو خوف زدہ ہو گیا۔ [illegible] دھرسینہ مجھے حیلے بہانے سے تو ساتھ نہیں لے جا رہا ہے [illegible] خیال آتے ہی وزیر سے آہستہ سے کہا۔

''مجھے قلعے سے باہر جانے میں خوف ہے۔ تم بتا[illegible] اب میں کیا کروں؟''

''آپ جب دروازے سے گزرنے لگیں تو چوکھ[illegible] پکڑ کر لٹک جایئے گا۔ ہاتھی آگے بڑھ جائے گا۔ بعد [illegible] آپ کو اتار لیا جائے گا اور قلعے کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔''

داہر نے اس مشورے پر عمل کیا اور چوکھٹ پکڑ[illegible] لٹک گیا۔ ہاتھی نے دروازہ پار کرلیا جس پر اب دھرسینہ اک[illegible] بیٹھا تھا۔ باہر نکل کر دھرسینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو داہر ہا[illegible] پر نہیں تھا اور دروازہ بند تھا۔ دھرسینہ کو اپنی ناکامی پر سخت کوفت ہوئی۔ وہ بڑی ترکیب سے داہر کو نکال لایا تھا لیک[illegible] داہر ہاتھ سے نکل گیا۔

دھرسینہ اس طرف سے مایوس ہو کر اپنی قیام گاہ [illegible] طرف لوٹ گیا لیکن سخت مایوس تھا۔ اس صدمے کا اثر تھا [illegible] شدید گرمی کا کہ خیمے میں پہنچتے ہی اسے سخت بخار چڑھ [illegible] اور چوتھے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ داہر کو خبر ہوئی تو اس [illegible] تصدیق کے لیے اپنے جاسوس بھیجے۔ جب اسے یقین ہو [illegible] تو وہ خود وہاں گیا۔ اس کے کریا کرم کا انتظام کیا اور اس [illegible] خزانے پر قبضہ کرلیا۔ دھرسینہ کے لشکر نے اس کی فرما[illegible] برداری اختیار کی۔

داہر ایک ماہ اروڑ میں گزارنے کے بعد برہمن آ[illegible] گیا۔ یہاں ایک سال قیام کیا۔ اس عرصے میں یہاں [illegible] تمام لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔

راجا داہر کو اب ہر طرف سے اطمینان تھا۔ اس [illegible] بہن سے شادی کر کے اپنی دانست میں اپنی سلطنت کو بچا[illegible] تھا لیکن یہ داغ بھی اسی کو لگنا تھا کہ خلافت عرب سے مخالفت ہو گئی۔ محمد بن قاسم یہاں آیا اور ارض سندھ میں ہند[illegible] سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

بہن سے شادی کے باوجود ارض سندھ کا مالک کو[illegible] اور ہو گیا۔

چچ کی بنائی ہوئی سلطنت اس کے بیٹے کے ہاتھوں [illegible] ہو گئی!

ماخذات

تاریخ سندھ، اعجاز الحق قدوسی۔ تاریخ سندھ۔
عبدالحلیم شرر۔ چچ نامہ، ترجمہ اردو۔

جدائی

طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کچھ لمحات ایسے مقدر میں رقم کرتا ہے جو کسی کے لیے بھی سرمایہ حیات ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھر گلیوں اور رستوں سے محبت کرنے والے اپنی مٹی سے کبھی جدا ہونے کو تیار نہیں ہوتے مگر جب... یہ جدائی ناگزیر ہو جائے تو وہ ایک ایک منظر کو اپنے دل کی دنیا میں نقش کرلیتے ہیں۔ وہ بھی جب آخری بار اس بستی میں مقیم ہوا تو لہو قطرہ قطرہ بن کر دل کی سرزمین پر زیر و بم پیدا کرتا رہا اور... جدائی پرچھائیں بن کر ساتھ رہی۔

عہدِ گزشتہ سے چند خوشگوار لمحات کشید
کرنے والے ایک دیوانے کا قصہ

عدنان حال ہی میں میرا دوست بنا تھا۔ بس سال ڈیڑھ سالہ تعلق تھا ہمارا۔ تاہم اس مختصر عرصے میں ہی وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ماضی اور حال کے بارے میں کافی کچھ جان گئے تھے لیکن ابھی ہماری زندگیوں کے بہت سے گوشے تاریکی میں تھے۔ میری عمر قریباً 23 سال تھی اور میں ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ عدنان مجھ سے دو تین سال چھوٹا مگر شادی شدہ تھا۔ کبھی کبھی جب عدنان رومانی معاملات کا ذکر کرتا تو میں اسے بتاتا کہ میری رومانی

زندگی دراصل تین دوستوں کی کہانی ہے۔ وہ ان تین دوستوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر پتا نہیں کیوں، میں جو اس سے ہر معاملے پر کھل کر بات کر لیتا تھا اس معاملے پر بات کرتے ہوئے خاموشی سادھ لیتا تھا۔ کوئی دیوار سی میرے اور اس کے درمیان آجاتی تھی...... لیکن پھر ایک دن ایسا آیا جب مجھ پر اداسی ٹوٹ کر برسی۔ دل کی رگیں غم کی یورش سے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے لگا جیسے میرے گھر کی دیواریں مجھ پر بڑھے جائیں گی اور میں زندہ دفن ہو جاؤں گا۔ اس روز شام چار بجے کے لگ بھگ میں نے عدنان کو ساتھ لیا اور ہم موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چوبرجی کے قریب وینس سینما میں پہنچ گئے۔ بڑا اداس ماحول تھا۔ کوئی ڈبا قسم کی اردو فلم لگی ہوئی تھی۔ پارکنگ میں اکا دکا موٹر سائیکل اور سائیکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا کہ فلم میں کتنی دلچسپی لی جارہی ہے۔ سینما کے اندر کھانے پینے کی دکانیں بھی ویرانی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ دہی بڑے کے اسٹال پر باسی چیزوں کے اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور ایک ادھیڑ عمر شخص انہیں بے دلی سے اڑانے میں مصروف تھا۔ سینما کی عمارت کا رنگ و روغن اڑا ہوا تھا اور کئی جگہ سے پلاستر بھی جھڑتا نظر آتا تھا۔

اگلا شو شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ ہم اوپر گیلری کی طرف چلے گئے اور وہاں موجود ایک طویل صوفے پر بیٹھ گئے۔ صوفے کی حالت بھی سینما کی مجموعی حالت سے مختلف نہیں تھی۔ "ریگ زین" پھٹ چکا تھا۔ ایک دو جگہ سے اسپرنگ جھانک رہے تھے۔ ہمارے بیٹھنے سے وہ جیسے کراہ اٹھا۔ یہاں موجود سینما کا چھوٹا سا اندرونی ریسٹوران بند پڑا تھا اور کاؤنٹر پر ایک بلی خاموش بیٹھی تھی۔ ہال کے اندر سے فلم کے ڈائیلاگز کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "عدنان! تم نے کئی بار پوچھا ہے کہ میری رومانی کہانی کے تین کردار کون کون سے تھے۔ میں آج تمہیں انہی سے ملانا چاہ رہا ہوں۔ یہ دراصل تین گہرے دوستوں کی کہانی ہے۔ بہار کی ایک خوشگوار شام کو وہ تینوں دوست اسی جگہ اکٹھے ہوئے تھے اور ایک یادگار کہانی کو آغاز ملا تھا۔ آج میں تمہیں ان تینوں دوستوں سے ملانا چاہتا ہوں۔ یہ بس ان تین کرداروں ہی کی کہانی ہے۔ لیکن میری ایک چھوٹی سی شرط بھی ہے۔ امید ہے تم مان لو گے۔ ہم یہاں اکٹھے بیٹھ کر فلم نہیں دیکھیں گے۔ علیحدہ علیحدہ بیٹھیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی یار؟"

"بس ہے نا بات۔" عدنان الجھا ہوا تھا مگر خاموش رہا۔

وہ پُرتجسس نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس کے اندرونی خانے سے شہلا کی تصویر برآمد کی۔ میں نے عدنان کو بتایا۔ "یہ ہے پہلا کردار...... شہلا...... اپنے چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن تھی۔ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی، وہ آئی سی ایس کر رہی تھی۔ اس کہانی کا دوسرا کردار میں طارق احمد ہوں اور میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ اس کہانی کا تیسرا کردار بھی تمہارے سامنے ہے اور تم تھوڑی سی کوشش کے ساتھ اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔"

عدنان ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گرد آلود کاؤنٹر پر اونگھتی ہوئی بلی کے علاوہ یہاں لابی میں فقط تین افراد اور نظر آرہے تھے۔ ایک تو سینما ہی کا خستہ حال گیٹ کیپر تھا۔ اس کا نام غالباً ریاض تھا۔ ایک کوئی مسافر ٹائپ شخص تھا جو شاید کسی گاؤں سے آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی مطلوبہ ٹرین یا بس کے روانہ ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی ہوں اور وہ وقت گزاری کے لیے فلم دیکھنے چلا آیا ہو۔ تیسرا ایک پکی عمر کا شخص تھا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ عین ممکن تھا کہ کسی طور اس شخص کا تعلق یہاں دکھائی جانے والی ڈبا فلم سے ہی ہو۔

عدنان نے تینوں افراد کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "ان تینوں میں سے تو مجھے کوئی نہیں لگتا۔"

"ہاں ان تینوں میں سے کوئی نہیں۔ لیکن وہ یہیں ہے اور تم اسے دیکھ بھی رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" عدنان گڑبڑا سا گیا۔ شاید اسے میری ذہنی صحت پر شک ہو رہا تھا۔

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ "عدنان! وہ تیسرا کردار...... یہ سینما ہے...... وینس سینما۔"

"سینما؟"

"ہاں عدنان...... یہی وہ تیسرا دوست ہے۔ یوں تو میں اپنے اس دوست کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں ایف ایس سی میں پڑھتا تھا۔ فلم بینی کا شوق عروج پر تھا۔ والد صاحب مذہبی آدمی تھے۔ سینما اور پتنگ بازی جیسی تفریحات ان کے نزدیک معیوب تھیں۔ چھوٹا بھائی میرا ہمراز تھا۔ اسے پتا ہوتا تھا کہ میں فلم دیکھنے گیا ہوا ہوں لیکن وہ والد اور والدہ کو یہی بتاتا کہ بھائی بس ابھی ابھی کسی کام سے نکلے ہیں۔ یہ 'ابھی ابھی' بڑا فائدہ بخش ثابت ہوتا تھا۔ یوں تو اور بھی بہت سے سینما ہال تھے جن کو میں اکثر رونق بخشتا تھا لیکن وینس سینما کی خوبی یہ تھی کہ یہ گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بہ مشکل ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ انٹرول کے وقت میں پارکنگ سے اپنی سائیکل نکالتا اور بھاگم بھاگ گھر پہنچ کر گھر والوں کو اپنی صورت دکھاتا اور باقی فلم دیکھنے واپس سینما پہنچ جاتا۔

یعنی اس سینما سے ایک انسیت شروع سے ہی تھی۔ اصل دوستی تب ہوئی جب اپریل کی ایک خوشگوار شام کو میں نے شہلا کو لیڈیز ویٹنگ روم کے دروازے پر دیکھا تھا۔ بس کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو دو نگاہوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دو زندگیوں کو بھی ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ شہلا میرے دل کو بھا گئی تھی اور شاید میں بھی اسے برا نہیں لگا تھا۔ ہفتے کی وہ شام ایک کہانی کا نقطۂ آغاز بن گئی۔

ہماری اگلی ملاقات بھی سینما کے رومان پرور ماحول میں ہی ہوئی۔ وہ بھی ہفتے کا ہی روز تھا اور شو بھی شام کا تھا۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ انٹرول پر میں چہل قدمی کے انداز میں ان نشستوں کی طرف چلا گیا جہاں شہلا اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ وہی جانا پہچانا عمل تھا، پروانے کو شمع کے گرد چکر لگانا ہوتا ہے اور ہر صورت چکر لگانا ہوتا ہے۔ اس روز میں نے شہلا کا گھر بھی دیکھ لیا...... اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس کے والد سیکریٹریٹ میں آفیسر ہیں۔

دھیرے دھیرے میرا اور شہلا کا تعلق آگے بڑھتا رہا۔ اس تعلق کو آگے بڑھانے میں مرکزی کردار اس سینما ہی کا رہا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی فیملی کے بجائے اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ فلم دیکھنے آئی۔ اس دن ہم نے اس ریسٹوران کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے باتیں کیں اور فون نمبرز کا تبادلہ بھی کیا۔"

عدنان توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اسے بتایا۔ "ان دنوں یہ سینما ایسا نہیں تھا، جیسا آج نظر آرہا ہے۔ یہ تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں ابھی سینما اور فلم بینی کا رواج زندہ تھا۔ اچھی فلمیں بھی لگتی تھیں۔ جمعہ کے روز فلموں کی نمائش کا افتتاح ہوتا تھا۔ لوگ اہتمام سے فلم دیکھنے جاتے تھے۔ اکثر فلموں پر کھڑکی توڑ رش پڑتا تھا۔ ٹکٹیں بلیک ہوتی تھیں۔ بہتر فلموں کی نمائش کے موقعے پر خواتین کے جگھٹے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ وینس سینما بھی رونق محل ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک بڑی شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ فلم بینوں کے لیے یہاں تک رسائی آسان تھی۔ نئی فلم کی نمائش کے موقعے پر نیچے والا احاطہ کھچا کھچ بھر جاتا تھا۔ یہ نیچے سفید سیڑھیاں دیکھ رہے ہو نا تم۔ ہجوم میں یہ بھی چھپ جاتی تھیں۔ یہ سامنے ہی "ون ایٹ" کی ٹکٹ کھڑکی تھی۔ یہاں پُرجوش تماشے دیکھنے کو ملتے تھے۔ زور آزمائی کے ذریعے ٹکٹ نکالے جاتے تھے۔ قطاریں ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں اور شائقین پر ڈنڈے برستے تھے۔ سینما کی بائیں طرف جو احاطہ ہے یہاں خوانچہ فروشوں کا اژدہام ہوتا تھا۔ ان کے پیچھے اشیائے خورونوش کی کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ دہی بڑے، آلو چنے، گرم سموسے، حلیم، شامی کباب اور نان، ٹھنڈی بوتلیں اور چائے۔ انٹرول ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ خوانچے والوں کی آوازیں سماں باندھ دیتیں۔ ٹھنڈی بوتلوں کی ٹن ٹن...... کباب والے کی ٹکاٹک اور ان سب میں سے نمایاں ہو کر ابھرتی ہوئی دہی بڑے والے کی صدا۔

ہاں عدنان! یہ انہی بارونق دنوں کی روداد ہے۔ اس سینما کی عمارت میری اور شہلا کی محبت کی گواہ ہے۔ یوں تو ہم کئی اور جگہوں پر بھی ملے مگر ہماری ملاقاتوں کا بڑا محور یہی سینما تھا۔ میری طرح یہ سینما شہلا کی پہنچ سے بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے گھر سے سینما کا فاصلہ یہی کوئی ایک کلومیٹر رہا ہوگا۔ ان کے گھر میں فلم بینی کا شوق بھی تھا۔ اس کی آپی اور بڑے بھائی جاوید بھی فلموں کے شیدائی تھے۔ ایک بار سینما کے اندر ہی جاوید بھائی سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ وہ خاصے ایڈوانس تھے اور کھلے ذہن کے مالک بھی۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا کہ میرے اور شہلا کے درمیان ایک رابطہ پروان چڑھ رہا ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں انہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اگر کوئی تھوڑا بہت ردعمل تھا بھی تو اسے مثبت ہی کہا جا سکتا تھا۔

کچھ عرصے بعد شہلا اپنی کسی سہیلی کے ساتھ یا پھر تنہا بھی آنے لگی۔ ایک بار ہم نے سینما کی گیلری میں اکٹھے بیٹھ کر فلم دیکھی اور راز و نیاز بھی کیے۔ پھر ایک بار سینما کے کیبن نے ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کیا اور وقت کے کچھ حسین لمحے ہماری جھولی میں ڈالے۔ یہ سینما ہمارا ہمراز دوست بن گیا تھا۔ ہماری "محبت گاہ" کے طور پر اس نے اپنے بازو ہمارے لیے کھول دیے تھے۔ وہ الفت کے اس حسین خوشبودار سفر میں ہمارے ساتھ شریک ہوا تھا۔ ہاں عدنان! میں آج بھی دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے ایک ایک چپے پر ہماری محبت کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہمارے قہقہے اس کی دیواروں میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہماری آوازیں اس کے ہال کی نیم تاریکی میں جذب ہیں۔ ہاں وہ بڑے سنہرے دن

تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم تینوں دوستوں سمیت ہر شے پر جوبن ہے۔ مجھے سب یاد ہے۔ سنیما جانا ان دنوں اکثر لوگوں کو اچھا لگتا تھا۔ سنیما میں جاکر فلم دیکھنا ایک مختلف طرز کی ''انجوائے منٹ'' تھی۔ سرما کی ٹھٹھری ہوئی شاموں میں سنیما کے اندر کا نیم گرم ماحول، فلم کے ساتھ ساتھ مونگ پھلی، ریوڑیوں اور چائے وغیرہ کا شغل، گرمیوں کی حبس زدہ فضا میں سنیما کے اندر کی دلکش ٹھنڈک اور پُرسکون تاریکی اور پھر جب انٹرول کے وقت یا فلم کے خاتمے پر باہر نکلتا تو پتا چلتا کہ آندھی آئی ہوئی ہے یا زوردار بارش ہورہی ہے۔ فلم شروع ہونے سے پہلے سنیما کے طول وعرض میں چکرانا اور فلم کے حوالے سے مختلف اندازے لگانا۔ فلم کے بعد اس پر تبصرے اور اس کی سینہ گزٹ مشہوری۔ ان دنوں اس تفریح کے سارے انداز مختلف تھے، میں نے ذرا توقف کیا اور کہا۔ ''تم نے سنیما کی اوپر گیلری دیکھی ہے نا، کتنی کشادہ ہے۔''

''پچھلی دفعہ تمہارے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔'' عدنان نے جواب دیا۔

''گیلری میں ہم اکثر سب سے بالائی رو میں دائیں کنارے پر بیٹھا کرتے تھے۔ شہلا ایک لمبی چادر میں ہوتی تھی جس میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے۔ ہمارا دوست یہ سنیما گھر ہماری مدد کرتا۔ خود کو نیم تاریکی میں ڈبو دیتا۔ اپنی اسکرین پر ایک کہانی بکھیر دیتا اور لوگوں کی توجہ ادھر ہو جاتی، میں اور شہلا ایک دوسرے سے کندھا ملا لیتے۔ ایک دوسرے کو چھوتے، سرگوشیاں کرتے، وہ عجیب شب وروز تھے۔ ہاں یوں لگتا تھا کہ ہر شے پر شباب ہے۔ ہر طرف محبت کا پُرسکوت بسیرا ہے لیکن سکوت کے نیچے لہریں بھی تو پلا کرتی ہیں۔ ہماری زندگیوں میں بھی دھیرے دھیرے ایک طوفان اٹھا اور پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ الٹ پلٹ کرر کھ دیا۔ ایک ایسی ہوا چلی جو چند ہی ماہ میں شہلا کو مجھ سے بہت دور لے گئی۔''

''شادی ہوگئی اس کی؟'' عدنان نے پوچھا۔

''نہیں شادی تو نہیں ہوئی لیکن وہ ''شادی'' سے بھی دور چلی گئی۔ اس کے گھر والے امریکا شفٹ ہو رہے تھے۔ وہ لوگ مجھے گھر داماد کے طور پر رکھنا چاہتے تھے۔ ایک عام سی ملازمت کے بجائے میرے لیے ایک نہایت روشن مستقبل کا انتظام کر رہے تھے لیکن میری ڈوریں میری بیوہ ماں اور ایک بیمار بھائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں...... اور میرے قدموں سے میری مٹی کی خوشبو ایک قدیم عہد کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ میرا ملک جیسا بھی تھا، میرا تھا۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں، اس کے گنجلک بازار، اس کی بے ہنگم ٹریفک، اس کے کھیت کھلیان اور اس کے لوگ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ مجھے پیارے تھے۔ میں اپنی جڑوں سے نکل نہیں سکتا تھا، دوسری طرف شہلا اس زمین پر رہ نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ سہانے سپنے سج چکے تھے۔ وہ رنگ ونور کے سیلاب کی طرف سفر کرنا چاہتی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ میں اس کا ہم سفر بنوں۔ یہ ایک جان لیوا دوراہا تھا لیکن آخر میں نے وہ راہ چنی جو میری ماں اور بیمار بھائی کی طرف جاتی تھی۔

ایک ایسی ہی اداس شام میں شہلا مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ہم تین سے دو رہ گئے، میں اور وینس۔ اس شام مجھے ایسے ہی لگا تھا جیسے سنگ وخشت کی یہ عمارت جسے سنیما کہا جاتا ہے، ایک جیتی جاگتی شخصیت بن گئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر خوب روئے تھے۔ کئی دن تک اشک بار اور افسردہ رہے تھے۔ پھر ہم دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے۔ مجھے لگا کہ شہلا تو چلی گئی مگر اپنی بے شمار یادیں ہم دونوں کے بیچ چھوڑ گئی ہے۔ ہم دونوں ان یادوں کو ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ وہ یہاں کھڑی ہوتی تھی۔ یہاں اس نے پہلی بار مجھ سے بات کی تھی۔ اس نیم تاریکی میں ہم نے ایک دوسرے کو پہلی بار چھوا تھا۔ یہاں فلاں واقعہ ہوا تھا، یہاں فلاں۔ پتا نہیں کیسے دھیرے دھیرے یہ عمارت جسے لوگ سنیما کہتے تھے، مجھے عزیز ہوتی چلی گئی۔ میں ہر ہفتے کی شام دوسرے شو پر یہاں آتا تھا۔ فلم کوئی سی بھی ہوتی، مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں تو اپنے اس دوست سے ملنے آتا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر چلنا، اس کی لابی میں بیٹھنا، اس کے خوانچہ فروشوں سے گفتگو کرنا اور اس کے تاریک ہال میں تنہائی سے ٹیک لگا کر گئے وقت کو آواز دینا مجھے اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی واقعی ہم دونوں دوستوں کا یہ ملاپ ایک اچھی تفریح کا سبب بھی بن جاتا تھا۔ کوئی خوب صورت فلم لگی ہوتی تھی۔ میں چند گھنٹوں کے لیے اس کے منظر نامے میں ڈوب کر اپنی پریشانیوں اور محرومیوں سے دور ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ آس مر کر بھی نہیں مرتی۔ بدترین تاریکیوں میں بھی ننھی یا جھوٹی امید کی کوئی کرن چمکتی رہتی ہے۔ میں جو تقریباً ہر ہفتے کی شام وینس سنیما کی طرف جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وینس میرا اور شہلا کا مشترکہ دوست تھا۔ میرے دل میں یہ آس بھی موجود رہتی تھی کہ شاید کسی وقت وہ

مجھ سے نہ سہی اپنے اس دوست سے ملنے ہی آجائے۔ شاید ابھی ہفتے کی کوئی ایک ایسی شام باقی ہو جس میں شہلا نے فلم کا دوسرا شو دیکھنے کے لیے یہاں آنا ہو۔ شاید...... شاید...... اور پھر اسی طرح بارہ سال بیت گئے۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی نکل گیا...... وقت بدل گیا، حالات بدل گئے، سنیما کی جگہ پہلے وی سی آر اور پھر سی ڈی اور انٹرنیٹ نے لے لی...... رجحانات کا دھارا رخ مڑتا ہوا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ لیکن میرے جیسے روایت پسند اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وہ اپنے رہن سہن سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنی معاشرت سے وابستہ کوئی بھی شے ان کے دل سے نکلتی نہیں ہے۔ میری اور وینس کی دوستی اب تک قائم ہے۔ میں اب بھی باقاعدگی سے یہاں آتا ہوں اور شاید آتا ہی رہتا لیکن...... اب......''

آواز میرے گلے میں اٹک گئی اور میں آگے نہ بول سکا۔

میری آنکھوں کی نمی دیکھ کر عدنان چونک سا گیا۔

''کیا بات ہے طارق۔ تم چپ کیوں ہوگئے۔ بتاؤ نا، کیا کہہ رہے تھے تم؟''

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... اب...... میری اور شہلا کی جدائی کے بعد میری اور وینس کی جدائی بھی عمل میں آرہی ہے۔ ہم دونوں بھی بچھڑ رہے ہیں، آج شام کے بعد شاید اب، میں کبھی یہاں نہیں آسکوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ کہیں جا رہے ہو تم...... میرا مطلب ہے کہیں ملک سے باہر جا رہے ہو؟''

''نہیں عدنان! میں نہیں جا رہا...... وینس جا رہا ہے۔ یہ سنیما جا رہا ہے۔''

''سنیما جا رہا ہے؟ کیا مطلب طارق؟''

''ہاں عدنان!...... یہ سنیما مجھ سے بچھڑ رہا ہے، یہ جا رہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔ آج کی شام آخری شام ہے۔ اب یہاں جو شو چلے گا وہ آخری ہوگا۔ آج جب شو کے بعد پردہ گرے گا تو پھر کبھی نہیں اٹھے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں عدنان! آج شہر کی یہ معروف تفریح گاہ جو لوگوں کے لیے خوشگوار گھڑیوں کا حوالہ رہی ہے، اپنا جانا پہچانا سفر ختم کر رہی ہے...... رجحانوں کے انقلاب نے اسے نگل لیا ہے، کل سے اس کی مسماری کا عمل شروع ہو جائے گا۔ یہاں ایک بہت بڑا پیٹرول پمپ بنے گا۔ سی این جی بکے گی، آہ...... گاڑیوں کا شور، دھوئیں کے مرغولے، پیٹرولیم کی بو...... اب یہاں کوئی سہانی شام نہیں اترے گی، نہ اس شام میں کوئی کہانی بنے گی۔ نہ اس کہانی میں کوئی طارق اور شہلا ہوں گے، نہ آنسو نہ مسکراہٹیں، رنگینی نہ سنگینی، ملاپ نہ جدائی، بس پیٹرول کی بو اور سی این جی کی پھنکار۔''

عدنان گم صم ہوگیا۔ اس نے ذرا حیرانی اور تاسف سے دائیں بائیں دیکھا۔ ماحول نے میرے بیان کی تصدیق کی۔ ایک عجیب سی ویرانی نے اس تفریح گاہ کو گھیرا ہوا تھا۔ جیسے سفر کی شام کوئی مسافر اپنے گھر میں اداس بیٹھا ہو، یا کوئی بیمار آخری ہچکی لینے سے پہلے لیٹا ہو، یا پھر کوئی خشک پتا ٹہنی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا ہو۔

میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ آغاز اور انجام میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ پینتیس چھتیس سال پہلے ایک دن وینس کا آغاز ہوا ہوگا۔ کسی ایسی ہی شام میں اس کا کونا کونا مہکا ہوگا۔ رنگین آنچلوں کی بہار آئی ہوگی۔ جلتی بجھتی روشنیوں نے اسے دلہا سا بنا رکھا ہوگا...... اور آج اختتام کی شام تھی، ایک شکستہ در و دیوار کی عمارت میں ایک مردہ سی فلم دکھائی جا رہی تھی اور اداسیاں گروہ در گروہ یہاں کے کونوں کھدروں میں بسیرا کیے ہوئے تھیں۔

عدنان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے تو بالکل پتا نہیں تھا یار، بس اتنا سنا تھا کہ یہ سنیما شاید گرا دیا جائے گا۔ کیا...... واقعی آج یہاں آخری شو دکھایا جا رہا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بھی صورتِ حال کی یاسیت میں ڈوب سا گیا۔ کچھ دیر بعد چونک کر بولا۔ ''یہاں آکر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ ہم اکٹھے آئے ہیں لیکن فلم میں اکیلا دیکھوں گا؟''

''یار! اب تو تمہیں وضاحت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ آج میرا دوست مجھ سے بچھڑ رہا ہے۔ یہ آخری گھڑیاں ہیں، مجھے تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گزار لینے دو۔''

عدنان نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ میری کیفیت سمجھ رہا تھا۔

❀ ❀ ❀

آس مر کر بھی نہیں مرتی۔ کیوں نہیں مرتی؟ مجھے پتا تھا وہ جو پچھلے گیارہ بارہ برس میں نہیں آئی ہے، اب بھی نہیں آئے گی۔ اس نے اب نہیں آنا تھا، لیکن پھر بھی میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا۔ آج آخری شو تھا...... آج کے بعد کوئی امید نہیں تھی اور اب تو سات بجنے والے تھے۔ وہ سات کے بعد کبھی نہیں آتی تھی۔

اور پھر سات بج گئے۔ میں اس آخری امید کو بھی دفنا کر اٹھ کھڑا ہوا...... آج بارہ سال بعد مجھے اپنے دوسرے دوست کو بھی الوداع کہنا تھا۔ عدنان اپنی مرضی سے اسٹال

کلاس کی بکنگ کی طرف چلا گیا۔ میں گیلری کی بکنگ کی طرف آیا۔ میں نے اپنا ہاتھ آخری بار ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں داخل کیا، ہاتھ کو اندر کی خوشگوار ٹھنڈک نے بوسا دیا۔

''دو ٹکٹ۔'' میں نے کہا۔

چپ چاپ بیٹھے بکنگ کلرک نے پیسے لے کر دو ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں آخری بار گیلری کی سیڑھیاں چڑھا، آخری بار اپنا ٹکٹ کٹوایا اور اپنے جانے پہچانے ہال میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے تصور کو تیرہ چودہ برس پیچھے لے گیا تھا۔ طویل چادر میں لپٹی ہوئی شہلا میرے ساتھ تھی۔ ہمارے قدم زمین کے بجائے آسمان پر پڑ رہے تھے۔ گیلری میں بس آٹھ دس افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے سب سے اوپر والی رو پر نگاہ دوڑائی۔ ہم دونوں کی مطلوبہ نشستیں خالی تھیں۔ دائیں کونے والی آخری دو نشستیں، میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کنارے والی نشست شہلا کے لیے خالی چھوڑ دی۔ سارے بھولے بسرے منظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ ہال کی مخصوص ٹھنڈی ٹھنڈی باس سانسوں میں سرایت کرنے لگی۔ میں نے نشست کے لمس کو محسوس کیا۔ فرش کی ہموار سطح کو، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی مانوس آوازوں کو۔ ہال کے اندر پھیری لگانے والوں کی صداؤں کو اور پھر اسکرین کے سرسراتے ہوئے پردے کو۔ یہ سب کچھ آخری بار تھا...... اور میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنی حیات میں جذب کر لینا چاہتا تھا۔

''ٹھنڈی بوتل صاحب۔'' پھیری والے نے کہا۔

''دو۔ ایک کوک ایک لیمن۔'' میں نے کہا۔

اس نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے لیمن شہلا کی نشست کی طرف رکھ دی۔ سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن نہیں...... سگریٹ ممنوع تھا اور شہلا کی ''موجودگی'' میں تو بالکل نہیں۔ میں نشست پر نیچے کو کھسکا اور میرا سر بے ساختہ تھوڑا سا بائیں طرف جھک گیا۔ یہاں شہلا کا شانہ ہوا کرتا تھا۔ آج وہ نہیں تھا۔ مگر تصور تو تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی لیکن فلم ہم کم ہی دیکھا کرتے تھے۔ آج بھی مجھے فلم نہیں دیکھنا تھی۔ مجھے تو صرف وینس کو الوداع کہنا تھا۔

ایک فلم اسکرین پر چلتی رہی اور ایک میرے ذہن میں۔

انٹرول کے وقت میں باہر نکلا۔ عدنان کہیں نظر نہیں آیا اور اسے آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واپس جا چکا ہے۔ شاید گھر میں بیٹھ کر کوئی نئی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ میں گنڈیری والے کے پاس آیا۔ چند ٹھنڈی گنڈیریاں لیں، پھر خوامخواہ ہی سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ ٹک شاپ والے کے پاس نان ٹھنڈے اور شامی خستہ حال تھے۔ پھر بھی میں نے انہیں چکھا۔ ہاں مجھے الوداع کہنا تھا، وینس سمیت سب کو الوداع کہنا تھا۔ تب میں دہی بڑے والے چاچے رفیق کے پاس آیا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں جانتا تھا اس کے دہی بڑوں پر ویرانی کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ پھر بھی میں نے دہی بڑے کھائے اور اسے زبردستی پیسے بھی دیے۔

''اب کہاں ملاقات ہو گی؟'' میں نے چاچے رفیق سے پوچھا۔

''ابھی کچھ پتا نہیں جی۔ شاید اب یہ کام ہی چھوڑ دوں۔ اب اس میں کچھ رہا ہی نہیں۔ اب تو گھر گھر میں سنیما ہے جی۔'' اس نے صافے سے اپنے ہاتھ صاف کر لیے اور برتن ڈھک دیے مجھے یوں لگا جیسے سنیما کے پردے سے پہلے اس نے اپنا پردہ گرا دیا ہے۔

انٹرول ختم ہو گیا تھا۔ گھنٹی بج گئی تھی۔ میں ہال میں واپس آ بیٹھا۔ ایک بار پھر تصورات میں ڈوبنے ابھرنے اور پھر ڈوبنے لگا۔ اب آخری شو آخری مرحلوں میں تھا۔ میرا دوست اپنا کام ختم کر کے سونے کے لیے جا رہا تھا، ایک نہ ختم ہونے والی نیند...... ایسی نیند جو عدم وجود کا دوسرا نام تھی۔

اور پھر شو ختم ہو گیا۔ پردہ آہستہ آہستہ سرکا اور اسکرین نے ہمیشہ کے لیے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔ دس پندرہ دیگر تماشائیوں کے ساتھ میں بھی سر جھکائے ہوئے باہر نکلا۔ قدم تو اٹھ رہے تھے مگر میں خود آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ مجھے جیسے خود کو گھسیٹ گھسیٹ کر اس چھت کے نیچے سے نکالنا پڑ رہا تھا۔ میں سیڑھیوں کی ...... ریلنگ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا ہوا نیچے اترا۔ در و دیوار کو دیکھا۔ احاطے میں کچھ ملازم فلموں کے اشتہاری بورڈ اکھاڑ رہے تھے۔ میں اس منظر سے نگاہیں چراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اب سنیما کی بیرونی دیوار میرے سامنے تھی۔ میں چلتا گیا اور اپنا ہاتھ بھی اس پر چلاتا گیا۔ یہ سنگ و خشت کی بے جان دیوار تھی لیکن میرے لیے نہیں، میرے لیے یہ زندہ تھی...... پورا وینس زندہ تھا، اور بے حد...... بے حد بھاری دل کے ساتھ مجھ سے جدا ہو رہا تھا۔ دیوار ختم ہو گئی، لمس ختم ہو گیا۔ لمس اسی طرح ختم ہوتے ہیں۔ میں آگے نکل گیا۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی...... ہاں، مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

''الوداع دوست!'' میں نے بس اتنا ہی کہا۔

مستحق

کاشف زبیر

اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ مجرم کے پیروں میں قدرت نے سفر کے بہت سارے پھیر رکھ چھوڑے ہیں... اور شاید اسی سبب وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹک پاتا۔ بہ ظاہر آگے بڑھنے کی بے چینی... درحقیقت اسے اپنے انجام کی جانب دھکیل رہی ہوتی ہے۔ وہ بھی جسے اپنی جائے پناہ تصور کر رہا تھا دراصل اس کی انجام گاہ ثابت ہوئی... کہ قدرت حق داروں کا حق اسی طرح ادا کرتی ہے۔

عقلمند دشمن اور ایک زورآور مجرم کے درمیان پراسرار کھیل

میں نے گھر کے سامنے پورچ میں گاڑی روکی اور لیٹر بکس سے اپنی ڈاک نکالتا ہوا اندر آ گیا۔ رات ہو چکی تھی اس لیے لائٹ جلاتے ہوئے میں لاؤنج میں آیا اور ڈاک کے لفافے صوفے کے سامنے رکھی میز پر ڈال کر پہلے اپنے لیے مگ میں کافی نکالی۔ باہر شدت کی سردی تھی۔ وسطی یورپ میں موسم سرما ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آسٹریا وسطی یورپ میں ہے۔ باہر سڑکوں کے کنارے فٹوں کے حساب سے برف پڑی تھی اور مزید برف باری کی پیش گوئی تھی۔

صوفے پر نیم دراز ہو کر میں نے ڈاک دیکھنا شروع کی اور پھر ایک لفافے نے مجھے سیدھا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ خط جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے آیا تھا۔ میں نے لفافہ کھولا اندر سے نکلنے والا خط جرمن زبان میں تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا' آسٹریا میں بھی جرمن بولی جاتی ہے۔ درحقیقت میرا تعلق بھی جرمن نسل سے تھا اور ہٹلر اصل میں آسٹریا میں ہی پیدا ہوا تھا۔

میں اپنا تعارف کرا دوں میرا نام زیوف طلر ہے اور ویانا کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں۔ اکیلا رہتا ہوں۔ بیوی بیس سال پہلے مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ ہماری اکلوتی بیٹی بھی عدالت کی طرف سے اسے مل گئی تھی اور پھر وہ اسے لے کر جرمنی چلی گئی۔ اس نے مجھ سے ہر رابطہ توڑ لیا اور میں دوبارہ شرمین کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا۔ شرمین میری بیٹی کا نام ہے۔ جب کارلا مجھ سے الگ ہوئی تو وہ صرف دو سال کی تھی۔ عدالتی حکم کے باوجود کارلا نے شرمین کو دوبارہ مجھ سے ملنے نہیں دیا بلکہ وہ اسے لے کر غائب ہو گئی۔ میں چاہتا تو عدالتی احکام کا سہارا لے کر اسے پولیس کی مدد سے تلاش کروا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد میں نے شادی نہیں کی اور آج پچاس سال کی عمر میں بھی اکیلا ہوں۔ یونیورسٹی میں بایو کیمسٹری کا مضمون پڑھاتا ہوں۔ میں نے اس مضمون میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ میرے کئی تحقیقی مقالے بین الاقوامی پرچوں میں شائع ہو چکے تھے۔

میں نے لفافے سے نکلنے والا خط پڑھا۔ کئی بار پڑھا اور حتیٰ کہ یہ مجھے حفظ ہو گیا تو میں نے اسے لفافے سمیت برقی آتش دان میں ڈال دیا۔ وہ لمحوں میں جل کر راکھ ہو گیا۔ میں نے اپنے لیے دوبارہ کافی نکالی اور صوفے پر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ فرینکفرٹ سے آنے والے اس لفافے میں میرے لیے نہایت اہم اطلاع تھی اور مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ دس منٹ بعد میں غسل کر رہا تھا۔ نہا کر میں نے کھانا کھایا اور ایک گھنٹے بعد میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ میں نے صبح چھ بجے کا الارم لگایا تھا۔ جو ٹھیک وقت پر شور کرنے لگا۔ مجھے رات زیادہ اچھی نیند نہیں آئی تھی۔ عام طور سے میں گہری نیند سوتا ہوں اور اپنے وقت پر ہی بیدار ہوتا ہوں۔ سر میں ہلکا سا بوجھل پن تھا جو گرم پانی سے نہا کر دور ہو گیا۔ اپنے لیے سیاہ کافی تیار کر کے میں نے کمپیوٹر آن کیا اور یونیورسٹی ای میل کر کے اطلاع دی کہ میں ایک سال کی چھٹی پر جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح چھٹی نہیں ملتی لیکن میں نے کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ مجھے یونیورسٹی حکام کے ردِعمل کی پروا تھی۔

گھر کی بجلی اور گیس کے کنکشن بند کیے۔ ہر اس چیز جس کو گرد سے بچانا تھا، اس پر پتلے سے پلاسٹک کی چادر چڑھا دی۔ تمام خراب ہو جانے والی چیزیں ایک بڑے شاپر میں ڈال کر باہر ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔ پانی کا کنکشن بند کیا اور پھر تمام ٹنکوں اور فلیش ٹینکس سے پانی خارج کیا۔ سیوریج سے آنے والے تمام سوراخوں پر اچھی طرح حشرات کش پاؤڈر چھڑکا۔ فریج کو خالی کر دیا۔ تمام کھڑکیوں اور دروازے کے نیچے موجود خلا پر پلاسٹک ٹیپ چپکا دیا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے اچھی طرح بند کیں اور داخلی دروازے کو لاک کر کے باہر آ گیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا بیگ لیا تھا جس میں میرا ایک سوٹ اور نائٹ سوٹ تھا۔ میری تمام دستاویزات مع کریڈٹ کارڈز اور اے ٹی ایم کارڈ کے میرے پاس موجود تھیں۔

میرے پاس مرسڈیز کا چند سال پرانا ماڈل تھا مگر مکمل طور پر آٹو میٹک یہ کار طویل فاصلوں کے لیے نہایت موزوں تھی۔ میں ویانا سے نکلا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ہائی وے ٹرک ان میں لنچ کیا۔ کھانا سادہ تھا لیکن قیمت بہت زیادہ تھی۔ شام چھ بجے جب تاریکی چھا چکی تھی، میں آسٹریا اور جرمنی کی سرحد تک پہنچ گیا تھا۔ میرا پاسپورٹ دیکھ کر حکام نے مجھے بہ آسانی جانے دیا۔ یورپی یونین کے ممبر ممالک کے شہریوں کو سرحد پار جانے کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں صرف پاسپورٹ یا اپنی شناختی دستاویزات دکھا دینا بھی کافی تھا۔ میں نے اپنی دوسری دستاویز کے بجائے پاسپورٹ دکھانا زیادہ مناسب سمجھا' کیونکہ دوسری دستاویزات سے پتا چل جاتا کہ میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں اور ممکن ہے یہ بات سرحدی چوکی کے ریکارڈ میں شامل کر لی جاتی۔ جبکہ پاسپورٹ کا صرف نمبر درج کیا جاتا ہے اور سال میں دو تین بار اس کی جانچ کی جاتی ہے کہ ملک میں آنے والا فلاں پاسپورٹ کا حامل شخص واپس گیا یا نہیں۔ اگر وہ واپس نہیں جاتا تو اس کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے لیکن واپس نہ جانا کوئی جرم بھی نہیں' ایسا صرف احتیاط کے طور پر کیا جاتا ہے۔

جرمن سرحدی حکام نے مجھے جانے کی اجازت دیدی۔ میں جس جگہ سے جرمنی میں داخل ہوا وہاں کوئی خاص شہر پاس نہیں تھا۔ معمولی سے قصبات تھے یا اِکا دُکا فارم ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ راستے میں آنے والا پہلا بڑا شہر میونخ تھا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے نازی انقلاب نے جنم لیا اور بالآخر اس نے پورے جرمنی کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اگرچہ

میرا میونخ میں رکنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اچانک شروع ہونے والی برف باری نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس موسم میں رات کے وقت ڈرائیو کرنے کے بجائے کہیں رک جاؤں اور صبح اپنے سفر کا آغاز کروں۔ اس کا آسان حل یہ تھا کہ میں کسی ہائی وے موٹل میں رک جاؤں لیکن اس میں مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنا پاسپورٹ دکھانا پڑتا اور اس... موٹل کے رجسٹر میں انٹری ہوتی۔ یہ چیز بعد میں میرے لیے مسئلہ کر سکتی تھی اس لیے میں نے ہائی وے موٹل کے بجائے کار کا رخ میونخ شہر کی طرف موڑ دیا۔ شہر میں مجھے راستے تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ کار میں ڈیجیٹل میپ موجود تھا اور ایک اسکرین پر شہر کا تفصیلی نقشہ بھی موجود تھا۔

ایک خاموش ہوٹل میں ڈنر کر کے میں نے ایک نزدیکی بار کا رخ کیا۔ بارٹینڈر سے وہسکی کا کہہ کر میں نے بار کا جائزہ لیا اور فوراً ہی مجھے مطلوبہ فرد نظر آ گیا۔ میں نے وہسکی کا گلاس خالی کیا اور پانچ یورو کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بارٹینڈر نے مجھے باقی رقم کی ادائیگی کی اور میں نے کونے میں موجود اس لڑکی نما عورت کو سر کی خفیف جنبش سے اشارہ کیا۔ وہ پہلے ہی میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اشارہ پاتے ہی وہ خود بھی باہر کی طرف چل پڑی۔ ہم دونوں ظاہر کر رہے تھے کہ ہم الگ الگ جا رہے ہیں۔ باہر آتے ہی وہ میری طرف آئی۔ میں نے بلا تمہید پوچھا۔ ''ایک رات کا کیا لیتی ہو؟''

اس نے بھی بلا تمہید جواب دیا۔ ''اگر اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو سو یورو اور میرے ساتھ چلو گے تو پچاس یورو مزید ادا کرنے ہوں گے۔''

وہ ایک ڈھلکتے جسم کی اور جوانی میں بوڑھی ہو جانے والی عورت تھی جو اپنے حلیے اور انداز سے لڑکی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کا ایک رات کا معاوضہ اتنا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے اس معاوضے میں وہسکی کی ایک بوتل بھی شامل ہو گی لیکن مجھ سے کافی یا ناشتے کی توقع مت رکھنا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''تمہارے پاس گاڑی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ہم پیدل چلیں گے۔''

اس نے شانے اچکائے۔ ''تب بہتر ہے ٹیکسی کر لو اس موسم میں پیدل چلے تو ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی ہائپوتھرمیا ہو جائے گا۔''

اس نے بہت کم لباس پہنا تھا اور اپنے بارے میں اس کا اندیشہ درست تھا۔ میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اس کی وجہ سے مجبوراً ٹیکسی کی۔ پانچ منٹ میں ہم اس عمارت کے سامنے تھے جہاں وہ رہتی تھی۔ یہ تھرڈ کلاس اور گندی سی جگہ تھی۔ اس کے پاس صرف ایک کمرا تھا جس میں ایک ڈبل بیڈ تھا اور فرش پر گھسا پٹا قالین بچھا ہوا تھا غنیمت یہ تھا کہ وہاں ہیٹر تھا اور میں آرام سے قالین پر بھی سو سکتا تھا۔ جب میں نے ہلکا کمبل اور تکیہ لے کر فرش پر ڈالا تو عورت نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تم بستر پر سو سکتی ہو۔''

''لیکن تم...؟'' اس نے کہنا چاہا۔

''میں صرف رات گزارنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اگر تمہیں اعتراض ہے تو میری رقم واپس کر دو میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔''

وہ بے وقوف نہیں تھی۔ اسے ایک ایسا گاہک ملا تھا جو صرف سونا چاہتا تھا اور اس کی وہسکی کی بوتل بھی بچا رہا تھا جبکہ وہ اس کی رات کا پورا معاوضہ بھی دے رہا تھا۔ اس نے فوراً سر ہلا دیا۔ ''مرضی تمہاری... اگر تمہارے ساتھ کوئی جسمانی یا نفسیاتی...''

میں نے اس کی بکواس سننے کے بجائے سونا بہتر سمجھا۔ اس کا معاوضہ اندر آتے ہی ادا کر دیا تھا اور اب میری جیب میں صرف تیس یورو تھے۔ میرے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں کار میں تھیں اور اس کا ریموٹ میں نے کار میں ہی رکھ دیا تھا، وہ میری آواز سے بھی کام کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا اس قسم کی سستی طوائفیں اپنے گاہکوں کو لوٹ لیتی تھیں اور اگر گاہک لٹنے کے بعد شور مچاتا تو وہ غنڈے بدمعاش فوراً آجاتے جو اصل میں طوائفوں کی آمدنی میں حصے دار ہوتے تھے۔ وہ شور کرنے والے کا دماغ درست کر دیتے تھے اور وہ چپ ہو کر نکل جانے میں عافیت سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رکھی تھی سوائے تیس یورو کے۔ میں صبح اٹھا تو توقع کے عین مطابق میرے کوٹ کی جیب سے تیس یورو غائب تھے۔ میں نے جیب ٹٹولتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس میں کچھ رقم تھی۔''

وہ بے پروائی سے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ ''اگر تھی تب بھی مجھے نہیں معلوم... میرا خیال ہے اب تمہیں رخصت ہو جانا چاہیے۔''

میرا تیس یورو کے پیچھے کوئی تنازع کھڑا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس سے اتفاق کیا اور کوٹ

پہن کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ عقب سے اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے جو بکواس کی اسے بھی میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ میری کار اس ریستوران کے سامنے کھڑی تھی جہاں میں نے رات ڈنر کیا تھا۔ ناشتا بھی اسی ہوٹل سے کیا اور وہاں واش روم میں ضروریات سے فارغ ہونے کے ساتھ میں نے منہ ہاتھ بھی دھو لیا۔ ناشتا کرتے ہی میں روانہ ہو گیا تھا اور آدھے گھنٹے بعد فرینکفرٹ جانے والی ہائی وے پر سفر کر رہا تھا۔ میونخ سے فرینکفرٹ کوئی پونے تین سو کلو میٹرز کے فاصلے پر ہے۔

دوپہر ایک بجے میں فرینکفرٹ میں تھا۔ یہاں بھی برف پڑ رہی تھی لیکن شہر کے اندر کی صورت حال کسی قدر بہتر تھی۔ سب سے پہلے میں نے لنچ کیا۔ سڑکوں اور گلیوں سے برف ہٹانے کا کام جاری تھا اور آمد و رفت کے راستے کھلے تھے۔ لنچ کے بعد میں دوبارہ روانہ ہوا اور گلیوں میں گاڑی گھمانے لگا۔ بالآخر ایک جگہ اپنے کام کے لیے موزوں لگی۔ وہاں گلی میں کھڑی گاڑیوں پر برف جمی تھی یعنی ان کو کئی دن سے وہاں سے ہٹایا نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف روکی اور ایک چھوٹا سا ٹول بکس لیتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ میں نے ایک تقریباً نئی گاڑی کا انتخاب کیا۔ اس کی نمبر پلیٹیں بھی نئی جیسی تھیں۔ صاف ستھری اور چمکتی دمکتی۔ اسکرو دیکھ کر میں نے ٹول بکس سے اسکرو ڈرائیور نکالا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں نے پہلی نمبر پلیٹ اتار لی۔ گلی ویران تھی اور اوپر مکانوں کی کھڑکیاں بند تھیں، ان کے شیشوں پر کہر جما ہوا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ کوئی میری کارروائی نہیں دیکھ رہا ہوگا۔

پانچ منٹ بعد میں دونوں نمبر پلیٹیں لیے واپس آیا۔ نمبر پلیٹس کار کے فٹ میٹ کے نیچے چھپا دیں اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کار کے ڈیجیٹل نقشے کی مدد سے میں نے ایک ایسی کار پارکنگ کا پتا چلایا جس میں طویل مدت کے لیے گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں اور وہ اس کی فیس لیتے تھے۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے میں نے ایک پارک کے کنارے جہاں دور تک کوئی نہیں تھا اپنی کار کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں اور اس میں مقامی پلیٹس لگا دیں۔ اب یہ مقامی کار نظر آ رہی تھی اور کوئی مجھ سے میری شناختی دستاویزات طلب نہ کرتا۔ کار پارکنگ کئی منزلہ تھی۔ میں نے ایک سال کی پارکنگ کا ٹکٹ لیا، اسے اسکرین پر اندر لگایا۔ کار کو سب سے اوپر والے فلور پر لے آیا اور ایک کونے میں کھڑا کر دیا جہاں کار کو چھیڑے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے گاڑی کے کمپیوٹرائزڈ سسٹم میں سیٹنگ کی۔ یہ خودکار سسٹم ہر دوسرے دن دس منٹ کے لیے گاڑی کا انجن چلا دیتا اور اس کی بیٹری چارج ہوتی رہتی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے گیس ٹینک فل کرا لیا تھا اور مجھے امید تھی کہ یہ سال بھر نہیں تو چھ سات مہینے ضرور چل جائے گا۔ اپنا پاسپورٹ اور دستاویزات میں نے اگلی نشست کے نیچے لاک ہو جانے والے خانے میں رکھ دیے، یہ خانہ نمبروں سے لاک ہوتا تھا۔ پھر اپنا بیگ لے کر میں نیچے اتر آیا۔ اس میں میرے دو جوڑے تھے اور میرے پاس تقریباً پانچ سو یورو کی رقم تھی۔ گاڑی میں دو ہزار یورو کی رقم تھی اگر مجھے ضرورت ہوتی تو میں دوبارہ نکال سکتا تھا۔ میرے پاس اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ تھے لیکن میں انہیں استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ یہ ریکارڈز پر آ جاتے۔

سب سے پہلے ایک باربر شاپ میں جا کر میں نے سر پر مشین پھروائی اور چہرے کی ایک دن بڑھ جانے والی ڈاڑھی کو فرنچ کی صورت دی۔ ان سارے کاموں سے نمٹتے ہوئے رات ہو گئی تھی۔ رات گزارنے کے لیے میں نے پھر وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ایک بھدی اور بوڑھی ہو جانے والی کال گرل کا انتخاب کیا جس نے آسانی سے مجھے اپنے بستر پر سو جانے کی اجازت دی اور خود صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ یہ رات میں نے سکون سے گزاری۔ وہ اچھی عورت تھی صبح اس نے مجھے نہانے دھونے کے موقعے کے ساتھ ناشتا بھی دیا تھا۔ میں نے اس سے آنے والی رات کی بات بھی کر لی اور اسے کچھ رقم پیشگی دے دی۔ وہ خوش تھی اور میں بھی خوش تھا کہ مجھے رہائش کے سلسلے میں بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑے گی۔ جرمن میری مادری زبان تھی اور میں اسے جرمن لہجے میں بولنے پر قادر تھا۔ آسٹریا میں لہجہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔

میں دس بجے اس کے گھر سے نکلا اور سارا دن سردی میں فرینکفرٹ کے مخصوص علاقوں میں گھومتا رہا۔ مجھے ایک خاص کام کرنا تھا اور یہ کام کیے بغیر میرا اگلا قدم بیکار تھا۔ اس دن مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا دن بھی اسی چکر میں گزر گیا۔ اب میرے پاس رقم کم رہ گئی تھی اور میں فکرمند تھا کہ رقم کم پڑ گئی تو مجھے بینک سے نکلوانا پڑے گی۔ تیسرے دن میں پھر نکلا اور خلافِ توقع اس روز کامیابی مل گئی۔ وہ دونوں لڑکے خود میرے پاس آئے تھے اور چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے جارحانہ انداز میں پوچھا کہ میں بار بار اس علاقے میں کیوں نظر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا۔ ”مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو بڑا کام کر سکے۔“

وہ مجھے فرانز نامی ایک بڑے بدمعاش کے پاس لے گئے اور میں نے اسے بتایا کہ مجھے کیا کام کرانا ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ کام ہو جائے گا بشرطیکہ میں اسے ایک ہزار یورو ادا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ پانچ سو یورو میں پہلے ادا کروں گا اور پانچ سو کام ہو جانے کے بعد۔ اس نے اعتراض کیا کہ میں بعد میں کیسے ادا کروں گا لیکن میں نے اسے مطمئن کر دیا ویسے بھی وہ بدمعاش ہوتے ہوئے بھی میرے پُراعتماد انداز سے دب گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یہ میری حفاظتی تدبیر ہے۔ جو شخص مجھے مطلوبہ چیز لا دے گا میں اسے بتاؤں گا کہ باقی کے پانچ سو یورو کہاں سے مل سکتے ہیں۔“

وہ غور کر کے بولا۔ ”مجھے منظور ہے لیکن پانچ سو ابھی...“

”نہیں، یہ میں تمہیں کل دوں گا۔ ساتھ ہی وہ انتظام بھی بتا دوں گا جس سے تمہیں باقی رقم مل سکے۔“

اس کے پاس سے نکلنے کے بعد میں مطمئن تھا۔ تین دن میں میری فرنچ باقاعدہ نمایاں ہو گئی تھی۔ یہ فرنچ مونچھوں سمیت تھی اس لیے میری شخصیت منفی تاثر دے رہی تھی۔ میں تین دن سے برش نہیں کر رہا تھا اور سگار پینے کے بجائے تمباکو چبا کر گزارا کر رہا تھا اس لیے دانت خوب میلے نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران میں جان بوجھ کر تیوریاں چڑھا کر اور آنکھیں زیادہ کھول کر رکھنے کی مشق کرتا رہا تھا اس سے میرے چہرے کا تاثر بالکل مختلف نظر آنے لگا تھا۔

اگلے دن پرانے کپڑوں کی دکان سے ایک خستہ حال ترین سوٹ لیا جو شاید کوئی بھکاری بھی لینا پسند نہ کرتا۔ اسے لے کر میں پارکنگ بلڈنگ میں آیا۔ آواز سے کار کو ان لاک کیا۔ اندر گھس کر میں نے ہزار یورو نکالے۔ سوٹ اتار کر پرانا لباس پہنا اور اپنے کپڑے سلیقے سے طے کر کے بیگ میں رکھ دیے اور بیگ ڈکی میں رکھ دیا۔

میں نے ایک ایسی کوریئر کمپنی کا رخ کیا جو امانتیں بھی رکھتی تھی اور مخصوص طریقۂ کار کے تحت انہیں کسی کے سپرد کر سکتی تھی۔ میں نے پانچ سو یورو ایک لفافے میں بند کر کے لفافہ ان کے سپرد کیا اور بتایا کہ کوئی اس پارسل کا نمبر بتائے تو اس سے کوڈ پوچھا جائے اور جواب میں وہ ایک مخصوص نمبر بتائے تو لفافہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ یہاں سے میں فرانز کے پاس پہنچا، اسے پانچ سو یورو نقد دیے۔ پھر میں نے اسے کوریئر کمپنی کا بتایا۔ ”ایک مہینے بعد کوئی جا کر وہاں پارسل نمبر بتائے اور پھر مخصوص کوڈ بتائے گا تو اسے ایک لفافہ دے دیا جائے گا جس میں پانچ سو یورو ہوں گے۔“

فرانز نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مسٹر کارل، تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

میں نے اسے اپنا نام کارل بتایا تھا۔ اس کا سوال نظر انداز کر کے میں نے اسے ایک چھوٹا سا چمکیلا سلینڈر دیا، یہ مشکل سے دو انچ لمبا اور نصف انچ گول تھا اور بہ ظاہر ہر طرف سے بند تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اسے کس طرح کھولتے ہیں۔ ”پارسل نمبر یاد رکھنا۔ کوڈ میں اس شخص کو بتاؤں گا جو مجھے یہ چیز لا کر دے گا۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے اور اسے کھولنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ یہ بند نہیں ہوگا اور بیکار ہو جائے گا میرے کام کا بھی نہیں رہے گا اور ظاہر ہے تمہیں بھی باقی رقم نہیں ملے گی۔“

میں وہاں سے نکل آیا۔ میرے پاس کچھ رقم رہ گئی تھی وہ بھی میں نے ایک فقیر کے سپرد کر دی۔ کچھ دیر بعد میں ایک پوش علاقے میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ یہاں سردی کے باوجود خاصی گہما گہمی تھی، لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو دیکھا جو ایک چرمی بیگ لے کر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے پاس آیا میں نے جھپٹ کر اس کا چرمی بیگ پکڑ لیا اور چھیننے کے لیے زور لگانے لگا لیکن یہ زور اتنا نہیں تھا کہ بیگ آسانی سے میرے ہاتھ میں آ جاتا پھر بوڑھا بھی کمزور نہیں تھا اس نے بیگ پر گرفت مضبوط کی اور چلا چلا کر پولیس کو بلانے لگا۔ دو تین منٹ کی کشمکش کے بعد میں نے اس سے بیگ چھین لیا۔ اس دوران میں ہمارے چاروں طرف اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ لیکن کسی نے مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بیگ چھینتے ہی میں نے بھاگنے کی کوشش کی اور بہ ظاہر بدحواسی میں کھمبے سے جا ٹکرایا۔ ٹکر سچ مچ شدید تھی میرا منہ اور گھٹنے متاثر ہوئے تھے اور میں وہیں گر گیا۔ اس پر چند نوجوانوں نے حوصلہ کر کے مجھے قابو کر لیا۔ میرا ویسے بھی بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بوڑھے آدمی نے اپنا بیگ دوبارہ مجھ سے چھین لیا تھا۔

دس منٹ سے بھی پہلے پولیس آ گئی اور دو پولیس والوں نے میرے خلاف فردِ جرم سن کر مجھے ہتھکڑیاں لگا کر پولیس کار کے پیچھے ٹھونس دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پولیس اسٹیشن پر تھا جہاں مجھے ایک سیل میں بند کر دیا گیا۔ میں سلاخوں کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا، بوڑھا اپنا بیگ سینے سے لگائے میرے بارے میں رپورٹ درج کرا رہا تھا۔ میرے پاس سے

پولیس کو کوئی ہتھیار نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر وہ مسلح ڈکیتی کی رپورٹ درج کرتے۔ انہوں نے رہزنی کی رپورٹ درج کی تھی۔ بڑے میاں مصر تھے کہ ان پر حملہ بھی ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی خراشیں دکھا رہے تھے جو بیگ چھیننے کی کوشش کے دوران آئی تھیں۔ مگر پولیس والے بیوقوف نہیں تھے۔ بوڑھے کے جانے کے بعد ایک پولیس آفیسر نے مجھے پوچھ گچھ کے مخصوص کمرے میں طلب کیا۔ وہاں میرے فنگر پرنٹ لیے گئے اور پھر تصویریں لیں۔ پھر پولیس افسر نے سوالات شروع کیے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کارل۔''

''تمہارے پاس سے کوئی شناختی دستاویز نہیں نکلی ہے۔''

''میرے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔''

''ڈرائیونگ لائسنس؟''

''میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے اور مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی ہے۔''

''کوئی شناختی کارڈ... جاب کارڈ؟''

''کچھ نہیں ہے، میں نے کبھی کوئی جاب نہیں کی۔''

''رہائش؟''

''میں فٹ پاتھ پر رہتا ہوں میری کوئی رہائش نہیں ہے۔''

''گزر اوقات کیسے ہوتی ہے؟''

''بس ہو جاتی ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔

آدھے گھنٹے کے اس انٹرویو میں، میں نے خود کو ہر طرح سے لاوارث اور بے گھر جرائم پیشہ شخص ثابت کیا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی زبان اور لہجہ نچلے طبقے کے لوگوں کا سا رکھا تھا اور چہرے کے تاثرات سخت اور منفی رکھے تھے۔ البتہ میں نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ ''مجھے رقم کی ضرورت تھی اس لیے اس بڈھے سے بیگ چھیننے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے پکڑا گیا۔''

پولیس افسر خوش ہو گیا اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے اعترافِ جرم کر لوں گا۔ اس نے فوراً میرا اعترافی بیان ریکارڈ کرایا اور پھر اسے پرنٹ کروا کر اس پر میرے دستخط بھی لے لیے۔ اس خوشی میں اس نے یہ بات بھی نظر انداز کر دی کہ اگر میں جرائم پیشہ تھا تو پولیس کے پاس میرا ریکارڈ پہلے سے کیوں نہیں تھا۔ شاید اس نے فرض کر لیا ہوگا کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو بہت احتیاط سے جرم کرتے ہیں اور مشکل سے پولیس کی گرفت میں آتے ہیں یا پھر قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی ہے بالآخر میں پہلی بار پکڑا گیا تھا۔ اگلے دن مجھے ایک عدالت میں پیش کیا گیا اور وہاں میرے کیس کی سماعت شروع ہوئی۔ میری طرف سے اعترافی بیان نے پولیس اور عدالت کے لیے سہولت پیدا کر دی تھی۔ میرے نوجوان سرکاری وکیل کی کوشش کے باوجود جیوری نے مجھے رہزنی کا مرتکب قرار دیدیا۔

جج نے مجھے پانچ مہینے کی سزا دے کر فرینکفرٹ کی ڈسٹرکٹ جیل بھیجنے کا حکم دیا۔ اگر میں جیل میں اپنا چال چلن درست رکھتا تو مجھے تین مہینے بعد پیرول پر رہا کیا جا سکتا تھا۔ پولیس نے جو برائے نام تحقیقات کیں ان سے اسے یہ معلوم ہوا کہ میں بارہ سال کی عمر سے بے گھر تھا اور فٹ پاتھوں پر پل رہا تھا۔ جرمنی میں ایسے افراد کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے جن کے پاس کوئی گھر نہیں ہے اور وہ فٹ پاتھ یا پارکوں میں سوتے ہیں۔ میرا کوئی ریکارڈ نہیں تھا لیکن پولیس یا عدالت نے اس پر بھی توجہ نہیں دی ان کی اصل توجہ جرم اور مجرم پر تھی۔ مجھے سزا دے کر وہ اپنے فرض سے سبک دوش ہو گئے تھے۔ صرف دس دن کے اندر مجھے سزا ہو گئی تھی۔ گیارھویں دن پولیس حکام نے مجھے جیل حکام کے حوالے کر دیا۔

جیل میں پہنچتے ہی سب سے پہلے مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ تمام کپڑے اتار کر میری دوسری چیزوں کے ساتھ ایک ڈبے میں بند کر کے جیلر نے اسے سیل بند کر دیا۔ پھر مجھے ایک راہداری سے گزارا گیا جس میں ایکسرے کیمرا لگا تھا۔ اگر میں اپنے جسم میں بھی کچھ چھپا کر لے جاتا تو پتا چل جاتا۔ میں جس کمرے میں نکلا، وہاں چھت پر شاور لگے تھے۔ میرے اندر آتے ہی عقب میں دروازہ بند ہو گیا اور شاور سے بہت تیزی سے جراثیم کش دوا ملا پانی برسنے لگا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں پانی سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شکر ہے پانی گرم تھا ورنہ دس منٹ تک ٹھنڈا پانی برستا تو مجھے باہر جاتے ہی نمونیا ہو جاتا۔ دس منٹ بعد شاور بند ہو گیا اور کمرے کا اگلا دروازہ کھل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ یہاں گرم ہوا پھینکنے والا شاور تھا میں اس کے نیچے کھڑا ہوا تو ایک منٹ سے بھی پہلے میرا جسم بالکل خشک ہو گیا۔ اس دوران میں ایک گارڈ ایک بنڈل اٹھائے اندر آیا۔ اس نے بنڈل میز پر رکھ دیا اور میری طرف دیکھا۔

''یہ تمہارا سامان ہے۔''

سامان میں ایک لباس، ایک تولیا، ٹوتھ پیسٹ و برش

اور اسی طرح استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ میں نے لباس پہنا اور گارڈ کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں راہداری سے گزر رہا تھا تو قیدی اپنی اپنی کوٹھریوں سے جھانک کر مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے اور یہ سب ناقابلِ بیان الفاظ تھے لیکن جیل کے قیدیوں کی زبان یہی تھی۔ میں سنی ان سنی کر کے چلتا رہا۔ گارڈ مجھے ایک سیل تک لایا۔ اس نے چابی سے تالا کھولا اور جیسے ہی میں اندر گیا اس نے کھسکنے والا فولادی دروازہ بند کر کے اسے دوبارہ تالا لگا دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''جیل میں خوش آمدید۔''

جرمن جیلوں میں قیدیوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ عام طور سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی لیکن جو قیدی بدمعاشی کرتے ہیں ان سے جیل حکام اچھی طرح نمٹتے ہیں۔ مجھے جس سیل میں رکھا گیا تھا وہ ایک آدمی کے لیے تھی۔ اس کی چوڑائی پانچ فٹ اور لمبائی نو فٹ تھی۔ بیڈ دھات کا تھا جس پر چند انچ موٹا میٹریس بچھا تھا۔ ایک کمبل اور ایک تکیہ تھا۔ سیل کے آخری حصے میں ایک کموڈ اور ایک چھوٹا سا واش بیسن لگا تھا۔ اس کے اوپر دیوار میں فکس آئینہ تھا اور ایک چھوٹا سا ریک تھا جس میں ٹوتھ پیسٹ اور کنگھا رکھا جا سکتا تھا۔ سامان رکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے خانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خانے کا جائزہ لیا اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا اور بالآخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ میں نے مطمئن ہو کر اپنا سامان اس خانے میں رکھ دیا۔

میں صبح چھ بجے جیل آیا تھا، آٹھ بجے کوٹھریوں کے دروازے خودکار انداز میں کھل گئے۔ ان کا لاک دو طرح سے کھلتا تھا، ایک مینول یعنی چابی سے اور دوسرا الیکٹرانک طریقے سے کھلتا تھا۔ جب سب قیدیوں کو کھولنا ہوتا تھا تو لاک الیکٹرانک طریقے سے کھول دیے جاتے تھے۔ جیل شیڈول کے مطابق قیدیوں کو صبح آٹھ بجے کھول دیا جاتا تھا۔ وہ میس میں جا کر ناشتا کرتے۔ اس کے بعد انہیں سارا دن آزاد رکھا جاتا تھا۔ وہ باہر جا کر میدان میں کھیلتے یا لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا اخبار اور رسالے پڑھتے۔ اس کے علاوہ انڈور کھیلوں کی سہولت بھی تھی۔ جیسے ہی سارے قیدی باہر آئے ان کے سیل دوبارہ بند ہو گئے، اب کوئی اس وقت تک اپنے سیل میں نہیں جا سکتا تھا جب تک یہ دوبارہ نہ کھولے جاتے۔ دوبارہ یہ رات آٹھ بجے کھلتے تھے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد قیدیوں کو دوبارہ صبح آٹھ بجے تک کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے اندر جانے کے بعد گارڈز معائنہ کرتے کہ کوئی قیدی اپنے سیل سے غیر حاضر تو نہیں ہے۔

ناشتے کے بعد میں نے لائبریری کا رخ کیا۔ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جیل میں ایک بہترین لائبریری بھی تھی جس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی تھی لیکن انٹرنیٹ کی تمام سرگرمیاں جیل حکام کی طرف سے نوٹ کی جاتی تھیں کہ قیدی کہیں باہر کسی سے غلط مقصد کے تحت رابطہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ لائبریری میں تازہ ترین اخبارات آتے رہتے تھے۔ میں نے انٹرنیٹ پر آسٹریا کے اخبارات نکالے اور انہیں دیکھتا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری پُراسرار گمشدگی کا ذکر ہوگا لیکن کسی اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی میں نے سکون کا سانس لیا یعنی ابھی تک میری عدم موجودگی کو گمشدگی قرار نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں کبھی اس طرح بغیر اطلاع کے غائب نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں دوبارہ لائبریری آ گیا۔ یہاں زیادہ تر عمر رسیدہ اور شریف طبع قیدی تھے۔ اس لیے لائبریری میں امن و سکون تھا۔ میں فی الحال ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کر رہا تھا جہاں مجھے بدمعاش قیدیوں سے سابقہ پڑے، وہ عام طور سے نئے آنے والے قیدیوں کے ساتھ جارحانہ رویہ اپناتے تھے۔

مجھے کسی کا خوف نہیں تھا لیکن میں نمایاں نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لیے لائبریری یا ٹی لاؤنج سب سے بہترین جگہ تھی۔ سب سے خطرناک جگہ کھیل کا میدان تھا جہاں آئے دن جھگڑے ہوتے تھے اور گارڈز بھی صرف اس وقت دخل دیتے تھے جب معاملہ سنگین ہو جاتا ورنہ چھوٹے موٹے جھگڑوں میں دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔ انڈور کھیلوں کی جگہ پر بھی بدمعاشوں کا قبضہ تھا اور وہاں بھی لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ لائبریری سے بدمعاش قیدیوں کا کوئی واسطہ نہیں تھا اور ٹی لاؤنج میں بھی گارڈز کی وجہ سے وہ سکون سے رہتے تھے اور جو سکون سے نہیں رہنا چاہتے تھے وہ وہاں آتے ہی نہیں تھے۔ میں لنچ کے بعد کچھ دیر ٹی لاؤنج میں گزارتا تھا۔ وہاں موجود قیدیوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔ شطرنج یا تاش کھیلتا اور شام کو ڈنر سے پہلے دوبارہ لائبریری جا کر کوئی کتاب نکلوا لیتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہاں قیدیوں کی اس حد تک نگرانی نہیں ہوتی ہوگی کہ ان کے پڑھنے پر بھی نظر رکھی جاتی ہو۔ کتاب ایشو کرا کے میں ڈنر کے بعد اپنے ساتھ لے آتا۔ مجھے جلدی نیند نہیں آتی تھی اس لیے اس وقت تک پڑھتا تھا جب تک نیند نہ آ جائے۔

چند ہفتوں میں، میں جیل کے طور طریقوں، جگہوں اور بعض ایسی چیزوں سے واقف ہو گیا جو بعد میں میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ جیل کا ایک حصہ واش روم اور

لیٹرین کے لیے مخصوص تھا۔ یہ خاصا بڑا حصہ تھا اور دن میں قیدی یہیں جاتے تھے۔ اسی جگہ انہیں ہر دوسرے دن نہانے کی سہولت مہیا کی جاتی تھی۔ قیدیوں کے گروپ بنا دیے گئے تھے اور ان کے دن اور اوقات طے کر دیے تھے وہ اسی وقت جا کر نہاتے اور اس کے بعد انہیں دوسرا لباس مہیا کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنے مقصد کے لیے چیزیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہ چیزیں مجھے مختلف جگہوں سے ملی تھیں اور میں نے انہیں بڑی احتیاط سے چھپا کر بیڈ کے نیچے والے خانے میں رکھا تھا۔ کبھی کبھی جیل حکام اچانک قیدیوں کے سیل کی تلاشی لیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قیدی کسی نہ کسی طرح ممنوعہ اشیا حاصل کر لیتے ہیں، ان میں منشیات بھی تھی اور چھوٹے موٹے ہتھیار بھی تھے۔

دوسرے ہفتے میں میس میں لنچ کر رہا تھا، میرے ساتھی قیدیوں کا ایک گروپ بن گیا تھا جس میں سب ہی معمولی جرائم میں قید ہونے والے افراد تھے۔ اچانک ایک طرف سے ہنگامہ کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ دو افراد آمنے سامنے آ گئے تھے۔ ان میں کسی بات پر زبانی تنازعہ ہوا لیکن اب بات ہاتھ پاؤں تک آ گئی تھی۔ میرے ایک معمر ساتھی نے کہا۔ ”وہ پیلے بالوں والا ڈیک ہے اور اس کے سامنے کالے بالوں والا ہینس ہے۔“

ہینس تقریباً تیس سال کا تومند شخص تھا، اس کے چہرے سے ایک قسم کی سفاکی اور اذیت پسندی ٹپک رہی تھی۔ میرے ساتھی نے کہا۔ ”یہ بہت خبیث آدمی ہے... ڈیک نیا آیا ہے اسے ہینس کے بارے میں علم نہیں ہے۔“

”یہ کس لیے جیل میں آیا ہے؟“

”اس نے نہایت سفاکی سے ایک لڑکی کو آبرو ریزی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کیا تھا۔ عدالت میں اس کے وکیل نے اسے ذہنی مریض ثابت کیا۔ اس وجہ سے اسے صرف پانچ سال کی سزا ہوئی ہے، اس میں سے بھی دو سال کا پیرول ہے۔ اسے یہاں آئے ہوئے یہ دوسرا سال ہے۔ ایک سال بعد یہ پیرول پر رہا ہو جائے گا۔“

”حالانکہ یہ سزائے موت کا مستحق ہے۔“ میں نے کہا۔ اس وقت تک گارڈز آ چکے تھے اور ان کا جھگڑا ٹل گیا تھا۔ میس میں سب آتے تھے اس لیے میس خبروں کا گڑھ تھا، یہاں سب کو سب کے بارے میں پتا چل جاتا تھا۔ اب مجھے فرانز کے نمائندے کا انتظار تھا۔ مجھے زیادہ عرصے انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ تیسرے ہفتے ایک دن میں لائبریری سے نکل رہا تھا کہ ایک کم عمر لیکن چہرے سے جرائم پیشہ نظر آنے والے لڑکے نے مجھے روک لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کارل...“

میں چوکنا ہو گیا۔ ”ہاں کہو...“

”مجھے فرانز نے بھیجا ہے۔“

”کیا کہا ہے اس نے اور ویسے یہ فرانز کون ہے؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

لڑکا مسکرایا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس فرانز کی بات کر رہا ہوں۔“

”دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی کام کی بات ہے تو کرو ورنہ میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”کام کی بات یہ ہے۔“ اس نے اچانک اپنی ہتھیلی میرے چہرے کی طرف کی تو میں بدک کر پیچھے ہٹا۔ میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کر رہا ہے لیکن جب میں نے اس کی ہتھیلی کو دیکھا تو اس پر ایک نمبر لکھا تھا، غور کرنے پر وہ پارسل نمبر ثابت ہوا۔ میں نے گہرا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے میری چیز کہاں ہے؟“

”فرانز نے کہا ہے پہلے کوڈ بتاؤ تب وہ چیز ملے گی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”طے یہ ہوا تھا جو شخص مجھے وہ چیز دے گا تب میں اسی شخص کو کوڈ بتاؤں گا۔“

لڑکے نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ وہ ناکام رہا تھا۔ اس نے جیب سے وہی چھوٹا سا سلینڈر نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا، یہ وہی سلینڈر تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے لڑکے سے کہا۔ ”غور سے سنو۔ میں دوبارہ نہیں بتاؤں گا یاد کر لو۔“

”تم فکر مت کرو کوڈ بتاؤ۔“

میں نے اسے چھ عدد والا کوڈ بتایا اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ یقیناً فرانز کا آدمی تھا۔ میں نے سلینڈر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور رات کوٹھری میں جاتے ہی اسے سامان رکھنے والے خانے کے اس خلا میں چھپا دیا جو میں نے کوشش کر کے تلاش کیا تھا اور پھر اسے ایک تار سے کرید کرید کر اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اس میں یہ سلینڈر چھپ سکتا تھا۔ اگلے روز میں پہلی بار کھلے میں آیا۔ موسم اب بھی سرد تھا لیکن برف باری نہیں ہوئی تھی اور جیل کا احاطہ صاف تھا۔ قیدی گرم کپڑوں میں مختلف کھیلوں میں مگن تھے یا ایکسرسائز اور دوستانہ جسمانی مقابلوں میں وقت گزار رہے تھے۔ میں نے ہینس کو تلاش کیا اور وہ مجھے ایک طرف چند افراد کے ساتھ مل گیا وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ صورت، جسامت اور انداز سے وہ ہینس کی ٹکر

کے نظر آتے تھے۔ شاید یہ جیل میں اس کا گروپ تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور باری باری جس طرح سب ایک ہی سگریٹ پی رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا وہ نشہ آور سگریٹ تھی۔

یہ سارا دن میں باہر رہا لیکن کسی ایک جگہ نہیں بیٹھا تھا بلکہ حرکت کرتا رہا۔ ہینس لنچ سے پہلے واش روم والے حصے میں گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس دن وہ جہاں جہاں بھی گیا میں غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے رہا۔ البتہ اس کے بہت پاس جانے سے گریز کیا تھا۔ وہ بہت چوکنا اور بے چین آنکھوں والا شخص تھا جو اپنے پاس آنے والے ہر فرد کو بہت مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کے قریب جانے سے گریز کیا تھا۔ اس کے بعد احتیاطاً ایک دن چھوڑ کر ایک دن میں اس کی نگرانی کرتا رہا اور ایک مہینے میں اس کے تمام معمولات سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ مجھے یہ جان کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ نہ صرف خود چرس اور کوکین کا نشہ کرتا تھا بلکہ جیل میں اس کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ وہ نہ جانے کس ذریعے سے یہ منشیات منگواتا تھا اور جیل میں ضرورت مند قیدیوں کو منہ مانگے داموں بیچتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں جیل کے عملے کے لوگ بھی ملوث تھے۔ یہ جاننے کے بعد میں مزید محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جیل میں رہ کر جرم کر رہا تھا اس لیے وہ اپنے آس پاس سے بہت زیادہ چوکنا تھا، اگر اسے مجھ پر شک ہو جاتا تو پھر میں اپنا کام آسانی سے نہیں کر سکتا تھا۔

میری احتیاط رنگ لائی مجھے وقت تو لگا لیکن بالآخر میں نے اس کے بارے میں سب کچھ جان لیا تھا۔ اس کی وہ عادت جو مجھے کام کی لگی تھی، وہ لنچ سے پہلے لازمی لیٹرین جاتا تھا اور وہاں خاصی دیر قیام کرتا تھا۔ وہ وہاں اتنی دیر لگاتا کہ باقی سب قیدی لنچ کے لیے میس چلے جاتے تھے اور وہ اس وقت میس میں آتا جب لنچ کا وقت تقریباً ختم ہونے والا ہوتا تھا اور اکثر وہ اپنی ٹرے باہر لے جا کر کھاتا تھا۔ لنچ کا وقت ختم ہوتے ہی میس خالی کرنا لازمی تھا، اس کے بعد کوئی قیدی وہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ لیٹرین میں اتنی دیر کرتا کیا تھا؟ لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ تجسس نہیں تھا۔ اس کا لیٹرین میں قیام کا یہ وقت مجھے اپنے منصوبے کے لیے موزوں لگ رہا تھا۔

مجھے جیل آئے دو مہینے ہو چکے تھے اور تیسرے مہینے کا آغاز تھا۔ ایک مہینے کے اندر میری پیرول پر رہائی یقینی تھی۔ مجھے اس سے پہلے ہی اپنا کام کرنا تھا۔ ہفتے والے دن قیدی جلدی لنچ کے لیے میس کی طرف یلغار کرتے تھے کیونکہ
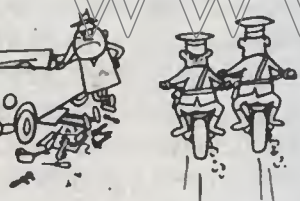
ہفتے کو سب سات بجے باہر آتے تھے اور اس لحاظ سے ناشتا بھی ایک گھنٹا پہلے ملتا تھا لیکن لنچ کا وقت وہی دو سے تین تھا۔ بھوک سے بے تاب قیدی جلدی میس پہنچ جاتے تھے۔ سوائے ہینس کے وہ، اپنے معمول کے مطابق لیٹرین میں خاصا وقت گزار کر آتا تھا۔ میں نے آنے والے ہفتے کو چن لیا۔ اس صبح میں وہ سارا سامان ساتھ لے کر نکلا تھا جو میں نے اِدھر اُدھر سے حاصل کیا تھا۔ یہ سامان اپنے لباس میں چھپا لیا تھا۔ سلینڈر بھی نکال لیا تھا۔ جیسے ہی لنچ کے لیے گھنٹا بجا تمام قیدی میس کی طرف روانہ ہو گئے اور ان میں سے کچھ نے پہلے واش روم کا رخ کیا تھا۔ ان میں، میں بھی شامل تھا اور جبکہ ہینس تو شامل تھا ہی۔

واش روم ایریا میں تین لیٹرین تھے۔ ان میں سے ہر

ایک میں آمنے سامنے دس دس خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں ایک کموڈ لگا تھا۔ پیشاب کے لیے الگ حصہ تھا۔ ہر لیٹرین میں داخل ہونے کا دروازہ ایک ہی تھا جس کے پاس ہی ہاتھ منہ دھونے کی جگہ تھی۔ کموڈ والے خانے اس سے آگے تھے۔ میں ہاتھ دھونے کے بہانے رک گیا اور دیکھا کہ ہینس بائیں طرف کے آخری خانے میں داخل ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی خانے میں جاتا تھا۔ میں ایک کموڈ والے خانے میں داخل ہوا اور اندر بیٹھ کر سامان نکالا۔ اس دوران قیدی جلدی جلدی فارغ ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔ آخری قیدی کے جاتے ہی میں نے باہر نکل کر ایک تختی دروازے کے باہر لگا دی جس پر آؤٹ آف آرڈر لکھا تھا۔ اگر کوئی آتا بھی تو وہ دوسرے لیٹرین کا رخ کرتا یہاں نہیں آتا۔ جوتے میں پہلے ہی اتار چکا تھا اور دبے قدموں واپس خانے میں آگیا۔

ہینس دم سادھے آخری قیدی کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں دروازہ بند کر کے آیا، اس کے خانے سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ کموڈ کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آوازیں کچھ دیر بعد رک گئیں۔ میں نے اپنی جیب سے سلینڈر نکالا اور اسے دونوں سروں سے پکڑ کر مخالف سمتوں میں گھمایا۔ اس کی نہ نظر آنے والی سیل آسانی سے ٹوٹ گئی اور سلینڈر کے دونوں سروں سے دو عدد کیپسول نما چیزیں نکل آئیں۔ ان میں سے ایک نیلے رنگ کا تھا اور دوسرا سرخ رنگ کا۔ میں نے سرخ کیپسول احتیاط سے سلینڈر میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا اور پھر منہ پر کپڑے سے بنا ایک ماسک چڑھا لیا، یہ میں نے خود بنایا تھا جیسے آؤٹ آف آرڈر کی تختی خود بنائی تھی۔ میں دبے قدموں خانے سے نکلا اور ہینس والے خانے کی طرف بڑھا۔ اس نے لیٹرین خالی پا کر بے فکری سے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اور کموڈ کی طرف جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ فلیش ٹینک کو ہٹا کر اس کے پیچھے نظر آنے والے خلا سے کچھ نکال رہا تھا اور اس کی توجہ پوری طرح اس طرف تھی۔

یہ بہترین موقع تھا، میں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور خاموشی سے اس کے پیچھے جا کر نیلا کیپسول اس کی گدی پر رکھتے ہوئے کیپسول کو دبایا تو گیس نکلنے جیسی آواز آئی اور ہینس فوراً ہی بے سدھ ہو کر منہ کے بل کموڈ پر گر پڑا۔ میں نے اسے کھینچ کر پیچھے کیا، کیپسول میں موجود دوا نے کام دکھایا تھا۔ یہ مخصوص قسم کا کیپسول تھا جس میں دوا گیس کی صورت میں پریشر سے بھری ہوتی ہے اور کیپسول دباتے ہی یہ سامنے کی طرف سے نکلتی ہے، پریشر کی وجہ سے یہ جلد سے ہوتی کسی انجکشن کی طرح خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ جسم کو سن کر دینے والی دوا تھی۔ آدمی ہوش میں رہتا ہے لیکن نہ تو بول سکتا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔ میں نے پھرتی سے ہینس کو پیچھے کھینچا اور کموڈ کا معائنہ کیا۔ تب انکشاف ہوا کہ ہینس اس کموڈ کے فلیش ٹینک کے پیچھے موجود خلا کو منشیات اور رقم رکھنے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس میں ایک پیکٹ میں کوکین، ایک میں چرس اور ایک میں مختلف کرنسی نوٹ تھے۔ میں فکرمند ہو گیا اگر کوئی غیر متوقع طور پر آجاتا تو ہینس کے ساتھ میں بھی پکڑا جاتا اور جیل میں منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کا الزام نہایت سنگین کیس بن جاتا۔ میں نے فلیش ٹینک کا جائزہ لیا اور سمجھ گیا کہ اسے کس طرح بند کرتے ہیں۔ اسے بند کر کے میں باہر آیا جہاں ہینس بے بسی سے فرش پر پڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ دو گھنٹے سے پہلے حرکت کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر کہا۔

''تم سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارا کوئی کاروباری حریف ہوں اور بزنس کی وجہ سے یہ حرکت کی ہے لیکن تمہارا یہ خیال غلط ہے۔''

میں نے سلینڈر سے دوسرا کیپسول نکالا اور زبردستی اس کا منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا لیکن وہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ ''اس کیپسول میں کیا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میں تمہیں کچھ اور بتاؤں گا۔ تمہیں وہ لڑکی یاد ہے جسے تم نے اغوا کیا اور پھر ایک ہفتے تک اسے اپنی قید میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ تم نے اسے بار بار درندگی کا نشانہ بنایا اور اس پر بھی تمہارا دل نہیں بھرا تو تم نے اسے زندہ حالت میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار دیا۔ اس کے ٹکڑے زمین میں دفن کر دیے لیکن تم پکڑے گئے۔ تمہارے جرم کے لحاظ سے تمہیں سزائے موت ہونی چاہیے تھی لیکن تمہارے وکیل کی چالاکی سے تم نفسیاتی مریض بن کر بچ گئے۔''

اس سے باتوں کے دوران میں نے سلینڈر اور دوسری چیزیں ایک کموڈ میں بہا دیں اور کئی بار فلیش ٹینک چلایا تاکہ یہ چیزیں بہہ کر سیوریج میں دور چلی جائیں۔ اس کے بعد میں واپس ہینس کے پاس آیا۔ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے اس سے صرف میں بات کر سکتا تھا۔ ''تم نے جو کیپسول کھایا ہے بلکہ میں نے کھلایا ہے اس میں ایک تیز اثر کیمیکل ہے جس کی خاصیت کچھ تابکار مواد جیسی ہے یعنی یہ جسم کو گلا سڑا دیتا ہے لیکن یہ تابکاری خارج نہیں کرتا۔ ایک بار یہ جسم میں شامل ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں

ہے... سنا تم نے دنیا کا کوئی علاج اور کوئی ڈاکٹر تم کو نہیں بچا سکتا۔ تم زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں لحہ بہ لحہ موت کا شکار ہو جاؤ گے اور اس دوران میں ایسے کرب و اذیت سے گزرو گے جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ ہاں شاید تمہارے ہاتھوں لوگ ایسے کرب سے گزرے ہوں۔ بہرحال اب انصاف ہوگیا ہے۔'' میں اس کے پاس سے کھڑا ہوگیا۔ ''دو گھنٹے بعد تم حرکت کر سکو گے لیکن اس کے بعد تم صرف دو ہفتے اور اپنے اس گندے وجود کے ساتھ دنیا میں گزار سکو گے۔ یہ اس لڑکی کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا بدلہ ہے۔''

میں نے ان تمام غیر متعلقہ جگہوں سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے جہاں یہ جیل حکام کو مشکوک کر سکتے تھے۔ آؤٹ آف آرڈر کی تختی اور نقاب میں نے میس کی طرف جاتے ہوئے ایک ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ میں میس میں آیا تو سب معمول کے مطابق تھا۔ میں اپنا کھانا لے کر اپنے گروپ کے پاس آبیٹھا۔ میرے ساتھی نے کہا۔ ''ہے کارل، آج تم نے دیر کردی۔''

''بس ایک ضروری کام نمٹا رہا تھا جس کے لیے میں اس جیل میں آیا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ بات کو مزاح کے انداز میں کہا تو سب ہنس پڑے۔ جب تک ہم لنچ کر کے فارغ ہوئے کسی نے ہینس کو لیٹرین کے فرش پر بے حس و حرکت پڑا دیکھ لیا تھا۔ اس نے شور مچا کر پہلے انتظامیہ کو بتایا اور جب جیل کا عملہ ہینس کو جیل کے اسپتال لے گیا تو وہ سنسنی پھیلانے کے لیے سب کو بتانے دوڑا آیا اس نے میس میں اعلان کردیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہینس کے گروپ کے مخصوص لوگ یہ سن کر فکر مند ہوگئے تھے۔ ان کا دھیان اپنے کاروباری حریفوں کی طرف گیا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا آنے والے چند دنوں میں جیل میں فساد متوقع تھا۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ رات تک ہینس واپس آگیا تھا۔ پتا نہیں اس نے جیل حکام کو کیا بیان دیا تھا۔ اگر اس نے حقیقت بتادی تھی تب بھی کسی کا دھیان میری طرف نہیں جاسکتا تھا۔

دوسرے دن اسے جیل سے کہیں لے جایا گیا اس وقت تمام قیدی صحن میں جمع تھے اور ہمارے سامنے ایک ایمبولینس ہینس کو لے کر روانہ ہوئی تھی۔ شام کو ٹی وی پر ہینس کے بارے میں خبر آرہی تھی۔ وہ اسپتال میں تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق اسے کوئی ایسا زہریلا کیمیکل کھلایا گیا تھا جس کا توڑ ان کے پاس نہیں ہے اس کیمیکل نے ہینس کے پورے جسم کو متاثر کیا تھا۔ اس کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ ٹی وی پر اس کی چند لمحوں کی جو ویڈیو دکھائی گئی اس میں اس کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا جیسے کسی نے باریک تیز دھار سے اس کے چہرے پر سنسکرت میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہو۔ وہ نڈھال سا اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ قیدیوں کے لیے یہ ایک سنسنی خیز خبر تھی۔ رات سے پہلے جیل کے قیدیوں کو علم ہوگیا تھا کہ کسی قیدی نے نقاب پہن کر ہینس کو زبردستی ایک کیپسول کھلایا تھا اور اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکی کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا جواب ہے جس قتل کے الزام میں ہینس کو سزا ہوئی تھی۔ جیل حکام کے پاس کسی قیدی کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اگلے دن پوری جیل کی مکمل تلاشی لی گئی بہت سارے قیدیوں کے پاس سے ممنوعہ اشیا نکلیں لیکن ان سے ہینس کے ساتھ ہونے والی واردات پر کوئی روشنی نہیں پڑی تھی۔

دو تین دن اس حوالے سے خاصی سنسنی رہی۔ واقعہ یہ تھا کہ جیل انتظامیہ ہل کر رہ گئی تھی۔ مگر چوتھے دن سے سب معمول پر آگیا۔ ٹی وی پر ہینس کو دکھانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی صورت اتنی خراب ہوچکی تھی کہ حکومت کی طرف سے پابندی عائد کردی گئی تھی۔ عورتیں اور بچے ٹی وی پر اسے دیکھ کر ڈر جاتے۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ خلافِ توقع اس واقعے کے بارھویں دن وارڈن کے دفتر سے میرا بلاوا آگیا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ میرے اچھے چال چلن کی وجہ سے جیل حکام نے مجھے قبل از وقت پیرول پر رہا کرنے کی سفارش کردی اور کل صبح مجھے رہا کیا جارہا تھا۔ یہ رہائی سرکاری وکیل کی مرہونِ منت بھی تھی جس نے بعد میں بھی میرے لیے جیل سے رابطہ رکھا اور قبل از وقت ہی مجھے پیرول پر رہا کرانے میں کامیاب رہا۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کیونکہ میرا کوئی گھر نہیں تھا اس لیے پیرول کی مدت تک مجھے ایک کمیونٹی سینٹر میں رہنا تھا اور لوگوں کے کام کرنے تھے۔ یہ کمیونٹی سینٹر لاوارث، بیمار اور غریب لوگوں کے لیے تھا۔ سزا یافتہ قیدی یہاں ان لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن رات آٹھ بجے تک مجھے لازمی کمیونٹی سینٹر میں موجود ہونا تھا۔ اس کے علاوہ جو کام میرے ذمے لگایا جاتا اسے انجام دینا تھا۔ میرا کام بہت آسان تھا، مجھے ان بوڑھے مریضوں کو وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لان کی سیر کرانی تھی جو از خود چل پھر نہیں پاتے تھے۔ یہ ڈیوٹی صبح دس سے شام چھ بجے تک تھی۔ دو دن تو میں کمیونٹی سینٹر میں ہی رہا۔ تیسرے دن میں ڈیوٹی کے بعد وہاں سے نکلا اور زیرِ زمین چلنے والی میٹرو ٹرین کی مدد سے اسپتال تک پہنچا جہاں ہینس داخل تھا۔ میں نے نیچے ریسپشن سے ہینس کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھا اور اس کی حالت تشویش ناک تھی۔ میں اوپر آیا تو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھے ہینس کی ایک جھلک دکھائی اور اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگرچہ یہ میں نے ہی کیا تھا لیکن میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس کیمیکل کا نتیجہ اتنا خطرناک نکلے گا۔ بایولوجسٹ کی حیثیت سے میرے لیے یہ کیمیکل حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور مجھے اس کی قاتل خصوصیت کا اچھی طرح پتا تھا لیکن یہ انسانی جسم کا کیا حال کرتا ہے اس کا مجھے پہلی بار اندازہ ہوا تھا۔ ہینس بستر پر گلے سڑے گوشت کا ڈھیر سا بن گیا تھا۔ اس کا منہ اتنا خراب ہوگیا تھا کہ اندر کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور وہ نہ جانے اس حال میں زندہ کیسے تھا۔ بہرحال اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ اگلے چوبیس گھنٹے گزار لے تو بڑی بات ہوگی۔

میں آنے والے سوا دو مہینے تک کمیونٹی سینٹر میں اپنا کام کرتا رہا۔ مجھے معلوم تھا میں مدت پوری کیے بغیر غائب ہوا تو مفرور قرار دیدیا جاؤں گا اور پولیس مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے پاس میری تصویر اور فنگر پرنٹ آگئے تھے۔ اگر وہ کوشش کرتے تو مجھے تلاش بھی کرسکتے تھے اور انہیں یہ معلوم کر کے زیادہ خوشی ہوتی کہ ان کا مطلوبہ مجرم اصل میں ویانا کا ایک یونیورسٹی پروفیسر ہے۔ اس کے بعد یہ تحقیق ہوتی کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور جلد یا بدیر پولیس ہینس کے ساتھ ہونے والی کارروائی کا ذمے دار مجھے ہی قرار دیتی۔ اس لیے جلد بازی سے بہتر تھا کہ میں کچھ صبر سے کام لیتا اور ایک بار مجھے رہائی مل جاتی تو میں یہاں سے غائب ہوجاتا۔ پھر کارل شوٹز کا دنیا میں کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ جرمن حکومت نے اسی نام سے میرے کاغذات بنوا دیے تھے اور اب میں باقاعدہ جرمن شہری تھا۔ جب تک میں جیل میں رہا میں نے سر کے بال چھوٹے رکھے۔ اسی طرح مونچھوں سمیت فرنچ کا انداز بھی برقرار رکھا۔ اس سے میرا حلیہ بالکل مختلف ہوگیا تھا۔

بالآخر پانچ مہینے کی سزا پوری ہوئی اور مجھے کمیونٹی سروس کی قید سے بھی رہائی مل گئی۔ میں نے سب سے پہلے اپنی خاصی بڑھ جانے والی فرنچ ڈاڑھی اور مونچھیں صاف کیں۔ پھر پارکنگ میں موجود گاڑی تک آیا۔ خدشات کے ساتھ میں نے گاڑی کے سسٹم کو ان لاک ہونے کا حکم دیا اور مجھے خوشی ہوئی جب اس نے حکم کی تعمیل کی یعنی بیٹری چارج ہوتی رہی تھی۔ میں نے اپنا سامان نکالا اور لباس تبدیل کیا۔ میرے پاس رقم تھی اور مجھے بینک سے رقم نکلوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ باہر نکل کر میں نے کار کی نمبر پلیٹس تبدیل کیں اور فوری طور پر روانہ ہوگیا۔ اپنا پرانا لباس اور نمبر پلیٹس میں نے ایک جگہ ڈسٹ بن میں ڈال دی تھیں۔ میونخ میں ایک رات اسی طرح ایک کال گرل کے گھر میں بسر کی اور اگلے دن ایک اور جگہ سے سرحد پار کی۔ اس طرح سرحدی حکام کو پتا نہیں چلا کہ میں کب جرمنی آیا تھا۔ انہوں نے کار اور پاسپورٹ دیکھ کر مجھے جانے کی اجازت دیدی۔ جب تک اس بات کی خاص طور سے جانچ نہ ہوتی کہ میں کب جرمنی آیا اور گیا تو کسی کو بھی پتا نہ چلتا کہ میں پانچ مہینے سے زیادہ عرصے جرمنی کی ایک جیل میں رہا تھا۔

گھر واپس آیا اور تمام چیزوں کو ورکنگ آرڈر میں لے آیا۔ ایک دن بعد میرا گھر ویسا ہی ہوگیا جیسے پانچ مہینے پہلے تھا۔ میں نے یونیورسٹی ای میل کی کہ میں واپس آگیا ہوں اور کل سے یونیورسٹی جوائن کروں گا۔ ای میل پر ہی مجھے شوکاز نوٹس بھیج دیا گیا تھا۔ یہ قابلِ اطمینان بات تھی کہ مجھے ملازمت سے فارغ نہیں کیا گیا تھا۔ میں کل یونیورسٹی جا کر حکام کے سامنے کوئی معقول وضاحت پیش کرسکتا تھا کہ میں کیوں پانچ مہینے یونیورسٹی سے غیر حاضر رہا۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ اس کے بعد میں اپنی معمول کی زندگی وہیں سے شروع کروں گا جہاں سے پانچ مہینے پہلے رکی تھی۔

پانچ مہینے پہلے فرینکفرٹ سے آنے والے خط میں اس جاسوس فرم نے مجھے اطلاع دی تھی کہ میری اکلوتی بیٹی شرمین آج سے کوئی دو سال پہلے ایک جنسی جنونی کے ہاتھوں ماری گئی تھی اور وہ جنونی ان دنوں جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ خط میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ اسے صرف پانچ برس کی سزا ہوئی ہے۔ میں نے کچھ عرصے پہلے اس فرم کو شرمین کی تلاش پر مامور کیا تھا اور میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی اندوہناک خبر سننے کو ملے گی۔ قاتل کی سزا کا سن کر میں نے محسوس کیا کہ اسے تو سزا ملی ہی نہیں ہے اور تب میں نے اسے خود سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کے جیل سے باہر آنے کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا اس دوران میں میرے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ میں نے اپنے فیصلے پر فوری عمل کیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنی بیٹی کے قاتل کو وہ سزا دیدی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

چودھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آ... تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرمین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرمین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں... دعائیں لیں، فرمین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرمین نے ایک... قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرمین کی نشا... والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو... سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے... ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دو... دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو بر... والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سپر اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پ...

کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کرچکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے مخالفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بنتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہوکر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ ... کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ شیخ حامد کے اثر و رسوخ مرکز تک تھے ... کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی ... ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کردیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز تک تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کرلیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غنڈے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت ... سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچالیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم ... تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کردیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرالیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو ... ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور جراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران ... اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کرکے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دھچکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کرادیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوبا شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ''بلیک ٹائیگر'' کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ''بلیک ٹائیگر'' کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھٹکا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کرلیتا ہے۔ اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکتا ہے جو اس کمرے تک آگیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور ... نوارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کردیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کرکے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد نے کنول سے شادی کے بعد دونوں گواہوں اور کنول کی ماں کے قتل کے احکامات جاری کردیے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سہاگ رات ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور ... سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ جراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب طرمان کو گرفتار کرکے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرکے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کے سبب محفوظ رہا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایس پی اورنگ زیب کے موقع واردات پر پہنچنے کے بعد ملحقہ تھانے کا عملہ اور پولیس فورس کی کچھ اور گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ اورنگ زیب کی ہدایت پر سڑک پر دونوں سمت پولیس تعینات کرکے راستے بلاک کردیے گئے۔ علاقے کے لوگوں نے بھی قانون نافذ کرنے والے مختلف اداروں کو فون پر اس خونی ٹکراؤ کی اطلاع دی تھی جس میں سات آٹھ انسانی قتل کی کہانی بھی سنائی گئی تھی۔

سچویشن کو کنٹرول کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سب سے پیشتر لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر اپنی گاڑی میں بٹھایا پھر علاقہ پولیس کے انسپکٹر کو ایک طرف کھڑے ہوکر کارروائی کے مختلف پہلوؤں پر بریفنگ دینے لگا۔

''جس بندے کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا ہے وہ میرا ذاتی واقف کار ہے۔ حادثے کی اطلاع اسی نے مجھے دی تھی، میں نہیں چاہتا کہ اس کا نام کسی بھی طرح درمیان میں آئے ورنہ کچھ جانے پہچانے مجرم بھی چوکنا ہوجائیں گے۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو بھی کسی نامعلوم فرد کی طرف سے فون کرکے اطلاع ملی تھی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں سر......'' انسپکٹر نے کہا۔ ''سب کچھ آپ کی ہدایت کی روشنی میں ہوگا۔''

''جو لاشیں بکھری پڑی ہیں وہ یقیناً پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی ہوں گی جن کو ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔''

''سر...... کیا آپ کو اس قسم کے کسی مقابلے کی توقع پہلے سے تھی؟''

''یس...... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس واردات کی پشت پر کس کا ہاتھ ہے۔'' اورنگ زیب نے سرد لہجے میں اعتراف کیا۔ ''جو آدمی میرے ساتھ جائے گا وہ اسی کے جان کے دشمن تھے۔''

''ایسی صورت میں تو میرا خیال ہے کہ آپ اگر اس کا تحریری بیان لے لیں تو......''

''نہیں...... فی الحال میں اس کا نام کسی صورت درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔''

''نہیں آئے گا سر...... لیکن جن لوگوں نے یہ قاتلانہ ڈراما اسٹیج کیا ہے وہ تو جانتے ہوں گے؟''

''ہاں...... اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کو آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' اورنگ زیب نے قدرے کرخت لہجے میں جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ''کوشش کیجیے گا کہ میڈیا کے لوگ بھی مرنے والوں کی تصاویر نہ بنا سکیں۔''

''او کے سر...... میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔''

''آپ ضروری کارروائی کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردیں...... مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، آپ کی تمام کاغذی کارروائی کی رپورٹ کل تک یقینی طور پر درکار ہوگی...... ممکن ہو تو مرنے والوں کی ہسٹری بھی معلوم کرکے اپنی رپورٹ کے ساتھ مجھے پہنچادیں، اس کے بعد ہی میں آپ کو کسی جوابی کارروائی کے لیے مزید ضروری گائڈلائن دے سکوں گا۔''

''سر......'' انسپکٹر نے اورنگ زیب کی بات پوری طرح سمجھنے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس مجرم کو بھی فوری طور پر حراست میں لے لیں جو اس حادثے کا ذمے دار ہے۔''

''آپ کا مشورہ قانون کے عین مطابق ہے لیکن......'' اورنگ زیب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''اس کو حراست میں لینے کا خواب ابھی ہمارے اعلیٰ افسران اور عہدیدار بھی نہیں دیکھ سکتے۔''

''آئی۔ سی۔!'' انسپکٹر نے حیرت کا اظہار کیا پھر وہ ضروری کارروائی میں مصروف ہوگیا۔

لیاقت حسین نے حملہ کرنے والے جس نقاب پوش کو زندہ چھوڑ دیا تھا وہ مردوں سے بھی بدتر حالت سے دوچار تھا۔ سب سے پہلے اس کی تصاویر لی گئیں پھر اورنگ زیب نے ایک سب انسپکٹر کو قریب بلاکر ہدایت دی۔ ''اسے ایمبولینس میں ڈال کر تھانے پہنچادیں، میں بھی ادھر آرہا ہوں۔''

''جو حکم سر......''

''انسپکٹر سے کہہ دیں کہ اس زخمی کا شمار بھی قبل از وقت قریب المرگ لوگوں میں لکھ لیں۔'' اورنگ زیب نے زخمی کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ حضرات کارروائی جاری رکھیے، میں آدھے گھنٹے بعد تھانے پہنچ جاؤں گا۔ کوئی ضروری مشورہ یا گائڈلائن درکار ہو تو موبائل پر رابطہ کرلیں۔''

''رائٹ سر......''

ماتحتوں کو ضروری ہدایتیں دینے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی سمت گھوما تو اس کی نظر سیٹھ عثمان کی گاڑی پر پڑی، ایک لمحے کو اس نے رک کر کچھ سوچا پھر سب انسپکٹر کو دوبارہ قریب بلاکر کہا۔ ''آپ کو ایک زحمت اور دے رہا ہوں۔'' اس نے مطلوبہ کار کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس کو کسی طرح ڈہنی

سپرنٹنڈنٹ سراج کی قیام گاہ تک پہنچا دیں، اس کا حوالہ بھی درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔''

سب انسپکٹر سے فارغ ہو کر وہ اپنی گاڑی میں آ گیا۔ لیاقت حسین اگلی نشست پر گم صم بیٹھا باہر کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ اورنگ زیب نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپسی کے لیے موڑ دی۔ موقع واردات سے کچھ دور آنے کے بعد اس نے لیاقت حسین کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

''تم کس سوچ میں گم ہو؟''

''میں گھر پر لیٹا ایک ذاتی مسئلے پر غور کر رہا تھا صاحب پھر...... آپ کے ساتھ اس وقت گاڑی میں کس طرح آ گیا؟''

لیاقت حسین کے چہرے سے عیاں الجھن اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط بھی نہیں ہے۔ اورنگ زیب اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا، عام حالات میں شاید وہ لیاقت حسین کے جواب کو تسلیم نہ کرتا مگر سراج بھی اسے بتا چکا تھا کہ کوئی روحانی قوت ایسی ہے جو لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے، وہ اس قوت کے تحت جو عمل کرتا ہے اس کے مکمل ہو جانے کے بعد گزری ہوئی باتیں اس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں جس کا اثر وہ ذاتی طور پر لے کر الجھتا رہتا ہے۔ سراج نے اورنگ زیب سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ لیاقت حسین کو اس مسئلے پر زیادہ نہ کریدے چنانچہ اس وقت بھی اورنگ زیب نے لیاقت حسین کے جواب پر کسی ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے دوستانہ انداز میں کہا۔

''میں تمہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا مگر...... تم شاید ابھی تک اپنے ذاتی مسئلے پر غور کرنے میں مصروف ہو؟''

''صاحب...... آپ مجھے تسلی تو نہیں دے رہے ہیں؟'' لیاقت حسین نے دبی زبان میں سوال کیا۔

''تمہیں یہ خیال کیوں آ رہا ہے کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟''

''وہ...... وہ......'' لیاقت حسین نے گڑبڑا کر کہا۔ ''دراصل میں اکثر کچھ باتیں بھول جاتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے جس کا اندازہ مجھے سراج صاحب کی باتوں سے بھی ہو چکا ہے...... ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟''

''اس لیے کہ تم ضرورت سے زیادہ وفادار اور مخلص ہو۔''

''آ...... آپ اس وقت مجھے ساتھ کیوں لائے تھے......؟'' لیاقت نے دوسرے انداز میں خود کو تسلی دینے کی خاطر سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میں آپ کی کیا خد[مت] کر سکتا ہوں۔''

''ذہن پر زور نہ دو۔'' اورنگ زیب نے یہ دستو[رانہ] لہجے میں کہا۔ ''مجھے ایک حادثے کی رپورٹ ملی تھی، م[یں اس] وقت سراج کے پاس تھا۔ آنے سے پہلے دوسراہٹ کی [خاطر] تمہیں بھی ساتھ لے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ تم اس وقت [بھی] نیند میں تھے، شاید اسی لیے تمہیں یاد نہیں، کچھ دیر بعد [ممکن] ہے کہ نیند کا خمار اترنے کے بعد تمہیں یاد آ جائے۔''

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس [کے] چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس جواب سے [پوری] طرح مطمئن نہیں ہوا تھا، اورنگ زیب نے اس کی کیف[یت] محسوس کر کے گفتگو کا رخ بدل کر پوچھا۔

''تمہاری بیوی شاید آج کل اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔''

''جی ہاں صاحب...... اس کے ایک قریبی رشتے [دار] کی موت ہو گئی تھی اس لیے اس کا جانا ضروری تھا۔''

''تم ساتھ کیوں نہیں گئے......؟''

''م...... میں سراج صاحب کو تنہا چھوڑ کر نہیں [جانا] چاہتا تھا صاحب، ان کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔'' لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''جب وہ م[یری] ضرورت کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں تو میں انہیں بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔''

''بیوی کو واپس لینے تو جاؤ گے؟''

''سراج صاحب سے اجازت مل گئی تو جاؤں گا صاحب۔''

''کیا مطلب؟'' اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''انہوں نے آج ہی مجھ کو تاکید کی تھی کہ میں ان [کی] اجازت کے بغیر گھر سے باہر بھی نہ نکلوں۔ کوئی سرپھرا د[شمن] ان کے علاوہ مجھے بھی نقصان پہنچانے کے خواب دیکھ [رہا] ہے۔ میں ان کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ کچھ دیر بعد تمہارے ذہن سے نیند کا خمار اترے گا تو سب باتیں تمہیں یاد آ جائیں گی۔''

لیاقت حسین نے تجسس بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا لیکن کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا ذہن اس زخمی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے لیے تھوڑی سی سختی کے بعد کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ لیاقت حسین کے آخری جواب کی رو[شنی میں یہ] بات بھی مزید واضح ہو گئی تھی کہ اسی کو راستے سے [ہٹانے] کی خاطر دشمنوں نے گھیرنے کی کوشش کی ہو گی لیکن [کسی] روحانی قوت کے کرشمے نے ان کی بساط پلٹ دی تھی۔ سراج کی سنائی ہوئی کہانیوں کے مطابق پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ناشتے سے فارغ ہو کر میڈم روبی اپنے اسٹڈی میں آ کر کچھ فائلوں کو الٹ پلٹ رہی تھی جب دروازے پر دستک سن کر پوچھا۔ ''کون ہے......؟'' پھر دستک کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ فائلیں اس وقت بھی اس کے سامنے میز پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص فائل کی تلاش میں ہے۔

''کیا بات ہے میڈم......؟'' تھریسا نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دریافت کیا۔ ''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہ فائل میں نے اپنے بیڈروم کے لاکر میں رکھ دی ہو۔'' میڈم نے سرسری طور پر جواب دیا پھر فائلوں کو ایک طرف ہٹا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ''کوئی خاص فائل نہیں تھی۔ میرے ایک دو پرسنل لیٹر تھے جو اس وقت مجھے یاد آ گئے تھے۔''

''کیا ان کا تعلق بھی کچھ موجودہ حالات سے ہے؟ میرا مطلب ہے کہ شیخ حامد سے متعلق کوئی اہم خط؟'' تھریسا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''براہ راست نہیں تھا لیکن وہ کسی ضرورت کے وقت کام آ سکتے تھے۔'' میڈم نے سنبھل کر جواب دیا پھر بات بدل کر بولی۔ ''اس وقت تمہیں شاید مجھ سے کوئی ضروری کام ہے ورنہ عام طور پر تم میری اسٹڈی میں کم ہی آتی ہو۔''

''آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔'' تھریسا نے محتاط لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ''پرسنل سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بھی ہے کہ آپ کے تمام دکھ سکھ کا خیال رکھوں۔''

''ہاں۔ اور تمہیں یہ اندازہ بھی ہو گا کہ میں تمہیں پرسنل سیکریٹری کے علاوہ اپنا رازدار بھی سمجھتی ہوں۔'' میڈم نے مزید وضاحت کرنے کے بعد بے تکلفی سے پوچھا۔ ''کہو، کیا بات ہے؟''

''بگ باس کے بنگلے پر جگا کے ساتھیوں کا حملہ آپ ہی کے اشارے پر ہوا تھا، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ نے براہ راست جگا سے بات نہیں کی، ہاشم کے بعد میں نے ہی لوچن کے ذریعے اسے پیغام بھیجا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جگا نے اس بار اس حملے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔'' تھریسا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''معاوضہ نہ لینے کی وجہ بھی میرے علم میں ہے۔ بگ باس کے خیال میں بلیک ٹائیگر کی موت میں جگا کے آدمیوں کو دخل رہا ہو گا۔ اس لیے کہ بلیک ٹائیگر نے ہاشم کو وہیں دیکھا تھا۔ رہا ہاشم کی خودکشی کا معاملہ تو اسے بھی میں نے ہی آپ کی ہدایت پر کوڈ سیون اسٹار کے حوالے سے احکامات جاری کیے تھے۔''

''مجھے تمام باتوں کا علم ہے۔ تم اس وقت کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میڈم نے وضاحت طلب لہجے میں تھریسا کو مخاطب کیا۔

''ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی بات اور ہے میڈم۔'' تھریسا نے بڑے خلوص سے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔ ''اس نے آپ کے ساتھ احسان کیا تھا لیکن ہر پولیس آفیسر پر اعتماد کرنا میرے خیال میں دانشمندی نہیں ہے...... ان کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی اکثر بہت مہنگی ثابت ہوتی ہے۔''

''تمہارا اشارہ غالباً ایس پی اورنگ زیب کی طرف ہے؟''

''میں انکار نہیں کروں گی۔'' تھریسا نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''آج ایس پی اورنگ زیب اپنی ذاتی رنجش کی وجہ سے بگ باس کے خلاف ہے۔ اس نے سراج کے توسط سے آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آپ کو جگا کے ذریعے بگ باس کی رہائش گاہ پر حملے کی خاطر اپنے مفاد میں استعمال کیا لیکن کل اپنا مقصد نکل جانے کے بعد ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے وہ آپ سے جگا کے بارے میں کھوج بھی کر سکتا ہے۔''

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔'' میڈم نے کسمسا کر کہا۔ ''لیکن اگر مسٹر سراج نے ایس پی اورنگ زیب کو میرے حوالے سے کچھ بتایا ہو گا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی بتایا ہو گا۔''

''میں نے اس پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ حالات کے پیش نظر کوئی بھی ذمے دار پولیس آفیسر کسی آڑے وقت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔'' تھریسا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس ضمن میں کیا میں آپ سے ذاتی سوال کر سکتی ہوں۔''

''میں نے تمہیں ہر قسم کا اختیار دے رکھا ہے۔'' میڈم نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ''کیا معلوم کرنا

چاہتی ہو؟''

''ڈی آئی جی آغا منظور کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟''

''میں سمجھی نہیں......''

''بگ باس سے انتقام لینے کی خاطر آپ نے افضل خان کو اعتماد میں لینے کی خاطر بہت بڑی پیش کش کی تھی۔'' تھریسا نے دبی زبان میں اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی۔ ''کیا افضل خان کے مقابلے میں، جو آپ کے اعتماد کو دھوکا دینے پر تل گیا تھا...... آپ آغا منظور کو اعتماد میں نہیں لے سکتیں، جبکہ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے وہ آپ کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ مسٹر سراج بھی اس ضمن میں آپ کو اشارہ دے چکے ہیں۔''

میڈم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھریسا کا مقصد سمجھنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھری، کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی پھر بڑے اعتماد سے دبی زبان میں کہا۔

''تھریسا...... مائی ڈیئر، تم اس راز سے واقف ہو کہ میں اپنے مرحوم شوہر کے قاتل سے انتقام لینے کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ افضل خان کو بھی کام کا آدمی سمجھ کر میں نے ایک جوا کھیلا تھا لیکن اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے...... اس کے علاوہ ایک عورت کیا ایک بار دھوکا کھانے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں کسی دوسرے مرد کے سامنے بھی زبان کھول سکتی ہے......؟ اس کے ساتھ ہی ابھی یہ بات بھی پوری طرح واضح نہیں ہے کہ آغا منظور کس حد تک بگ باس کی دشمنی مول لے سکتا ہے...... مسٹر سراج نے یہ ضرور کہا ہے کہ اب وہ بھی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے فارمولے پر عمل کرنے پر آمادہ ہے لیکن کیا میرا براہ راست اس سے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کرنا مناسب ہوگا؟''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی دن کسی بہانے سے اسے یہاں کھانے پر بلانے کی کوشش کروں۔''

''کیا بہانہ کروگی؟''

''پہلی بار جب مسٹر سراج نے آپ کو افضل خان کی بلڈنگ کے باہر والے ناخوشگوار واقعے سے محفوظ کیا تھا۔ اس وقت وہ آغا منظور ہی کی ہدایت پر آپ کی نگرانی پر مامور تھا، لیاقت حسین نجات دہندہ بن کر سامنے آگیا۔ اب مسٹر سراج بھی بم بلاسٹ کے سبب بستر پر ہیں اور لیاقت حسین پر بھی قاتلانہ حملے کی اطلاع آپ کو سراج سے مل چکی ہے۔ ہم ان تمام موضوعات پر بھی بات کر سکتے ہیں۔ مل بیٹھنے کے بعد اور بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کو بھی آغا منظور کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع میسر آجائے گا۔''

''ٹھیک ہے...... تم اگر یہی مناسب سمجھتی ہو تو لو......'' میڈم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''بہت دنوں سے لوچن اور ڈوما بیکار بیٹھے ہیں...... انہیں واپس بھیج دیا جائے؟''

''نہیں......'' میڈم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''میں انہیں ایک آخری بار اور استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں کل تک اس پروگرام سے بھی مطلع کردوں گی۔''

تھریسا جانے کے ارادے سے اٹھی تو میڈم نے اسے روک کر کہا۔

''پہلی ملاقات میں تم اشاروں کنایوں میں بھی آغا منظور کو گھر بلانے کے بارے میں کچھ نہیں کہوگی۔''

''اتنا میں بھی سمجھتی ہوں کہ ہمیں دوسرا قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔ میز پر ایک ساتھ بیٹھیں گے تو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ خود آغا منظور بھی اس دعوت کو کس پس منظر میں دیکھتا ہے۔'' تھریسا نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دور اندیشی کی بات کی پھر قدم اٹھاتی اسٹڈی سے نکل گئی۔

☠☠☠

لیاقت حسین کو سراج کے مکان پر چھوڑنے کے بعد اورنگ زیب نے سرسری طور پر سراج کو مختصر واقعات سے آگاہ کیا پھر سیدھا متعلقہ تھانے پہنچا سب انسپکٹر اس کو اس کمرے تک لے گیا جہاں زخمی مجرم ننگے فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کو دیکھا تو تڑپ کر بولا۔

''میرے پاؤں بھلے بندھے رکھو لیکن ہاتھ کھول دو تاکہ اپنے زخموں کو کھجا سکوں۔''

''میں آگیا ہوں، اب تمہاری کھجلی بھی دور ہو جائے گی۔'' اورنگ زیب کے اشارے پر کمرے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ ٹارچر کرنے والے دو سنگدل اور تجربے کار سپاہی کمرے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ سب انسپکٹر بھی موجود رہا۔

''جس آدمی نے تمہارے آدمیوں کو تنہا بھون ڈالا تھا وہ تمہاری آتی جاتی سانسوں کو بھی ختم کر سکتا تھا لیکن تم نے زبان کھولنے کا وعدہ کر کے وقتی طور پر زندگی کی بھیک مانگی تھی جو تمہیں مل گئی۔ اب کیا ارادہ ہے؟'' اورنگ زیب نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ''زندگی یا موت......''

''میں تم سے اکیلے میں بات کرنا پسند کروں گا۔'' زخمی نے ہونٹوں کے سامنے جمتے خون کے لوتھڑوں کو ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ''کیوں؟...... اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو گے۔''

اورنگ زیب نے زخمی کو غور سے دیکھا پھر اس نے سب انسپکٹر سمیت سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرا خالی ہونے کے بعد زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے زندگی کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے لیکن کوئی وجہ تھی جو میں نے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔''

''لیکچر نہیں...... سیدھی طرح میرے سوالات کے جواب دو۔'' اورنگ زیب نے بگڑے ہوئے تیور سے اسے مخاطب کیا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''تم ٹیڑھی کھیر ہو۔ یہ بات ہمارے بڑوں کو بھی معلوم ہے۔'' زخمی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میں بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے زبان کھولی یا بند رکھی۔ دونوں ہی صورتوں میں مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا شاید...... اسی لیے میں نے وقتی طور پر کسی مصلحت سے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ اسے میری بزدلی سے تعبیر نہ دینا۔''

اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ کچھ توقف سے بولا۔ ''تم نے تنہائی میں بات کرنے کی شرط کیوں لگائی تھی؟''

''کالی بھیڑیں ہمارے ساتھیوں میں بھی ہیں۔'' زخمی نے پھر منہ صاف کرنے کی خاطر فرش پر تھوک کر کہا۔ ''تمہارے لوگ بھی نوٹ کی گڈیوں کی خوشبو سونگھ کر ایمان بیچ دیتے ہیں...... ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہے۔''

''اب کیا کہنا چاہو گے؟''

''جو ساتھی مر چکے ہیں ان میں میرا نام بھی شامل کرا دو...... اس کے بعد جب تک میری سانس چل رہی ہے تم کو مجھے کسی ایسی جگہ رکھنا ہوگا کہ ہمارے کسی بڑوں کو بھی میری زندگی کی بھنک نہ ملے۔''

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو......؟''

''جس کی بولی سب سے زیادہ......'' زخمی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر کر تلخیوں میں تبدیل ہوگئی۔ ''جو قانون کی نظروں میں انعام یافتہ مجرم قرار دے دیا جائے پھر ضرورت مندوں میں اس کی بولی بھی چڑھ جاتی ہے۔''

''میں نے کہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔'' اورنگ زیب نے ایک بار پھر بگڑے ہوئے تیور سے اسے اپنی حیثیت اور قیمتی وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''آرام سے بات کرو آفیسر...... میں بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے زندگی طلب کی تھی۔'' زخمی کے تیور بھی بدلنے لگے۔ ''اگر تمہارے پاس میری بات سننے کے لیے وقت نہیں ہے تو پھر اپنے آدم خور کتوں کو دوبارہ اندر بلالو۔ میں اب تم سے رحم یا زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔''

اورنگ زیب تلملا کر رہ گیا لیکن اس کی تجربے کار نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ زخمی کی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کمرے میں کچھ دیر موت کا سناٹا طاری رہا پھر اورنگ زیب نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کھل کر بات کرو...... لیکن وقت کا خیال بھی رکھو ورنہ ایک بار پولیس کی فائنل رپورٹ تیار ہو جائے تو اس میں ردوبدل کی گنجائش بھی بہت کم رہ جاتی ہے۔''

''جانتا ہوں......'' زخمی نے کراہ کر کہا پھر اورنگ زیب کی نظروں میں نظریں ڈال کر ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں کسی کی موت کی خبر سننے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ جس دن تم مجھے اس کی سانس اکھڑنے کی خوشخبری سناتا اسی دن مجھے تھوڑا ساز ہر فراہم کر دینا۔ میں ثابت کردوں گا کہ مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔''

''کس کی موت کی خوشخبری سننا چاہتے ہو؟''

''وہی جس نے لیاقت حسین کے ڈیتھ وارنٹ جاری کیے تھے...... وہ...... وہ تمہارے ساتھ بھی بہت جلد کوئی آخری مار کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔'' زخمی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم بھی اس کا نام جانتے ہو آفیسر۔''

''تمہاری زبان اس کا نام لیتے ہوئے کیوں لرز رہی ہے؟'' اورنگ زیب نے جھلا کر دریافت کیا۔

''م...... میں شیخ حامد کی بات کر رہا ہوں آفیسر...... جس نے تمہارے محکمے کی بڑی بڑی کرسیوں کو منہ مانگے داموں خرید رکھا ہے۔ کیا تم انکار کرو گے؟''

''نہیں......'' اورنگ زیب کے چہرے پر آکٹوپس کا نام سننے کے بعد ایک رنگ آکر گزر گیا۔

''مجھے تمہارا کھرا جواب سن کر خوشی ہوئی۔'' زخمی کی آنکھیں کسی بھید سے چمکنے لگیں۔

''تم نے جس مگر مچھ کا نام لیا ہے وہ خود سامنے نہیں آتا۔'' اورنگ زیب نے زخمی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اپنے خریدے ہوئے مجرموں کو آگ میں جھونکتا رہتا ہے۔ تم...... تم ان لوگوں کے نام سے بھی ضرور واقف ہوگے۔''

''سب کے ناموں سے کوئی واقف نہیں ہوتا لیکن میں دو تین نام ضرور جانتا ہوں۔'' زخمی نے درد کی شدت سے کراہ کر کہا۔ ''جو اس کا سب سے قابل اعتماد مہرہ تھا اسے ہمارے حلقوں میں بھی بلیک ٹائیگر کے نام سے پہچانا جاتا ہے لیکن تم

بھی جانتے ہو کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''
''اسپورٹس کار میں مارا گیا تھا؟''
''ہاں...... لیکن اس کی موت حادثہ نہیں تھی...... کسی نے اس حادثے سے قبل اسے شوٹ کر دیا تھا، مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے، تفصیل تم جانتے ہو گے۔''
''باقی دو تین کون ہیں؟''
''تین نہیں...... میں صرف دو کے نام جانتا ہوں۔'' زخمی نے کھنکار کر تھوکتے ہوئے جواب دیا۔ ''بلیک ٹائیگر کی جگہ کس کو ملی، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس وقت راجو نامی شخص کی گڈی اونچی اڑ رہی ہے...... وہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا تھا لیکن تم...... تم بھی کسی اونچی کرسی سے ملنے والے حکم پر اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے...... میں نے غلط تو نہیں کہا۔''
آخری جملہ ادا کرتے وقت زخمی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بھی ابھر آئی تھی۔
''ہاں...... ایسا ہی ہوا تھا مگر میں نے بھی اس حکم کی پیروی کچھ سوچ سمجھ کر کی تھی۔'' اورنگ زیب نے بھی جواب میں مسکرا کر کہا۔ ''تم راجو کی موت کی خبر بھی بہت جلد سن لو گے۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔''
''ایسی بات نہیں ہے آفیسر......'' زخمی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''اوپر تک کنکشن ملا ہو اور پیچھے کھونٹا مضبوط ہو تو کچی گولیاں بھی پکی ہو جاتی ہیں۔ تم لوگ بھی ہم پر اسی لیے جال نہیں ڈالتے کہ ہمارے گرو گھنٹال کا کھونٹا بھی مضبوط ہے لیکن ایک مشورہ میرا بھی سن لو...... راجو کی موت ہمارے کھونٹے کی بیٹھک پر پیاز کترنے سے کم نہیں ہو گی۔ ایک بار چوکنا ہونے کے بعد وہ بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں بھی صورت نظر آتے ہی گولی مار دینے کا حکم صادر کر دیا جائے۔ فی الحال وہ بھی تمہارے کھونٹوں کی وجہ سے رعایت سے کام لے رہا ہے۔''
''دوسرا کون ہے......؟'' اورنگ زیب نے اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے ہوئے پوچھا۔
''میں نے اسے دیکھا نہیں لیکن بلیک ٹائیگر کے بعد وہ نمبر دو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔'' زخمی نے رک رک کر اطمینان سے جواب دیا۔ ''کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں وہ پولیس ریکارڈ پر اسلم ڈنکا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔''
''تم کس نام سے مشہور تھے؟'' اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''مرنے والے اپنا نام نہیں بتایا کرتے آفیسر۔'' [زخمی] معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تم میرا بھی کاغذی خانہ پری کرنے کی خاطر کسی بھی مجرم کے کھا[تے] میں ڈال دینا۔ کیا فرق پڑے گا؟''
''کتنی دیر تک سانس روک سکتے ہو؟''
''کبھی اس کی پریکٹس نہیں کی مگر تم اپنے بھنگیوں کو میر[ی] لاش سمیٹنے کے لیے بلا لو۔ دو منٹ یا اس سے کچھ اوپر تک [...] سانس روکنے کی کوشش بھی کر لوں گا۔''
''ایک بات اور......'' اورنگ زیب نے کچھ سوچ [کر] سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔ ''شبنم نامی لڑکی تمہارے گرو گھنٹال کے پاس کام کرتی تھی وہ آج کل کہا[ں] غائب ہے؟''
''اس کو تلاش کرنے کی ذمے داری بھی نمبر دو کو دی گ[ئی] ہے...... یہ بھی سنا ہے کہ گرو گھنٹال نے تمہارے ڈی آئی جی یہی کام سونپا ہے۔''
''ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی گاڑی پر اسپتال کے قریب کس نے بم کا دھماکا کیا تھا؟''
''وہ تم لوگوں کو صرف وارننگ کے لیے تھا۔'' زخمی نے سانس درست کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر مارنا مقصو[د] ہوتا تو تم دونوں اس وقت زندہ بھی نہ ہوتے...... میں غلط بیانی نہیں کر رہا۔ جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ بھی نمبر [دو] کے خاص آدمی تھے جو کبھی اوچھا وار نہیں کرتے۔''
''ٹھیک ہے، تم مرنے کو تیار ہو جاؤ، میں بھنگیوں کو بلا[تا] ہوں۔'' اورنگ زیب نے مدھم آواز میں کہا پھر دروازہ کھول کر کچھ فاصلے پر موجود سب انسپکٹر کو بلا کر کہا۔ ''آپ کسی پرائیویٹ ایمبولینس کو کال کر لیں۔ زخمی کی لاش میں خو[د] ٹھکانے لگانے کے لیے لے جاؤں گا۔ اس عرصے میں بھنگیوں کو طلب کر لیں مگر زبان بند ہی رکھیں۔''
''میں سمجھتا ہوں سر...... آپ کے حکم کے خلاف ورزی نہیں ہو گی۔''
سب انسپکٹر کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے دوبارہ اندر آ کر کمرا بند کیا پھر انسپکٹر کو فون کر کے زخمی کو مردہ ظاہر کرنے کے سلسلے میں ضروری ہدایتیں دینے لگا۔ بیس منٹ بعد ایمبولینس آنے کی اطلاع ملی تو اورنگ زیب نے کمرے کا دروازہ دوبارہ کھول دیا، دروازے پر موجود دو بھنگی اس کے اشارے پر اندر آ گئے۔ زخمی نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ صرف سارا جسم اکڑا لیا بلکہ سانسیں بھی روک لی تھیں۔

☠☠☠

پستہ قد کا وہ فرنچ کٹ ڈاڑھی والا جس فور اسٹار ہوٹل [کے] گیسٹ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شیخ [...] کے مین آفس سے تین میل کے فاصلے پر تھا، فرنچ کٹ [ڈا]ڑھی کے علاوہ اس کے چہرے پر ناک سے ذرا نیچے بائیں [جان]ب والا سیاہ تل بھی اس کی گندمی رنگت کو اور اجاگر کر رہا [تھا]۔ اس نے اس وقت اسی قسم کا اسپورٹنگ لباس زیب تن [کیا] تھا جو عام طور سے گولف کھیلنے والے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ [آن]کھوں پر موٹے فریم کی عینک اس کے چہرے پر بے حد [بھد]نما نظر آ رہی تھی۔ جس انہماک سے وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا [اس]سے بہ ظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی [فرص]ت ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سنہری بیگ بھی موجود [تھا]۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔
ٹھیک دس بج کر پینتالیس منٹ پر فرنچ کٹ ڈاڑھی [وا]لے کا موبائل وائبریٹ ہوا تو اس نے فوراً ہی اسکرین پر [نمب]ر دیکھ کر اسے آن کر لیا۔ ''ہیلو...... کیا پروگرام ہے......؟'' [اس]نے ادھر ادھر دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔
''میں گیٹ نمبر دو کے باہر سیاہ رنگ کی وین میں موجود [ہ]وں، اس پر ایک کوریئر سروس کا نام لکھا ہو گا۔ تم آ کر پچھلے [حص]ے میں بیٹھ جانا پھر پروگرام بھی فائنل کر لیں گے۔ وین کے [ڈ]رائیور سے کوئی بات مت کرنا۔''
''او کے......'' فرنچ کٹ ڈاڑھی والے نے جو لوچن [...] کے سوا کوئی اور نہیں تھا، موبائل آف کیا۔ سنہری بیگ اٹھا کر [ک]اندھوں سے لٹکایا پھر گیٹ نمبر دو کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ [پ]انچ منٹ بعد وہ باہر نکلا تو سیاہ وین سامنے ہی پارک تھی، وہ [خ]اموشی سے وین کی پشت پر گیا۔ شاید اسے آتا دیکھ لیا گیا تھا [...]جو پشت کا دروازہ کھول دیا گیا، لوچن خاموشی سے اندر داخل [ہ]وا۔ پچھلے حصے میں سرتاپا سیاہ چست لباس میں موجود شخص [...]ڈوما تھا جس نے سیاہ وین کے حرکت میں آنے کے بعد لوچن سے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔
''تمہیں سیون اسٹار کی جانب سے کوئی نئی ہدایت تو نہیں ملی؟''
''نہیں......'' لوچن نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہمیں صرف مین آفس کو تباہ کرنے کا کام سونپا گیا ہے وہ بھی اس طرح کہ پوری عمارت کو، خاص طور سے بگ باس کے خاص آفس کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔''
''تمہارا کیا خیال ہے؟'' ڈوما نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا اس عمارت اور بگ باس کے آس پاس اس کی نگرانی کی خاطر گارڈز اور مسلح چوکیدار نہیں ہوں گے؟''
''یقیناً ہوں گے۔'' لوچن نے کہا۔ ''نہ ہوتے تو یہ کام سستے داموں کسی مقامی بدمعاش سے بھی لیا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس کے لیے خاص احتیاط اور دور اندیشی سے کام لینا ہو گا۔ باقاعدہ ٹکراؤ کا قوی امکان ہے۔''
ڈوما نے فوری کوئی جواب نہیں دیا۔ لوچن بھی کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''میرا ذاتی خیال ہے کہ اس مہم کے بعد ہماری چھٹی بھی کر دی جائے گی۔''
''تمہیں کس طرح اندازہ ہوا؟'' ڈوما نے اسے چونک کر وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
''ایسے چھوٹے موٹے کاموں میں ہم جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مقامی لوگ زیادہ کارآمد ہوتے ہیں۔ بہرحال اب میں خود بھی اکتا گیا ہوں۔''
''کیا تم نے اس عمارت کے پورے حصوں کو اندر باہر سے دیکھ رکھا ہے؟'' ڈوما نے سوال کیا۔
''تم نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔'' لوچن نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''البتہ ہمیں جو نقشہ فراہم کیا گیا ہے اور جن حصوں کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے اس کا بہ غور جائزہ لے چکا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بگ باس کے مخصوص آفس کو نشانہ بنانے کی خاطر ہم میں سے ایک آدمی کو عمارت کے پچھلے حصے کی جانب جانا ہو گا۔ دوسرے کے لیے صدر دروازے سے اندر داخل ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمیں اسلحے کے علاوہ ان پلاسٹک بموں کا استعمال بھی کرنا ہو گا جو آگ بھڑکانے کے کام آتے ہیں۔ کیا تم نے پوری تیاری کر لی ہے؟''
''ہاں، میں کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہوں۔'' ڈوما نے ایک پل توقف کے بعد سوال کیا۔ ''تم کس حصے کی طرف سے ایکشن شروع کرنا پسند کرو گے؟''
''پچھلے حصے سے۔'' لوچن نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم مجھے اسی طرف ایک بلاک چھوڑ کر اتار دینا۔ میں پچھلے حصے میں آگ لگانے کے بعد وہاں موجود گارڈز اور نگرانی کرنے والوں کو یہی تاثر دوں گا کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں اور پچھلے حصوں کو خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ ایسی صورت میں صدر دروازے کی نفری بھی پچھلی طرف توجہ دے گی۔ تم اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر عمارت میں داخل ہو سکتے ہو، دو چار آدمیوں کو پھر بھی ختم کرنا ضروری ہو گا اس میں کوئی رعایت نہ کرنا۔''

''رائٹ......'' ڈوما نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔
''طے شدہ پروگرام یہ ہوگا کہ ہم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اپنا کام شروع کریں گے اور ہر حال میں بارہ بجے تک اپنی اس وین تک پہنچیں گے جو قریبی پوسٹ آفس کی عمارت کے عقب میں ہماری منتظر ہوگی۔ او کے۔''
''او کے۔'' لوچن نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''ہم طے شدہ وقت کی ہر حال میں پابندی کرنے کے عادی بھی ہیں لیکن...... اگر کوئی ایک فریق کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا تو دوسرا کیا کرے گا......؟''
''وہ آخری فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔'' ڈوما نے صاف گوئی سے کہا پھر وہ دونوں ہی اپنے سفری بیگ میں موجود پلاسٹک بم اور دیگر ضروری چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ دونوں کے چہروں سے سکون ہی سکون ظاہر ہو رہا تھا۔ ڈوما نے گیارہ بج کر دس منٹ پر لوچن کو مطلوبہ عمارت سے ایک بلاک پیچھے اتارا اور خود اگلی نشست پر بیٹھ کر اپنی پوزیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔

لوچن نے وین سے اترنے کے بعد اس طرح طویل انگڑائی لے کر جسم کے مختلف حصوں کو گھمایا جیسے وہ طویل سفر کے بعد اپنے اوپر طاری ہونے والی تکان دور کر رہا ہو۔ اس عمل سے فارغ ہوتے وقت اس نے نظریں گھما پھرا کر قرب وجوار کا جائزہ بھی لے لیا پھر نہایت سکون سے سیٹی پر ایک مغربی ٹیون الاپتا ہوا اگلے بلاک تک پہنچنے کی خاطر شارٹ کٹ استعمال کرتا قدم بڑھانے لگا۔ گیارہ بج کر بیس منٹ پر وہ مطلوبہ عمارت کے عقبی حصے کی سامنے والی فٹ پاتھ پر موجود تھا۔ اس کے شبہے کے عین مطابق مطلوبہ عمارت کی پشت پر بھی دو گارڈ لیفٹ رائٹ کرنے میں مصروف تھے، لوچن کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں رینگ گیا جہاں اس کا خطرناک آٹومیٹک موجود تھا جس کے ذریعے وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر ایک منٹ میں چھ فائر کرسکتا تھا۔ ایک پل میں اس نے آخری فیصلہ کیا پھر دوسری فٹ پاتھ کی سمت جانے لگا۔ دونوں گارڈز اسے روڈ کراس کرتے دیکھ کر رک گئے۔ ان دونوں کی نظریں لوچن پر مرکوز تھیں جو اس وقت بھی بہ ظاہر سیٹی بجانے میں مگن تھا۔
''ہالٹ......'' ایک گارڈ نے رائفل سیدھی کر کے لوچن کو دبنگ آواز میں مخاطب کیا۔ ''تم کون ہو...... کہاں جاتا ہے؟''
لوچن جواب دینے کے لیے سوچ رہا تھا جب کہیں سے ایک فائر ہوا جس نے لوچن سے سوال کیا تھا وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہوگیا۔ دوسرے گارڈ نے پوزیشن لینے کی کوشش... اتنی دیر لوچن کے لیے کافی تھی، اس نے آٹومیٹک نکال... کیا، دوسرا گارڈ بھی موت کی نیند سوگیا۔ لوچن کے... بات حیرت انگیز تھی کہ پہلے گارڈ کو مارنے والا کون تھا... دوست ہی رہا ہوگا، دشمن ہوتا تو ان دونوں گارڈز کے... اس وقت لوچن خود دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوچکا... گارڈ پر کسی رائفل سے چلائی جانے والی گولی کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ لوچن کے سوچنے کا زیادہ وقت نہیں تھا اس نے سفری بیگ... پلاسٹک بم نکالے، دانت سے ان کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس... کے بعد دیگرے ان کو شیخ حامد کے آفس کی دیوار پر... آتش گیر مادہ ایک شعلے کے روپ میں بھڑک اٹھا۔ تیر... اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر آفس کی شیشے کی کھڑکی پر... اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ اندر سے شعلے اٹھے اور شیشوں... ٹکڑے ٹوٹ کر نیچے گرنے سے چھناکے کی آواز... ابھریں۔ لوچن حفظ ماتقدم کے طور پر سڑک پر اوندھا ہو... تیزی سے کہنیوں کے بل رینگتا ہوا پہلی فٹ پاتھ پر آ... اس کی وہ احتیاط بروقت ثابت ہوئی، جلتی ہوئی عمارت... دائیں موڑ سے ایک جیپ برق رفتاری سے گھوم کر تیزی... اس سڑک پر آگئی جس پر ایک طرف خود لوچن اور دو... جانب دو مردہ گارڈز کی لاشیں پڑی تھیں۔ جیپ میں تین... گارڈ ہی نظر آ رہے تھے۔ لوچن نے برق رفتاری سے... اور پلاسٹک بم نکالا۔ جیپ کچھ فاصلے پر تھی، مگر اس کی... میں آگئی تو اس نے بم کو اس طرف اچھالا پھر آٹومیٹک... ریپڈ فائرنگ بھی شروع کردی، آگ کے شعلوں... ابھرتے ہی جیپ بھی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ لو... نے تیزی سے لپک کر بلڈنگ کے کونے پر پہنچ کر اس کی... لے لی ورنہ دوسری جانب سے اندھا دھند ہونے... فائرنگ کی لپیٹ میں بھی آسکتا تھا۔ جو گارڈ جلتی ہوئی جیپ... سے زخمی حالت میں زندہ بچے ہوں گے۔ ان کی کھوپڑی... الٹ جانا بھی یقینی امر تھا، لوچن نے آٹومیٹک کا میگزین... پھر آگے بڑھنے والوں کو روکنے کی خاطر لگاتار فائرنگ کی... کے بعد پلٹ کر دوڑنے لگا۔ وہ اپنے حصے کا کام کرچکا تھا... حامد کا ذاتی آفس اور اس کا فلور پوری طرح آگ کی... لپیٹ میں تھا۔ سڑک عبور کرنے کے بعد وہ رک گیا۔ ا... لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا... اس کے ذہن میں یہ سوال بھی رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ جس... پہلی گولی گارڈ پر چلائی وہ کون تھا؟ وہ ان ہی خیالوں میں...

...جب اچانک عقب سے کچھ آہٹ سن کر چونکا لیکن اسے... ہوچکی تھی، عقب سے سر پر کیا جانے والا حملہ اتنا بھرپور تھا... وہ چکرا کر رہ گیا پھر اس نے جب خود کو دو تین باوردی اور... پولیس والوں کے چنگل میں دیکھا تو اسے دن میں... نظر آگئے۔ اس کے سفری بیگ میں آٹومیٹک کے... میگزین کے علاوہ ایک دو دستی بم اب بھی موجود تھے۔ ...بھی جانتا تھا کہ اس کا پولیس کے ہاتھوں لگنا سیون اسٹار کو... طور پر پسند نہیں آئے گا۔ خود بھی وہ اس کے لیے آمادہ ...تھا۔ مگر اس نے وقتی طور پر کچھ دیر کے لیے خود کو ان کے ...رحم وکرم پر چھوڑ دیا پھر سانس درست کرنے کے بعد پوچھا۔
''مجھے کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو......؟''
''پریشان مت ہو......'' ایک بڑی بڑی مونچھ والے ...پولیس مین نے کہا۔ ''تھانے چل کر ہم اپنی تسلی کرلینے کے بعد ...تمہارے سوالات کے جواب بھی دیں گے۔ ابھی اپنی ...چونچ بند ہی رکھو۔''
لوچن پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرے پولیس والے نے ایک جھٹکے سے اس کا بیگ اتار لیا۔ اس افتاد کے بعد لوچن نے سختی سے اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب اس کے ...ذہن میں ڈوما کا خیال ابھر رہا تھا۔ پولیس والے اسے دبوچ ...کر کچھ دور لے گئے پھر ایک پولیس جیپ قریب آکر رکی تو ...پولیس والوں نے اس کی تفصیلی تلاشی لینے کے بعد دھکے مار کر ...جیپ میں بٹھا دیا۔ ہاتھ پشت پر کر کے ان میں ہتھکڑیاں بھی ...ڈال دی گئیں۔
''تم اکیلے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔'' ...اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک پھول والے نے پلٹ کر اسے ...تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔
''تھانہ آ جانے دو، پھر اطمینان سے پوری کہانی بھی سنا ...دوں گا۔'' لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا۔
''کیا حکم ہے صاحب......؟'' مونچھ والے نے اپنی مخصوص زبان میں ایک پھول والے افسر سے پوچھا۔ ''ابھی سے اس کی چھترول نہ شروع کردیں؟ تھانے پہنچنے تک اس کا سارا کلف بھی اتر جائے گا۔''
''نہیں......'' اے ایس آئی نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ خاص مجرم نظر آتا ہے۔ ہمارے بڑے افسران اس سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ میں نے انہیں فوری طور پر حادثے کی اطلاع کردی تھی۔''
ٹھیک اسی وقت ڈوما صدر دروازے پر موجود مسلح گارڈز کو موت کے گھاٹ اتار کر عمارت میں داخل ہوچکا تھا، بلڈنگ کی عقب سے کچھ ہنگامہ خیز۔ آوازیں اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں لیکن جو مہم اسے سونپی گئی تھی وہ اسے ادھورا چھوڑ کر جانے کے لیے خود کو آمادہ نہ کرسکا، عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا تھا جب کسی چیز کے جلنے کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ لوچن پشت کی جانب آگ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ڈوما کے ذہن میں ابھرنے والا یہ احساس ہی اس کے خون کو گرما گیا، اس نے اپنی رفتار اور تیز کردی، پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے دفتر کے بیرونی دروازے کو آزمایا جو بند نہیں تھا، ممکن ہے اندر کچھ افراد موجود ہوں، اس نے اپنے آٹومیٹک کے دستے پر گرفت مضبوط کی پھر دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہو کر بغلی دیوار سے چپک گیا، اگلا قدم اٹھانے سے پیشتر وہ وہاں کی سن گن لینا چاہتا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ ریسپشن ہال تھا، اندھیرے کے سبب اسے ہر چیز واضح طور پر نظر نہیں آرہی تھی، وہ دو منٹ اسی پوزیشن میں کھڑا رہا پھر سامنے کا ایک دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی آگ کی لپٹ کی روشنی بھی نظر آگئی جو اندرونی حصے میں کہیں لگی تھی، دروازہ کھلتے ہی دو افراد بھی اس کے سامنے آگئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔
''مجھے میں نہیں آتا کہ ہمارے دوسرے آدمی کہاں مر کھپ گئے۔ دو گارڈز پشت پر بھی تعینات تھے، مسلح افراد کی جیپ بھی راؤنڈ پر تھی۔ پھر یہ آگ......''
''میں نے فائر بریگیڈ کو فون کر دیا ہے مگر......'' دوسرے کے لہجے سے بھی وحشت ٹپک رہی تھی۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ بگ باس رات کی ڈیوٹی دینے والوں میں سے کسی ایک کو بھی معاف کرسکے گا۔ ایک دو کی غلطی کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔''
''ادھر دفتر کے اندر بھی ہمارے تین چار آدمی تھے، وہ کہاں گئے؟'' پہلے نے مردہ آواز میں سوال کیا۔
''وہ...... وہ شاید کبھی تانے سو رہے ہوں گے۔'' دوسرے نے جھلا کر کہا۔ ''میں پولیس کو بھی فون کرتا ہوں۔''
اپنا جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اس نے جیب سے غالباً اپنا موبائل نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ کراہتا ہوا فرش پر ڈھیر ہوگیا۔
''ٹچ'' کی مدھم آواز ہونے کے باوجود اس کا دوسرا ساتھی جو یقیناً پروفیشنل ہی تھا، خطرے کی بو سونگھ کر تیزی سے زمین پر لیٹ گیا، اس نے حیرت انگیز طور پر رائفل پکڑے

پکڑے دو کروٹیں تبدیل کیں پھر جدھر سے "پچ" کی آواز ابھری تھی ادھر اندازے ہی سے فائر بھی کر دیے۔ ڈوما نے ایک پل کی دیر کی ہوتی تو دونوں گولیاں اس کے جسم میں ہی پیوست ہوتیں۔ موبائل نکالنے والے کو نشانہ بنانے کے بعد ہی اس نے پھرتی سے اپنی پوزیشن تبدیل کرلی تھی۔ رائفل بردار کی توجہ منتقل کرنے کی خاطر اس نے دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا آتشی پلاسٹک بم بھی بچ جانے والی عقبی دیوار پر اچھال دیا، ہلکے دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی کئی بھڑکتے شعلے لپکے تو پورا ماحول جگمگا اٹھا۔ رائفل والے کی نظریں شعلوں کی طرف اٹھی تھیں کہ ڈوما کے آٹومیٹک سے نکلی ہوئی دوسری گولی اس کے وجود کو نگل گئی۔ شعلوں کی روشنی میں میدان بہ ظاہر صاف نظر آیا تو ڈوما نے بیگ سے دو گولے نکال کر دائیں بائیں اچھال دیے۔ شعلوں کے بلند ہوتے ہی وہ اٹھ کر تیزی سے نیچے واپس جانے والے زینوں کی طرف لپکا، اسے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اپنا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ اسے مکمل اعتماد تھا کہ آتش گیر مادہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پورے فلور کو شعلوں کی لپیٹ میں لے لے گا، اس سے پیشتر ہی وہ عمارت سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن چار چھ زینے طے کرنے کے بعد ہی اس کی پشت پر بائیں شانے کے قریب جیسے کسی نے لوہے کی سلاخ اتار دی ہو۔ درد کی شدت سے کراہتا ہوا وہ زینوں پر گرا تو بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ کسی نے پشت ہی سے اسے سائیلنسر لگے اسلحہ سے نشانہ بنایا تھا، سیڑھیوں پر قلابازیاں کھاتے ہوئے بھی اس کا ذہن نہ صرف پوری طرح بیدار تھا بلکہ اس نے آٹومیٹک کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا پھر ایک ذرا سنبھلتے ہی اس سمت فائر کر دیے جدھر سے دشمن نے گولی چلائی تھی، اس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ ایک انسانی جسم چکراتا ہوا سیڑھیوں پر گرا پھر تیزی سے سیڑھیوں پر رول کرتا ہوا ڈوما کے قریب آکر ڈھیر ہوگیا۔ اسی لمحے زینوں کے تیز پاور کی روشنی بھی آن ہوگئی، ڈوما نے حیرت انگیز پھرتی سے بلب کا نشانہ لیا لیکن روشنی کرنے والا اس پر سبقت لے گیا، ڈوما کے فائر کرنے کی حسرت پوری ہوگئی لیکن اس کا نشانہ چوک گیا تھا، اس کی وجہ دشمن کی جانب سے کیا جانے والا فائر تھا جس نے اس کے سیدھے بازو کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آٹومیٹک ڈوما کے ہاتھ سے نکل گیا، اس کے باوجود اس نے تن بہ تقدیر خود کو سیڑھیوں پر گرا دیا، اوپر سے فائر ہو رہے تھے لیکن ڈوما اس وقت تک قسمت سے بچتا رہا جب تک وہ درمیانی لینڈنگ تک پر نہیں پہنچ گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو گولیاں اس کے جسم کے آر پار ہوگئیں۔ زینوں سے دو گارڈز رائفلیں تانے اس کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تھے ان کے چہروں سے خوف ہی عیاں تھا۔ شاید آفس سے والے شعلوں کی لپک ان کے مستقبل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔

"تت...... تم جیت کر بھی ہار گئے۔" ڈوما نے ز[illegible] سے لہجے میں کہا۔ "تمہارا باپ تمہیں مجھ سے زیادہ [illegible] ناک موت سے دو...... دو...... دو چار کرے گا۔ بار[illegible] باسٹرڈس۔"

"تم نے یہ کام کس کے اشارے پر کیا ہے؟" رائفل بردار نے ڈوما سے گرج کر سوال کیا۔

"یو آر رانگ...... سن آف اے...... بچ۔" اکھڑتی ہوئی سانس سنبھال کر فاتحانہ انداز میں بولا۔ "جس کا نمک کھاتے ہیں، جس کو ایک بار...... زز...... دے دیتے ہیں اس سے...... دھو...... دھوکا نہیں کرتے۔"

"تمہارے ساتھ اور کون تھا......؟" دوسرے رائفل کے بٹ سے ڈوما کے زخمی کندھے پر شدید ضرب [illegible] دیوانوں کی طرح کہا۔ "حرام کے تخم...... مرتے وقت [illegible] ہمارے لیے کچھ آسانیاں پیدا کردو۔"

"آخ تھو......" ڈوما نے خون تھوکتے ہوئے حقا[illegible] سے کہا۔ "تت...... تت تم مرد ہو کر...... موت سے ڈر[illegible] ہو...... بلا ڈی سوائن۔"

جواب میں ان دونوں نے ڈوما کو بے تحاشا رائفل [illegible] بٹ سے دھنا پھر اس کو پھلانگتے ہوئے نیچے اتر گئے [illegible] سے کچھ آدمیوں کی تیز تیز بات کرنے کی آوازیں [illegible] تھیں۔ ڈوما نے بڑی مشکلوں سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ موبائل اس کے پاس ہی تھا۔ موبائل نکال کر اس نے [illegible] سم نکال کر منہ میں رکھ کر چبانا شروع کردیا۔ موبائل قد[illegible] میں ڈال کر اسے توڑا پھر خلا میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"گڈ...... گڈ...... بب...... بائی...... سیون[illegible] ون...... اس...... سس...... ٹٹ...... ٹٹ...... ٹا۔ ٹا۔"

سیون اسٹار کو پوری طرح گڈ بائی کہنے کی حسرت پو[illegible] کر سکا۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی لیکن اس کے مردہ ہو[illegible] پر اس وقت بھی جوان مردوں کی سی فاتحانہ مسکراہٹ جم[illegible] گئی تھی۔

✿✿✿

ریٹائرڈ میجر عاطف اس وقت کلب میں دوستوں کے ساتھ تفریح میں مصروف تھا جب اس کے

پر دارا رستم علی کی کال ریسیو ہوئی۔ پرائیویسی کی خاطر وہ دوستوں سے ایکسیوز کر کے تھوڑی دور چلا گیا۔ اسے شبہ تھا کہ دارا نے اسے بلا مقصد فون نہیں کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ رسمی دو چار جملوں کے بعد ہی دارا نے میجر عاطف کو باپ کی پریشانی سے آگاہ کر دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ پولیس ایس پی اورنگ زیب نے بھی رستم علی سے اس کے دفتر آکر ملاقات کی تھی۔

''ایس پی کی آمد کا مقصد کیا تھا؟'' میجر عاطف نے دریافت کیا۔

''ڈیڈ اور ایس پی کی ملاقات بند کمرے میں ہوئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ملاقات بھی کچھ خاص نوعیت ہی کی تھی۔''

''اب تم کس وجہ سے پریشان ہو؟''

''جو ٹینڈر میں نے بہرحال کسی نہ کسی طرح زیادہ آفر دینے کے باوجود حاصل کیا ہے اس نے شیخ حامد کو ضرور مشتعل کر دیا ہوگا۔ ڈیڈ کو یہی اندیشہ ہے، وہ مجھے اور روشنا کو باہر جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ دوسری صورت میں ممکن ہے وہ ٹینڈر کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔''

''آئی سی، گویا تمہارا یہاں سے چلا جانا شرط قرار دیا گیا ہے۔''

''ہاں...... لیکن فی الحال میں نے انکار کر دیا ہے۔''

''اب کیا چاہتے ہو؟''

''شیخ حامد کی تھوڑی سی گوشمالی تاکہ وہ ڈیڈ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔'' دارا نے بے حد سنجیدگی سے درخواست کی۔ ''تم یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتے ہو۔''

''ہو جائے گا۔'' میجر عاطف نے کہا۔ ''ڈونٹ وری لیکن ایک شرط پر......''

''وہ کیا......؟''

''تمہیں کلب کے لیے بھی تھوڑا وقت نکالنا پڑے گا۔ ہمارے سرکل کے اکثر لوگ تمہاری اور روشنا کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔'' عاطف نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کچھ دنوں بعد ہم ایک فینسی ڈریس پروگرام بھی ارینج کر رہے ہیں، تمہیں اور روشنا کو بھی اس میں حصہ لینا پڑے گا۔''

''رات کے کھانے پر آجاؤ۔ براہ راست روشنا سے بھی بات کر لینا، اگر وہ تیار ہوگئی تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا سمجھوں......؟ کیا شادی کے بعد سے روشنا نے تمہیں کنٹرول میں لے رکھا ہے۔'' میجر عاطف نے شوخی سے سوال کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے لیکن ڈیڈ پرانے وقت کے بزرگ ہیں، کلب میں آنا جانا پسند نہیں کرتے، روشنا ان ہی کی وجہ سے احتیاط کرتی ہے ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ اس نے کس شوق سے کلب جوائن کیا تھا۔ ہم نے اچھا خاصا ایک حلقہ بھی بنا لیا تھا۔''

''ڈونٹ وری...... تم روشنا کو راضی کر لو، میں انکل کو منا لوں گا۔ او کے، رات کھانے پر ملاقات ہو رہی ہے۔'' میجر عاطف نے موبائل آف کیا پھر دوستوں کے قریب جا کر اس نے دارا اور روشنا کو واپس کلب لانے کا دعویٰ کیا تو سب ہی نے ''تھری چیئرس فار میجر عاطف'' کا نعرہ بلند کیا۔

☠☠☠

اے ایس آئی نے تھانے پہنچ کر لوچن کے متعلق ماتحتوں کو ضروری ہدایت دی پھر وہ ایس ایچ او کے کمرے میں آگیا جہاں اس وقت ایس پی اورنگ زیب کے علاوہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج بھی موجود تھا۔ اے ایس آئی انہیں جائے وقوعہ سے متعلق بریفنگ دے رہا تھا۔ جب مرنے والے گارڈز اور ڈوما کی تصویروں کا سیٹ بھی آگیا۔ اورنگ زیب، اے ایس آئی سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ سراج نے تصویریں الٹنی پلٹنی شروع کر دیں۔ ڈوما کی تصویر سامنے آئی تو وہ چونکا۔ ہاشم کی موت کی تصدیق کرتے وقت ملکی ایئر لائن نے جو معلومات اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کی تفصیل فراہم کی تھیں، ان میں ڈوما کی تصویر بھی شامل تھی، اب ڈوما سامنے آیا تھا تو لاش کی تصویر کی صورت میں جس سے تیسرے مسافر کی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اے ایس آئی بریفنگ دے کر چلا گیا تو سراج نے اورنگ زیب کو بھی ڈوما کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

''آئی سی!'' اورنگ زیب نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''گویا تین میں سے دو مر چکے ہیں۔ اب صرف ایک باقی ہے لیکن...... کیا آپ کو اندازہ ہے کہ یہ تینوں کس پارٹی کے لیے کام کر رہے تھے......؟''

''یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن حالات کی روشنی میں میرا ایک اندازہ ہے جو ممکن ہے غلط بھی ہو کہ یہ تینوں شاید میڈم کے لیے کام کر رہے تھے۔''

''کیا اب میڈم اس کا اقرار کر لیں گی؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ آپ کے اکسانے پر کم از کم جگا سے کام بھی لے رہی ہے۔''

''میں بعد میں میڈم کو بھی ٹٹولنے کی کوشش کروں گا، فی

الحال جو حملہ آور گرفتار کر کے لایا گیا ہے اس سے دو دو باتیں بھی ہو جائیں۔''

اے ایس آئی کی رہبری میں وہ اس کمرے تک پہنچے جہاں لوچن کو ایک لوہے کی کرسی پر پوری طرح کس کر باندھ رکھا گیا تھا۔ اس کرسی سے ہائی پاور کی بجلی کا ننگا تار بھی منسلک تھا جو مجرم کی زبان کھولنے کی خاطر بہت کارآمد ثابت ہوتا تھا۔

اورنگ زیب اور سراج کمرے میں داخل ہوئے۔ اے ایس آئی باہر ہی روک دیا گیا۔ سراج اس وقت لوچن کو سامنے زندہ حالت میں دیکھ کر دوبارہ چونکا۔ اورنگ زیب بھی لوچن کو غور سے دیکھنے لگا جو اس وقت بھی اس طرح بے پروا نظر آرہا تھا جیسے وہ قیدی نہ ہو۔ بس ایک لمحے کو...... لوچن کی نظروں میں بھی اورنگ زیب اور سراج کو سامنے دیکھ کر ایک چمک سی ابھری لیکن اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ''تم غیر ملکی ہو مسٹر......'' اورنگ زیب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے لوچن کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ ''مجھے اس بات کا تجربہ ہے کہ غیر ملکی مجرم ہونے کے باوجود کھل کر بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ مشرق والوں پر اپنی سابقہ برتری کا احساس انہیں اب بھی ہے۔''

''میں اس وقت غیر ملکی نہیں...... صرف مجرم ہوں آفیسر۔'' لوچن نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''تم مجھے بانس پر چڑھانے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں...... یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے جس پر دنیا کی کوئی طاقت اپنا عمل دخل مسلط نہیں کر سکتی۔''

''میری اطلاع کے مطابق تم نے شیخ حامد کے آفس کو آتش گیر مادے کے پلاسٹک بموں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔'' اورنگ زیب نے قدرے خشک لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ''اس کے علاوہ تم نے تقریباً پانچ بندے بھی مار دیے۔ تم کیا کہو گے؟''

''میں نے نفری کا شمار نہیں کیا، ممکن ہے پانچ کے ساتھ دو ایک اور بھی لپیٹے میں آگئے ہوں۔'' لوچن نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ''رہا شیخ حامد کا آفس تو اس کام کے لیے مجھے خاص طور پر تعینات کیا گیا تھا جو مجھے ہر قیمت پر کرنا تھا۔''

''کس کے اشارے پر......؟''

''ہم جس کو زبان دیتے ہیں اس کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ ہم اس کے نام سے واقف بھی نہیں۔ جو احکامات ملتے تھے اس کے لیے ایک خاص کوڈ ورڈ پہلے سے طے ہو گیا تھا۔''

''احکامات مرد کی آواز میں ہوتے تھے یا کبھی کبھی کوئی عورت بھی......'' سراج نے گھما پھرا کر کریدنے کی کوشش کی۔

''سوری آفیسر...... میں اس معاملے میں بھی زبان بند رکھنے کا عہد کر چکا ہوں۔'' لوچن نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تمہارے کچھ اور ساتھی بھی تھے...... ہیں۔'' اس بار سراج نے محتاط انداز میں لوچن کو مخاطب کیا۔

''اگین سوری آفیسر......'' لوچن عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''ہم بین الاقوامی سطح کے مجرم ہیں۔ مر جاتے ہیں لیکن دوسرے کا نام نہیں لیتے۔''

''کچھ دیر پہلے تمہارا ایک ساتھی اور بھی تھا جو فرار ہوتے وقت کام آگیا۔ اس کے حساب میں بھی کئی قتل درج کیے گئے ہیں۔'' اورنگ زیب نے ڈوما کی آخری تصویر نکال کر لوچن کو دکھائی۔ لوچن نے زبان سے کچھ نہیں کہا چہرہ آگے کر کے تصویر کو ہونٹوں سے چوم لیا۔ یہ بھی اس کا خاموش اعتراف ہی تھا۔

''تمہارا نام میری معلومات کے مطابق لوچن ہے؟'' سراج نے دوسرا سوال پوچھا۔

''ہاں......'' لوچن نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''اس بار میں نے اسی نام کا انتخاب کیا تھا۔ ایک بار جس نام کا انتخاب ہو جائے اسے ہم دوسرے معاہدے میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔''

''تمہارا ایک ساتھی، کچھ دنوں پہلے خودکشی کر چکا ہے۔'' سراج نے بات جاری رکھی۔ ''اس کی لاش ہمیں ایک پرائیویٹ ریسٹ ہاؤس سے ملی تھی۔''

''ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن...... اگر اس نے خودکشی کی ہوگی تو یقیناً اپنی کسی غلطی کے اعتراف کے بعد ہی کی ہوگی۔'' اس بار بھی لوچن نے گول مول جواب دیا۔ ''جو خودکشی انسان ہنسی خوشی اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ جس کی پشت پر اس کو احساس ہو کہ اس نے کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ ہماری نظروں میں قابل فخر ہوتا ہے اس لیے کہ ہم عام حالات میں کسی سے خوف زدہ ہو کر اس قسم کا بزدلانہ قدم نہیں اٹھاتے۔''

''جس جہاز میں تم یہاں آئے تھے اس کی فرسٹ کلاس میں صرف تین ہی مسافر تھے۔'' اورنگ زیب نے سراج کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ''دو کام آگئے...... تیسرے تم ہو......''

''جب تمہیں کسی ذریعے سے اطلاع مل گئی ہے تو پھر اب اپنا اور میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟'' لوچن کے لہجے میں یک لخت کرختگی آگئی۔ ''یہ وہم دل سے نکال دو کہ میں تمہاری سختیوں سے تنگ آکر خودکشی کرلوں گا۔ ویسے یہ بھی بتادوں کہ مرنا جینا بھی ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ ہم زبان کھولنے کے بجائے مردوں کی طرح مرجانا ہی پسند کرتے ہیں۔''

''اور اگر ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہیں تو......'' سراج نے سوال کیا۔

''یہ تمہاری مرضی کی بات ہے۔'' لوچن نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میں تمہارے سامنے رحم کی درخواست نہیں پیش کروں گا۔''

''زہریلا کیپسول......؟'' اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''اس کے علاوہ اور بھی بے شمار طریقے ہیں جن سے شاید تم لوگ ابھی تک واقف بھی نہ ہو۔''

''جگا کا نام کبھی سنا ہے؟''

''کبھی دیکھا نہیں...... صرف سنا ہے کہ اسے تمہارے جیل خانے کے گندے ماحول نے مجرم بنادیا ہے۔'' لوچن نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''اب بھی وہ قتل و غارت گری سے پرہیز ہی کرتا ہے۔''

''ایک اہم سوال اور......'' اورنگ زیب نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ''کیا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا آدمی تھا جس نے پہلی گولی چلا کر عمارت کے عقبی حصے پر دو گارڈ میں سے ایک کو ہلاک کیا تھا۔ اس کی موت رائفل کی گولی سے ہوئی تھی جبکہ تمہارے پاس سے آٹومیٹک پستول اور پلاسٹک بم ہی مل سکے ہیں۔''

''میں تمہاری معلومات کو چیلنج نہیں کروں گا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں بھی نہیں جان سکا کہ وہ کون مہربان تھا۔ اس نے بروقت کام نہ دکھایا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی تمہارے ہتھے نہ چڑھ پاتا، موت کی پرسکون نیند سو رہا ہوتا۔ ہوسکتا ہے اسے پوشیدہ طریقے سے ہماری حفاظت پر مامور کیا گیا ہو۔''

''ہم تمہیں تھرڈ ڈگری سے دوچار نہیں کریں گے۔'' اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''ایک شرط پر...... تم خودکشی نہیں کرو گے۔''

''تم سوچ لو آفیسر...... ہم کسی قسم کی بارگیننگ کرنے کو بھی اپنے اصول کے خلاف ہی سمجھتے ہیں۔''

''ہم بھی جلدی میں قدم اٹھانے سے گریز ہی کرتے ہیں۔'' اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر سراج کے ساتھ اٹھ کر باہر آگیا۔

''آپ کا لوچن کے بارے میں کیا اندازہ ہے......؟'' سراج نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

''کام کا آدمی ہے...... ہمیں اس کے ساتھ ممکنہ رعایت سے کام لینا ہوگا۔'' اورنگ زیب نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ''ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا تعلق میڈم روبی ہی سے ہوگا۔ آپ نے بھی دبی زبان میں شبہے کا اظہار کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میڈم نے لوچن اور اس کے ساتھی کو صرف آکٹوپس کے آفس کو آگ لگانے کا کام سونپا ہو اور جگا کے کسی آدمی کو ان کی حفاظت پر مامور کر دیا ہو جو اپنا کام کرکے نکل گیا ہو۔''

ایس ایچ او کے دفتر میں پہنچ کر اورنگ زیب نے ڈیوٹی انسپکٹر کو ہدایت دی۔

''آپ کوشش کرکے گرفتار ہونے والے مجرم کا کم از کم دس دن کا ریمانڈ حاصل کریں۔ اس کی نگرانی پر ذمے دار عملے کو تعینات کریں اور...... جب تک میں نہ کہوں آپ حضرات مجرم کے ساتھ کوئی سخت رویہ بھول کر بھی اختیار نہ کریں۔ دیگر معاملات میں آپ کو ضابطے کی کارروائی کرنے کا مکمل اختیار ہوگا۔''

''او کے سر......''

''ایک خاص بات اور...... مجرم کو ایسے لاک اپ میں رکھا جائے جہاں تک نگرانی کرنے والوں کے سوا کسی اور کی پہنچ ممکن نہ ہو...... کسی کو ملاقات کی اجازت بھی نہ دی جائے...... کوئی اثر و رسوخ استعمال کرے تو آپ فوری طور پر کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔''

''میں آپ کے حکم کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں سر...... آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب کچھ اور ضروری ہدایت دے کر اٹھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ ایس ایچ او نے کال اٹینڈ کی پھر ریسیور اورنگ زیب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈی آئی جی صاحب کی کال ہے سر...... آپ کے لیے۔''

''ہیلو سر......'' اورنگ زیب نے ریسیور لے کر بڑے سکون سے اٹینڈ کیا۔ ''اس وقت کیسے یاد کیا؟''

''ابھی آپ کے آکٹوپس کا فون آیا تھا۔'' ڈی آئی جی آغا منظور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا موبائل فون مسلسل

بند آرہا ہے۔ شاید سگنل نہیں آرہے ہوں گے۔ میں نے آپ کو گھر پر کال کیا وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ متعلقہ تھانے پر ملیں گے۔ آپ کو شاید اطلاع مل گئی ہوگی کہ کسی نے آکٹوپس کے فلور پر دونوں جانب سے حملہ کرکے وہاں آگ لگادی ہے، اس کے بیان کے مطابق اس کے گارڈز اور حفاظتی دستے کے دس بارہ آدمیوں کو بھی ہلاک کیا گیا ہے۔''

''ادھر ہی جارہا ہوں سر...... مرنے والوں کی گنتی بھی کرلوں گا۔ قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا ان کی تعداد کے بارے میں۔'' اورنگ زیب نے سرد انداز میں جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔ ''میرے لیے کوئی خاص ہدایت......''

''میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں لیکن...... ذرا ہاتھ ہلکا رکھیے گا۔ وہ اس وقت فون پر پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا، ہوسکتا ہے کہ اس نے ہمارے سلسلے میں مرکز میں اپنے واقف کاروں سے بھی الٹی سیدھی شکایتیں کی ہوں۔''

''فکر نہ کریں سر...... اگر کوئی آفت آئے تو آپ بلاتکلف میرا نام لے کر اپنی پوزیشن کلیئر کرسکتے ہیں۔'' اورنگ زیب کے چہرے پر بھی ناگوار تاثرات ہی ابھرے تھے۔ ''اوپر والوں کو میں سنبھال لوں گا۔''

''پھر بھی...... اگر مصلحت سے کام لیا جائے اس میں زیادہ دانش مندی ہوگی۔''

''اس کی ذمے داری بھی آکٹوپس کے طرزِ عمل پر ہوگی۔ اگر اس نے میری پوزیشن کا خیال نہیں کیا تو شاید مجھے کھلے الفاظ میں اسے بتانا ہوگا کہ ایک ذمے دار ایس پی کے کیا فرائض ہوتے ہیں اور وہ کس حد تک قانون کی طاقت کا استعمال کرسکتا ہے۔'' اورنگ زیب نے جملہ مکمل کرتے ہی دوسری جانب سے کسی بات کا انتظار کیے بغیر ریسیور رکھ دیا پھر سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا لمبے لمبے قدم اٹھاتا ایس ایچ او کے آفس سے نکل کر باہر کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کوئی بھی قانونی قدم اٹھانے سے قطعی دریغ نہیں کرے گا۔

راستے میں اس نے سراج سے بھی زیادہ بات نہیں کی۔ جائے وقوعہ پر پہنچ کر اس نے تمام زاویوں سے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا۔

فائر بریگیڈ نے پورے دفتر کو مکمل تباہ ہونے سے کسی حد تک بچالیا تھا لیکن جو کچھ تباہ ہوچکا تھا وہ بھی شیخ حامد کے زخموں پر کٹی ہوئی مرچ سے کم نہیں تھا۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت شیخ حامد اپنے گھر پر ہی بیٹھا فون کھڑکا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک ایک حصے کا جائزہ لیا پھر اس نے وہاں موجود پولیس آفیسر سے اپنے سامنے پوری رپورٹ بھی تیار کرائی۔ سراج بھی حتی الامکان اس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔

***

لیاقت حسین کی زندگی میں جو اچانک انقلاب آیا وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ فرحین سے شادی کے بعد وہ جس بے سروسامانی میں سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلا تھا اس وقت اس کے ساتھ ماں کی دعاؤں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت کے بعد اس کے برے دن دور ہوگئے تھے۔ اس نے انسانیت کے ناتے جو قربانیاں دی تھیں اس نے اسے سب کی نظروں میں معتبر بنادیا تھا۔ وہ مختلف حالات سے گزرنے کے بعد پرسکون زندگی گزار رہا تھا جب اسے اتفاقاً سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان کاروباری تعلقات کا پہلی بار علم ہوا۔ جو باتیں اس نے سن لی تھیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ کسی مال کی سپلائی میں تاخیر کے سبب سیٹھ عثمان کو جو کاروباری پریشانی لاحق ہوئی تھی اس نے ان دونوں کے درمیان ایک دراڑ سی پیدا کردی تھی۔ پہلے اسے صرف شبہ تھا کہ مال سپلائی کرنے والا کون تھا، اس کے ذہن کے ایک گوشے میں اپنے والد کا خیال آیا تھا جس نے اسے کشمکش میں مبتلا کردیا تھا، پھر ساری بات اس روز واضح ہوگئی جس روز فرحین نے اسے فون پر بتایا تھا کہ سردار سرفراز خان ہی وہ کاروباری تھا جس سے سیٹھ عثمان کی تکرار ہوئی تھی۔

حقیقت جان کر لیاقت حسین کی بے چینی قدرتی بات تھی، اس کے رگوں میں بھی باپ کا لہو گردش کر رہا تھا۔ وہ باپ کی اصول پسندی سے واقف تھا۔ وہ سچا اور کھرا انسان تھا، کسی کو زبان دے کر پیچھے ہٹنا اسے منظور نہیں تھا۔ لیاقت حسین کی پسند معلوم ہونے سے پیشتر ہی وہ شاہ پری کے والد کو زبان دے چکا تھا۔ اس نے زبردستی اپنی مرضی لیاقت حسین پر مسلط کرنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن اپنا یہ فیصلہ بھی سنادیا کہ شاہ پری کے علاوہ اگر لیاقت حسین نے کسی اور کو شریک حیات بنایا تو اس کی حویلی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ماں نے فرحین کے حق میں فیصلہ لیا تو لیاقت حسین نے باپ کی حویلی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ کراچی آنے کے بعد بھی وہ کسی مرحلے پر مایوس نہیں ہوا...... اس نے جو دینی تعلیم حاصل کی تھی اس کی روشنی میں وہ کسی بھی ضرورت مند کی مدد کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتا تھا، قدرت کو اس کی ادا بھائی تو اس نے کسی کو وسیلہ بنا کر اسے اپنی رحمتوں سے نواز دیا۔ اس کی

زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا جب اسے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان کسی بدمزگی کی بھنک ملی تھی۔ اس شبہے کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے ہر پہلو پر غور کیا پھر اس نے براہ راست سیٹھ عثمان سے مل کر پہلی بار یہ بتا دیا کہ وہ سردار سرفراز خان کا لختِ جگر ہے۔ اس کی صاف گوئی پر سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور اب قدرت نے اسے پھر نوازنے کی ٹھان لی تھی۔

اس شام حسبِ معمول سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم سراج کی رہائش گاہ پر آئے تو لیاقت حسین نے ہی ان کا استقبال کیا تھا۔ الماس بیگم راحیلہ کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئیں، سیٹھ عثمان لیاقت حسین سے بات کرنے لگے۔

''لیاقت حسین...... تم نے وعدہ کیا تھا اور زبان دی تھی کہ سردار سرفراز خان کا نام ظاہر ہونے کے بعد بھی تم ہم سے علیحدگی نہیں اختیار کرو گے، ہم جو کہیں گے تم اس پر آنکھ بند کر کے پہلے کی طرح عمل کرو گے۔''

''آپ حکم دیں صاحب۔ لیاقت حسین آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرے گا۔'' لیاقت حسین نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''ایک مشکل کام درپیش ہے، تم چاہو تو وہ مشکل دور ہو سکتی ہے۔''

''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے صاحب۔'' لیاقت حسین جذباتی ہو گیا۔ ''آپ کی خاطر اگر مجھے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

سیٹھ عثمان خاموشی سے اندر چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد لیاقت حسین کو بھی طلب کر لیا گیا۔ لاؤنج میں سراج اور الماس بیگم کے علاوہ راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان بھی موجود تھے۔ لیاقت حسین ان کے سامنے ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

''لیاقت حسین۔'' سراج نے اسے مخاطب کیا۔ ''مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ تم غلط بیانی بھی کرتے ہو۔''

لیاقت حسین نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر دبی زبان میں کہا۔ ''میں انکار نہیں کروں گا صاحب لیکن کبھی کبھی غیرت بھی انسان کو مصلحتاً غلط بیانی پر مجبور کر دیتی ہے۔''

''غلطی بہرحال غلطی ہوتی ہے جس کی سزا بھی ضرور ملتی ہے۔'' سراج کے لب و لہجے سے اپنائیت عیاں تھی۔

''آپ جو سزا دیں گے مجھے منظور ہوگی صاحب۔'' لیاقت حسین نے بہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تمہیں سراج صاحب نہیں بلکہ راحیلہ سزا دینے کا ارادہ کر چکی ہیں۔'' الماس نے کہا۔ ''فوری طور پر تمہیں موجودہ ملازمت سے برطرف کیا جا رہا ہے۔''

لیاقت حسین نے چونک کر سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر کئی سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے جب سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم جانتے ہو لیاقت حسین کہ میں بیگم صاحبہ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرتا۔ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے واپس لینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ البتہ میں اپنے ذاتی اختیار سے تمہیں اپنے نئے دفتر کا سپروائزر مقرر کر رہا ہوں اور فوری طور پر تمہاری تنخواہ تیس ہزار روپے کر رہا ہوں۔''

لیاقت حسین گنگ رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہو پھر جب الماس نے اسے مبارکباد دی اور سراج نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا تو اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''صاحب۔'' اس نے بھرائی آواز میں سیٹھ عثمان سے کہا۔ ''آپ نے جو حکم دیا ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن ایک درخواست میری بھی قبول کر لیجیے۔''

''کھل کر بتاؤ لیاقت حسین...... ہم تمہاری کسی فرمائش سے انکار نہیں کریں گے۔''

''میں آپ کی گاڑی کی چابی کسی اور کو نہیں دوں گا...... آپ جہاں بھی جائیں گے، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''گڈ......'' سراج نے کہا۔ ''میں تمہاری اس بات سے بالکل متفق ہوں۔ جب تک کچھ معاملات پوری طرح ہمارے کنٹرول میں نہ آ جائیں۔ عثمان کا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ آنا جانا میں بھی پسند نہیں کروں گا۔''

کچھ دیر بعد لیاقت حسین واپس اپنے کمرے میں آیا تو اسے اپنی ماں بڑی شدت سے آئی۔ یہ سب اسی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا، اس نے خدا کا شکر ادا کرنے کی خاطر دو رکعت شکرانے کے ادا کیے پھر دو رکعت استغفار کے پڑھے، خدا سے گڑگڑا کر دعا کرتا رہا کہ وہ اسے ہر معاملے میں سرخرو کرے، قدم قدم پر اپنے رحم و کرم سے نوازتا رہے۔ وہ ہر معاملے میں ہمیشہ ثابت قدم رہے، اس سے کبھی کوئی ایسی لغزش نہ ہو جو خدا اور اس کے محبوبؐ کے لیے ناپسندیدہ ہو۔ مرتے وقت تک اس سے بھول کر بھی کوئی ایسا گناہ سرزد نہ ہو جو آخرت میں اس کی پکڑ کا سبب بن جائے۔

اس رات لیاقت حسین کو فرحین کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، وہ پاس ہوتی تو دونوں مل کر اس کامیابی کا

جشن مناتے جو لیاقت حسین کو اچانک نصیب ہوئی تھی۔ خود فرحین کا سر بھی بلند ہو جاتا کہ اس نے لیاقت حسین کے مستقبل کے لیے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے ہو گئے۔ فرحین کو یاد کرتے وقت لیاقت حسین نے طے کر لیا تھا کہ وہ دو ایک روز میں سیٹھ عثمان سے اجازت لے کر فرحین کو لینے چلا جائے گا۔ اسی بہانے ماں سے بھی مل لے گا جو اسے یاد آتی رہتی تھی۔ ممکن ہے طویل جدائی کے بعد وہ حویلی جائے تو سردار سرفراز خان بھی اسے گلے لگا کر معاف کر دے۔ ان ہی خیالوں میں گم لیاقت حسین نیند کی وادیوں میں ہچکولے کھانے لگا۔ اس کی پلکوں پر آنے والے کل کے خواب مچل رہے تھے جب فرحین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''سچ مچ سو گیا یا مجھے آتا دیکھ کر آنکھیں موند لیں۔''

لیاقت حسین نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ فرحین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے قریب کھڑی تھی، خلافِ توقع اس نے پیلے رنگ کی ساڑی باندھ رکھی جس کا تنگ بلاؤز اسے پریشان کر رہا تھا، اس کی نگاہوں میں مستی ہی مستی نظر آ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بائیں جانب گیندے کا ایک تازہ پھول بھی لگا تھا۔

''تو...... تو کب آئی؟'' لیاقت حسین نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''یہاں کیسے پہنچ گئی؟''

''دوپہر کو آ گئی تھی لیکن بیگم صاحب نے روک لیا تھا، اب وہی مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں۔ تیری خوشی میں اضافہ کرنے کی خاطر۔'' فرحین نے ایک خاص ادا سے اٹھلا کر کہا۔ ''یہ تو اس طرح ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟'' پھر اس نے لیاقت حسین کے اور قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''سچ بتا کیسی لگ رہی ہوں؟''

''یہ ساڑی تجھے......''

''تیری شاہ پری نے دی ہے۔'' فرحین نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اسی نے باندھنا بھی سکھا دیا۔ جانتا ہے وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''کیا کہہ رہی تھی......؟''

''کہہ رہی تھی کہ ایسے لباس میں مرد کی رال بہت جلدی ٹپکنے لگتی ہے۔''

''وہ سچ کہہ رہی تھی......'' لیاقت حسین نے اسے بے اختیار اپنے قریب گھسیٹ کر بازوؤں میں جکڑ لیا۔ فرحین کسمسا کر بولی۔

''اٹھ کر کواڑ کو کنڈی تو لگا لے۔ کوئی آ گیا تو کیا کہے گا؟''

فرحین کے قرب نے لیاقت حسین کو دیوانہ بنا دیا تھا لیکن وہ اس کے کہنے پر دروازہ بند کرنے کی خاطر اٹھ گیا۔ فرحین اسے شوخ نظروں سے دیکھتی رہی، لیاقت حسین کو آج اس کا ہر انداز بڑا حسین نظر آ رہا تھا۔ شاید دس گیارہ دنوں کی دوری نے اس کو بھی بےچین کر دیا تھا۔ خود لیاقت حسین بھی اسے نئے لباس اور نئے ڈھنگ میں دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کی روشنی بھی گل کرنے کے بعد وہ دوبارہ فرحین کے قریب آیا تو فرحین نے پہلی مرتبہ اسے اپنے کھلے بازوؤں میں سمیٹ لیا، اس کے سینے کی دھڑکن بتا رہی تھی کہ لیاقت حسین سے دور رہ کر وہ بھی اس کے قرب کے لیے مضطرب ہو گئی تھی۔ لیاقت حسین کو فرحین کا وہ نیا انداز اور بےقابو کر گیا۔ بڑی دیر تک وہ اس کے بالوں سے کھیلتا رہا، اس کے گالوں پر اپنی محبت کی مہریں لگاتا رہا۔ فرحین کی بےخودی اور خودسپردگی کا نیا انداز اسے طوفانی تھپیڑوں کی مانند اپنے ساتھ بہا لے جانے کی کشمکش کر رہا تھا جب کسی نے اسے بڑے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

''آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھا ہو رہا ہے عقل کے دشمن...... سنبھل جا ورنہ سب کچھ ستیاناس ہو جائے گا۔''

لیاقت حسین نے گھبرا کر آواز کی سمت دیکھا، جس نابینا بزرگ نے اسے سنگھیپر کے ٹینٹ میں بیٹھے ہوئے دیوانے تک پہنچنے میں مدد کی تھی، اس وقت اسی کا ہیولا اس کے سامنے فضا میں بل کھاتا نظر آ رہا تھا۔ لیاقت حسین ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس نے کمرے میں دوبارہ روشنی کی تو خود بھی ششدر رہ گیا۔ فرحین کا کوئی وجود کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر نابینا کے ہیولے پر نظر ڈالی جو آہستہ آہستہ لرزتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ لیاقت حسین نے بوکھلا کر پلنگ کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا، جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا شاید وہ سب کچھ ایک خواب تھا لیکن فرحین کے جوڑے میں لگا ہوا گیندے کا پھول اس وقت بھی اس کے بستر پر مسلا ہوا پڑا صاف نظر آ رہا تھا۔

☠☠☠

شیخ حامد کے لیے وہ سانحہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کر دیتا۔

یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اس کی شہ رگ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی تھی۔ اس کے کارندے اسے ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہے تھے۔ دو گھنٹے سے وہ متواتر کبھی فون اور کبھی اپنے مختلف موبائل پر کالیں کر رہا تھا۔ ہر کال کے ساتھ ملنے والی نئی اطلاع اس کے لیے جلتی پر تیل کا کام کر

رہی تھی۔ دفتر جل جانے کا معاملہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے حلق کے نیچے اتار لیتا۔ یہ اس کی شہرت اور ساکھ پر ایسی کاری ضرب تھی جس نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے عمارت اور سازوسامان کے جلنے یا تباہی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ انشورنس کمپنی سے وہ ایک کی جگہ دس وصول کرسکتا تھا۔ سارے ریکارڈ کی کاپی مختلف کمپیوٹرز پر محفوظ کراتے رہنا اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود دوسروں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا اس لیے یہ بھی بہ خوبی جانتا تھا کہ اس کے مخالفوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ کوئی بھی کسی وقت چھوٹے موٹے وار پلٹ کر کرسکتا تھا اسی مقصد سے وہ ہر نئی فائل کو کسی الماری یا دراز میں محفوظ کرنے سے پیشتر اس کا مکمل ڈیٹا کمپیوٹرز پر محفوظ کرنے کا عادی تھا۔ اس کام میں ایک منٹ کی تاخیر بھی اسے منظور نہیں تھی۔ جو عمارت جل کر خاکستر ہوچکی تھی وہ پندرہ بیس روز میں دوبارہ مرمت کرائی جاسکتی تھی لیکن وہ کسی دشمن کو سر اٹھانے سے پیشتر ہی کچل دینے کی عادی تھا اس لیے پہلی بار جب کسی نے بھرپور وار کیا تو غصے سے پاگل ہی ہوگیا تھا۔

اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ایک بدیسی دوشیزہ کے ساتھ کنول سے مجبوراً دور رہنے کا غم غلط کر رہا تھا جب نمبر دو نے اسے آگ کی اطلاع دی تھی۔

''باس۔ کسی نے ہمارے آفس کو دونوں طرف سے آتشی بم پھینک کر آگ لگادی ہے۔''

''کیا بک رہے ہو......؟'' وہ آغوش میں سمٹی ہوئی بے لباس دوشیزہ کو غصے سے ایک طرف دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کون لوگ تھے؟''

''ابھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوا۔ صرف اتنی اطلاع ملی ہے کہ وہ تعداد میں غالباً دو ہی تھے۔ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایک موقع پر مارا گیا دوسرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔''

''جو حرام کے تخم ہم نے پال رکھے تھے وہ کہاں مر گئے تھے......؟''

''ان میں سے بھی آدھے کام آگئے۔ جو زندہ ہیں، ان کے بیانات لیے جارہے ہیں۔''

''جس حرامزادے کی لاش ملی ہے وہ کون تھا؟ کس پارٹی سے تعلق تھا اس کا......؟''

''ابھی تصدیق نہیں ہوسکی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا تعلق بھی اسی سیاہ فام حبشی سے تھا جس کی لاش کچھ دنوں پیشتر ایک مقامی گیسٹ ہاؤس سے ملی تھی۔''

''خیال نہیں......'' وہ کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''مجھے درست اطلاع ملنی چاہیے۔''

''کسی حد تک اس خبر کو مصدقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔''

''کھل کر بات کرو...... میں معمے حل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''ہمارے ایک پولیس کے انفارمر نے بتایا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تین غیر ملکی ایک ہی جہاز میں ایک ساتھ یہاں آئے تھے، ایک سیاہ فام تھا جو پوسٹ مارٹم کی کہانی کے مطابق خودکشی کرچکا ہے۔ دوسرا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں کام آگیا۔ تیسرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔''

''آئی۔سی......'' شیخ حامد نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جگا کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟''

''وہ ابھی تک انڈر گراؤنڈ ہی ہے۔''

''اسے فوری تلاش کرنا ضروری ہے۔'' شیخ حامد نے چیخ کر حکم دیا۔ ''جو سیاہ فام مرچکا، اس حرامی کو جگا کے ٹھکانے پر ہی دیکھا گیا تھا۔ بلیک ٹائیگر نے اسی دن سے اس کا تعاقب شروع کیا تھا لیکن......'' شیخ حامد جملہ مکمل کیے بغیر دہاڑا۔ ''وہ میرا سب سے کارآمد آدمی تھا جسے گولی ماردی گئی پھر اس کے بعد سے جگا بھی منظر عام سے ہٹ گیا۔ اس ساری کہانی کے پیچھے مجھے جگا ہی نظر آرہا ہے۔ اسے کسی طرح بھی تلاش کرو، اب میں تم لوگوں کی غفلت برداشت نہیں کرسکتا۔''

''رائٹ سر......'' دوسری جانب سے مختصر جواب دیا گیا۔

''جس غیر ملکی کو پولیس لے گئی ہے وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''علاقے کے تھانے میں۔ میری معلومات کے مطابق وہاں ایس پی اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا پھر...... پھر اسی نے پولیس پارٹی کے ساتھ جائے حادثہ کی تفصیلی رپورٹ بھی جائزہ لینے کے بعد اپنی موجودگی میں موقع پر ہی تیار کرائی ہے۔''

اورنگ زیب کا نام شیخ حامد کے زخموں پر نمک سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر بدیسی دوشیزہ پر ڈالی جو بہ دستور بستر کی شکنوں پر بکھری پڑی بڑی بے پروائی سے سگریٹ پینے میں مصروف تھی۔ وہ ایک لمحے تک اسے خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا پھر بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔

''جو لوگ عمارت کی چوکیداری پر تعینات تھے ان میں سے کتنے مارے گئے؟''

''صحیح تعداد ابھی نہیں معلوم ہوئی لیکن ایک اطلاع کے مطابق آٹھ دس کام آگئے ہیں۔''

''باقی جو بچے ہیں ان نمک حراموں کو بھی گولی مار دو۔''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شیخ حامد نے انتظار بھی نہیں کیا پھر فوری طور پر فون پر ڈی آئی جی کرائمز سے رابطہ کیا۔

''مجھے حادثے کی اطلاع مل چکی ہے جناب، میں......''

''میری اطلاع کے مطابق حملہ آوروں کا ایک غیر ملکی ساتھی پولیس کی حراست میں ہے؟''

''میں ابھی متعلقہ تھانے کو فون کرکے......''

''اب پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے آغا منظور۔'' شیخ حامد نے اس کی بات کاٹ کر تلملاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گرفتار ہونے والے کی تمام تفصیل صبح تک درکار ہوگی، تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتادوں کہ اب میں مرکز کے ان بڈھ حراموں کو بھی ہلا کر رکھ دوں گا جو ہر ماہ پابندی سے دم ہلاتے ہوئے مجھے سلام کرتے ہیں، تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟''

''آپ پریشان نہ ہوں جناب...... میں براہ راست اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔'' ڈی آئی جی نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تم پھر مجھے دلاسہ دینے کی باتیں کر رہے ہو۔'' اس نے بہ دستور جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''نئے ایس پی کے آنے کے بعد سے تم بھی مجبور نظر آرہے ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے لیکن......''

''میری بات کا خیال رکھنا...... مجھے صبح تک پوری تفصیل درکار ہوگی۔'' اس نے ایک بار پھر ڈی آئی جی کی پوری بات سنے بغیر کہا پھر جھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اٹھ کر چند لمحے تک ادھر ادھر کسی زخمی درندے کی طرح ٹہلتا رہا پھر بستر پر پڑے شکار کے قریب آگیا، غیر ملکی دوشیزہ نے اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ شیخ حامد اس کے ساتھ بھوکے شیر کی طرح لپٹ گیا۔ چند لمحے اس کے جوان جسم کے نشیب و فراز کو جھنجوڑتا رہا پھر اسے دوبارہ بستر پر چھوڑ کر اس نے موبائل اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف سے نمبر دو کی کال تھی۔

''سر...... جو پولیس کی حراست میں ہے اسے سخت پہرے میں رکھا گیا ہے، کسی کو بھی اس کے قریب......''

''نان سنس......'' شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔ ''کال کا مقصد بیان کرو؟''

''وہ...... وہ...... اس کا نام لو چن ہے سر، چینی باشندہ ہے۔ اس کا تعلق ایک بین الاقوامی تنظیم سے ہے جو ضرورت مندوں کو منہ مانگی رقم کے عوض بندے فراہم کرتی ہے۔'' ایک ہی سانس میں بات جاری رکھی گئی۔ ''جو ہمارے گارڈ کا نشانہ بنا اس کا نام ڈوما ہے اس کا تعلق بیروت سے تھا، وہ بھی اسی تنظیم کا سرگرم کارکن تھا۔''

''جس نے خودکشی کی وہ ہاشم تھا، کیوں؟''

''یس سر......''

''یہ بات تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد میرا گھریلو ملازم بھی معلوم کرسکتا تھا۔'' اس نے بڑی نفرت کا اظہار کیا۔ ''اصل سوال یہ ہے کہ ان حرامزدوں کو کس پارٹی نے یہاں آنے کی دعوت دی تھی؟''

''میں کوشش میں لگا ہوں سر لیکن......''

''اب کوشش سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ جھلا کر بولا۔ ''مجھے رزلٹ چاہیے۔''

''او۔ کے سر......!''

''ون منٹ......'' شیخ حامد نے اچانک ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال کے تحت سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''لیاقت حسین بھی ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ تم اس کے بارے میں اب کیا کہو گے؟''

''وہ...... وہ...... سب کچھ حیرت انگیز ہی تھا سر ورنہ......''

''ایک بات پر غور کرو......'' اس نے نمبر ٹو کی بات کاٹ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''لیاقت حسین کے بچ کر نکل جانے کے بعد ہی یہ آگ لگانے والی کارروائی کی گئی ہے۔''

''اوہ......'' نمبر ٹو چونکا۔ ''ہوسکتا ہے سر کہ پھر اس میں ایجنسی کے کچھ لوگ بھی شامل ہوں۔''

''نہیں......'' شیخ حامد نے اس کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ ''ایجنسی کے لوگ بین الاقوامی تنظیم سے کبھی دہشت گرد نہیں امپورٹ کرتے لیکن ایک بات طے ہے...... جو کچھ ہوا اس میں کسی نہ کسی زاویے سے لیاقت حسین کا نام ضرور درمیان میں آتا ہے۔''

''آپ کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے سر لیکن لیاقت حسین کچھ دنوں سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کے بنگلے پر ہے۔ اس روز بھی وہ اتفاق سے ہمیں نظر آگیا تھا، ہم نے ایکشن لینے میں دیر بھی نہیں کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو وہ......''

''گولی کے بدلے گولی......'' شیخ حامد کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے۔ ''جب تم ڈنکا کے نام سے مشہور تھے

وقت تمہارا بھی یہی اصول تھا......"
"آپ صرف اشارہ کر دیں سر...... عمل کرنا میرا کام ہے۔"
"صرف ایک دن اور انتظار کرلو اس کے بعد لیاقت حسین جس چھت کے بھی نیچے ہو اسے بھی آگ لگا دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"
"سمجھ گیا سر......"
شیخ حامد نے موبائل آف کیا تو بدیسی عورت نے اٹھ کر پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، بڑی نشیلی آواز میں بولی۔ "کم آن ڈارلنگ! لٹ اس فنش ون راؤنڈ، پلیز۔" اس کی آنکھیں شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ خود سپردگی کا بے باک انداز بھی قیامت ہی تھا، شیخ حامد نے اسے پھر اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ یہ صرف اس کی وحشت کا مظاہرہ تھا ورنہ اس کے ذہن میں اس وقت بھی انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ شعلے جنس مخالف کی آتش شوق کو سرد کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسے پھر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس کے اندر انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس سے مجبور ہو کر اس نے براہ راست ایس پی اورنگ زیب کے نمبر پنچ کیے پھر موبائل کان سے لگایا۔
"ہیلو...... ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں......"
"میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔"
"اوہ......" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "جو سانحہ رونما ہو چکا اس پر مجھے بھی دکھ ہے۔"
"میں نے تمہیں تعزیت کا اظہار کرنے کی خاطر فون نہیں کیا تھا۔" شیخ حامد بری طرح بھنا گیا۔
"میرے لائق کوئی حکم......؟"
"جو سور کی اولاد مر گیا اسے جہنم میں ڈالو۔ میں اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں جو تمہاری حراست میں ہے۔"
"وہ بھی غیر ملکی ہی ہے لیکن اس نے ابھی تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔" اورنگ زیب نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "ہم مختلف طریقوں سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زیادہ ڈرائنگ روم ٹریٹمنٹ اس لیے نہیں دے رہے کہ اگر وہ بھی مر گیا تو اصل مجرم اور ذمے دار افراد تک پہنچنے میں مشکل بھی پیش آسکتی ہے۔"
"تمہارا کچھ ذاتی خیال تو ہوگا کہ مجھے نقصان پہنچانے میں کس باسٹرڈ کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"
"مجھے آپ کے نقصان اور اس وقت آپ کی ذہنی کیفیت...... دونوں کا اندازہ ہے مسٹر حامد لیکن میں فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"
"کیا یقینی بات اگلوانے کی خاطر مجھے کہیں اوپر فون کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی؟" شیخ حامد نے تیکھے انداز میں اورنگ زیب کو اپنے اثر ورسوخ سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔
"یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے شیخ صاحب، میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔"
شیخ حامد مشورہ والی بات سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ "میں تم کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"
"اوہ...... کیا آپ نے اس وقت یہی کہنے کے لیے زحمت گوارا کی ہے۔" اورنگ زیب کے جواب میں بھی کوئی لچک نہیں تھی۔
"تمہاری فائنل رپورٹ کب تک تیار ہو جائے گی؟"
"پولیس صرف سنجیدگی سے تفتیش کر سکتی ہے محترم...... کوئی ٹائم فریم دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔"
"او۔ کے......" شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے لائن منقطع کر دی پھر غصے میں کھولتا ہوا ٹیلی فون کے قریب گیا۔ اس بار وہ براہ راست مرکزی وزیر داخلہ کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ اس کا رہا سہا سکون بھی اورنگ زیب سے گفتگو کرنے کے بعد غارت ہو گیا تھا۔
"ہیلو شیخ صاحب......" دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی آواز ابھری۔ "اس وقت کیسے یاد کر لیا؟"
"آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی......؟"
"قطعاً نہیں، ابھی پندرہ منٹ پیشتر ہی ایک میٹنگ سے آیا ہوں اور آپ کا فون ملنے سے تو ہمیں خوشی ہوئی ہے۔" دوسری جانب سے خاصی بے تکلفی سے کہا گیا۔ "اور سنائیں، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"
"کاروبار کو تو آگ لگ گئی جناب۔" شیخ حامد نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے؟"
"خیریت ہوتی تو اس وقت آپ کو زحمت نہ دیتا...... ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے دشمنوں نے میرے آفس اور پورے فلور کو جلا کر سب کچھ راکھ کا ڈھیر کر دیا ہے۔"
"کوئی گرفتاری بھی ہوئی یا نہیں......؟"
"ایک غیر ملکی کی لاش ملی ہے، دوسرا ایس پی اورنگ زیب کے قبضے میں ہے۔"

"ایس پی سے بات کی آپ نے؟"
"آپ بھول رہے ہیں کہ میں آپ سے پہلے اس کے تبادلے کی بات کر چکا ہوں۔" شیخ حامد نے یاد دہانی کراتے ہوئے جواب دیا۔ "اسے فون کیا بھی میں نے، لیکن اس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی کہ وہ مجھے نہ تو معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے نہ ہی کوئی ٹائم فریم دے سکتا ہے۔"
"آغا منظور سے شکایت کی آپ نے؟"
"وہ بھی آپ کی طرح ایس پی کے خلاف کوئی ایکشن لینے سے کتراتا ہے۔" شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ "اب تو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑے گا کہ براہ راست صدر مملکت یا وزیراعظم تک رسائی حاصل کروں۔"
"آپ پریشان نہ ہوں شیخ صاحب...... میں براہ راست ایس پی سے بات کرتا ہوں، وہ آپ کو ہر معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے۔"
شیخ حامد نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر داخلہ بھی کوئی چھوٹی موٹی شے نہیں تھا، ریسیور رکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تو غیر ملکی دوشیزہ نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"اگر آپ مصروف ہو تو پھر مجھے جانے کی اجازت دو۔" اس کے لہجے سے بیزاری ہی مترشح تھی۔
"او۔ کے...... گٹ لاسٹ۔"
شیخ حامد کا غیر مہذب جواب دوشیزہ کے لیے غیر متوقع تھا، اس نے برا سامنہ بنایا۔ واش روم میں جا کر لباس پہنا اور خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد ہی شیخ حامد کے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی جس پر اورنگ زیب کا نام بھی نظر آرہا تھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ تین گھنٹی کے بعد ہی اس نے اپنا موبائل آن کر کے خشک لہجے میں پوچھا۔
"اب کیسے یاد کیا......؟"
"وزیر داخلہ کے فون کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ آپ سے رابطہ کروں، مجھے اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔" اورنگ زیب نے سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔
"آپ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"
"جو ملزم تمہاری حراست میں ہے اس نے کچھ اگلا یا نہیں؟"
"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں جناب۔"
"کوشش سے کام نہیں چلے گا۔" شیخ حامد کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ "اس کے حلق میں ڈنڈا ڈال کر سب کچھ اگلوانے کی کوشش کرو۔ مجھے ہر قیمت پر معلوم ہونا چاہیے کہ کس سور ما کی اولاد نے مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی کی ہے۔"
"سر......" اورنگ زیب نے پہلی بار مرعوب ہونے والا انداز اختیار کیا۔ "کچھ وقت تو درکار ہوگا۔"
"ٹھیک ہے...... میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دے سکتا ہوں۔"
"شکریہ شیخ صاحب۔ چوبیس گھنٹے کا وقت میرے لیے بہت کافی ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ اس کے بعد آپ کو شکایت نہ ملے۔" اورنگ زیب نے بدستور شستہ انداز میں کہا۔ "جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"
شیخ حامد نے "گڈ!" کہہ کر لائن کاٹ دی۔ اس وقت پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہرحال ایس پی اورنگ زیب کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر ایک دو ضروری کالیں اور کیں پھر سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

☠☠☠

پرتاب بھوشن اس وقت کالی کے مندر کی ایک کٹیا میں کھڑا پجارن مدھو کو تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔
دیوی کے لیے اپنا جاپ پورا کرنے کے بعد اب اس نے اپنی جون بھی بدل دی تھی، عام پنڈت پجاریوں کا روپ اختیار کر لیا تھا، اس وقت بھی خاصا صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا، گہرے زرد رنگ کی اجلی دھوتی اس کے لمبے تڑنگے جسم پر خاصی سج رہی تھی، بازو اور سینہ کھلا ہوا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی کلائی میں لوہے کے دو کنگن تھے، ننگے سینے اور کشادہ پیشانی پر صندل کی دھاریاں پڑی تھیں۔ گلے میں کئی چھوٹی بڑی مالائیں جھول رہی تھیں۔ ایک گہرے گیروے رنگ کی اکیس موٹے دانوں کی مالا بھی تھی جس پر اس وقت اس کی موٹی موٹی انگلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں لیکن وہ جن تیز نظروں سے مدھو کو گھور رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت اچھے موڈ میں نہیں ہے۔
مدھو پوری طرح بن سنور کر، رنگ روپ نکال کر اس کی کٹیا میں آئی تھی، اس کی جھیل کنول جیسی مدھر بھری آنکھوں میں مستی ہی مستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، کاجل کی ڈوری نے ان آنکھوں کو اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ کٹیا میں داخل ہونے سے پہلے اسے پورا وشواس تھا کہ مہان پجاری اس کے روپ نکھار کو دیکھ کر دیوانہ ہو جائے گا۔ اپنے شریر کی سندرتا بڑھانے کی خاطر اس نے بڑے گھیر کا پنڈلیوں تک اونچا گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ سینے پر تنگ چولی تھی۔ خوب صورت

کلائیوں میں اس نے گھاگرے سے ملتے جلتے رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں، بالوں کا جوڑا باندھ کر اس نے داہنی جانب گیندے کا پھول بھی لگا رکھا تھا۔ مندر کے کھلے صحن سے گزرتے وقت اس نے جس لہراتی چال کا مظاہرہ کیا تھا اس نے وہاں موجود تمام پجاریوں کے من میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ سب اس نئی پجارن کو پہلی بار دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے لیکن پرتاب بھوشن اسے کٹیا میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر کئی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ انگلیوں کی گردش بھی ہاتھ میں دبی مالا پر کچھ شدت اختیار کر گئی تھی۔

''کیا بات ہے مہاراج......'' مدھو نے اٹھلا کر اسے لبھانے کی کوشش کی۔ ''تم اس طرح اپنی داسی کو کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''تو......'' پرتاب نے اس کے گیندے کے پھول کو حقارت سے دیکھا۔ ''اسے زمین پر ڈال کر چرنوں تلے روند دے۔''

''مہاراج......''

''میری آگیا کا پالن کر......'' پرتاب نے مدھو کو تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ''اسی کے کارن سارا بنا بنایا کھیل چوپٹ ہوگیا۔''

مدھو نے جوڑے سے پھول نکال کر قدموں تلے مسل دیا پھر ہاتھ باندھ کر بولی۔ ''مہاراج، کیا داسی سے کوئی بھول ہوگئی؟''

''مورکھ...... تو اس مسلے کے پاس پھول لگا کر کیوں گئی تھی؟''

''اس کو پوری طرح شیشے میں اتارنے کے کارن۔ تم ہی نے تو کہا تھا......''

''ہاں...... یاد ہے مجھے۔'' پرتاب جل کر بولا۔ ''پرنتو اسی پھول کے کارن اس کے کان بھی کھڑے ہوگئے۔''

''میں سمجھی نہیں مہاراج۔'' مدھو نے معصومیت سے کہا۔ ''وہ دشٹ تو پوری طرح مجھے اپنی استری جان کر میرے شریر میں سمانے کو بیاکل تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کیسے اسے اپنی بھول کا دھیان آگیا۔ وہ ایک دم چونکا تھا مہاراج پھر...... میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''تو نہیں جانتی لیکن دیوی کی کرپا سے میں پاتال میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔'' پرتاب نے ہونٹ چباتے ہوئے خلا میں گھور کر کہا۔ ''وہ کوئی چھایا تھی جس نے اس مسلے کو میرے جال میں پھنستے پھنستے بچا لیا اور اب...... اب وہ دور چلا گیا ہے۔''

''کہاں چلا گیا مہاراج؟''

''اپنی استری کو لینے گیا ہے۔ دو ایک دن میں واپس بھی لوٹ آئے گا۔ پھر میں اسے اس طرح گھیروں گا کہ اگلا پچھلا سارا حساب برابر ہو جائے گا۔''

''تم نے...... گیندے کی پھول کی بات کیوں کی تھی مہاراج؟''

''اسی پھول نے اسے الجھن میں ڈال دیا ہے۔'' پرتاب سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''وہ تیرے شریر سے الگ نہ ہوتا تو وہ اتنی جلدی دم دبا کر بھاگنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ مگر میں نے دیوی کی دیا سے جو مہان شکتی پراپت کی ہے وہ اسے نشٹ کرنے میں میری سہائتا اوش کرے گی۔ پھول نے کھیل خراب کر دیا، میں نے تیرے چاروں اور (طرف) جو منڈل باندھا تھا وہ اس سے باہر نہ نکلتا تو اس حرامی کی نظر میں بھی نہ آتا...... تو نے بھی جلدی میں واپس آتے ہوئے اس پر دھیان نہیں دیا۔'' پرتاب نے مدھو کو پھر چبھتی نظروں سے دیکھا۔ ''اس مسلے کے شریر کی آگ نے تجھے بھی پگھلا دیا تھا شاید......''

''ایسا نہیں ہے مہاراج۔'' مدھو نے دوبارہ ہاتھ باندھ لیے۔ ''دیوی جانتی ہے میں اس کے چرنوں کی دھول ہوں۔ میرے من میں کھوٹ ہوتا تو دیوی کی نظریں بھی میرے من کا چور پکڑ لیتیں۔ پھر شاید مجھے تمہاری سیوا کرنے کا سے بھی نہ ملتا۔''

''دیوی نے تیرے اوپر جو کرپا کی ہے اسے بھولنا مت ورنہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گی۔''

''تم بھی شما کرو مہاراج۔'' مدھو نے اس بار آگے بڑھ کر پرتاب کے پیر تھام لیے، اس کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

پرتاب کی آنکھیں گھمنڈ سے چمک اٹھیں کچھ دیر وہ مدھو کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دیکھ کر بتا کہ اس سمے وہ مسلا کہاں ہے؟''

''مہاراج...... میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں کیول ایک داسی ہوں، میرے پاس وہ شکتی......''

''آنکھیں موند لے۔'' پرتاب نے اس کی بات کاٹ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''من میں دیوی کا دھیان کر لے۔ راستے کے اندھیارے بھی دور ہو جائیں گے۔''

مدھو نے دو تین بار آنکھیں جھپکائیں پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو تین منٹ تک اس کے چہرے پر الجھن طاری رہی پھر ہونٹوں پر ایک مسکان کھلنے لگی۔ چہک

کر آنکھیں بند کیے بولی۔

''ہاں مہاراج...... وہ...... وہی ہے، کسی گاڑی میں ڈھیر سارے لوگوں کے بیچ بیٹھا ہے۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ سب تمہاری کرپا اور دیوی کی دیا ہے۔''

پرتاب نے آگے بڑھ کر اس کے گداز گالوں کو ہتھیلیوں کے بیچ تھاما تو مدھو نے آنکھیں کھول دیں، ان آنکھوں میں چمک ہی چمک تھی اس نے پرتاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا مہاراج۔''

''جانتا ہوں۔'' پرتاب عجیب انداز میں مسکرایا۔ ''اب بھی نہ ہوتا مورکھ لیکن یہ سب بھی اسی مہان شکتی کا چمتکار ہے جو میں نے دیوی کے لیے کٹھن جاپ پورا کرنے کے بعد پراپت کیا ہے۔''

''یہ...... یہ بھی میرے لیے اچنبھا ہے۔'' مدھو نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ ''آج وہ چمتکار ہو گیا جو میں نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔''

''نہیں پوچھے گی کہ یہ کیسے ہوا؟'' پرتاب اسے گھورتا ہوا بولا پھر مسکرا کر پوچھا۔ ''پارس پتھر کا نام کبھی سنا ہے؟''

''سنا ہے مہاراج...... گیانی کہتے ہیں کہ وہ جسے مل جائے وہ قسمت کا دھنی کہلاتا ہے۔'' مدھو نے جواب دیا۔ ''جس دھات پر اسے رکھ دیا جائے وہ بھی کھرا سونا بن جاتی ہے۔''

''جو مہان شکتی کے مالک ہوتے ہیں، جن کو دیوی کا خاص آشیرباد حاصل ہوتا ہے وہ بھی پارس پتھر سے کم نہیں ہوتے۔''

''میں سمجھی نہیں مہاراج......؟ پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔''

''اوش ہوتا ہے۔ پر اسے یہ شکتی اوپر والا دان کرتا ہے۔'' پرتاب نے چھاتی ٹھونک کر جواب دیا۔ ''دیوی نے اپنی کرپا سے مجھے بھی جاپ منڈل سے نکلنے کے بعد یہی شکتی دان کر دی تھی۔ تو بڑی بھاگیہ شالی ہے جو تو نے گپھا سے نکلتے ہی میرے چرن چھو لیے اور...... جب میں نے تیرے شریر سے اپنے شریر کو رگڑا تو...... تو بھی کندن بن گئی۔ پرنتو ایک بات دھیان میں رکھنا۔ جب تک تیرا من اجلا ہے۔ تیرے بھیتر کوئی کھوٹ نہیں آئی تو دیوی کی کرپا سے مزے لوٹتی رہے گی لیکن...... جس دن میں نے تجھ سے نظریں پھیر لیں تو پھر تو کوڑے کے ڈھیر میں پڑا کچرا بن جائے گی پھر...... دیوی بھی تجھے شما نہیں کرے گی۔''

''میں سارا جیون تمہارے چرنوں کی دھول میں رہوں گی مہاراج...... تم جو آگیا دو گے۔ اس کا پالن کرنا اپنا دھرم سمجھوں گی۔'' مدھو نے بڑی عقیدت سے ہاتھ باندھ کر پرتھوی کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے ایک بار جو بھول ہوگئی ہے اسے شما کر دو۔''

''ایک بات اور گانٹھ سے باندھ لے......'' پرتاب نے اسے پھر تیز نظروں سے گھورا۔ ''دیوی نے تجھے کیول میری سیوا کرنے کو کہا ہے۔ کبھی بھول کر بھی اگر کسی ہٹے کٹے پجاری کو دیکھ کر تیرا من للچایا تو پھر نہ تو گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔''

''ایسا میرے جیون میں کبھی نہیں ہوگا مہاراج، میں وچن دیتی ہوں۔'' مدھو نے جواب دینے میں دیر نہیں کی لیکن پھر فوراً چونک کر بولی۔ ''مہاراج کیا تم نے جس دشمن کے پاس بھیجا تھا اس کا دھرم نشٹ کرنے کے کارن بھی مجھے اپنے شریر کی رکشا کرنی پڑے گی؟''

''مورکھ......'' پرتاب کے غلیظ ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی، سینہ تان کر بولا۔ ''تو کالی کی داسی ہے اور میری سیوا کر رہی ہے تو پھر یہ بات بھی کبھی نہ بھولنا کہ اپنے دیوی دیوتاؤں اور دھرم کے لیے شریر تو کیا، جیون کا بلیدان دینا بھی کوئی پاپ نہیں۔ دیوی کی بھی یہی سیکشا ہے جس پر جیتا ہمارا دھرم ہے۔''

''مہاراج...... اب میرے لیے کیا آگیا ہے؟''

''تو نے اچھا روپ نکالا ہے مدھو......'' پرتاب نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''پر ابھی نہیں...... جب میرا من چاہے گا تجھے بلا لوں گا۔''

مدھو اس سے کتنی کھڑی رہی۔ اسے آنکھ بند کر کے کسی کو دیکھنے کی شکتی ملی تو وہ تن من دھن سے خوش تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پرتاب سے علیحدہ نہیں کیا پھر جب پرتاب نے چھوڑ دیا تو اس نے مدھو سے یہ بھی بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اس مسلے پر نظر رکھنا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو تو ترنت مجھے خبر کر دینا۔''

''مہاراج...... تم نے کہا تھا کہ کوئی چھایا تھی جس نے تمہارا راستہ کھوٹا کر دیا تھا۔ وہ کس کی چھایا تھی؟''

''اسی کی کھوج میں ہوں......'' پرتاب نے بل کھا کر کہا۔ ''ایک بار وہ مجھے جل (دھوکا) دے کر نکل گئی پرنتو پرتاب نے ہارنا نہیں سیکھا۔ میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا...... تو...... تو اب جا۔''

مدھو ہاتھ باندھ کر الٹے قدموں کٹیا سے نکل گئی تو پرتاب کچھ دیر بعد پھر فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر کے پھر کچھ بدبدانے لگا۔

☆☆☆

شیخ حامد رات بہت دیر سے سویا تھا۔ دفتر میں لگنے والی آگ اس کے دل و دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے نقصان کی فکر نہیں تھی، اس کے انشورنس ایجنٹ نے کل رات ہی اسے فون کر کے کہا تھا کہ تمام ضروری کارروائی زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں مکمل ہونے کے بعد رقم اس کے بینک میں جمع کرا دی جائے گی۔ وزیر داخلہ نے بھی پہلی بار ایس پی اورنگ زیب کے مقابلے میں مردانگی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے نتائج حسب منشا برآمد ہوئے تھے۔ خود اورنگ زیب نے اسے کال کر کے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا جو شیخ حامد کے لیے ایک فتح تھی۔

صبح تقریباً دو بجے وہ بستر پر دراز ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے اندر جو کھلبلی مچی تھی اس کو پرسکون کرنے کی خاطر اسے کم از کم دس گھنٹے پرسکون نیند کی ضرورت تھی، اس نے ملازموں کو ہدایت کر دی تھی کہ اسے بلا کسی بہت اہم وجہ کے ڈسٹرب نہ کیا جائے لیکن...... ابھی اسے آدھے گھنٹے کا ذہنی سکون بھی نہیں ملا تھا جب اس کے موبائل کی مدھم گھنٹی بجی۔ شیخ حامد نے جھلا کر اسکرین پر نظر ڈالی، وہ کنول کی کال تھی۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ موبائل کو اٹھا کر دیوار پر اتنی شدت سے مارے کہ پھر وہ ڈسٹرب نہ ہو سکے لیکن پھر کسی خیال کے تحت اس نے موبائل آن کر لیا۔

''اس وقت کیسے کال کیا......؟'' اس کے لہجے میں بیزاری بھی شامل تھی۔

''سنا ہے کہ آپ کے دفتر کو......''

''گولی مارو دفتر کو۔'' وہ تلملا کر بولا۔ ''تمہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تک کس فکر میں جاگ رہی ہو؟''

''آپ سے ایک بہت اہم بات اور کرنی تھی۔ اسی نے میری نیند بھی اڑا دی ہے۔'' کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کیا اہم بات ہے؟''

''ابھی پندرہ منٹ پہلے ایک ان نون کال آئی تھی میرے نمبر پر......''

''تمہارے نمبر پر......؟'' شیخ حامد چونکا۔ ''تمہارا نمبر میرے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟''

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا لیکن...... وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس میری اور آپ کی کچھ ایسی تصویریں ہیں جو اگر منظر عام پر آگئیں تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''ربش......'' شیخ حامد جھلا کر اٹھ بیٹھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''میں نہیں جانتی لیکن وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا اور......''

''ناممکن......'' اس نے کنول کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میرے خاص آفس اور تمہارے بیڈ روم تک کوئی چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''آپ ایک بات کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔'' کنول نے جواب دیا۔ ''جو نو وارد میرا موبائل نمبر معلوم کر سکتا ہے وہ......''

''تم نے کسی سہیلی وغیرہ کو تو یہ نمبر نہیں دیا۔'' شیخ حامد کے ذہن میں ایک امکانی خیال ابھرا۔

''آپ نے مجھے دو موبائل دیے ہیں۔ ایک صرف آپ کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا...... دوسرا نمبر کسی کو نہیں دیا بلکہ اس سے ابھی تک کوئی کال بھی نہیں کی گئی۔''

شیخ حامد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں پھر شبہات سر ابھارنے لگے۔ دو تین منٹ خاموشی کے بعد ایک ممکنہ خیال کے تحت اس نے کنول کے علاوہ خود کو بھی تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ہو سکتا ہے کسی نے اپنے مطلوبہ نمبر غلط ملائے ہوں اور تمہارا نمبر مل گیا ہو؟''

''لیکن اس نے وہ دھمکی......''

''ریلیکس۔'' اس نے کنول کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہو سکتا ہے اس کی آواز سن کر تم گھبرائی ہو اور اس نے تمہاری خوابیدہ آواز سن کر محض تم سے فلرٹ کرنے کی خاطر ایک امکانی بات کہہ دی ہو اور تم...... ون منٹ......!'' وہ بات کرتے کرتے چونکا۔ ''اس کا جو نمبر تمہارے موبائل پر ریکارڈ ہوا ہے۔ وہ کیا ہے......؟''

دوسری طرف سے بتائے جانے والے نمبروں کو نوٹ بک پر لکھنے کے بعد اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب تم سو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ کس کی موت آئی ہے۔'' بعد میں شیخ حامد نے اسی وقت ان نمبروں کو چیک کرایا تو یہ جان کر اس کی نیند اور اچاٹ ہو گئی کہ وہ نمبر ایک ایسے شخص کا تھا جو ایک سال پیشتر کسی ایکسیڈنٹ میں کام آ گیا تھا۔ اس کی اکلوتی بیوی شوہر کی موت کے بعد پنجاب کے کسی گاؤں میں واپس لوٹ گئی تھی۔ گویا وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں رہا تھا پھر وہ کس

کے ہاتھ لگ گیا؟ جس کے ہاتھ لگا اسے کنول کے وہ نمبر کیسے معلوم ہوئے جو شیخ حامد کے سوا کسی اور کے پاس نہیں تھے......؟ وہ ان ہی خیالوں سے الجھ رہا تھا جب اس کے دوسرے موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ اسکرین پر آنے والا نمبر اس کے خاص آدمی نمبر ٹو کا تھا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

''اس وقت کیا ضروری کام پیش آگیا۔''

''باس...... ہمارے ستارے شاید گردش میں آتے جا رہے ہیں۔''

''اب کیا پہاڑ ٹوٹ پڑا......؟'' شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے سوال کیا۔

''تین لاشوں کا پیٹی پیک پارسل باہر سروس روڈ پر پڑا ہے۔''

''کس کی لاشیں ہیں...... تفصیل بیان کرو۔'' شیخ حامد کی آنکھوں کی نیند تین لاشوں کا حوالہ سنتے ہی اچاٹ ہوگئی۔

''راجو اور ان دو ساتھیوں کی لاشیں ہیں باس، جنہیں آپ کی سفارش پر کوٹھی پر ہونے والے حملے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔'' نمبر ٹو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پندرہ بیس منٹ پہلے ایک لوڈنگ ٹرک سروس روڈ سے گزرا تھا جس پر سے کوٹھی کے گارڈز کی توجہ ہٹانے کی خاطر فائرنگ بھی کی گئی۔ ٹرک تیزی سے نکل جانے کے بعد ہمارے آدمیوں نے دیکھا کہ لکڑی کی تین قد آدم تابوت نما پیٹیاں سروس روڈ پر پڑی تھیں۔ ان کا چہرہ باہر سے بھی دیکھا جا سکے اس لیے چہرے کے سامنے والی لکڑی کو بڑی مہارت سے دائرے کی صورت میں کاٹ دیا گیا تھا۔''

شیخ حامد نے پوری تفصیل سننے کے بعد حلق کے بل چیختے ہوئے دریافت کیا۔

''پیٹیاں اب کہاں ہیں......؟ انہیں کھولا تو نہیں گیا؟''

''آپ کو اطلاع دینا ہمارا پہلا فرض تھا۔ اب آپ جو حکم دیں۔''

''لوڈنگ ٹرک کا نمبر نوٹ ہوا؟''

''اس کا موقع ڈیوٹی گارڈ کو نہیں مل سکا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''اس کی داہنی ران میں گولی لگی ہے۔ جان بچانے اور پوزیشن لینے کی خاطر گارڈز ایک لمحے کو پیچھے ہٹے تھے، اتنی دیر میں مطلوبہ ٹرک غائب ہوگیا۔''

''باہر والے کہاں مر گئے تھے؟''

''کسی کو اس کی توقع نہیں تھی باس، اس ... لیے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ لوڈنگ ٹرک سے بے آواز گولیاں چاروں طرف چلائی جا رہی تھیں۔ جو کچھ ہوا وہ سوچے سمجھے اور منظم طریقے سے ہوا ہے۔''

''تمہارا خیال کس طرف جا رہا ہے......؟''

''پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا باس لیکن ...... ایس پی اورنگ زیب ان کو چھوڑنے پر ڈی آئی جی کے اصرار کے بعد بھی بہ مشکل آمادہ ہوا تھا۔ راجو اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی اس چوتھے آدمی وکی پینتھر کو بھی آزاد کر دیا تھا۔''

''وکی کس کا آدمی تھا......؟'' شیخ حامد نے ہاتھ ملتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ...... وہ جگا کے لیے کام کر رہا تھا۔''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جگا کو قبر سے کھود کر بھی برآمد کرنے کی کوشش کرو۔'' اس بار شیخ حامد غصے سے لرزتا ہوا چلایا۔ ''یہ بھی معلوم کرو کہ وہ ولدالحرام ہی کس کے لیے کام کر رہا ہے؟......''

''ہم ہر طرف کھنگال چکے ہیں باس۔'' نمبر دو نے کہا۔

''وہ ہمارے خوف ہی سے کہیں انڈر گراؤنڈ ہوگیا ہے۔ جس دن کسی کو نظر آگیا اس دن آپ سے پوچھے بغیر ہی اسے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔''

''گارڈ سے کہو کہ وہ علاقے کے تھانے کو نئی صورت حال کی رپورٹ کرے۔ ذاتی حیثیت میں ...... میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فون سے بڑے طیش کے عالم میں آغا منظور کے گھر کے نمبر ملا رہا تھا۔

''ہیلو......'' تیسری چوتھی گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے آغا منظور کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''شیخ حامد بول رہا ہوں۔''

''اس وقت کیسے یاد کیا......؟''

''جن حرامیوں نے دفتر کو آگ لگائی تھی وہ ابھی تک دندناتے پھر رہے ہیں۔''

''خیریت...... اب کیا ہوا؟''

''میں نے کوٹھی کے حملے کے بعد اپنے جن آدمیوں کو تمہاری سفارش پر رہا کرایا تھا۔ ابھی کچھ دیر پیشتر ان کی لاش کی پیٹیاں کوٹھی کے سامنے سروس روڈ پر پھینک دی گئی ہیں، جس لوڈنگ ٹرک کے ذریعے انہیں یہاں ڈمپ کیا گیا ہے اس سے باقاعدہ گولیوں کی بارش بھی کی گئی۔ میری کوٹھی کا ایک ڈیوٹی گارڈ بھی زخمی ہوگیا۔'' شیخ حامد نے بھنا کر پوچھا۔

شہر میں تمہاری جو پیٹرولنگ پارٹیاں گشت کر رہی ہیں۔ وہ جھک مار رہی ہیں؟''

''جو پیٹیاں پھینکی گئی ہیں انہیں وہیں پڑا رہنے دیں۔ پندرہ منٹ کے اندر دوسرے عملے کے ساتھ آتا ہوں۔'' دوسری جانب سے ہدایت کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شیخ حامد نے اپنے خاص آدمیوں کو کچھ ضروری کالیں کیں پھر وہ خواب گاہ سے نکل کر نچلے فلور کے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کے نیچے اترنے کے کچھ دیر بعد آغا منظور بھی اس کے سامنے موجود تھا۔

''ایک ہی رات میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو تین وارداتیں۔'' شیخ حامد نے پیشانی پر بل ڈال کر بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اگر جواب میں میرے آدمیوں نے بھی کاروباری...... دفاتر میں شعلے بھڑکانے شروع کر دیے اور اندھا دھند لوگوں کو موت کے منہ میں جھونک دیا تو تم...... تمہاری فورس اور دوسری تمام ایجنسیوں کی نیندیں بھی حرام ہو جائیں گی۔''

''میں آپ کی پوزیشن سمجھ رہا ہوں شیخ صاحب لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ یقیناً کسی سوچی سمجھی اسکیم کے پیش نظر ہو رہا ہے۔ آپ ابھی کھل کر کسی پر شبہ نہیں کرتے...... آپ جس کی طرف انگلی اٹھا دیں، ہم اس کو آنکھ بند کر کے حوالات میں ڈال کر اس کی زبان کھلوانے کی پوری کوشش کریں گے لیکن......''

''تم نے ابھی تک شبنم کے اغوا کے بارے میں کیا کامیابی حاصل کر لی؟'' جواب میں شیخ حامد کی پیشانی پر بھی سلوٹیں ابھر آئیں ــــ ''جگا جیسا غنڈا اور اس کے پالتو کتے بھی کہیں اپنی کسی عزیزہ کی رومالی میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ کوئی سور ما مرد نہیں جو سامنے آئے پھر؟...... کیا اس کے نتائج صرف مجھے بھگتنے پڑیں گے؟ تم بھی مجبور ہو، میں بھی صبر کرتا رہوں تو پھر دنیا کا کاروبار کون چلائے گا......؟ جگا...... شبنم کو اغوا کرنے والے یا دوسرے اچکے اور اٹھائی گیرے؟''

''میں نے آپ کی کسی بات سے نہ پہلے انکار کیا ہے، نہ اب کروں گا...... آپ اشارہ کریں تو میں ملازمت چھوڑنے کو بھی تیار ہوں۔'' آغا منظور نے قدرے جز بز ہو کر کہا۔ ''اس کے سوا جو آپ حکم دیں میں وہ بھی کرنے کو آمادہ ہوں۔''

شیخ حامد نے کوئی فوری جواب نہیں دیا پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایس پی اورنگ زیب اندر آگیا۔ اس نے خلاف توقع جس مہذب انداز میں شیخ حامد کو سیلیوٹ کیا تھا اس سے شیخ حامد کا سینہ کچھ اور چوڑا ہوگیا۔

''کوئی کلیو ملا......؟'' آغا منظور نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

''جس ٹرک سے لاشوں کی پیٹیاں گرائی گئی تھیں وہ ہماری ایک نائٹ پیٹرولنگ پارٹی کی نظروں میں آگیا ہے۔''

''کوئی گرفتار بھی ہوئی......؟'' شیخ حامد نے براہ راست اورنگ زیب سے سوال کیا۔

''مذکورہ ٹرک فیکٹری ایریا کے قریب سڑک کے کنارے پارک ملا ہے اور......'' اورنگ زیب نے ذرا تامل سے کہا۔ ''اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے جس ڈرائیور کی لاش ملی ہے اس کے جیب سے برآمد ہونے والے شناختی کارڈ سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ وہ کون تھا، کہاں ملازمت کرتا تھا۔''

''کون تھا وہ سورما......؟'' شیخ حامد بھڑک کر کھڑا ہوگیا۔

''وہ کوئی سورما نہیں بلکہ ایک مظلوم تھا شیخ صاحب۔'' اورنگ زیب نے دبی زبان میں کہا۔ ''اسے اس واردات میں اسلحہ کے زور پر استعمال کیا گیا پھر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔''

''کچھ پتا تو چلے کہ کون تھا وہ مجرم یا مظلوم؟''

''وہ ٹرک اور وہ ڈرائیور...... دونوں آپ کی کمپنی کے تھے۔'' اورنگ زیب نے بہ دستور مدھم لہجے میں انکشاف کیا تو شیخ حامد کے علاوہ آغا منظور بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''اب تم مجھے کیا حکم دو گے آغا منظور؟'' شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔ ''کس سے رابطہ کروں؟ کس کے گلے میں گھنٹی باندھوں؟ یہ سب میرے ہی ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ تم سب کس مرض کی دوا ہو......؟''

''میں صرف دو روز کی مہلت چاہوں گا شیخ صاحب۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے قوی امید ہے کہ ان دو دنوں میں میرے آدمی کوئی نہ کوئی سراغ تلاش کر لیں گے، ویسے آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر میں بھی ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔''

''جو لاشیں میرے آدمیوں کی گفٹ پیک کی صورت میں ملی ہیں، ان کا کیا کروں؟''

''صرف آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔'' اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ''ضروری تفتیش کے بعد میں انہیں احترام کے ساتھ دفنانے کا بھی بندوبست کر دوں

گا۔متعلقہ تھانے میں آپ کے گارڈ نے جو رپورٹ درج کرائی ہے وہی بہت ہے۔''

''سوچ لو ایس پی......'' شیخ حامد نے اورنگ زیب کو تیز نظروں سے گھورا۔''اگر دو روز میں تم بھی کوئی تیر نہ مار سکے تو......؟''

''ناکامی کی صورت میں اس کا اختیار بھی آپ کو ہوگا۔ آپ جو فیصلہ صادر کریں گے، وہ مجھے منظور ہوگا۔''

کچھ دیر بعد شیخ حامد کی کوٹھی سے نکل کر باہر آنے کے بعد آغا منظور نے اورنگ زیب کو ایک طرف لے جاکر سمجھاتے ہوئے کہا۔''آپ کو کوئی یقینی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔خاص طور پر میری موجودگی میں......فرض کیجیے اگر آپ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو۔''

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سر......'' اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔''مجرم تک تو ہم بہت پہلے پہنچ چکے ہیں، صرف اس کے ہاتھوں میں لوہے کے کنگن ڈالنے باقی رہ گئے ہیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کا مقصد لیکن شاید آپ اس آکٹوپس کی خطرناک چالوں سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔''

''واقف ہوگیا ہوں سر......اسی لیے تو اب اس کے سامنے جھک رہا ہوں۔''

''وہاٹ......'' آغا منظور نے حیرت سے اورنگ زیب کو دیکھا۔''کیا آپ واقعی اس کے سامنے سرنڈر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟''

''فی الحال......'' اورنگ زیب نے شانے اچکا کر بڑی معصومیت سے جواب دیا۔''دو روز بعد کون کس کے شکنجوں میں ہوگا۔قبل از وقت کون یقین سے کہہ سکتا ہے۔''

آغا منظور کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔وہ ایس پی کے جملے کی گہرائی تک پہنچنے سے ہی قاصر تھا پھر......قبل اس کے کہ وہ اورنگ زیب سے مزید وضاحت چاہتا۔ملحقہ تھانے کا انسپکٹر ان کے قریب آگیا۔ان کے درمیان پیش آنے والی واردات کی قانونی باتیں شروع ہوگئیں تو آغا منظور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد واپس گھر چلا گیا۔

☠☠☠

تھریسا نے بڑے والہانہ انداز میں آغا منظور کا استقبال کیا تھا۔ڈرائنگ روم میں میڈم روبی پہلے سے موجود تھی جہاں اس نے آغا منظور کو سادگی سے خوش آمدید کہا۔خود آغا منظور اس وقت خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی اس نے میڈم کو ایک خاص انداز میں جسے میڈم روبی نے بھی محسوس کیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی تمام تر مصروفی باوجود ہمارے غریب خانے پر آنا منظور کرلیا۔''

''وہ بھی شاید نام کی مناسبت سے۔'' میڈم کے اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برجستہ کہا تو آ صرف لاجواب ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک بار پھر ایسی والہانہ نظروں سے دیکھا جیسے یہ کہنا چاہ رہا ہو ''اگر آپ اس غریب خانے پر مجھ خاکسار کو بھی سر چھپا خاطر تھوڑی سی جگہ مستقل بنیادوں پر فراہم کردیں تو بڑ پروری ہوگی۔''

کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر تھری سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''اب ہمارے سراج صاحب کی طبیعت کیسی ہ

''خدا کا شکر ہے کہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ منظور نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا ۔''میرا خیال آپ نے میرے علاوہ سراج کو بھی دعوت دی ہوگی۔''

''ان کی دعوت بھی ضرور ہوگی اور آپ کو بھی دو بلایا جائے گا۔'' تھریسا نے مسکرا کر کہا۔''اس طرح آ آنا جانا بھی لگا رہے گا۔''

''آپ حکم دیں تو میں بستر لے کر ادھر ہی ہوجاؤں۔'' اس بار آغا منظور نے تھریسا کے جملے سے ف اٹھا کر معصوم صورت بنا کر کہا تو میڈم بھی اپنی بے ساختہ ضبط نہ کرسکی۔وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں رکھنے کے بعد سے مہمان کی نظریں کسی نہ کسی بہانے ا سمت بار بار بہک رہی تھیں۔

''آج کل تو خیمہ بستیوں میں بھی پکے الاٹمنٹ بغیر قدم ٹکانے کی جگہ نہیں ملتی۔آپ اس خوب صورت گھر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔''

''انسان اگر دن میں بھی خواب دیکھ لے تو میر خیال سے کوئی پابندی نہیں ہے، اس وقت تو پھر رات ہے

''آپ کی باتوں پر مجھے حیرت ہی ہو رہی ہے میڈم نے اس کے جواب سے متاثر ہوکر قدرے ب سے کہا۔''جس محکمے سے آپ کا تعلق ہے وہاں بذلہ سنج بہت کم پائے جاتے ہیں۔''

اس پُراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

بھائی بھائی

مریم کے خان

تعلق کوئی بھی ہو بغیر احساسات کے مردہ جسم کے مانند ہوتا ہے' ان کا تعلق بھی انتہائی پُراسرار تھا... ایک خود فریبی میں مبتلا ایک کو مفاد پرستی کا مرض لاحق... بہ ظاہر یک جان دو قالب... مگر دو مختلف روپ... ان کی محبت انہیں ایک دوسرے سے قریب رہنے پر مجبور کرتی تھی مگر کوئی تیسرا وجود ایسا بھی تھا جس نے ان کی سمتوں کا رخ مخالف کر ڈالا۔اس کے باوجود لہو کی پکار ہلچل مچاتی رہی... بالآخر ان میں سے ایک نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کا بھرم ریت کے مانند بکھر کر رہ گیا۔

دو بھائیوں کی بے مثال محبتوں اور مخالفتوں کا عجب تماشا

سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ جوان اور خوب صورت آدمی فیری ٹاؤن کے قبرستان میں ایک قبر کے سامنے ساکت کھڑا تھا۔اس کے سنہری مائل سرخ بال بکھرے ہوئے تھے۔قبر پر جیمز ایڈم کے نام کا کتبہ لگا تھا۔چوکور سنگِ مرمر کی بڑی سی سل پر جیمز ایڈم کا نام اور مختصر تعارف تھا۔اس کے چہرے پر غم والم کے تاثرات تھے کیونکہ اس کا بھائی ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا تھا۔اسے اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی۔جیمز ایڈم کی موت آج سے ٹھیک ایک سال پہلے

آج ہی کے دن اور تقریباً اسی وقت واقع ہوئی تھی۔ یعنی آج جیمز ایڈم کی برسی تھی۔ اس وقت قبرستان میں اور کوئی نہیں تھا بس وہی ایک جیمز ایڈم کی قبر کے سامنے افسردہ کھڑا تھا۔

☆☆☆

امریکی ریاست ساؤتھ ڈکوٹا میں ایڈم خاندان غیر معروف نہیں تھا۔ وہ اس علاقے میں آنے والے اولین لوگ تھے اور گزشتہ ڈھائی سو برس سے زیادہ عرصے سے یہاں آباد تھے۔ اس عرصے میں خاندان بہت بڑھ گیا تھا اور اس کے بہت سارے لوگ دوسرے علاقوں کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر اب بھی بیشتر ایڈمز ساؤتھ ڈکوٹا میں ہی آباد تھے۔ ریاست کے وسطی حصے میں اس چھوٹے سے قصبے میں ایڈم خاندان کے کئی گھرانے آباد تھے اور انہیں یہاں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ وہ دولت مند تھے اور قصبے کی معیشت ایک طرح سے ان ہی کے گرد گھومتی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی سیاسی اہمیت بھی تھی۔ قصبے کا میئر اور مقامی کانگریس مین یا سینیٹر ان کی رضامندی سے بنتا تھا۔ اس سے ایڈم خاندان کے اثر و رسوخ کا بہ خوبی پتا چلتا تھا۔

مارش ایڈم ایک بزنس مین تھا۔ قصبے کے پاس ایک انڈسٹریل اسٹیٹ میں اس کا شیشے کی اشیا بنانے کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ یہ کارخانہ اس کے باپ نے قائم کیا تھا لیکن اسے اس مقام تک مارش لے کر آیا تھا۔ آغاز میں یہاں صرف سادہ شیشہ اور شیشے کی سادہ مصنوعات بنتی تھیں پھر مارش یہاں جدید ٹیکنالوجی لایا، اس نے شیشے کی اعلیٰ اور معیاری اشیا بنانا شروع کیں اور اب ایڈمز گلاس کی مصنوعات پورے امریکا بلکہ یورپ تک جاتی تھیں۔ مارش ارب پتی تھا اور اس کے پاس دنیا کی ہر آسائش اور سہولت تھی۔ فیری ٹاؤن میں مارش کا خوب صورت ولا نما گھر تھا۔

☆☆☆

نوجوان نے گہری سانس لی اور قبر کے پاس سے ہٹ کر قبرستان سے باہر جانے لگا۔ دن کی روشنی اپنے آخری دموں پر تھی۔ سرما کا آغاز تھا اور درختوں سے زرد ہو کر جھڑنے والے پتے راستوں اور سڑک پر تھے۔ ہوا انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑاتی پھر رہی تھی۔ قبرستان قصبے سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے آغاز میں فیری ٹاؤن کا خوب صورت سفید عمارت والا چرچ تھا۔ عین اس وقت جب وہ سڑک پر آیا اور قصبے کی طرف جانے لگا تو چرچ سے فادر جارج نکلے اور انہوں نے نوجوان کو جاتے دیکھا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اس خوب صورت ولا کے سامنے کھڑا تھا جس کے گیٹ پر ایڈم ہاؤس کی تختی لگی تھی۔

☆☆☆

مارش ایڈم کے دو بیٹے جیمز اور مائیکل تھے۔ بڑا تھا، اسے شروع سے تعلیم سے دلچسپی تھی اس لیے اس عمری میں بزنس ڈگری حاصل کر لی اور باپ کے کاروبار میں شامل ہو گیا۔ جیمز اس سے پانچ برس چھوٹا اسے تعلیم سے زیادہ کھیل کود اور مہم جوئی سے دلچسپی تھی۔ دلچسپی اس کی موت کی وجہ بنی۔ صرف بائیس برس کی عمر موٹر سائیکل کے حادثے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ میل فی گھنٹا کی رفتار سے زیادہ تیز بائیک چلا رہا تھا۔ اس کی بائیک سڑک پر پڑے آئل سے سلپ ہوئی اور جیمز سمیت قلابازیاں کھاتی ایک کھائی میں جا گری۔ جیمز موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ جب ایمبولینس اور ڈاکٹر حادثہ پر پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔

یہ بڑا افسوس ناک سانحہ تھا جس نے سنا وہ اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جیمز ہنس مکھ، زندہ دل اور ملنسار نوجوان تھا اس کے بے شمار دوست تھے اور دشمن کوئی نہ تھا۔ اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن ان میں سے کوئی اس کی گرل فرینڈ نہیں بن سکی تھی۔ جو اسے پسند تھیں وہ اسے پسند نہیں تھا اور جو اسے پسند کرتی تھیں جیمز کو ان میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ان کے پاس جانے کی کوشش بھی نہیں کیونکہ وہ کسی کو دھوکا دینے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے لڑکیوں سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان سے دوستی کر سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ لڑکیاں اس صاف گوئی پر مسوس کر رہ گئی تھیں لیکن ان میں سے کسی نے جیمز کے دل میں کینہ نہیں رکھا تھا۔ وہ سب بعد میں بھی اس کی دوست رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر کھڑا ایڈم ولا کو دیکھتا رہا۔ سامنے وسیع عریض لان تھا جس میں وہ کبھی اپنے بھائی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس عالی شان مکان میں دونوں بھائی اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ گیٹ سے اندر آیا اور سرخ بجری والے ڈرائیو وے سے ہوتا عمارت کے سامنے والے حصے میں آیا۔ داخلی دروازہ بلند چھت والے برآمدے میں تھا۔ چھت کو گول رومن طرز کے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ داخلی دروازے سے اندر آیا۔ سامنے ایک طویل سرخ کارپٹ سے آراستہ گیلری تھی۔ گیلری میں دونوں طرف دروازے تھے۔ دیواروں کے ساتھ چھوٹی میزیں اور اسٹولز پر آرائشی چیزیں رکھی تھیں۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ گیلری سے ہوتا ہوا عمارت کے مرکزی ہال میں آیا جہاں آتش دان کے اوپر اس کے خاندان کی تصاویر لگی تھیں۔ ان میں مارش ایڈم، اس کی بیوی ایما اور دونوں بچے مائیکل اور جیمز نمایاں تھے۔

☆☆☆

جیمز بہت سے افراد کو پسند کرتا تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے محبت تھی، اپنی ماں سے محبت تھی جو اس کے باپ سے الگ ہو گئی تھی اور اب کسی اور کی بیوی تھی۔ مارش نے بیوی کو اس شرط پر طلاق دی کہ بچے وہ رکھے گا۔ ایما کی بھی یہی خواہش تھی کیونکہ وہ جس شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی اس نے ایما کے بچوں کو قبول کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ علیحدگی کے بعد ایما سال میں دو بار بچوں سے ملتی تھی۔ ایک بار وہ ان سے ملنے آتی تھی اور دوسری بار جیمز اور مائیکل اس کے پاس جاتے تھے۔ ایسا عام طور سے اس وقت ہوتا تھا جب ایما کا دوسرا شوہر مارٹن کاروباری دورے پر کہیں گیا ہوتا تھا۔ جب تک وہ اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے یہ معمول جاری رہا۔ مائیکل نے اٹھارہ سال کا ہوتے ہی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ماں باپ کی علیحدگی میں وہ ماں کو قصوروار سمجھتا تھا اور اس کا رویہ ایما سے سرد ہوتا تھا۔ البتہ جیمز ماں سے محبت کرتا تھا۔ وہ اپنی وفات تک ماں سے ملتا رہا۔ اٹھارہ سال کے بعد وہ آزاد ہو گیا تھا کہ اپنی مرضی سے ماں سے ملے۔ وہ سال میں کئی بار جا کر ایما سے مل کر آتا تھا۔

ماں سے محبت اپنی جگہ، اسی طرح جیمز باپ سے بھی محبت کرتا تھا لیکن اگر اسے صحیح معنوں میں کسی سے محبت تھی تو وہ اس کا بھائی مائیکل تھا۔ وہ اسے جنون کی حد تک چاہتا تھا۔ بچپن سے وہ مائیکل کا دیوانہ تھا اور جب وہ بالکل چھوٹا سا تھا تو زیادہ تر مائیکل کے پاس ہی رہتا تھا، وہ اسکول سے آتے ہی جیمز میں لگ جاتا اور اسے اٹھائے گھومتا تھا۔ اگر کبھی مائیکل اسے گود سے اتار دیتا تو وہ رونے لگتا تھا پھر ایما کے پاس جا کر بھی نہیں بہلتا تھا۔ اسے صرف مائیکل کے پاس قرار آتا تھا۔ ایما کو بچوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ جیمز کو مائیکل کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ بھائیوں میں ویسے ہی محبت ہوتی ہے لیکن جیمز کی مائیکل سے وابستگی اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اس کا بیشتر وقت مائیکل کے ساتھ گزرتا تھا۔ ڈھائی سال کی عمر میں وہ اس کے ساتھ سونے لگا تھا اور صبح جب مائیکل اسکول چلا جاتا تو جیمز سارے گھر میں بولایا ہوا پھرتا تھا۔ جب مائیکل اسکول سے واپس آتا تو اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

صرف جیمز ہی نہیں، مائیکل بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ بھائی کی خاطر اس نے کسی کو دوست نہیں بنایا۔ وہ اسکول سے آتا تو اس کا سارا وقت جیمز کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ اس کا اس طرح خیال رکھتا جیسے کوئی ماں اپنے پہلے بچے کا خیال رکھتی ہے بلکہ مارش کا کہنا تھا مائیکل، جیمز کا اتنا خیال رکھتا تھا جتنا ایما نے مائیکل کا بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ اسے کھلاتا، نہلاتا دھلاتا اور اس کے کپڑے بدلتا تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جیمز کے لیے مائیکل کے ساتھ زندگی کا ہر لمحہ خوشیوں سے بھرپور تھا۔ جب وہ دس سال کا تھا تو ایما اور مارش میں علیحدگی ہو گئی۔ جیمز ماں کے جانے سے دکھی ہوا تھا لیکن اسے خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ مائیکل موجود تھا جو ہر طرح سے اس کا ساتھی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا تھا۔

جیمز اسی اسکول میں داخل ہوا جہاں مائیکل اب بڑے گریڈ میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن وہ جیمز کو ساتھ اسکول لے کر جاتا اور اسے اسکول کی عمارت تک پہنچا کر پھر اپنے اسکول کی طرف جاتا تھا۔ بڑے گریڈ والوں کی عمارت الگ تھی۔ البتہ اسکول ایک ہی جگہ تھا۔ جیمز کی چھٹی پہلے ہوتی تھی اور اس وقت مارش اسے لینے آتا تھا کیونکہ مائیکل کلاس میں ہوتا تھا۔ گھر میں جیمز کو ایک گھنٹا بھائی کے بغیر گزارنا پڑتا تھا اور یہ گھنٹا اس کے لیے کتنا مشکل تھا یہ بات وہی جانتا تھا۔ وہ مائیکل کے انتظار میں نہ تو کپڑے بدلتا اور نہ کچھ اور کرتا تھا۔ جیسے ہی مائیکل گھر میں داخل ہوتا وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جاتا تھا۔ مائیکل اس کے کپڑے تبدیل کراتا اور پھر اسے منہ ہاتھ دھلا کر کھانا کھلاتا۔ جیمز دس برس تک بھائی کے ہاتھ سے کھانا کھاتا رہا تھا پھر مارش نے ذرا سختی کی تو جیمز نے خود سے کھانا شروع کیا تھا۔

مائیکل پندرہ سال کا ہو چکا تھا لیکن اس کی نہ تو کسی سے خاص دوستی تھی اور نہ ہی اس کی کوئی بیرونی سرگرمی تھی۔ اس کی عمر کے لڑکے مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ وہ گرل فرینڈز رکھتے تھے اور زندگی کے تمام تجربے کر چکے تھے لیکن مائیکل ان چیزوں سے دور تھا۔ اس کی وجہ جیمز تھا جو اسے کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد اس کا سارا وقت جیمز کے لیے مخصوص تھا۔ جیمز نے کسی اور سے دوستی نہیں کی۔ اگر کسی بچے نے اس سے دوستی کی کوشش کی تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ایسا لگتا تھا اسے سوائے اپنے بھائی کے دنیا میں اور کوئی پسند ہی نہیں ہے۔ اسکول سے آ کر کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر پڑھتے اور آرام کرتے تھے، پھر کھیلنے کے لیے باہر لان پر نکل آتے۔ مارش کا وسیع و عریض مکان تقریباً ایک ہیکٹر رقبے پر

پھیلا ہوا تھا۔ اس کا لان کسی فٹ بال گراؤنڈ سے کم نہیں تھا۔ جیمز اور مائیکل روز شام کو یہاں فٹ بال کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی وہ منی گولف کھیلتے یا پھر رگبی سے شوق پورا کرتے تھے۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر آتش دان کے پاس کھڑا خاندان کی تصاویر دیکھتا رہا۔ اس میں مارش کا باپ اور اس کا دادا آئزک ایڈم بھی موجود تھا۔ خاندان کے کچھ دوسرے افراد بھی کسی کسی تصویر میں تھے لیکن تقریباً تمام ہی تصاویر مارش اور اس کی فیملی کی تھیں۔ پھر وہ ہال سے ہوتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ لاؤنج میں ایک دیوار مکمل طور پر شیشے کی تھی اور اس کے پار ولا کے سوئمنگ پول کا نیلا پانی کسی آئینے کی طرح ساکت تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

مارش کو تیراکی کا شوق تھا اس نے ولا میں خاصا بڑا سا سوئمنگ پول بنوایا تھا۔ یہ اگرچہ اولمپک سائز تو نہیں تھا لیکن اس سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ ایک طرف اس میں ڈائیو کرنے کا انتظام بھی تھا۔ مختلف جگہوں پر اس کی گہرائی مختلف تھی جہاں بچے تیرتے تھے وہاں پانی صرف پانچ فٹ گہرا تھا اور ڈائیو والے حصے میں پندرہ فٹ گہرا تھا۔ اس میں ڈائیور پچاس فٹ کی بلندی سے بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مائیکل شروع سے بہت اچھا تیراک تھا۔ اس نے صرف چار برس کی عمر میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔ اسے خود مارش نے تیرنا سکھایا تھا۔ البتہ جیمز کو پانی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ پانچ برس کا ہو گیا تھا اور اس نے ایک بار بھی پول میں قدم نہیں رکھا تھا۔ مائیکل نے کئی بار اسے آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہیں مانا۔ ایک بار تو مائیکل نے اسے اٹھا کر پول میں پھینک دیا اور پھر اس کے پیچھے خود بھی کود گیا۔ بد حواس جیمز نے اسے اس بری طرح جکڑا کہ وہ خود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ بہ مشکل اس نے خود کو جیمز کی گرفت سے آزاد کیا اور پھر اسے پانی سے نکال کر باہر لے آیا۔ اس روز مارش نے پہلی بار مائیکل کو بری طرح ڈانٹا تھا۔

اس واقعے کے بعد جیمز پانی سے مزید ڈرنے لگا تھا۔ عجیب بات ہے کہ بعد میں اس نے مہم جوئی کا ہر کام کیا۔ وہ پہاڑوں اور چٹانوں پر چڑھا۔ اس نے اسکائی ڈائیونگ بھی کی۔ بائیک کا اسے جنون تھا اور وہ بہت خطرناک رفتار سے بائیک چلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے دیکھنے والے ڈر جاتے تھے لیکن جیمز کو کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ البتہ وہ جب کبھی پانی کے پاس جاتا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس نے مرتے دم تک کبھی پانی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ پول پارٹیوں میں شریک نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کبھی کسی دریا یا ندی پر گیا تھا۔ اپنی بائیس برس کی عمر میں اس نے بار بھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ اگر مہم جوئی کے دوران اسے پانی سے واسطہ پڑ جاتا تو وہ اسے پار کرنے کے لیے کوئی پُل تلاش کرتا تھا چاہے پانی چند فٹ گہرا کیوں نہ ہو، پُل تلاش کرنے کے لیے اسے میلوں دور کیوں نہ پڑے۔ عجیب بات تھی۔ ساری عمر پانی سے ڈرنے والا ایڈم موت کے وقت پانی سے بھرے ایک گڑھے میں تھا۔ اگرچہ وہ گڑھے میں گرنے سے پہلے مر چکا تھا مگر اس کی لاش پانی میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔

☆☆☆

پانی دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا اس لیے جلد ہی پول کی طرف سے آگے نکل آیا۔ ولا کے عقبی حصے میں مارش نے لان کی جگہ ایک گرین ہاؤس بنوا دیا تھا۔ یہاں اس نے ٹراپیکل علاقے کے پودے اور درخت منگوا کر لگائے تھے۔ بزنس سے فارغ ہو کر وہ کئی گھنٹے اس گرین ہاؤس کی دیکھ بھال میں گزارتا تھا۔ ایما سے اس کے بہت سارے اختلافات میں سے ایک یہ گرین ہاؤس بھی تھا۔ ایما کو شکوہ تھا کہ مارش کو جو وقت اسے دینا چاہیے وہ گرین ہاؤس کو دیتا تھا۔ بعد میں مارش کا یہ شوق مائیکل نے بھی اپنا لیا تھا اور وہ باپ کے ساتھ مل کر گرین ہاؤس کی دیکھ بھال کرنے لگا تھا۔ جیمز کو گرین ہاؤس سے کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ساری عمر میں شاید تین بار یہاں قدم رکھا ہوگا اور وہ بھی مائیکل کی وجہ سے، جو وہاں موجود ہوتا تھا۔ اسے برداشت نہیں تھا کہ مائیکل اس سے زیادہ کسی چیز یا انسان پر توجہ دے۔

☆☆☆

ہائی اسکول کے آخری سال میں مائیکل کو ہاکی کا شوق ہوا تھا۔ اس نے اسکول کی ٹیم میں شمولیت کی کوششیں شروع کر دیں مگر اسکول کی ٹیم میں پہلے ہی بہت اچھے کھلاڑی موجود تھے اور ان میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مائیکل کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ اسکول میں کلاسز ہوتی تھیں پھر وہ گھر آ جاتا اور شام کو دوبارہ اسکول کے اسٹیڈیم پر پریکٹس میں حصہ لینے جاتا تھا۔ جب اس نے پریکٹس میں حصہ لینے کا آغاز کیا تو جیمز بے قرار ہو گیا۔ وہ مائیکل کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب اس سے دوری جیمز کو کھلتی تھی۔ دوسری طرف اسے احساس تھا کہ ہاکی کھیلنا مائیکل کا شوق ہے۔ جیمز نے اس کا حل یہ نکالا کہ جب مائیکل پریکٹس کے لیے جاتا تو وہ بھی اس کے ساتھ جاتا۔ اسے ہاکی کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسے سرے سے یہ کھیل پسند ہی نہیں تھا۔ وہ صرف مائیکل کی خاطر دو تین گھنٹے میدان کے سامنے بنچوں پر گزارتا تھا۔

اس دوران میں وہ نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کچھ اور کرتا تھا۔ بس ٹکٹکی باندھے مائیکل کو دیکھتا رہتا اور جیسے ہی مائیکل میدان سے باہر آتا وہ لپک کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ مائیکل نے کئی بار اسے سمجھایا کہ وہ کیوں اس طرح بور ہوتا ہے، اس سے بہتر ہے وہ گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرے یا کوئی گیم کھیلا کرے لیکن جیمز بھائی سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں جب لڑکے اپنی روٹین خود بنانے لگتے ہیں ان کے الگ دوست ہوتے ہیں اور الگ سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ وہ کھیلتے ہیں اور ٹیموں کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ مل کر پڑھتے ہیں اور مل کر پکنک پر جاتے ہیں تو جیمز کو سوائے مائیکل کے اور کسی سے سروکار نہیں تھا۔ وہی اس کا دوست اور ہم دم تھا۔ وہ اسی کے ساتھ کھیلتا اور اسی کے ساتھ تفریح کرتا تھا۔ لیکن جب مائیکل نے ہاکی کھیلنا شروع کی تو پریکٹس کے بعد اس میں اتنی ہمت اور وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ جیمز کے ساتھ فٹ بال کھیلتا۔

لڑکیاں کھلاڑیوں کو پسند کرتی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر مضبوط، جارح اور ہیرو ہوتے ہیں، یہ تینوں خصوصیات لڑکیوں کو پسند ہیں۔ فطری بات تھی کہ میدان کے باہر موجود تماشائیوں میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہوتی تھی۔ وہ اپنی پسند کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے وہاں آتی تھیں۔ ان میں ایک مشل بین بھی تھی۔ جب جیمز، مائیکل کے ساتھ جانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ مشل مائیکل میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ بڑی دل کش اور نازک اندام لڑکی تھی۔ جب کھیل کے دوران مائیکل کوئی اچھی موو بناتا تو وہ بڑے پُرجوش انداز میں اسے داد دیتی تھی۔ جب مائیکل باہر آتا تو وہ بلند آواز سے اسے سراہتی تھی۔ جیمز نے یہ بات پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔ پھر مائیکل بھی مشل کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ اس کی تعریف کرتی تو مائیکل اس کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ وہ جب مشل سے بات کرتا تو وہ کھل اٹھتی تھی۔

ایک دن مائیکل بہت اچھا کھیلا تو مشل جیسے دیوانی ہو گئی تھی جیسے ہی مائیکل باہر آیا وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے چوم لیا۔ جیمز کے ساتھ مائیکل بھی ہکا بکا رہ گیا۔ پھر مائیکل مسکرانے لگا تھا۔ ظاہر ہے اس عمر کے کسی نوجوان کو کسی لڑکی کی طرف سے ایسی حرکت بری لگ ہی نہیں سکتی۔ اس نے مشل کا شکریہ ادا کیا تھا۔ مشل نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اس سے کہیں اور ملنے کو کہا۔ مائیکل ہچکچایا پھر اس نے ویک اینڈ پر باہر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے مشل کو اپنا نمبر دیا اور اس کا نمبر لے لیا۔ جب وہ جیمز کے ساتھ واپس جا رہا تھا تو بہت خوش تھا۔ جیمز کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا اور اس نے اپنے تاثرات سے واضح بھی کیا تھا لیکن زندگی میں پہلا موقع تھا جب مائیکل نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔

مائیکل ویک اینڈ پر مشل سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں کی دوستی تیزی سے پروان چڑھی تھی۔ جیمز کو لگا مائیکل اس سے دور جا رہا ہے اس سے چھن رہا ہے اور چھیننے والی مشل ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ معاملہ ایک حد سے آگے جاتا، اچانک مشل مائیکل سے کھنچنے لگی۔ اس نے کھیل کے میدان میں آنا چھوڑ دیا اور جب مائیکل نے اس سے باہر ملاقات کی کوشش کی تو اس نے بہانوں سے انکار کر دیا۔ جلد مائیکل کو پتا چل گیا کہ اس انکار کے پس پشت ایک اور لڑکا ٹام تھا، وہ اسکول کی سوئمنگ ٹیم میں شامل تھا اور لڑکیوں میں بڑا مقبول تھا۔ شکل صورت کا اچھا تھا، بس ایک خرابی تھی کہ وہ ایک معمولی بارمین کا لڑکا تھا۔ مائیکل نے مشل سے جب سختی سے پوچھا تو دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مشل نے اس پر اور اس نے مشل پر بے وفائی کے الزامات لگائے تھے۔ نتیجہ دوستی کے خاتمے کی صورت میں نکلا تھا۔ مائیکل مشتعل اور غم زدہ تھا۔ بہت دن تک وہ دکھ کی کیفیت میں رہا اور جیمز نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اسے خوشی تھی کہ اس کا بھائی اسے واپس مل گیا ہے۔

☆☆☆

وہ گرین ہاؤس سے آگے آیا تو ولا کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا برڈ ہاؤس تھا۔ یہ شوق بھی مارش کا تھا، اسے نایاب اور نادر پرندے پالنے کا شوق تھا۔ اس نے بہت مہنگے داموں یہ پرندے جمع کیے تھے اور برڈ ہاؤس میں ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کا مکمل انتظام تھا۔ ان میں سے بعض پرندے ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ مالیت کے تھے اس لیے مارش نے برڈ ہاؤس اس طرح بنوایا تھا کہ کوئی غیر متعلقہ شخص کسی صورت اندر داخل نہ ہو سکے۔ پرندوں کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا۔ اس نے ان کی دیکھ بھال، خوراک اور علاج کے لیے باقاعدہ کورس کر رکھا تھا۔ جب مائیکل نے گرین ہاؤس اپنے ذمے لے لیا تو مارش کو خیال آیا کہ برڈ ہاؤس جیمز کی ذمے داری بنا دے۔ جیمز کو پرندے اچھے لگتے تھے لیکن اس نے انہیں پالنے میں کبھی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ یہ ذمے داری والا کام تھا اور جیمز کو ایسا کوئی کام یا مشغلہ اچھا نہیں لگتا تھا جو اس کی ذمے داری بن جائے۔ اس لیے جب مارش نے اس سے برڈ ہاؤس سنبھالنے کو کہا تو جیمز نے صاف انکار

کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”سوری ڈیڈی مجھے پرندے پالنے کا شوق نہیں ہے۔“

”اگر نہیں ہے تو پیدا کرو۔“ مارش کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی۔ ”تم نہ کوئی کھیل کھیلتے ہو اور نہ کوئی اور ہابی ہے۔ اگر پرندے پالنے کا شوق نہیں ہے تو کچھ اور کرو۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔“

☆☆☆

وہ ولا کی عقبی سمت سے عمارت میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا جہاں بیڈ رومز تھے۔ وہ جیمز کے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسے جیمز کی زندگی میں تھا۔ جیمز کی ہر چیز اپنی جگہ رکھی تھی اور کمرے کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔ دیواروں پر جیمز کی تصویریں لگی تھیں جن میں وہ فٹ بال کھیلتے اور مہم جوئی کرتے دکھائی دے رہا تھا ایک تصویر میں وہ اپنی ہارلے ڈیوسن بائیک کے ہمراہ تھا۔ اسی بائیک کو چلاتے ہوئے اسے حادثہ پیش آیا تھا۔

☆☆☆

مارش کی بات نے جیمز کو بھی قائل کر لیا کہ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے لیکن یہ کچھ اسے اپنی مرضی سے کرنا چاہیے۔ وہ چودہ سال کا ہو چکا تھا اور اسکول میں اپر گریڈ میں آ گیا تھا۔ ان دنوں مائیکل بزنس انسٹی ٹیوٹ چلا گیا تھا اور جیمز اکیلا تھا اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا، اس لیے مارش کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ اس نے اسکول کی فٹ بال ٹیم کے لیے ٹرائل دیے اور منتخب ہو گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا کھیل بہت اچھا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس نے کبھی باقاعدہ فٹ بال نہیں کھیلی تھی۔ یہ شاید ایڈم ولا کے لان پر فٹ بال سے گھنٹوں پریکٹس کا نتیجہ تھا جو وہ مائیکل کے ساتھ کرتا تھا۔ چند مہینے میں وہ ٹیم کا مقبول ترین کھلاڑی بن گیا تھا۔ اس کا کھیل تو بہترین تھا ہی، اس کی شخصیت بھی کم سحر انگیز نہیں تھی۔ ابھی وہ پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور اس کا قد پونے چھ فٹ سے تجاوز کر گیا تھا۔ اسمارٹ ورزشی جسم اور دل کش نقوش کی وجہ سے لڑکیوں کا فیورٹ بن گیا تھا۔ اس کے اردگرد پروانہ وار منڈلانے والی لڑکیاں عمر میں اس سے تین چار سال بڑی تھیں۔ کم عمری اور ناتجربے کاری کے باوجود جیمز کو یہ سب اچھا لگتا تھا۔ البتہ اس نے کسی لڑکی کو گرل فرینڈ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی توجہ لڑکیوں سے زیادہ اپنے کھیل کی طرف تھی۔ اسی کی وجہ سے اسکول کی ٹیم نے کاؤنٹی چیمپین شپ جیتی تھی۔ اس کے بعد جیمز فیری ٹاؤن کا مقبول ترین لڑکا بن گیا تھا۔

☆☆☆

وہ جیمز کے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا، یہ مائیکل کا بیڈ روم تھا۔ کمرا مائیکل کے ذوق اور پسند کے مطابق سجا ہوا تھا۔ خوب صورت ڈبل بیڈ کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل اور اس پر لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ ایک طرف دیوار گیر شیلف میں کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ مائیکل کو مطالعے کا شوق تھا۔ اسی شیلف میں اس کی بزنس کی ڈگری سرٹیفکیٹس سجے ہوئے تھے۔

☆☆☆

مائیکل ایک بزنس انسٹی ٹیوٹ میں بزنس مینجمنٹ کورس کر رہا تھا۔ وہ دو سال بعد آیا تو جیمز کی کایا پلٹ پر حیران رہ گیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ گھر آنے کے بجائے تفریح کرنے فلوریڈا چلا گیا تھا اور دونوں سال اس کی گرمیوں کی چھٹیاں وہیں گزری تھیں، اسے صرف سرما میں چند دن آنے کا موقع ملا تھا تب سردی کی وجہ سے بیرونی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ جیمز زیادہ تر گھر میں پایا جاتا تھا۔ اس لیے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ جیمز میں کیا تبدیلی آ چکی ہے۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو جیمز سوائے اسکول جانے کے اور گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا لیکن اب وہ گھر میں کم پایا جاتا تھا۔

جیمز کی تبدیلی کا صحیح معنوں میں اندازہ اس وقت ہوا جب مائیکل نے کورس مکمل کر کے مارش کے ساتھ بزنس دیکھنا شروع کیا۔ وہ واپس ولا آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جیمز پہلے کی طرح اس سے چمٹ جائے گا۔ مگر اسے حیرت ہوئی جب جیمز نے اسے زیادہ لفٹ نہیں کرائی تھی۔ اسے مائیکل کے آنے کی خوشی تھی لیکن اس نے اس کے لیے اپنی سرگرمیاں ترک نہیں کی تھیں۔ ان دنوں وہ اسکول میں فائنل کے امتحان کی تیاری کے ساتھ انٹر اسٹیٹ ٹورنامنٹ میں اسکول کی نمائندگی کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ ان کے کوچ کو امید تھی کہ اگر جیمز ٹھیک کھیلا تو وہ پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک لازمی حاصل کر لیں گے۔ جیمز اسے یہ سب بڑے جوش و خروش سے بتا رہا تھا۔ مائیکل مسکرا دیا۔

”شکر ہے اب تم بڑے ہو گئے ہو، ننھے بچے نہیں رہے۔“

اس کا اشارہ سمجھ کر جیمز جھینپ گیا تھا۔ ”وہ وقت اور تھا جب تک میں تمہارے ساتھ رہا مجھے دنیا کا پتا ہی نہیں چلا لیکن جب تم چلے گئے تو مجھے دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا۔“

”تم نے ٹھیک کہا لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی پر تم اس وقت کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔“

”وہ میری غلطی تھی۔“ جیمز نے اعتراف کیا۔ ”دراصل میں نے بچپن سے تمہارے سوا کسی کو دیکھا ہی نہیں... میرے لیے تم ہی سب کچھ تھے۔ ممی ڈیڈی کی حیثیت بھی تمہارے مقابلے میں ثانوی تھی۔“

مائیکل نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”بہرحال اب تم سمجھ گئے ہو کہ زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔ مگر کھیلوں کے ساتھ ضروری ہے تم تعلیم اور اپنے مستقبل کی پروا بھی کرو۔“

جیمز بے پروائی سے مسکرایا۔ ”بزنس سنبھالنے کے لیے تم ہو نا... پھر مجھے کیا ضرورت ہے اس بارے میں پریشان ہونے کی۔“

مائیکل کے ساتھ مارش کا بھی خیال تھا کہ جیمز کو اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ جیسے مائیکل نے اسکول سے نکلتے ہی بزنس مینجمنٹ کے کورس میں داخلہ لے لیا تھا اور وہ صرف بائیس برس کی عمر میں کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جب وہ جیمز کی عمر کا تھا تب بھی کہیں زیادہ میچور تھا۔ جیمز میں یہ میچورٹی نظر نہیں آ رہی تھی، اس کے خیال میں زندگی کھیل کود اور انجوائے منٹ کے لیے ہے۔ اسے کھیلوں کے ساتھ مہم جوئی کا شوق بھی تھا لیکن مارش کی طرف سے اس پر پابندی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اٹھارہ سال کا ہو تو اسے اس معاملے میں باپ کی اجازت کی ضرورت نہ رہے۔ اسے پُر خطر مہم جوئی کا شوق تھا۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد بھی اسے تین مہینے انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس نے مارش کی خواہش کے برعکس بزنس انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینے کے بجائے ایک مقامی کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کا ماحول بہت رنگین تھا کیونکہ کالج میں بے شمار لڑکیاں تھیں۔ بزنس انسٹی ٹیوٹ کا ماحول سنجیدہ اور سادہ تھا، وہاں آنے والی لڑکیاں بھی اتنی شوخ و شنگ نہیں تھیں۔ مائیکل سے وہاں کے ماحول کے بارے میں سن کر ہی جیمز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بزنس انسٹی ٹیوٹ نہیں جائے گا۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد اسے کوئی پُر خطر کام کرنے کے لیے اپنے باپ کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ایک مہم جو کلب جوائن کر لیا۔ اسے ہائکنگ اور راکنگ اچھی لگتی تھی۔ پھر بائیک کا شوق تھا۔ اس نے ہائی اسکول پاس کرنے پر مارش سے ہارلے ڈیوسن بائیک مانگ لی۔ مارش کو بائیکرز اچھے نہیں لگتے تھے لیکن جیمز کی فرمائش پوری کرنی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ اسے ہارلے ڈیوسن کا نیا ماڈل لے کر دیا جس کی قیمت پینتیس ہزار ڈالرز تھی۔

کھلاڑی

شاعری سے ہماری دلچسپی اس عمر میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ جب دادی ماں کی نثری کہانیوں کا سلسلہ ختم گیا تھا اور جب سے ہم نے ٹرکوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا تھا۔ شومئ قسمت کہ اس وقت خدوخال ایسے نہ تھے کہ کوئی ہمارے ہاتھ میں شاعری کی کتاب تھماتا اور کہتا۔ ”خوش فہم اور حرف آشنا، نادر خان کے ذوق مطالعہ کی نذر۔“ ان دنوں ہمیں اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ شاعری میں کون غالب ہے اور کس کا اقبال بلند ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا۔ ”شعر اور شاعر چھپائے نہیں چھپتے۔“ الغرض اشعار کہیں نہ کہیں سے ہمارے کانوں میں اور سر پر پڑتے رہے۔

سب سے پہلا جو شعر ہم نے سنا، وہ تھا۔

پڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

یہ شعر ہم جب بھی سنتے تھے، کان کھول کر سنتے تھے اور جس کان سے سنتے اسی سے نکال دیتے تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ اگر یہ شعر معنوی اعتبار سے صحیح ہے تو جتنے نواب گزرے ہیں، اگر پڑھ لکھ کر نواب بنے تھے تو پھر وہ شاعروں کو اشرفیوں کی پوٹلیاں دے دے کر کیوں پڑھواتے تھے؟ اور جب کھلاڑی کھیل کود کر خراب ہوتے ہیں تو ان کو کھلا کھلا کر نوٹوں کی گڈیاں ان کے ہاتھ پر کس لیے رکھی جاتی ہیں؟ وہ گڈیاں ان کے منہ پر کیوں نہیں ماری جاتیں؟

نادر خان سرگروہ کی کتاب
”باادب بامحاورہ ہوشیار“ سے اقتباس

اس سے پہلے مارش اسے مہم جو کلب کی رکنیت کے لیے بھی پچاس ہزار ڈالرز کی بھاری رقم دے چکا تھا۔ جیمز کے ذاتی خرچے بھی بہت تھے اور اکثر اسے مہینے کا دس ہزار ڈالرز جیب خرچ بھی کم پڑ جاتا تھا۔ مائیکل جو بزنس میں مارش کے برابر ذمے داریاں نبھا رہا تھا، اس کے اخراجات بھی اتنے نہیں تھے۔ نت نئی چیزوں اور کاموں کے لیے جیمز باپ سے وقتاً فوقتاً بھاری رقومات لیتا رہتا تھا لیکن اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کے باوجود جیمز تعلیم پر توجہ دیتا تھا۔ کالج کے ہر سمسٹر میں اس کا اے گریڈ ضرور آتا تھا۔ تین سال بعد اس نے گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ اس نے سائنس لی تھی اس لیے مارش کی خواہش تھی کہ وہ شیشے کی ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے والے کسی ادارے میں داخلہ لے تاکہ وہ کاروبار میں براہ راست حصہ لے سکے۔ لیکن ایک بار پھر جیمز نے اسے مایوس کیا تھا۔ اس نے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔

''سوری ڈیڈی... یہ بزنس میرے بس کا روگ نہیں ہے۔''

''تمہارے بس کا روگ نہیں تو میرے بعد تم کیا کرو گے؟'' مارش نے تلخی سے پوچھا۔

جیمز نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ ''ڈیڈی آپ کے بلین ڈالرز کی دولت ہے، اس کے ہوتے ہوئے مجھے کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے؟''

''بالکل ضرورت ہے کیونکہ ہر انسان کو کام کرنا چاہیے۔'' مارش نے برہمی سے کہا۔ ''جو شخص کام کر کے دولت نہیں کماتا، وہ معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے۔''

''تب میں بوجھ ہی ٹھیک ہوں۔'' جیمز مسکرایا۔ اسے باپ کے غصے اور پریشانی کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ ''ویسے مائیک ہے نا...''

''ہاں لیکن ہر چیز اس کی ذمے داری نہیں ہے۔'' مارش غصے سے بولا۔ ''تم پہلے ہی اس کے ساتھ بہت زیادتی کر چکے ہو۔''

جیمز چونکا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''تمہیں کچھ بتانا بیکار ہے کیونکہ تم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔'' مارش نے افسوس سے کہا۔

اس کے کچھ عرصے بعد جیمز بائیک کے حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مارش باپ تھا مگر اسے خود سے زیادہ مائیکل کی فکر تھی کہ وہ جیمز کی جدائی کیسے برداشت کرے گا۔ وہ جیمز سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ لیکن مائیکل نے حیرت انگیز طور پر ہمت کا ثبوت دیا، اس نے خود کو بھی سنبھالا اور باپ کو بھی دلاسا دیتا رہا تھا۔ مارش صدمے کی بہت عرصے تک دفتر بھی نہیں گیا تھا، مائیکل ہی سب [illegible] رہا تھا۔ خاصے عرصے بعد مارش اس قابل ہوا تھا [illegible] سکے۔ اس وقت اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ مائیکل [illegible] تھا ورنہ اگر جیمز کی جگہ مائیکل مر جاتا تو مارش کا کارخانہ [illegible] جاتا۔ جیمز میں سرے سے بزنس دیکھنے کی صلاحیت [illegible] تھی۔ جبکہ مائیکل نے اس کی عدم موجودگی کا احسا[س] ہونے نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

وہ کتابوں کے شیلف کے پاس کھڑا تھا کہ اچا[نک اس] کی نظر بیڈ کے سرہانے رکھی ایک تصویر کی طرف گئی، وہ دیکھتا رہ گیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کمرے سے نکل آیا۔ رخ عمارت کے مرکزی ہال کی طرف تھا۔ مارش ابھی تک سے نہیں آیا تھا۔ وہ عام طور سے دفتر سے سب سے آ[خر میں] اٹھتا تھا جب اس کا پورا اسٹاف چھٹی کر کے جا چکا ہوتا [تھا۔] باہر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ داخلی دروازہ کھلا اور کوئی آیا۔ قالین پر جوتوں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دے رہی [تھی۔] نوجوان جلدی سے ہال کے ایک تاریک کونے میں چ[لا گیا] اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ آنے والا ہال میں داخل ہوا اور سید[ھا] ایک کونے میں بنے چھوٹے سے بار کی طرف بڑھا۔ اس [نے] ایک ہاتھ سے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے [اپنے] لیے ایک جام بنایا اور اسے لے کر صوفے کی طرف آیا۔

وہ مائیکل تھا، اس نے نوجوان پر دھیان نہیں دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر مائیکل نے سیل فون نکالا اور کسی کو کال کر[نے] لگا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''ڈیئر یہ میں بات [کر رہا] ہوں... باہر ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟... جان اب میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا... ایک ہی دفعہ کھو کر رہا ہوں... اب تو میں نے تمہاری تصویر اپنے بیڈ [کے] سرہانے رکھی ہے تاکہ تمہارا خیال سوتے میں بھی [میرے] ساتھ رہے... جان جو ہوا اس میں میرا اتنا قصور [نہیں] تھا... تم جانتی ہو یہ سب جیمز کا کرا دھرا تھا... اس نے رقم دے کر تمہارے پیچھے لگایا تھا اور تمہیں کال کر کے میر[ے] بارے میں مس گائیڈ کرتا تھا... ہاں وہ نفسیاتی مر[یض تھا] ... میرے پاس کسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا... میں سالوں تک اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہا... جب انجوائے کرنے کی لائف تھی تو میں جیمز کی آیا بنا رہا... میں بزنس انسٹی ٹیوٹ سے واپس آیا تو وہ مجھے نظرانداز کر [کے] خود زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔'' مائیکل کا لہجہ زہر[یلا]

گیا۔ ''اس کا خیال تھا میں ساری عمر گدھا بنا اس کے لیے کام کرتا رہوں گا اور وہ مزے کرے گا... ہاں اس حادثے نے میری اس سے جان چھڑا دی... ان ہی دنوں مجھے پتا چلا تھا کہ اس نے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے کیا چکر چلایا تھا... ہاں ٹام نے خود قبول کیا تھا... تم نہیں جانتیں یہ سن کر مجھ پر کیا گزری تھی اور میں نے تمہیں کس طرح دیوانہ وار تلاش کیا تھا... خدا کا شکر ہے تم مجھے مل گئیں اور اب میں تمہیں کسی قیمت پر نہیں کھونا چاہتا... جیسے ہی ڈیڈ بزنس ٹرپ سے واپس آئیں گے میں بات کرلوں گا اور میرا خیال ہے آنے والے مارچ میں ہم شادی کے بعد ہنی مون پر جاسکیں گے... کہاں؟... جہاں تم کہو... آج کی ملاقات میں ہم تفصیلات طے کرلیں گے۔''

بات کرکے مائیکل نے سیل فون کو بوسہ دے کر کال کاٹ دی۔ پھر اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا اور آتش دان کے اوپر لگی اپنی اور جیمز کی تصویر کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''شکر ہے میری تم سے جان چھوٹ گئی ورنہ تم ساری عمر مجھے استعمال کرتے رہتے... ڈیڈی اور مشل یہی سمجھتے ہیں کہ تمہیں حادثہ پیش آیا تھا اور مجھے تمہارے مرنے کا بہت دکھ تھا... لیکن حقیقت صرف مجھے معلوم ہے... تمہاری بائیک کو حادثہ نہیں پیش آیا تھا... اس کا بندوبست میں نے کیا تھا... سنا تم نے مسٹر جیمز ایڈم... جب مجھے پتا چلا کہ تم نے مشل کو مجھ سے دور کرنے کے لیے کیا سازش کی ہے تو میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا۔ اگر میں نے تمہارا بوجھ اپنی گردن سے نہیں اتارا تو یہ بوجھ ساری عمر میری گردن پر ہی رہے گا۔ اس بوجھ کو اتارنے کے لیے مجھے کچھ زیادہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ بس سڑک پر تھوڑا سا آئل گرانا پڑا تھا مجھے معلوم تھا تم کتنی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہو اور سڑک کے اس تنگ موڑ سے گزرتے ہوئے بائیک کو کس جگہ سے گھماتے ہو، بس میں نے وہیں کچھ گندا آئل ڈال دیا۔ سیاہ رنگ کا ہونے کی وجہ سے تمہیں پتا بھی نہیں چلا اور بائیک سلپ ہوگئی۔ پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ مجھے تم سے نجات مل گئی اور پولیس بھی یہ سمجھتی رہی کہ گندا آئل کسی گاڑی سے گرا تھا۔ آج اس واقعے کو پورا ایک سال ہوگیا ہے۔ سنا تم نے جیمز ایڈم... لیکن تم نہیں سن سکتے۔''

مائیکل ہنسا اور اسی لمحے اس کی نظر اس کونے کی طرف گئی جہاں نوجوان کھڑا تھا۔ مائیکل کی ہنسی رک گئی اور وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا پھر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مائیکل سمجھ رہا تھا کہ وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید مائیکل نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ آتش دان سے ذرا دور تاریک کونے میں ساکت کھڑا یہ سب سن رہا تھا اور اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ... کے دل کش چہرے پر دکھ کی پرچھائیں لرزنے لگی تھی ... نے مائیکل کے جانے کے بعد خود سے کہا۔ ''یہ کس طرح ہے... نہیں یہ کوئی دھوکا ہے۔''

مگر وہ جانتا تھا یہ دھوکا نہیں تھا، مائیکل نے جو کہا تھا اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا اور اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تھکے قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا تھا۔ ولا سے نکل کر وہ دوبارہ سڑک پر آیا اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔ شام ہوگئی تھی اور تاریکی تیزی سے چھا رہی تھی۔ جب وہ قبرستان کے دروازے سے داخل ہوا تو ماحول تقریباً تاریک ہوگیا تھا۔ وہ پختہ روش پر چلتا ہوا چرچ کے پاس سے ہوتا جیمز ایڈم کی قبر کی طرف جانے لگا۔ اچانک چرچ کے فادر جارج نمودار ہوئے۔ فادر جارج گزشتہ تیس سال سے اس چرچ میں فادر تھے اور مقامی طور پر ہر شخص کو جانتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ جیسے اسی کے منتظر تھے۔ اسے دیکھ کر وہ چونک گئے پھر خوف زدہ نظر آنے لگے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر رک گیا تھا۔

''نوجوان تم کون ہو؟'' فادر جارج نے ہمت کرکے پوچھا۔ نوجوان نے ان کی طرف دیکھا۔

''میں...'' اس نے دکھ سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''میں سمجھتا تھا مائیکل مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا کہ وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتا ہے لیکن...''

یہ سنتے ہی فادر جارج لڑکھڑا کر پیچھے ہوگئے تھے۔ اب خوف ان کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا مگر نوجوان جملہ ادھورا چھوڑ کر ان کی طرف توجہ دیے بغیر تیزی سے ان کے برابر سے ہوتے ہوئے قبرستان کی طرف جانے لگا۔ فادر جارج اسی جگہ کھڑے ناقابلِ یقین نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ قبرستان میں مڑا اور جیمز ایڈم کی قبر کی طرف جانے لگا۔ فادر جارج نے جب آخری بار اسے دیکھا تو وہ جیمز ایڈم کی قبر کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک تاریک ہیولے کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا، اس کے بعد یک دم غائب ہوگیا، ابھی تھا اور اگلے ہی لمحے وہاں کوئی نہیں تھا۔ فادر جارج نے گہری سانس لی اور خاصے سرد موسم میں ماتھے پر آجانے والا پسینا صاف کیا۔ انہوں نے خود سے کہا۔ ''یقیناً مجھے غلط فہمی ہوئی ہے... ہاں یہ غلط فہمی ہی ہے۔''

فادر جارج مڑے اور چرچ میں چلے گئے۔ قبرستان میں سرد اور تیز ہوا سوکھے پتے اڑا رہی تھی۔

تعاقب

سلیم انور

بعض مناظر اس قدر پُرفریب ثابت ہوتے ہیں کہ فریب کھانے والا انسان خود کو انتہائی بے وقوف سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اسے بھی خود پر یہی گمان گزرا جب چلتے چلتے اسے ٹھوکر لگی اور اس کی تمام حسیات بے دار ہوگئیں۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے والے تمام سائے مشکوک دکھائی دے رہے تھے لیکن اچانک ایک منظر نے اس کے تمام شک دور کردیے۔

رگوں میں لہو کی گردش تیز کرتی ایک سنسناتی تحریر

مجھے یقین ہے کہ آپ اس احساس سے بہ خوبی واقف ہوں گے..... خوف و دہشت اور سنسنی کی وہ لہر جو آپ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی ہوئی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب آپ ایک اچٹتی نگاہ اپنے شانوں پر سے عقب میں ڈالتے ہیں اور یہ یقین آجاتا ہے کہ کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔

چاہے آپ کتنی ہی بغلی گلیوں میں گھوم جائیں اور چاہے اپنی رفتار جتنی بھی کم یا زیادہ کرلیں آپ اس مشتبہ
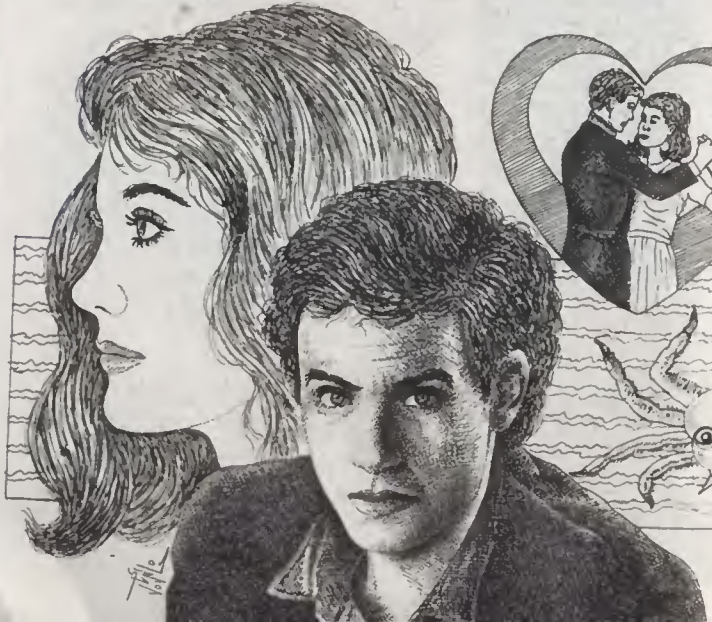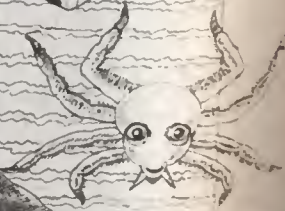
ہیولے کو اپنے عقب میں چالیس فٹ کے فاصلے پر بہ دستور موجود پاتے ہیں...... تب آپ کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے؟

بس یہی کیفیت اس وقت مجھ پر طاری تھی۔

میں IOS یا یونان کے کسی بھی حصے سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی مجھے یقینی طور پر اس بات کا معمولی سا گمان تھا کہ طیش میں آکر رات میں IOS نامی اس چھوٹے سے یونانی شہر میں تنہا نکل پڑنا محفوظ ہوگا...... نہ جانے مجھے جسٹن سے معمولی لڑائی پر بے مقصد اتنا طیش کیوں آگیا تھا جو میں ہوٹل سے نکل پڑی۔

میرا خیال ہے کہ میں اپنے ذہن پر سے ہر قسم کے خیالات کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتی تھی اور بحیرۂ روم کی گرمیوں کی یہ رات بڑی مسحور کن تھی۔ اس رات کے سحر کو اور مزید بہتر انداز سے بیان نہیں کیا جاسکتا...... نیلے دروازوں والے سفید مکانات، دیواروں پر انگور کی چڑھتی ہوئی بیلیں، پس منظر میں ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی سمندری لہروں کا شور اور فضا میں پھولوں اور جڑی بوٹیوں کی ٹھہری ہوئی مہک۔

یہ ایک پرفیکٹ، مسحور کن، دل موہ لینے والی رات تھی!

میں اس رات کا بھرپور لطف لے رہی تھی کہ وہ میری نظر میں آگیا۔

پہلے تو میں یہی سمجھی کہ یہ میرا واہمہ ہے۔ اس نے ہڈ والا سیاہ رنگ کا سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ سائے میں ہونے کی بنا پر اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اپنے انداز سے وہ روایتی قسم کا دبے پاؤں پیچھا کرنے والا لگ رہا تھا۔ اسی قسم کا جو آپ صرف پرانی اسکول کی ڈراؤنی فلموں میں دیکھا کرتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق کے لیے کہ وہ واقعی ایک حقیقت ہے، مجھے چھ بار غیر منطقی ٹرن لینے کے علاوہ دو درجن بار شانوں پر سے عقب میں اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد اس کی موجودگی کا یقین آگیا۔

مجھ پر خفقانی کیفیت طاری ہوگئی۔ میرا ذہن کورا ہوگیا۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں بہ دستور چلتی رہوں اور اپنے عقب میں اچٹتی نگاہ ڈالتی رہوں۔

جو گلی میں نے منتخب کی وہ تنگ اور مختصر تھی۔ لگ بھگ دو سو فٹ کے بعد وہ کسی قسم کے اسکوائر سے جاملتی تھی جہاں لوگوں کی ریل پیل دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ شخص مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس بات کا چانس تھا کہ میں دوڑ کر اس کی دسترس سے نکل کر اسکوائر کے ہجوم میں گم ہوجاؤں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں اس پر بھرپور توجہ مرکوز رکھوں اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے شانوں سے عقب میں اچٹتی نگاہ ڈالنے کا سلسلہ موقوف نہ کروں۔

کارنر سے گھومتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اس تنگ مختصر سی گلی میں صرف چند دروازے گلی کے رخ پر تھے۔ گلی میں نہ تو کوئی دکان دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی کوئی مے کدہ...... اور یہ بات اس چھوٹے سے جزیرے میں قطعی غیر روایتی محسوس ہوئی۔

اگر وہ تعاقب کرنے والا اس گلی میں داخل ہوتا ہے تو مجھے پتا چل جائے گا لیکن تب میں کیا کروں گی؟

میں نے اپنا چہرہ تاروں بھرے آسمان کی طرف اٹھالیا اور التجا کرنے لگی۔ ''خدایا، پلیز اسے میرے پیچھے مت آنے دینا۔ کاش یہ سب میرا واہمہ ہو!''

یہ میری زندگی کے ممکنہ بدترین اوقات تھے۔ زندگی بالکل اس طرح لگ رہی تھی جیسے فلموں میں کوئی منظر سنسنی خیز دکھایا جاتا ہے۔

گلی میں بیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد احتیاط کے ساتھ گھوم گئی تاکہ اسے احساس نہ ہونے پائے کہ میں اس کی موجودگی سے باخبر ہوں۔

وہ اب بھی وہاں موجود تھا۔

بہ دستور میرے عقب میں۔ اس اندھیری گلی میں۔

میں نے اپنا سانس روک لیا تھا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ میری نگاہیں بار بار بے قراری میں میرے شانوں کے عقب میں اور اس راستے پر جس پر میں آگے بڑھ رہی تھی، اٹھ رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں گھونگھے کی سی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہوں۔ صرف میری نبض کی رفتار اس حقیقت کی مظہر تھی کہ میں کم وبیش دوڑ رہی تھی۔

شاپنگ اسکوائر میں پہنچنے کے بعد میں مجمع میں گم ہوگئی۔ پھر ایک جگہ رک کر میں جھکی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ چاہے عارضی طور پر سہی، لیکن میں فی الوقت محفوظ تھی۔

اسکوائر کے مین ریسٹورنٹ کے کھلے آنگن کا احاطہ سرخ یاقوتی گلاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ فضا گلاب کی خوشبو سے معطر تھی۔ عام حالات میں، میں اس مسحور کن ماحول کو کسی طور نظر انداز نہ کرتی بلکہ بھرپور طریقے سے لطف لینے کا احساس مجھے تروتازہ کردیتا۔

لیکن اس وقت معاملہ دوسرا تھا۔ میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

میں ایک کے بعد ایک گلاب کی ٹہنیاں توڑ رہی تھی۔

میں اس درد سے بے خبر تھی جو میری ہتھیلیوں میں ہورہا تھا۔ گلاب کے کانٹوں نے میری ہتھیلیوں کو لہولہان کردیا تھا اور ہتھیلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

لیکن مجھے صرف ایک ہی بات کی فکر لاحق تھی۔ اپنے دفاع کی۔ کم از کم ان کانٹے دار ٹہنیوں سے میں اپنا کچھ نہ کچھ بچاؤ تو کر ہی سکتی تھی۔

اب میں منظم طور پر اپنا کام کررہی تھی...... ایک اچٹتی نگاہ شانوں پر سے اپنے عقب میں ڈالتی، پھر ایک ٹہنی توڑتی، پھر اچٹتی نگاہ عقب میں ڈالتی، پھر ایک ٹہنی توڑتی...... اور ہر بار مجھے وہ دیکھنے کو مل رہا تھا جو میں کسی طور بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

میرا پیچھا کرنے والا!

اب تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح بس جسٹن کے پاس پہنچ جاؤں لیکن میں اس اسکوائر سے، اس ہجوم سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک وہ شخص میرا تعاقب ختم نہیں کردیتا۔

پھر ایک ناقابلِ پیمائش حوصلے کے ساتھ گلاب کی کانٹے دار ٹہنیوں کو ایک ہتھیار کے مانند ہاتھ میں دبوچے میں اس شخص کی جانب بڑھنے لگی جو میرا تعاقب کررہا تھا۔

لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب اس شخص نے یہ بھانپ لیا کہ میں کس مقصد سے اس کی جانب بڑھ رہی ہوں تو وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ میرے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں یہ معاملہ بالکل الٹ ہوگیا۔ اب میں اس کا تعاقب کررہی تھی اور وہ مجھ سے دور بھاگ رہا تھا۔

پھر یہ سلسلہ ایک وحشیانہ تعاقب میں بدل گیا۔

لوگ تیزی سے چھٹ رہے تھے اور ہم ان کے درمیان سے بھاگتے چلے جارہے تھے۔ گلاب کی کانٹے دار ٹہنیاں بہ طور ہتھیار میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھیں۔

پھر میں چیخ پڑی۔ ''رک جاؤ!''

اور پھر میں مزید حیرت زدہ رہ گئی جب میرے تحکمانہ انداز پر وہ یک دم رک گیا۔

میں بھی رک گئی اور ہانپنے لگی۔ پھر وہ گھوما اور اس نے اپنا ہڈ اوپر اٹھا دیا۔ میں محتاط انداز میں اس کے قریب پہنچی تو وہ کسی طور پر ایسا نظر نہیں...... آرہا تھا جسے دیکھ کر جھرجھری آجائے یا ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑنے لگے۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس ہوٹل کا سیکیورٹی گارڈ ہوں جہاں تم قیام پذیر ہو۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''تو میرا تعاقب کیوں کررہے تھے؟''

''تمہارے بوائے فرینڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم پر نظر رکھوں تاکہ تم اس اجنبی جگہ پر کھو نہ جاؤ یا کوئی تم پر دست درازی کی کوشش نہ کرے۔'' یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''IOS رات کے وقت کسی بھی تنہا خاتون کے لیے خطرناک جگہ ثابت ہوسکتی ہے۔''

یہ سن کر میری ہیجانی کیفیت ختم ہوگئی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے جسٹن سے میری لڑائی لاکھوں برس پہلے ہوئی تھی۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ لڑائی کس بات پر ہوئی تھی۔

میں جلد از جلد واپس جسٹن کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔

''میں واپس چلنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔ ساتھ ہی اپنا ہتھیار یعنی گلاب کی کانٹے دار ٹہنیوں کو اپنے خون آلودہ ہاتھوں سے علیحدہ کرتے ہوئے نیچے رکھ دیا اور گلاب توڑ کر اپنے ہاتھوں میں بھر لیے۔

پھر ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے اپنے خون میں تر گلاب اپنے جسٹن کے قدموں میں ڈھیر کردیے۔

پس منظر

مرزا امجد بیگ

انسان اگر نہ ملے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا مگر کسی کامل کر بچھڑ جانا کئی داستانوں کو جنم دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے اور بدقسمتی سے اسے بھی اپنا ہمسفر کھونا پڑا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی جدائی کی رسوائی نے اس کے دامن کو بھی داغدار کر ڈالا۔ ایسے میں بیگ صاحب قانون کے ہتھیاروں سے آراستہ دلائل کا انبار لے کر اس کے دامن کو دھونے چلے آئے... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ غم اسے موت کی نیند سلا دیتا۔

وکالت کا تجربہ ”لکانے“ کی خواہش کرنے والے ایک موکل کا پرمزاح انداز

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ پیش منظر کہلاتا ہے۔ اس منظر نامے کے عقب میں بھی بہت کچھ پوشیدہ ہوتا ہے جہاں تک انسانی آنکھ کی رسائی ممکن نہیں۔ اس چھپے ہوئے راز کو منظرِ عام پر لانے کے لیے بینائی کے ساتھ دانائی کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے پھر بصارت اور بصیرت کا یہ باہمی ملاپ تحقیق و تفتیش کی گاڑی کو کسی حتمی منزل تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں عدالت سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے عقب سے مجھے پکارا۔ اپنے نام کی پکار سن کر مجھے رکنا پڑا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ہینڈسم نوجوان کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے پایا۔ میں رک کر سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں عدالت کے کمرے سے نکل کر راہ داری سے گزر رہا تھا یہی نوجوان ایک وکیل کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ وہ مذکورہ وکیل سے میرے ہی بارے میں پوچھ رہا تھا۔

مذکورہ نوجوان نے میرے قریب پہنچ کر اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”السلام علیکم بیگ صاحب......!“

”وعلیکم السلام۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے مصافحے کے لیے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

”آپ مجھے نہیں جانتے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن شیرازی صاحب کے توسط سے میں آپ سے غائبانہ متعارف ہوں اور آج ملاقات بھی ہوگئی ہے......“

”میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ”آپ کن شیرازی صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟“

میرے جاننے والوں میں شیرازی نام کے تین افراد شامل تھے۔ فیصل شیرازی کا تعلق شوبزنس سے تھا۔ نجم شیرازی مشیر انکم ٹیکس تھے اور فرید شیرازی ایک فلاحی تنظیم کے روحِ رواں تھے۔ اس اسمارٹ نوجوان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں نجم شیرازی کی بات کر رہا ہوں جناب۔ وہ جو انکم ٹیکس وغیرہ کے وکیل ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر استفسار کیا۔ ”آپ کی تعریف؟“

”اوہ...... آئی ایم رئیلی ویری سوری بیگ صاحب۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں جلدی سے بولا۔ ”میں پریشانی میں اپنا تعارف تو کرانا بھول ہی گیا...... میرا نام ہاشم ہے...... ہاشم انور۔“

”آپ نے اپنے پریشان ہونے کا ذکر کیا ہے؟“ میں نے تنقیدی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اسی سلسلے میں آپ میرے پاس آئے ہیں؟“

”جی ہاں، بالکل یہی معاملہ ہے۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

”میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ ٹھیک ایک گھنٹے بعد میرے آفس آجائیں پھر وہیں پر آپ سے تفصیلی بات ہوجائے گی۔“

اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا تھا اور اس وقت میں لنچ پر جاتا تھا۔ لنچ کرنے میں آدھا پونا گھنٹا لگ جاتا، تاہم میں نے ہاشم انور کو احتیاطاً ایک گھنٹے کا ٹائم دیا تھا۔ ڈھائی بجے تک تو میں یقیناً اپنے آفس میں پہنچ ہی جاتا۔ میں ایک مخصوص ریسٹورنٹ میں دن کا کھانا کھایا کرتا تھا جو سٹی کورٹ کی عمارت اور میرے آفس کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔

”ہاشم نے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کا آفس کہاں پر ہے؟“

”یہاں سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے۔“ میں نے کہا پھر اس کثیر المنزلہ عمارت کا نام بھی بتا دیا جس کے اندر میرا دفتر تھا۔

مذکورہ عمارت میں زیادہ تر وکلا ہی کے دفاتر واقع تھے۔ ہاشم نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے بیگ صاحب! میں اتنی دیر میں لنچ کرلیتا ہوں۔“

”لنچ......“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”آپ کہاں لنچ کریں گے؟“

”کہیں بھی۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”ایکچوئلی مجھے تو ایک گھنٹا گزارنا ہے۔ اسی دوران میں پیٹ پوجا بھی ہوجائے گی۔“

”اگر کوئی پرابلم نہ ہو تو آج لنچ میرے ساتھ ہی کرلیں۔“ میں نے ایک اندرونی جذبے کے تحت اسے پیشکش کردی۔ ”میں اس وقت لنچ کے لیے ہی ایک قریبی ریسٹورنٹ میں جارہا تھا۔“ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میری پیشکش قبول کرلی۔

ہاشم کی عمر میرے اندازے کے مطابق پچیس اور چھبیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت اور صحت مند نوجوان تھا۔ رنگ گورا اور چہرے کے نقوش سے وجاہت جھلکتی تھی۔ اس نے جینز کے اوپر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یہ لباس اس پر بہت سج رہا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیوں اور کاٹھی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کسرت کرتا ہوگا۔ اس کا بدن اسپورٹس مین والا تھا اور حرکات وسکنات میں بڑی منظم مستعدی پائی جاتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ایک خوب صورت فریم والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ خاصا سلجھا ہوا نوجوان تھا، بات چیت کا انداز انتہائی مہذب اور شائستہ تھا۔

مجھے صحت مند، خوش مزاج اور چاق وچوبند نوجوان بہت اچھے لگتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے بے ساختہ ہاشم کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا لگا تھا اور اس پیشکش میں بھی میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔

ہم ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھے تو ہمارے درمیان بات چیت بھی ہونے لگی۔ ہاشم میرے ساتھ بیٹھ کر ذرا سا بھی نروس محسوس نہیں ہورہا تھا۔ وہ ایک پُراعتماد نوجوان تھا تاہم جو پریشانی اسے کھینچ کر میرے پاس لائی تھی اس کے آثار ہاشم کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھے جاسکتے تھے۔ وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

اس نے آرڈر وغیرہ کا معاملہ مجھی پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تھوڑے غور وخوض کے بعد دو ایسی ڈشز آرڈر کردیں جو ہم دونوں بہ آسانی کھاسکتے تھے۔ آرڈر پلیس ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی لہٰذا میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہاشم سے پوچھا۔

”ہاشم! آپ جانتے ہیں دنیا میں سب سے قیمتی شے کیا ہے؟“

”آئی تھنک...... انسانی زندگی۔“

”اور انسانی زندگی میں سب سے قیمتی شے؟“

”اوں......“ اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”ٹائم۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کے دونوں جواب مجھے پسند آئے ہیں۔“

”تھینک یو بیگ صاحب۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے تو ہم بھی وقت کا پورا پورا استعمال کریں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کھانا بھی چلے گا اس دوران میں ہماری گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

”بس تو پھر سب سے پہلے آپ مجھے اپنے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

وہ بتانے لگا۔ ”جناب! میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ میں گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہوں۔ ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں میری رہائش ہے۔ ایک سال پہلے شادی بھی کرچکا ہوں۔ مین سولجر بازار میں میری چشموں کی دکان ہے جہاں میں دن بھر موجود ہوتا ہوں۔ میری دکان پر ہر کوالٹی اور ہر دام کے چشمے موجود ہیں۔ میں اپنے پاس آنے والوں کی نظر بھی ٹیسٹ کرتا ہوں اور ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق چشمے بھی بنا کردیتا ہوں۔“

”اوہ...... لگتا ہے، آپ اپنے کام میں بڑے ماہر ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”جناب! یہ تو آپ کو تجربے کے بعد ہی صحیح طور اندازہ ہوگا کہ میں اپنے پیشے میں کتنا ماہر ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر موقع ملے تو آپ ایک مرتبہ ضرور میری شاپ پر تشریف لائیں۔“

”آپ کی سیلز مین شپ کا تو اس دعوت ہی سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہوگیا ہے۔“ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک آپ کی دکان پر تشریف لے جانے کا تعلق ہے تو جناب، میرے ساتھ قریب یا دور، کسی بھی نوعیت کی ضعف نظری والا معاملہ تو ہے نہیں البتہ سن گلاسز کا مجھے ضرور شوق رہا ہے بلکہ شوق ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی شاپ پر اچھے سن گلاسز بھی ہوں گے؟“

”بالکل ہیں جناب۔“ وہ بڑے وثوقی انداز میں سر کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس لوکل سن گلاسز بھی ہیں اور آپ جیسے باذوق لوگوں کے لیے میں نے برانڈڈ گلاسز بھی رکھے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، پھر تو آپ کی دکان کا ایک آدھ چکر لگانا ہی پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

وہ تشکرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بہت خوشی ہوگی بیگ صاحب۔“

میں نے فوراً اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ہاشم صاحب! میں پچھلے پندرہ منٹ سے آپ کے ساتھ ہوں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ آپ خاصے اطمینان کے ساتھ مجھے کمپنی دے رہے ہیں جس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی سنگین نوعیت کا معاملہ نہیں ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

واضح رہے کہ اس دوران میں ہمارا آرڈر پلیس کردیا گیا تھا اور ہم نے کھانا شروع کردیا تھا۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ”آپ کسی حد تک درست فرمارہے ہیں۔“

”کسی حد تک...... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ......“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے کہ میں مطمئن نظر آتا ہوں۔ میرے چہرے سے وہ پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر نہیں ہورہی جتنا کہ معاملہ سنگین ہے اور اس تضاد کا بھی ایک سبب ہے بیگ صاحب۔“ وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، ایک نوالہ منہ میں رکھا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! دراصل میرے ساتھ ایز یچ کوئی پرابلم نہیں ہے۔“

”پھر......؟“ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اپنے ایک دوست کی پرابلم لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا دوست عاطف ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاشم اپنے کسی مسئلے کے لیے مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا ہی معاملہ نکل آیا تھا۔ اصل میں ہمارے درمیان گفتگو کی نوعیت کچھ ایسی رہی تھی کہ میں اندازہ نہیں کرپایا تھا، مسئلہ اس کا ہے یا کسی اور کا۔

”آپ کا دوست عاطف کس قسم کی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے؟“ میں نے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

”پولیس نے عاطف کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”عاطف نے کس کو قتل کردیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے...... اس پر کس کے قتل کا الزام ہے؟“

”اس کی بیوی ہما کے قتل کا الزام۔“

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”میں جانتا ہوں، عاطف ایسا انسان نہیں ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہما کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مصیبت میں پھنسایا گیا ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں، آپ کا عاطف بے گناہ

ہے؟''
''جی ہاں، مجھے اس کی بے گناہی کا سوفی صد یقین ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''اس یقین کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟''
''نہیں جناب! یہ میرے دل کی گواہی ہے۔''
''عدالت دل کی گواہی اور اس قسم کے جذباتی معاملات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہاشم صاحب۔'' میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں پر ہمیں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے واقعاتی شہادتیں اور گواہوں کو پیش کرنا پڑتا ہے جب جا کر کہیں بات بنتی ہے۔''
''جناب! عدالتی معاملات کا تو آپ ہی کو زیادہ پتا ہوگا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں عاطف کو پچھلے پندرہ سال سے جانتا ہوں، جب وہ ہماری اپارٹمنٹس بلڈنگ کے قریب ہی ایک بستی میں رہتا تھا۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا اسے اس کیس میں ظاہر کیا جارہا ہے۔ وہ ہما کو کوئی معمولی سی تکلیف بھی پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا چہ جائے کہ قتل......''
''آپ نے بتایا ہے کہ ملزم عاطف پہلے آپ کے گھر کے نزدیک ہی کسی بستی میں رہتا تھا۔'' میں نے کھانے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب وہ کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے؟''
''جی ہاں، وہ شادی کے بعد سولجر بازار کے علاقے میں منتقل ہوگیا تھا۔''
''آپ کے دوست کی شادی کتنا عرصہ پہلے ہوئی تھی؟''
''لگ بھگ ایک سال پہلے۔''
''ہما کے قتل والا واقعہ کہاں پیش آیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ان کے فلیٹ پر۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ ''سولجر بازار والے فلیٹ پر۔''
''اوہ......!'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا پھر پوچھا۔ ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''
''دو دن پہلے کا۔''
''دو دن......'' میں نے زبانی حساب لگاتے ہوئے کہا۔ ''آج انیس اگست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہما کو سترہ اگست کو قتل کیا گیا ہے؟''
''جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''
''اور اس کا ایک مطلب یہ بھی کہ......'' میں نے [illegible] میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہ اس وقت آپ کا دوست عاطف عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہوگا؟''
''جی ہاں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگا۔ ''سترہ اگست کی دوپہر میں واقعہ پیش آیا تھا اور اسی روز پولیس نے اسے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اگلے روز یعنی گزشتہ کل پولیس نے عاطف کو [illegible] پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا اور اب وہ تھانے میں بند ہے۔''
''کون سے تھانے میں؟'' میرے سوال کے جواب میں اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔
''پولیس نے کتنے دن کا ریمانڈ حاصل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے جواب دیا۔ ''سات دن کا۔''
''ملزم عاطف کے کوئی بچے وغیرہ......؟''
''نہیں بیگ صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''ابھی تک ان کی اولاد نہیں ہوئی تھی۔''
''ایک بات میرے سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے اپنی الجھن کو بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''عاطف کے ورثا میں کوئی آپ کے ساتھ نظر نہیں آرہا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''
''جی، اس کی خاص وجہ ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
میں جب ویٹر کو بل کی رقم مع اس کی ٹپ کے [illegible] کرنے لگا تو ہاشم نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے والٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''آپ نہیں بیگ صاحب، کھانے کے پیسے میں دوں گا۔''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاشم صاحب۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
''پلیز بیگ صاحب۔'' وہ والٹ کھول کر اس میں سے رقم نکالنے لگا۔
میں نے پوچھا۔ ''ہاشم، اس ریسٹورنٹ میں آپ میرے ساتھ آئے ہو یا میں آپ کے ساتھ آیا ہوں؟''
''ظاہر ہے، آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''
''کھانے کی پیشکش میں نے آپ کو کی تھی یا آپ نے مجھے؟''
''یہ آفر آپ ہی نے دی تھی۔''
''بس تو پھر ثابت ہوگیا کہ اس لنچ پر میں آپ کا میزبان اور آپ میرے مہمان تھے۔'' میں نے زیرِ

مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا کھانے کا بل بھی میں ہی دوں گا۔''
اس وضاحت کے بعد ہاشم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور ہم مذکورہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ملزم کے ہمدرد دوست ہاشم کے ساتھ اپنے چیمبر میں بیٹھا ہوا تھا۔
''وہاں ریسٹورنٹ میں، میں نے آپ سے ملزم کے ورثا کے حوالے سے ایک سوال کیا تھا۔'' میں نے گفتگو کے منقطع سلسلے کو بحال کرتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ مجھے کوئی خاص وجہ بتانے والے تھے؟''
''جی بیگ صاحب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''عاطف کا کوئی عزیز رشتے دار آپ کو اس لیے میرے ساتھ نظر نہیں آرہا کہ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' میں چونک اٹھا۔
''عاطف چار پانچ سال کا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی والدہ نے ماں اور باپ بن کر اسے پالا ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کی والدہ بھی چل بسیں۔ وہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ ایک ڈیڑھ سال زیرِ علاج رہنے کے بعد اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب اس بات کو بھی کم و بیش پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''دور کا کوئی عزیز رشتے دار اس دنیا میں موجود ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ عاطف کی زبانی بھی میں نے ایسا کوئی ذکر نہیں سنا۔''
میں نے ایک سفاک حقیقت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ہاشم سے کہا۔ ''آپ کا دوست قتل کے ایک مقدمے میں بہ طور ملزم نامزد ہو چکا ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے کہ اس کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں کتنے اخراجات ہو سکتے ہیں؟''
''میں کسی اماؤنٹ کا درست اندازہ تو قائم نہیں کر سکتا بیگ صاحب۔'' ہاشم نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ آپ کی فیس کے علاوہ دیگر عدالتی اخراجات بھی ہوں گے۔''
''اور یہ تمام تر اخراجات کون برداشت کرے گا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بہ قول آپ کے، ملزم کے آگے پیچھے تو کوئی ہے ہی نہیں۔ کہیں آپ کے ذہن میں یہ تو نہیں ہے کہ اس سلسلے میں ملزم کی سسرال والے اس کی مالی اور اخلاقی مدد کریں گے؟''
''نہیں جناب! اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ تو اس کیس میں مخالف پارٹی ہیں۔ ہما کی ماں کا جھکاؤ استغاثہ کی جانب ہے اور وہ بھی عاطف ہی کو ہما کا قاتل سمجھتی ہیں۔''
''تو پھر......؟''
''جناب بیگ صاحب! آپ اپنی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کی بالکل فکر نہ کریں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''منصور صاحب نے اس سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے بلکہ اس واقعے کے بارے میں بھی مجھے انہوں نے ہی بتایا تھا۔''
''یہ منصور کون صاحب ہیں؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''منصور صاحب دراصل عاطف کے باس ہیں بیگ صاحب۔'' ہاشم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''منصور ٹریولز کے مالک۔''
''اچھا تو آپ کا دوست کسی ٹریول کمپنی میں کام کرتا ہے؟''
''جی بیگ صاحب۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''وہ ٹکٹنگ کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ منصور ٹریولز کا آفس میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔''
''چلیں ایک مسئلہ تو حل ہوا۔'' میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب ایک اور بڑا مسئلہ باقی ہے۔''
''کون سا مسئلہ بیگ صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے کہا۔ ''ضمانت کا مسئلہ۔''
''میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟'' اس کے لہجے میں الجھن تھی۔
''ہاشم صاحب!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس عدالت میں چالان پیش کر دے گی۔ اس موقع پر مجھے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کرنا ہوگی۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی بندوبست کر رکھا ہے؟''
''بندوبست؟'' اس کی آنکھوں میں تذبذب کی پرچھائیں لہرائی۔ ''ذرا وضاحت فرمائیں گے۔''
''ضرور۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

کہا۔ ''جب ملزم کو چالان کے ساتھ پولیس حوالۂ عدالت کردیتی ہے تو ڈیفنس کی جانب سے ملزم کے لیے ضمانت یا ضمانتی کا انتظام کرنا پڑتا ہے تا کہ اسے جیل کسٹڈی سے بچایا جاسکے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہوتی ہے تاہم اس سلسلے میں کوشش ضرور کی جاتی ہے۔'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی وضاحت مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''شخصی ضمانت کو ضمانتی یا ضامن بھی کہتے ہیں جو یقیناً کسی نہایت ہی معزز اور معاشی طور پر خوش حال شہری کی صورت میں عدالت کے لیے قابلِ قبول ہوتی ہے اور اگر ملزم کی ضمانت کے لیے ایسی کوئی معتبر سماجی شخصیت میسر نہ ہو تو پھر سکہ رائج الوقت کام آتا ہے۔ ضمانت کے ضمن میں عدالت ایک بھاری مالیت کا بانڈ بھرواتی ہے۔ آپ اسے ذاتی مچلکہ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں آج سے پہلے کوئی آئیڈیا نہیں تھا بیگ صاحب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا منصور ٹریولز والے منصور صاحب آپ کے دوست کے لیے شخصی ضمانت دینے کے لیے تیار ہوجائیں گے؟''

''میں سمجھتا ہوں انہیں انکار تو نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن پھر بھی میں ان سے بات کرنے کے بعد ہی کنفرم کرسکتا ہوں۔''

''آپ ایسا کریں کل اسی وقت منصور صاحب کو اپنے ساتھ میرے آفس لے آئیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں خود ہی براہ راست ان سے بات کرلیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ میں لے آؤں گا انہیں۔''

''اس واقعے کے بارے میں آپ کو اگر مزید کچھ پتا ہو تو مجھے تفصیل سے بتائیں۔'' میں نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب، مجھے تو کل رات ہی اس واقعے کی اطلاع ملی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور وہ بھی منصور صاحب کے فون کے ذریعے۔ میں رات کو اپنی شاپ بند کرنے ہی والا تھا کہ ان کا فون آگیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ عاطف ایک ناگہانی میں پھنس گیا ہے۔ میری عاطف سے ملاقات ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ عاطف نے منصور صاحب کو میرے بارے میں بتایا تھا کہ مشکل کی اس گھڑی میں ایک میں ہی ہوں جو اس کے لیے بھاگ دوڑ کرسکتا ہوں۔ منصور صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ مالی محاذ پر وہ بھرپور تعاون کریں گے اور عملی میدان میں مجھے پاؤں اور زبان کو زحمت دینا ہوگی لہٰذا آج صبح میں پہلے ان کے دفتر گیا۔ انہوں نے مجھے ابتدائی اخراجات کے لیے کچھ رقم بھی دی ہے۔ شیرازی صاحب سے میں نے رات ہی بات کرلی تھی اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔'' وہ رکا ایک طویل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا بیگ صاحب۔''

''کیا آپ عاطف کو دیکھنے تھانے گئے تھے؟''

''ابھی تک تو نہیں گیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کے پاس سے فارغ ہونے کے بعد اس طرف جاؤں گا۔ آج کے دن کے لیے میں نے اپنی شاپ بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''رات کو میں بھی تھانے جاکر اس سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا۔ چند ضروری کاغذات پر اس کے دستخط بھی کرواتا ہوں گے۔''

''بیگ صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''شیرازی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنی فیس ایڈوانس میں لیتے ہیں۔ یہ کام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے تا کہ میں آپ کے آفس سے اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوں کہ آپ نے میرے دوست کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔''

بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اپنا پرس بات شروع کرنے سے پہلے ہی نکال چکا تھا۔ اس کی سوالیہ نظر کا ایک ہی مطلب تھا کہ میں اسے اپنی فیس کے اماؤنٹ کے بارے میں بتاؤں۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی خواہش پوری کردی۔

''شیرازی صاحب نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ میں اپنی فیس ایڈوانس ہی میں وصول کرتا ہوں۔''

اس نے میری فیس کے برابر مالیت کے نوٹ گن کر رقم میری جانب بڑھادی۔ میں نے رقم گن کر اپنی میز کی دراز میں ڈالی اور بدلے میں اسے فیس کی وصولی کی رسید بنا کردے دی۔

جب وہ میرے دفتر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''ایک بات آپ پر واضح کردوں ہاشم صاحب!''

وہ رک کر ٹھٹکی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے اپنی فیس کھری کر کے یہ کیس تو ہاتھ میں لے لیا ہے لیکن ملزم سے ملاقات کے بعد یا کیس کی اسٹڈی کے دوران میں اگر کسی مرحلے پر مجھے یہ احساس ہوا کہ آپ

کا دوست کسی بھی زاویے سے اپنی بیوی کے قتل میں ملوث ہے تو اسی لمحے میں یہ کیس چھوڑ دوں گا پھر آپ مجھ سے کوئی شکایت نہیں کیجیے گا۔''

''آپ اس عمل میں حق بہ جانب ہوں گے بیگ صاحب۔'' اس نے بھی بڑے واضح انداز میں کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے، ایسی کوئی بھی صورتِ حال پیش نہیں آئے گی۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔'' میں نے مثبت طرز فکر کا اظہار کیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا، بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا پھر آیندہ روز آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا۔

میں نے اسی رات دفتری مصروفیات سے نمٹنے کے بعد اپنی گاڑی کو متعلقہ تھانے پہنچا کر ملزم عاطف سے ایک بھرپور ملاقات کرلی اور مجھے جن قانونی کاغذات پر اس کے دستخط کی ضرورت تھی وہ بھی کروالیے۔ ان کاغذات میں سرفہرست تو میرا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت تھی۔

اس بات کا پہلے بھی درجنوں بار کبھی مختصر اور کبھی تفصیلاً احوال بیان کیا جاچکا ہے کہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ملزم سے ملاقات ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال کبھی قائدِ اعظم، بانی پاکستان اور کبھی دھونس دھمکی کی جھلک دکھا کر یہ کام بھی کر ہی لیا جاتا ہے سو اس رات بھی میں نے کسی نہ کسی طرح ملزم عاطف سے ایک تسلی بخش ملاقات کرلی تھی۔

کہانی کے واقعات کو آگے بڑھانے اور اس کیس کو عدالت میں لے جانے سے پہلے میں آپ کو وقوعہ کے پس منظر سے آگاہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بیشتر باتیں تو مجھے ملزم جو کہ اب میرے موکل کی حیثیت اختیار کرچکا تھا، کی زبانی پتا چلی تھیں اور کچھ اہم باتیں میں نے اپنی ریسرچ اور ہاشم انور کے تعاون سے بعد میں معلوم کرلی تھیں۔ میں کسی تفصیل میں جائے بغیر سوائے چند اہم باتوں کے اس کا تمام خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

ملزم عاطف اس دنیا میں اکیلا تھا جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد عاطف کی والدہ نے اسے بڑی محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ اس کی والدہ ایک معروف فارماسیوٹیکل کمپنی میں کسی نچلی پوسٹ پر کام کرتی تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہوگئی تھیں اور پھر اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ہاشم نے اپنی اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نزدیک جس بستی کے بارے میں بتایا تھا وہاں عاطف کا ذاتی ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کا والد بس یہی ایک مکان ترکے میں چھوڑ کر گیا تھا پھر جب اس کی والدہ بھی چل بسیں تو وہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا۔ والدہ کی محنت سے اس نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم بھی حاصل کرلی تھی۔ جب گھر کا واحد ذریعۂ آمدنی بھی زمین اوڑھ کر سو گیا تو عاطف روزگار کے سلسلے میں سرگرم عمل ہوگیا۔

اس کی والدہ بڑی دانش مند خاتون تھی۔ گاہے بہ گاہے جو بھی بچت ہوجاتی وہ اس کے سرٹیفکیٹ خرید لیا کرتی تھی چنانچہ جب وہ اس دنیا سے اٹھی تو کم و بیش دو لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹس اس کے گھر میں رکھے تھے جن کے حوالے سے اس نے اپنی موت کے بعد عاطف ہی کو ان کا مالک نامزد کر رکھا تھا۔ عاطف نے وہ سرٹیفکیٹس اپنے نام پر تو ٹرانسفر کروا لیے تھے تاہم انہیں کیش کرانے کی حماقت نہیں کی۔ رقم ہاتھ میں آجائے تو خرچ کرنے کی ہزاروں جگہیں نکل آتی ہیں۔ وہ مذکورہ رقم کو سیونگ سرٹیفکیٹس کی صورت محفوظ رکھ کر ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

انسان اگر خلوصِ نیت سے کسی کام کی کوشش کرے تو جلد یا بہ دیر اسے اپنے مقصد میں کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ عاطف کی بھی یہ سعی رائگاں نہیں گئی اور مختلف دفتروں کے دھکے کھانے کے بعد بالآخر ایک ماہ کے خاتمے پر اسے منصور ٹریولز میں جاب مل گئی تھی۔ یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور اپنی گرفتاری تک وہ بڑی ثابت قدمی سے اسی ملازمت پر جما ہوا تھا۔

کسی بھی ادارے میں کام کرنے کے لیے باہمی موافقت بہت ضروری ہوتی ہے۔ عاطف اور منصور کے درمیان ابتدا ہی میں میوچل انڈراسٹینڈنگ پیدا ہوگئی تھی۔ عاطف ایک محنتی اور ایمان دار شخص تھا اور منصور ایک مہربان اور قدرداں انسان لہٰذا آج تک کسی نے کسی کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب عاطف کی شادی کا معاملہ سامنے آیا تو اس مرحلے پر بھی منصور صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہما (مقتولہ) کا باپ خاور حمید (مرحوم) عاطف کا گھر دیکھ کر فوراً بدک گیا تھا، اس نے دوٹوک اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں ہما کی ضد کی وجہ سے اس شادی کے لیے تیار تو ہوگیا ہوں لیکن میری بچی بیاہ کر اس جھگی میں نہیں آئے گی۔''

چند ماہ پہلے تک خاور حمید زندہ تھا لیکن اب پیوند خاک ہو چکا تھا۔ وہ ایک آسودہ حال بزنس مین تھا لہٰذا عاطف کے گھر کے حوالے سے اس کا اعتراض بڑا جائز نظر آتا تھا۔ ہما نے ایک بنگلے میں آنکھ کھولی تھی اور ساری زندگی بڑے آرام و آسائش میں گزری تھی۔ ان کی رہائش گرومندر کے نزدیک ایک پوش علاقے میں تھی۔ خاور حمید کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کا کام کرتا تھا۔ اس کا آفس ٹاور کے نزدیک آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع تھا۔ خاور حمید اور منصور چونکہ ایک ہی علاقے میں بزنس کرتے تھے اور کبھی کبھار ایک دوسرے سے واسطہ بھی پڑ جاتا تھا لہٰذا وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

ہما اور عاطف کے سوشل اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن محبت کی کشش انہیں اتنا قریب لے آئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا اور ان کے بیچ محبت کا یہ رشتہ کس طرح استوار ہوا تھا۔ آپ صرف یہ جان لیں کہ ہما اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور خصوصاً خاور حمید کی بے حد لاڈلی بھی۔ ہما کی تمام تر ضدوں اور من مانیوں کے لیے اس کی ماں رئیسہ بیگم، خاور حمید ہی کو ذمے دار ٹھہراتی تھی۔ اس کے خیال میں خاور حمید کے حد سے بڑھے ہوئے لاڈ پیار اور آزادی نے ہما کو خود سر اور سرکش بنا دیا تھا۔ جب عاطف کے حوالے سے گھر میں ہما کی شادی کی بات چلی تو سب سے زیادہ مخالفت رئیسہ بیگم ہی نے کی تھی۔

''میں کسی قیمت پر یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

خاور حمید کو ہما نے اس شادی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی پدرانہ کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھی لہٰذا کسی بھی معاملے میں خاور کی رائے کو ہموار کرنے میں اسے دقت پیش نہیں آتی تھی پھر یہ بھی تھا کہ خاور حمید ایک زندہ دل انسان تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ محبت کرنے والا۔ وہ جیو اور جینے دو کا حامی تھا لہٰذا جب ہما نے بڑے واشگاف الفاظ میں اسے اپنی محبت سے نہ صرف یہ کہ آگاہ کیا بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اگر عاطف اسے نہ ملا تو وہ اپنی جان دیدے گی تو باپ کا دل پگھل گیا۔ وہ دل جس میں بیٹی کی محبت بہ درجہا موجود تھی بلکہ وہ ہما کی محبت کی آنچ ہی سے زندہ تھا۔

خاور حمید نے بیوی کا اعلان سماعت کیا تو پوچھا۔ ''کیوں بھئی، آپ اس شادی کو رکوانے کا بیڑا کیوں اٹھا رہی ہیں؟''

''میں ماں ہوں۔'' وہ شوہر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہما کا اچھا برا جانتی ہوں۔ کچھ سوچ کر ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں۔'' خاور حمید نے کہا۔ ''آخر تم نے سوچ کیا رکھا ہے؟''

''یہ لڑکا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' وہ گول مول انداز میں بولی۔

''اچھا۔'' خاور نے اسے سوالیہ نظر سے گھورا۔ ''آخر کیا خرابی ہے لڑکے میں؟''

''کوئی ایک خرابی ہو تو بتاؤں بھی۔'' اس کا انداز اس بار بھی ٹالنے والا تھا۔

''اگر ایک سے زیادہ خرابیاں ہیں اس نوجوان میں تو......'' خاور نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ''تو پھر کوئی سی بھی دس خرابیاں بیان کر دو۔''

''تمہیں تو مذاق کی سوجھ رہی ہے اور میں پریشان ہوں ہما کے لیے۔''

''ہما کو کیا ہو رہا ہے بھئی؟''

''اس نے نادانی میں جو فیصلہ کیا ہے اور تم بھی اس معاملے میں اس کی مدد کر رہے ہو یاد رکھو خاور......'' اس کا انداز تنبیہی ہو گیا۔ ''یہ لڑکا ہمیں بہت نقصان اٹھائے گی اور تم بھی بیٹھ کر رو دو گے اس کے پیچھے تو۔''

''یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں رئیسہ۔'' خاور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تو جو فیصلہ ہو گیا سو ہو گیا۔ کچھ بھی ہے ہما کی خوشی کی خاطر یہ قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔''

''میں نے سنا ہے اس لڑکے کا تو کوئی آگے پیچھے بھی نہیں ہے۔''

''تم نے ٹھیک ہی سنا ہے...... پھر؟''

''میں رشتے داروں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''کوئی پوچھے گا کہ لڑکا کون ہے، اس کے ماں باپ کون ہیں، خاندان کون سا ہے تو...... تو میں کیا جواب دوں گی انہیں؟''

''وہی جواب جو برسوں پہلے تمہارے والدین نے اپنے خاندان والوں کو دیا تھا۔'' خاور نے معنی خیز نظر سے رئیسہ کی جانب دیکھا۔

خاور کی بات اس کی سمجھ میں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہ سکی تو وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''بھئی برسوں پہلے میں پاکستان کے ایک دور دراز

علاقے سے کراچی آیا تھا۔ روزگار کے سلسلے میں۔'' خاور پُرسوچ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا بھی کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ دور کے رشتے داروں کو میں بہت دور چھوڑ آیا تھا گویا اس وقت میرے بھی کوئی آگے پیچھے نہیں تھا جیسا کہ آج عاطف کے ساتھ ہے۔ ہماری بھی تو شادی ہو ہی گئی تھی نا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما ایک ہموار سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نہ صرف ہماری شادی ہو گئی تھی بلکہ میں نے دن رات سر توڑ محنت کی اور اپنا نام بنا لیا۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے عزت، دولت، شہرت، بزنس۔ جب میری شادی ہوئی اس وقت تو میں عاطف سے بھی گیا گزرا تھا۔ مجھے امید ہے آگے چل کر عاطف بھی بہت ترقی کرے گا۔ تمہاری قسمت سے میں بن گیا تھا اور ہما کی قسمت سے عاطف بھی ان شاءاللہ ضرور کچھ بن کر دکھائے گا۔''

''یہ کوئی فارمولا تو نہیں ہے۔'' رئیسہ بیگم برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہماری ہما کے لیے خاندان ہی میں ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے پھر اپنوں کو چھوڑ کر باہر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''باہر جھانکنے والا معاملہ نہ تو تم نے کیا ہے اور نہ ہی اس میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔'' خاور نے بڑے واضح انداز میں کہا۔ ''یہ ہما کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی عاطف کا انتخاب کیا ہے۔''

''لڑکیوں کو اتنی زیادہ آزادی بھی نہیں دینا چاہیے کہ وہ والدین کی خواہشات کو پھلانگ کر اپنی مرضی کے فیصلے کرنے لگیں۔'' رئیسہ کے معنی خیز جملے نے خاور کو یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

''رئیسہ! تم اپنے خاندان کا اور رشتوں کا کچھ زیادہ ہی ذکر کر رہی ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری نظر میں ہما کے لیے خاندان میں کون سا رشتہ سب سے زیادہ مناسب ہے؟''

''میری نظر تو چاروں طرف گھوم پھر کر ایک ہی رشتے پر ٹکتی ہے۔''

''کس پر؟'' خاور سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

''نوید پر...... نوید صدیقی پر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں سمجھتی ہوں نوید ہما کی بہت قدر کرے گا۔ اسے ایسا فرماں بردار شوہر پوری دنیا میں نہیں ملے گا۔''

''تم بیٹی کے لیے شوہر ڈھونڈ رہی ہو یا شوفر؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں نوید صدیقی ہما کو حد سے زیادہ پسند کرتا ہے۔'' وہ نوید صدیقی کی وکالت کرتے ہوئے بولی۔ ''نفیسہ آپا نے اشاروں کنایوں میں دو تین مرتبہ مجھ سے بات بھی کی ہے۔''

''نوید یقیناً ہما کو پسند کرتا ہو گا لیکن ہما اس گینڈے کو سخت ناپسند کرتی ہے۔'' خاور نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اب ان باتوں کو چھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے ہما کی پسند کی تائید کا فیصلہ کر لیا ہے...... بس!''

جب خاور حمید بس کہہ دیا کرتا تو پھر بحث و تکرار کے سارے دروازے بند ہو جایا کرتے تھے۔ رئیسہ کو اس بات کا برسوں سے تجربہ تھا لہٰذا ان کے بیچ میں گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

رئیسہ بیگم نے جس نوید صدیقی کا ذکر کیا تھا وہ رئیسہ کی بڑی بہن نفیسہ کا بیٹا تھا۔ نوید صدیقی ایک ست الوجود گینڈا نما انسان تھا۔ وہ زبان کا بہت خراب اور غصے کا بھی خاصا تیز تھا۔ ہما اس کی بدمزاجی کے باعث ہی اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔ نفیسہ کا شوہر فواد صدیقی گارمنٹس کا ایکسپورٹر تھا اور اس کی خاور حمید سے نہیں بنتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ خاور حمید کی اس سے کبھی نہیں بنی تھی حالانکہ فواد تو خاور کے قریب ہونے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن

خاور اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ ابتدا میں فواد نے خاور کے توسط سے ایکسپورٹ کے ایک دو کام کروائے تھے اور خاور نے اس کی بے ایمانی پکڑ لی تھی۔ خاور کی نظر میں فواد ایک دھوکے باز اور چرب زبان شخص تھا اور اس قماش کے لوگوں سے خاور سو گز دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

خاور نے ہما کی شادی سے پہلے عاطف نے چھوٹے سے مکان کو دیکھ کر جو نقطۂ اعتراض اٹھایا تھا اس پر عاطف بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اگلے روز اس نے اپنے باس منصور کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو میں کرتا ہوں کچھ۔''

''آپ کیا کریں گے سر؟'' عاطف نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا۔

''میں خاور حمید سے اس سلسلے میں خود بات کروں گا۔'' منصور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے امید ہے تمہارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔'' عاطف نے اپنے باس کی تسلی سے مطمئن ہو گیا۔

دو روز بعد منصور نے خاور کے دفتر جا کر اس مسئلے پر بات کی۔ خاور نے کہا۔ ''میں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہا ہوں۔ آپ خود بتائیں منصور صاحب، میری بیٹی اس بستی کے جھونپڑا نما مکان میں کیسے رہے گی؟''

''میں آپ کے موقف سے اتفاق کرتا ہوں خاور صاحب۔'' منصور نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد ہما عاطف کے بستی والے مکان میں نہ جائے۔''

''تو پھر......؟'' خاور نے سوالیہ نظر سے منصور کو دیکھا۔

''پھر یہ کہ اس شادی سے پہلے ہی عاطف کی رہائش تبدیل ہو جانی چاہیے۔'' منصور نے معنی خیز انداز میں کہا۔

خاور نے استعجابیہ نظر سے منصور کو دیکھا اور بولا۔ ''وہ کیسے؟''

''میرے پاس اس کام کو ممکن بنانے کے لیے دو آئیڈیاز ہیں۔'' منصور نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ ''ایک آئیڈیا کا تعلق آپ سے اور دوسرے کا مجھ سے ہے۔''

''پلیز وضاحت کریں۔'' یہ کہہ کر خاور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

منصور نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر بتانے لگا۔ ''دیکھیں خاور صاحب! آپ اپنی اکلوتی بیٹی کو عاطف کے نکاح میں دینے جا رہے ہیں یعنی آپ اسے اپنی فرزندی میں لینے والے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔'' خاور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اصولی طور پر تو یہ آپ کا فرض بنتا ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے آرام و آسائش کے لیے تھوڑی بہت انویسٹ منٹ کر ڈالیں۔'' منصور نے بڑے ڈھنگ سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر نعمت اور ہر دولت سے نواز رکھا ہے۔ اگر آپ کسی مناسب سے علاقے میں ہما کے نام سے ہی کوئی فلیٹ خرید لیں تو آپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح ان لوگوں کی رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ تو ہے آپ کے لیے آئیڈیا۔''

منصور اتنا بتانے کے بعد خاموش ہوا تو خاور نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ کے حصے کا آئیڈیا کون سا ہے؟''

''میرے آئیڈیا کی باری اس وقت آئے گی جب آپ اپنے حصے کے آئیڈیا پر عمل کرنے سے انکار کر دیں گے۔'' منصور نے کہا۔ ''بہر حال میں وہ بھی بتا ہی دیتا ہوں۔''

''ارشاد۔'' خاور نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کی جانب سے انکار آتا ہے تو پھر میں عاطف کے لیے شادی سے پہلے ہی کسی معقول علاقے میں رہائش کا بندوبست کر دوں گا۔'' منصور ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرنے لگا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں اسے کوئی فلیٹ خرید کر نہیں دے سکتا البتہ کرایے پر ضرور دلوا سکتا ہوں اور وہ اس طرح کہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فلیٹ کرایے پر لینے کے لیے ایڈوانس کی جو رقم فلیٹ کے مالک کو دینا ہو گی وہ میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا اور یہ رقم عاطف ہی کی ملکیت ہو جائے گی اب جہاں تک فلیٹ کے ماہانہ کرایے کی ادائیگی کا سوال ہے تو میں اس سلسلے میں عاطف سے دوٹوک بات کر لوں گا۔ وہ بستی والے اپنے مکان کو کرایے پر اٹھا دے گا اور وہاں سے ملنے والے کرایے میں مزید رقم ملا کر وہ ہر ماہ فلیٹ کا کرایہ بھرتا رہے گا اور یہ مزید رقم اس کے لیے کوئی اضافی بوجھ ثابت نہیں ہو گی کیونکہ میں اس کی تنخواہ میں کم و بیش اتنا ہی اضافہ کر دوں گا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''خاور صاحب، میں جو کر سکتا ہوں وہ آپ کو بتا دیا ہے۔''

''میں آپ کے پُرخلوص جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ عاطف کے سچے خیر خواہ ہیں۔'' خاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا بلکہ آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ اصولی طور مجھے اپنی بیٹی کے سکھ اور آرام کے لیے تھوڑی بہت انویسٹ منٹ کر لینا چاہیے تو مجھے آپ کی اصولی بات سے پوری طرح اتفاق ہے اور میں اس نیک کام کے لیے تیار بھی ہوں لیکن......''

''لیکن کیا خاور صاحب؟'' خاور کے نامکمل جملے پر منصور نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ کہ......'' خاور نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اس کارِ خیر میں آپ کی طرف سے بھی حصہ شامل ہو جائے۔''

''آپ حکم کریں۔'' منصور نے جلدی سے کہا۔ ''میں اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

''آپ صرف عاطف کی سیلری میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں۔'' خاور حمید نے بڑی رسان سے کہا۔ ''باقی کے تمام معاملات میں دیکھ لوں گا۔''

''ڈن!'' منصور نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کر دیا۔

وہ دونوں مزید آدھے گھنٹے تک عاطف اور ہما کی شادی کے حوالے سے بات چیت کرتے رہے پھر یہ محفل برخاست ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عاطف کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن اس کا باس اس کے لیے ایک سرپرست کا کردار ادا کر رہا تھا۔ یہ منصور کا بڑا پن اور عاطف کی خوش قسمتی تھی۔

اس اہم میٹنگ کے دو ماہ کے بعد عاطف اور ہما کی شادی ہو گئی اور اس شادی سے ایک ماہ پہلے خاور حمید نے سولجر بازار کے علاقے میں ہما کے نام سے ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں مناسب سا فلیٹ بھی خرید لیا تھا۔ ہما کو بیاہ کر اسی فلیٹ میں جانا تھا جہاں عاطف کی معیت میں اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا۔

سب کچھ پروگرام کے مطابق عمل میں آ گیا۔ ہما اور عاطف راضی خوشی سولجر بازار کے علاقے میں رہنے لگے۔ ان کے فلیٹ کا ایک رخ نشتر پارک کی جانب تھا۔ یہ فلیٹ ہما کے میکے سے بھی بہت قریب تھا۔ یوں سمجھیں کہ واکنگ ڈسٹینس پر۔

انسان عقل اور سوجھ بوجھ کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے لیکن اوپر بھی کوئی مہا منصوبہ ساز بیٹھا ہوا ہے جس کے سامنے بڑے بڑوں کی منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ قدرت نے ان لوگوں کے لیے اپنے طور پر کوئی اور ہی پلاننگ کر رکھی تھی لہٰذا شادی کے بعد ایک سال کے عرصے کے اندر ہی حالات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔

خاور حمید کا انتقال ہو گیا۔ رئیسہ بیگم جائداد، کاروبار کی بلاشرکت غیرے مالک بن گئیں۔ ان کی ناتجربہ کاری کا تمام فائدہ بہنوئی نے اٹھایا۔ خاور حمید کی زندگی میں تو فواد صدیقی کا کوئی داؤ کارگر نہیں ہوتا تھا لہٰذا اس کی موت کے بعد اپنی بیوی نفیسہ بیگم کی مدد سے فواد نے بڑی کاری گری کے ساتھ رئیسہ بیگم کے گھر اور کاروبار میں راستہ بنا لیا۔ عاطف یہ تمام ترسیاسی بازی گری دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ اسے چونکہ اپنی سسرال سے ہمدردی تھی اس لیے وہ ہما کے توسط سے رئیسہ بیگم کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے مخلصانہ جذبات کی ناقدری ہو رہی ہے تو اس نے خاموشی سے کنارہ کش ہو جانا بہتر سمجھا۔ رئیسہ بیگم چونکہ عاطف سے ہما کی شادی کی مخالف رہی تھی اس لیے وہ عاطف کو اپنے سامنے کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی، اس کی باتوں کو کیا اہمیت دیتی۔ اس اثنا میں بہ قول کسے رئیسہ بیگم کے گھر اور کاروبار پر فواد صدیقی اپنے پنجے گاڑ چکا تھا۔

حالات اپنے مزاج اور ڈگر پر گامزن تھے کہ ایک روز ہما کو اس کے فلیٹ کے اندر قتل کر دیا گیا اور کاشف کو اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا گیا اور اب اسی عاطف کا کیس میرے ہاتھ میں تھا میں تھا جو اس کے دوست ہاشم کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا۔

حسبِ وعدہ اگلے روز ہاشم انور مجھ سے ملنے آفس پہنچ گیا لیکن اسے اکیلے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی جب کہ آج تو اسے منصور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر آنا تھا۔ میں نے جب اسی حوالے سے سوال کیا تو اس نے بتایا۔

''منصور صاحب کی آج کی مصروفیات پہلے سے طے تھیں اس لیے وہ نہیں آ سکے لیکن انہوں نے پیشی پر عدالت پہنچنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''پیشی پر!'' میں نے سوالیہ نظر سے ہاشم کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے جب پولیس اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کرے گی؟''

''جی ہاں، میری یہی مراد تھی۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''ضمانت وغیرہ کے سلسلے میں منصور صاحب سے بات ہو گئی؟''

''جی، وہ عاطف کا ضمانتی بننے کے لیے تیار ہیں۔'' اس نے بتایا۔'' کہہ رہے تھے وکیل صاحب یعنی آپ ضمانت وغیرہ کے کاغذات تیار کروالیں ۔ جہاں جہاں ضروری ہوگا وہ آکر دستخط کردیں گے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔'' ہاشم، اس کیس کے سلسلے میں بعض جگہوں پر آپ کی مدد اور تعاون کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ اس کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہیں نا؟''

''آپ مجھے ان دونوں میدانوں میں مستعد پائیں گے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

''مجھے آپ سے یہی امید تھی ۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اسے چند ابتدائی نوعیت کی ہدایات دے دیں۔

''یہ کام تو چالان پیش ہونے سے پہلے ہی میں کردوں گا بیگ صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔'' اور کوئی حکم؟''

''جب ضرورت ہوگی تو حکم نہیں بلکہ آپ کو زحمت دوں گا۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔'' ذرا کیس کی باقاعدہ سماعت تو شروع ہونے دیں۔''

بہ وقتِ رخصت اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور سرسری انداز میں پوچھ لیا۔'' بیگ صاحب، آپ میری شاپ پر کب تشریف لا رہے ہیں؟''

''شاپ پر۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں۔'' اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولا۔'' آپ کو سن گلاسز دیکھنا تھے نا۔''

''اوہ ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔'' بس، ذرا فرصت مل جائے پھر ان شااللہ ضرور چکر ماروں گا۔ ویسے ایک بات ہے ہاشم صاحب......'' میں نے اپنی بات کے اختتام پر جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔

''کون سی بات بیگ صاحب؟''

''یہ بات کہ ......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔'' میں تو آپ کی شاپ پر جب جاؤں گا تب جاؤں گا ہی لیکن آپ اٹھتے بیٹھتے مجھے خوب مارکیٹنگ سکھا رہے ہیں۔ اگر کبھی وکالت کا پیشہ چھوڑ کر مجھے دکان داری کرنا پڑی تو سیلز مین شپ میں مار نہیں کھاؤں گا۔''

میں نے تو مذاق کے انداز میں بات کی تھی۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔'' چلیں کوئی بات نہیں بیگ صاحب، ہم اسے ایڈجسٹ کرلیں گے۔''

''ایڈجسٹ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔'' ہاشم صاحب، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''ویری سمپل بیگ صاحب۔'' وہ لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔'' اگر میں واقعی آپ کو مارکٹنگ سکھا رہا ہوں تو اس کیس کے دوران میں آپ سے بھی مر گا ہے بہ گا ہے وکالت سیکھتا رہوں گا، حساب برابر ہوجائے گا۔ کیا پتا......'' اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔'' کیا پتا، مستقبل بعید میں مجھے دکان داری چھوڑ کر وکالت کا خوانچہ لگانا پڑ جائے۔''

''وکالت کا خوانچہ۔'' بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔'' یہ کیا ہوتا ہے ہاشم صاحب؟''

''بھئی بیگ صاحب۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' میں آپ کی طرح کا کوئی ماہر اور تجربہ کار وکیل تو ہوں گا نہیں جو میرے کریڈٹ پر درجنوں بلکہ سیکڑوں کامیاب کیسز درج ہوں اور لوگ مزید کیس میرے ریکارڈ پر چڑھانے کے لیے بھی بے چین ہوں۔ مجھے تو روز کنواں کھود کر اپنے لیے پانی نکالنا ہوگا۔''

''لیکن اس کنوئیں اور پانی کا خوانچہ وکالت سے کیا کام؟''

''جناب، جب میری کوئی پیشہ ورانہ ساکھ نہیں ہوگی تو پھر عمدہ قسم کا دفتر سجا کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا مجھے بہ نفسِ نفیس مارکیٹ میں رزق کی تلاش کے لیے نکلنا پڑے گا اور وہ بھی اس طرح......''

اس نے دونوں بازو پھیلا کر کچھ اس انداز کا اشارہ دیا جیسے اس نے کوئی تھال وغیرہ اٹھا رکھا ہو، پھر اپنی بات کی تکمیل کرتے ہوئے بولا۔

''میں اس طرح اپنی وکالت کا خوانچہ اٹھا کر سٹی کورٹ کے باہر اور کبھی اندر یہ صدائیں لگایا کروں گا ......اے بھائی صاحب، اللہ کے نام پر مجھ سے کوئی کیس کرالو۔ بڑی دعائیں دوں گا۔ اے بہن، اگر شوہر سے کوئی تنازع چل رہا ہے تو لعنت بھیجو اس کی منحوس شکل پر۔ میں آخر کس مرض کی دوا ہوں۔ مجھ سے اور میری خوانچہ بہ دست وکالت سے رجوع کرو، کورٹ سے ایسا خلع دلواؤں گا کہ عمر بھر دعائیں دو گی ...... وغیرہ وغیرہ......!'' میں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا، بے ساختہ کہا۔

''ہاشم صاحب! آپ بہت زندہ دل اور دلچسپ انسان ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

''آپ کو کبھی اداکاری وغیرہ کا بھی شوق رہا ہے؟'' پھر پوچھا۔'' کبھی نہیں بیگ صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' میں جو کچھ بھی بولتا ہوں اس میں کوئی تصنع، بناوٹ یا اداکاری کا دخل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ نیچرل ہوتا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا'' اداکاری نہیں تو پھر لکھنے لکھانے کا شوق ضرور رہا ہوگا؟''

''پڑھنے کا بہت شوق ہے۔'' اس نے جواب دیا ''جو بھی ناول یا کتاب ہاتھ لگے، میں راتوں رات چاٹ ڈالتا ہوں۔''

''آپ کی پڑھنے کی یہ عادت بڑی سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔'' میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔'' اگر آپ ساتھ ساتھ لکھنا بھی شروع کردیں تو مجھے یقین ہے، آپ ایک کامیاب رائٹر کے روپ میں خود کو منوا سکتے ہیں۔'' میں نے مزید کہا۔'' آپ ڈائجسٹ کیوں نہیں پڑھتے؟''

''بس، ایسے ہی......'' وہ سرسری انداز میں بولا۔'' اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔''

''پڑھا کریں۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''خصوصاً سسپنس ڈائجسٹ تو بہت ہی معیاری اور پُرمغز میگزین ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ اس میں میری کہانی چھپتی ہے بلکہ واقعی یہ میگزین معتبر اور قابلِ تعریف ہے۔''

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد، پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اسی روز میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی۔ اب اس کیس کی سماعت کا آغاز ہوگیا تھا۔

جج نے ملزم کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کردیا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ جب پولیس کسی کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کیس کے حوالے سے اپنی تفتیش مکمل کرلی ہے اور چالان کی اسی رپورٹ میں ملزم کا اقراری بیان بھی شامل ہوتا ہے جو کہ ظاہر ہے، ایک جبر کے نتیجے میں وجود پاتا ہے۔ پولیس والے جب تشدد کی فضا میں ملزم کو ایک ناکردہ جرم قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو وہ جان کی امان چاہتے ہوئے اقراری بیان پر انگوٹھا یا دستخط ثبت کردیتا ہے۔ بعدازاں وہ عدالت کے روبرو اس بیان سے منحرف ہوجاتا ہے اسی لیے پولیس کی کسٹڈی میں کیے گئے ملزم کے اقبالِ جرم کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔

صحتِ جرم سے انکار کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا جاچکا تو میں اپنے موکل کی ضمانت کے لیے دلائل دینے کی غرض سے آگے بڑھا اور جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد بولنا شروع کیا۔

''جنابِ عالی! میرا موکل سراسر بے قصور ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔''

''یور آنر......'' وکیلِ استغاثہ نے ضمانت رکوانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے کہا'' ملزم نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا اس کی ضمانت قبول کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

''جنابِ عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک شریف رکن ہے۔ اس کیس کی وجہ سے اس کی نیک نامی اور شرافت پر بڑے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اسی معاشرے کا ایک معتبر شخص اس کی ضمانت دینے کو تیار ہے لہٰذا میں نہیں سمجھتا، میرے موکل کی ضمانت پر رہائی عدالت کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرسکتی ہے۔''

''ضامن کے معتبر، خوش حال اور مضبوط ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ وہ جس کی ضمانت دے رہا ہے وہ بے گناہ و بے قصور ہے۔'' وکیل استغاثہ نے سلسلۂ اعتراضات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' ملزم نے ایک خاص پلاننگ کے تحت اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ یہ خطرناک مجرم ہے یور آنر......!''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے چیخ سے مشابہ احتجاجی لہجے میں کہا۔'' وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے لیے انتہائی نامناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے...... آئی آبجیکٹ، آئی آبجیکٹ......!''

''وکیل صاحب!'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔'' آپ کو وکیل استغاثہ کے کون سے

الفاظ پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی پیشی ہے۔'' میں نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا جب تک میرے موکل پر عائد کردہ جرم عدالت کے روبرو ثابت نہیں ہوجاتا، اس کے لیے ''خطرناک مجرم'' کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طور جائز نہیں ہے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ آیندہ ملزم کے لیے ان الفاظ کا استعمال نہ کرے جن پر ڈیفنس کو اعتراض ہے۔

''ٹھیک ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے بادل ناخواستہ اثبات میں گردن ہلائی اور اپنی مخالفت کو ایک نئے زاویے سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! ملزم کو جائے وقوعہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ واقعات وشواہد اسے پوری طرح قاتل قرار دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں استغاثہ کے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جن کی شہادت ملزم کا کچا چٹھا سب کھول کر رکھ دے گی لہٰذا معزز عدالت سے میری پُرزور اپیل ہے کہ وہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کی سماعت کو آگے بڑھانے کے لیے نئی پیشی کی تاریخ دیدے۔''

''مثلاً استغاثہ کے پاس ایسے کون سے گواہ ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''جو میرے موکل کا کچا چٹھا کھول کر رکھ سکتے ہیں۔''

''استغاثہ سردست ان کو ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''جب استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوگا تو آپ خود ہی تماشا دیکھ لیں گے۔''

''تماشا......!'' میں نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا پھر اپنے موکل کی ضمانت کے سلسلے کو آگے بڑھادیا۔

ہمارے بیچ مزید پندرہ منٹ تک ترش اور تلخ کلمات کا تبادلہ ہوتا رہا لیکن میں اپنے موکل کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ چنانچہ عدالت نے ملزم عاطف کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات صادر کرنے کے بعد آیندہ پیشی کے لیے تاریخ دیدی۔

اگلی پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

ہم عدالت سے نکلے تو ہاشم نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ''بیگ صاحب! عاطف کی ضمانت تو منظور ہی نہیں ہوئی۔ منصور صاحب کے بھی آج عدالت آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

اس وقت ''منصور ٹریولز'' کا مالک اور ملزم کا باس منصور بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاشم کی مایوسی پر الفاظ کا مرہم رکھتا، منصور نے یہ فریضہ سنبھالتے ہوئے ہاشم کو سمجھانا شروع کردیا کہ قتل کے ملزم کی ضمانت میں کس نوعیت کی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! میں آپ کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔''

''تھینک یو منصور صاحب!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ماشا اللہ! قانونی معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔''

''ہاشم بھی سمجھنے لگے گا۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے، اس نے آپ سے وکالت سیکھنے کا پروگرام ترتیب دیا ہے؟''

''پتا نہیں جناب، یہ مذاق میں کیا، کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔'' میں نے ہاشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سنجیدہ ہوں بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ میری باتوں کو مذاق نہ سمجھیں۔''

''ٹھیک ہے، ہاشم صاحب!'' میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔ ''آپ اس کیس کے دوران میں صرف اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔ استادی شاگردی کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔''

منصور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! ملزم کی جب ضمانت منظور نہیں ہوئی تو ظاہر ہے اس کے ساتھ ہی ضمانتی کا کردار بھی ختم ہوجائے گا۔''

''جناب! اس کیس میں آپ کا کردار محض ضمانتی تک محدود نہیں تھا۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''آپ تو ایک طرح سے اس کیس میں عاطف کے سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔ آپ کا کردار اس کی زندگی میں یہ کیس کھلنے سے پہلے بھی رہا ہے اور اس کیس کے خاتمے کے بعد بھی جاری وساری رہے گا۔''

منصور نہایت ہی ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کا مالک تھا۔ میری بات کو اس نے توجہ سے سنا اور میرے خاموش ہونے پر اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے کب اس کردار کی ادائیگی سے انکار کیا ہے جناب! میں تو کچھ اور ہی کہنے والا تھا۔''

''کچھ اور کیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے انداز سے اسے دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل:

ہے کہ آیندہ پیشی پر میں ملک میں نہیں ہوں گا۔ مجھے دو تین دن کے لیے کسی ضروری کام سے تھائی لینڈ جانا ہے لہٰذا آپ ہی اس کیس کو دیکھ لیجیے گا۔ میری ضمانت والا معاملہ تو ختم ہو چکا البتہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''البتہ اگر آپ کو اس کیس کے سلسلے میں میرے کسی مالی تعاون کی ضرورت پیش آ جائے تو آپ میرے صاحب زادے شہزاد سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میری غیر موجودی میں شہزاد ہی بزنس کو سنبھالتا ہے اور میں نے اسے شہزاد کے حوالے سے تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کر رکھا ہے۔''

''تھینک یو منصور صاحب!'' ہاشم نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

منصور مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

میرے اور ہاشم کے بیچ دس منٹ تک مزید بات چیت ہوتی رہی پھر میں نے اسے کچھ نئی ہدایات کے ساتھ رخصت کر دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کچھ ذکر ہو جائے۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتولہ ہما کی موت سترہ اگست کی دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے بتیس بور کے سائلنسر لگے ریوالور سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ آلۂ قتل سے دو گولیاں فائر کی گئی تھیں جو براہِ راست مقتولہ کے سینے پر لگی تھیں اور انہی میں سے ایک گولی نے اس کے دل میں گھس کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

واقعات کے مطابق مقتولہ کی لاش فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کے اوپر پڑی ملی تھی۔ اسے بیٹھنے کی پوزیشن میں قتل کیا گیا تھا اور اس کی موت بھی چند سیکنڈ میں واقع ہو گئی تھی تاہم دل پر گولی کھانے اور موت کے منہ میں جانے کے درمیان جو قلیل مدت حائل تھی اسی وقفے میں گردن کے علاوہ اس کا بدن بھی ذرا سا ایک جانب جھک گیا تھا یعنی وہ نیم دراز والی حالت میں آ گئی تھی۔

میرے لیے اس قتل کی واردات کا جو پہلو سب سے زیادہ دلچسپی اور توجہ کا حامل تھا وہ یہی تھا کہ اسے اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس کی موت کا الزام اسی کے شوہر یعنی میرے موکل عاطف پر عائد کیا گیا تھا۔

☆☆☆

آیندہ پیشی پر جب عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے کسی گواہ کا بیان شروع ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے آئی او سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

جج نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے آئی او کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اسے وٹنس باکس میں جا کر کھڑے ہو جانا چاہیے۔ آئی او نے فوراً جج کے نگاہی احکامات کی تعمیل کی۔

اس کیس کا آئی او (تفتیشی افسر) بشارت بھٹی نامی ایک سب انسپکٹر تھا۔ آئی او کی حیثیت بھی استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں بہ نفسِ نفیس حاضر رہنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں، میری معلومات کے مطابق استغاثہ کی طرف سے چھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن واضح رہے کہ میں سسپنس کے ان صفحات میں صرف اہم اور قابلِ ذکر گواہوں ہی کا تذکرہ کروں گا۔

میں وٹنس باکس کے قریب پہنچا اور انکوائری آفیسر بشارت بھٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی او صاحب! کیا میں آپ کو بھٹی صاحب کہہ کر بھی مخاطب کر سکتا ہوں؟''

''بڑے شوق سے......'' وہ کسل مندی سے بولا۔

بشارت بھٹی کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ اس کے چہرے سے بیزاری اور کاہلی ٹپکتی تھی اور ظاہری حالت سے بھی وہ سست الوجود نظر آتا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو ہل کر پانی پینا بھی پسند نہیں کرتے۔ پتا نہیں، وہ محکمۂ پولیس میں کیسے سروائیو کر رہا تھا...... شاید عاطف جیسے بے گناہوں کو ملزم نامزد کر کے!

''بھٹی صاحب!'' میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے اور کس نے دی تھی؟''

''کم و بیش تین بجے سہ پہر!'' اس نے جواب دیا۔

''اور یہ اطلاع اپنے ہی گھر سے تھانے فون کر کے ملزم نے بہ قلم خود دی تھی۔''

''بہ قلم خود......'' میں نے گہری چوٹ کی۔ ''یعنی آپ کا مطلب ہے، ٹیلی فون کے ذریعے اپنے قلم سے لکھ کر......؟''

''جناب! فون پر تو منہ سے بولا جاتا ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''قلم سے تو کاغذ پر لکھا جاتا ہے۔''

''میں نے تو آپ ہی کے فرمان کو دہرایا ہے بھٹی

صاحب!''

''میں نے کب کہا ہے کہ......'' اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ ''ملزم نے قلم سے کاغذ پر لکھ کر ٹیلی فون کے ذریعے اس واقعے کی اطلاع دی تھی......؟''

''اب آپ اپنے الفاظ ہی سے پھر رہے ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''یا پھر...... شاید آپ کو ''بہ قلم خود'' کا مفہوم اور معنی ہی نہیں معلوم۔''

وہ یہ تو سمجھ گیا کہ اس سے گرامر کی کوئی غلطی ہو گئی ہے تاہم اس کے دماغ میں اتنا کرنٹ موجود نہیں تھا کہ وہ قواعد کی غلطی کو بھی پکڑ پاتا لہٰذا وہ کھسیانہ سا ہو کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''گویا ملزم نے ہی آپ کو اس سانحے کی اطلاع دی تھی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر سے جواب پر اکتفا کیا۔

''اور آپ کی نظر میں ملزم ہی اپنی بیوی کا قاتل ہے؟''

''جی ہاں، بالکل......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''واہ وا...... کیا کمال کی نظر پائی ہے۔'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''اس نظر کے طفیل جس پر بھی آپ کا کرم ہوتا ہوگا وہ خیر سے...... اس نظر کرم کی تاب نہ لاتے ہوئے پتا نہیں، بغیر ویزا پاسپورٹ کون کون سے جہان کی سیر کو نکل جاتا ہوگا۔''

''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!''

''میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ ہما کی موت سہ پہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ ٹھیک تین بجے ملزم نے اپنے فون سے تھانے میں اس افسوسناک واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''تو اس میں آپ کو کیا خرابی نظر آتی ہے وکیل صاحب!'' وہ قدرے برہمی کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''خرابی نہیں...... خرابیاں کہیں بھٹی صاحب!'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آپ اپنی بات کی وضاحت فرمائیں گے؟'' وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

''کیوں نہیں......!'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا ''آپ کو پتا ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا جو وقت درج کیا گیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے......؟''

''آپ ہی بتا دیں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ ''لیکچر بازی کا آپ ہی کو زیادہ شوق ہے۔''

''مجھے تو اور بھی بہت سی بازیوں کا شوق ہے بھٹی صاحب!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جن میں شطرنج بازی، نیزہ بازی اور جیت بازی کو باقی ہر بازی پر فوقیت حاصل ہے۔''

''یہ جیت بازی کیا ہوتی ہے؟'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''یہ وہ بازی ہے جس کے اختتام پر جیت انسان کا مقدر بنتی ہے۔''

وہ برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ میں، مقتولہ کی موت کا وقت دو بجے بتایا گیا ہے اور نہ ہی تین بجے بلکہ دو اور تین بجے سہ پہر کے الفاظ درج ہیں جس کا واضح مطلب ہے کہ مقتولہ کی موت دو اور تین بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس کا درست وقت ...... سہ پہر ڈھائی بجے کا ہو...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا بھٹی صاحب!''

''آپ کا بیان بالکل درست ہے۔'' وہ تائید کی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم میں اسی طریقے سے وقت کا مارجن سیٹ کیا جاتا ہے لیکن آپ اس بحث سے آخر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ......'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''میرے موکل نے آپ کی تھیوری اور فلاسفی بلکہ الزام کے مطابق، ڈھائی بجے سہ پہر اپنی بیوی کے سینے میں دو گولیاں اتار کر اسے موت کی نیند سلا دیا پھر اپنے فلیٹ میں بیٹھا آدھا گھنٹا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی اور پھر ایک مرتبہ اپنی بیوی کی لاش کے پاس بیٹھ کر پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس دوران میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی جائے وقوعہ سے فرار ہونے کا خیال نہیں آیا...... آپ اس کو کیا کہیں گے بھٹی صاحب!''

''ملزم کا شاطر پن......!'' وہ بغرض ناگواری آمیز نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہی تو اس کی ہوشیاری

اور چالاکی کا کمال ہے کہ نہ صرف یہ جائے وقوعہ پر جما بیٹھا رہا...... اس نے آلۂ قتل کو بھی کہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ سائلنسر لگا ریوالور ادھر اپنی بیوی کی لاش کے قریب ہی پھینک دیا تھا۔''

''میرے موکل کی ہوشیاری، چالاکی اور شاطرانہ پن کا تو آپ نے قصہ بیان کر دیا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو ذرا آپ کی مستعدی اور پھرتیوں کا بھی جائزہ لے لیا جائے...... ہوں؟''

اس نے میرے ''ہوں'' کے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں اس کی مخاصمانہ نظر کی پروا کیے بغیر مستفسر ہوا۔

''بھٹی صاحب! آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''اس وقت تین بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔''

''صرف پچیس منٹ میں۔'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''یہ ہوئی نا پھرتی والی بات۔ ورنہ واردات کی اطلاع کے بعد حرکت کے معاملے میں پولیس کی ہڈحرامی خاصی مشہور ہے۔''

''آبجیکشن یور آنر......!'' وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

وہ اپنے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے فاضل دوست نے ابھی محکمۂ پولیس کی کارکردگی کے لیے جو نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کسی بھی طور مناسب اور جائز نہیں ہیں۔ وکیل صفائی کو اس قسم کے طرزِ عمل سے روکنے کے لیے سرزنش کی جائے۔''

وکیل استغاثہ کا واضح اشارہ الفاظ ''ہڈحرامی'' کی جانب تھا۔ جج نے استغاثہ کے اعتراض کو درست مانتے ہوئے مجھے اپنے بیان میں سے ''ہڈحرامی'' ایسے الفاظ کو خارج کرنے کا حکم دیا۔ میں نے فوراً جج کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہاں ''انتہائی غیر ذمے دار'' کے الفاظ ٹانک دیے اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتولہ اپنی زندگی کی بازی ہار چکی تھی؟''

''جی ہاں...... سو فی صد۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور آلۂ قتل یعنی اعشاریہ تین دو کیلی بر کا سائلنسر لگا ریوالور مقتولہ کی لاش کے قریب ہی پڑا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔''

''آپ کو یقین ہے کہ مقتولہ کو اسی ریوالور سے قتل کیا گیا تھا؟''

''جی ہاں...... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو بعد کی پیداوار ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔''

''مقتولہ کی لاش صوفے پر پڑی تھی۔'' وہ بڑے سادہ لہجے میں بولا۔ ''قریب ہی سائلنسر لگا ریوالور بھی پڑا نظر آ رہا تھا جس کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ مقتول کو اسی ریوالور سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔''

''یہ مطلب آپ نے اپنی تن آسانی کے لیے اخذ کر لیا تھا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ اس سلسلے میں چھان بین بھی کی جاسکتی تھی۔''

''کیسی چھان بین......؟''

''کیا آپ نے آلۂ قتل پر سے ایف پی لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی؟''

''ہم نے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی۔''

''پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے۔''

''آپ کے خیال میں میرے موکل نے دستانے وغیرہ پہن کر فائرنگ کی ہوگی؟''

''ہاں...... یہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہوسکتا ہے۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں......؟''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً یہ کہ...... ملزم نے ریوالور پھینکنے سے پہلے اسے کسی کپڑے سے اچھی طرح صاف کر دیا ہو۔'' آئی او نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''یہ ناممکن تو نہیں ہے۔''

''واقعی یہ ناممکنات میں شمار نہیں ہوتا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی ''اور آپ میرے موکل کو تو پہلے ہی چالاک، عیار اور شاطر قرار دے چکے ہیں۔''

وہ ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''جب کسی ملزم کے ایف پی اس کی شناخت یا اس کے جرم کی وقوع پذیری میں معاون ثابت نہ ہو رہے ہوں تو پھر ایک اور بھی ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔'' میں نے خاص لہجے میں کہا پھر بھولنے کی اداکاری کے ساتھ اس میں اضافہ کر دیا۔

''اس ٹیسٹ کا کوئی بھلا سا نام ہے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا، ذہن سے اتر گیا ہے۔''

''پیرافن ٹیسٹ......!'' اس نے ترت بتایا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''یاد آ گیا، اس ٹیسٹ کا یہی نام ہے۔ کیا آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کرایا تھا؟''

پیرافن ٹیسٹ (Paraffin Test) ایک مخصوص قسم کا کیمیکل ٹیسٹ ہے جس کی مدد سے فائرنگ کرنے والے شخص کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات کا سراغ لگا لیا جاتا ہے۔ انکوائری آفیسر نے میرے سوال کے جواب میں اپنی گردن کو نفی میں جنبش دی اور بولا۔ ''جی نہیں......!''

''کیوں نہیں؟''

''جب ملزم آلۂ قتل پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرسکتا ہے تو پھر وہ پولیس کی آمد سے قبل اپنے ہاتھوں کو بھی اچھی طرح دھو سکتا ہے......''

اس کا جواب نامعقولیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

''بھٹی صاحب، ایک بات سچ سچ بتائیں گے؟''

''جی پوچھیں۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''میں نے ابھی تک آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔''

''یہ تو مہربانی ہے جناب کی۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا مقتولہ کی لاش سے آپ کی بات ہوئی تھی؟''

''یہ کس قسم کا سوال ہے وکیل صاحب؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ سوال نہیں کریں، صرف جواب دیں۔''

وہ معاندانہ انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

میں نے کہا ''ہاں یا نہ......؟''

''بھلا کوئی لاش سے بھی گفتگو کرسکتا ہے؟''

''وضاحت نہیں...... صرف جواب!'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''ہاں یا نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ ٹپٹا گیا۔

''اس کا مطلب ہے، مقتولہ کی زبانی آپ کو نہیں پتا چلا تھا کہ ملزم نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار کر اسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا تھا......؟''

''جی، اس کا یہی مطلب ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

''پھر ملزم نے آپ کو خود ہی بتا دیا ہوگا کہ اپنی بیوی کا قاتل بہ قلم خود وہی ہے؟'' میں نے آئی او کو مزید چڑانے کے لیے بہ قلم خود کے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔

''یہ اتنا بھی سیدھا نہیں جتنا شکل سے نظر آتا ہے۔'' وہ ناپسندیدہ انداز میں ملزم کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''اس نے تو آخری وقت تک اس جرم سے انکار ہی کیا تھا۔''

''تو پھر آپ نے......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بھٹی صاحب! آپ نے کس بنا پر میرے موکل کو اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا؟''

''ہمیں ایک ایسا عینی شاہد مل گیا تھا کہ جس کی گواہی کے بعد ملزم کے مجرم ہونے میں کسی شک وشبے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی......'' آئی او نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''عینی شاہد!'' میں نے اچھا خاصا زور دے کر اس کے الفاظ دہرائے۔ ''آپ نے ابھی یہی کہا ہے نا؟''

''جی ہاں، آپ نے جو سنا، میں نے وہی کہا ہے۔''

''عینی شاہد...... یعنی آئی وٹنس کا مطلب تو آپ کو بہ خوبی معلوم ہوگا؟''

''بالکل معلوم ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''یعنی آپ معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ آپ کے پاس ایک ایسا گواہ بھی موجود ہے جس نے میرے موکل کو اپنی بیوی کا مرڈر کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

''جی ہاں......!''

''کیا آپ معزز عدالت کو اس شخص کا نام بتانا پسند کریں گے؟''

''اس کا نام گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔''

''پھر تو ابھی اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی؟''

میں نے ٹٹولتی ہوئی اور کھوجتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اسے جواب دیتے ہی بنی۔

''اس شخص کا نام نور علی ہے۔''

''یہ نور علی وہی تو نہیں......'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر آئی او کو دیکھا۔ ''جو ملزم اور مقتول کے سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہے؟''

''جی ہاں، وہی ہے۔'' اس نے تصدیق کر دی۔

میں نے اپنی جرح کو موقوف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

جج نے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت

برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔
''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''
☆☆☆
آیندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے امتیاز نامی ایک گواہ کو پیش کیا گیا۔
امتیاز بھی ''منصور ٹریولز'' ہی میں ملازم تھا اور اس کی حیثیت ایک چپراسی کی تھی۔ منصور کی ٹریول ایجنسی میں لگ بھگ بارہ افراد کام کرتے تھے۔ امتیاز نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔
امتیاز کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے تاہم بالوں کی اس سفید پوشی کو اس نے خضاب کی مدد سے کور کر رکھا تھا۔ وکیل استغاثہ نے کچھ اس انداز میں جرح کا آغاز کیا۔
''امتیاز صاحب! آپ کو منصور ٹریولز میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''
''لگ بھگ پانچ سال!'' گواہ نے جواب دیا۔
''اور ملزم کب سے وہاں کام کر رہا تھا؟''
''مجھے صحیح اندازہ تو نہیں جناب لیکن کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجھ سے بھی کافی عرصہ پہلے سے اس فرم میں کام کر رہا تھا۔''
''آپ وثوق کے ساتھ اتنا تو بتا سکتے ہیں ناکہ پچھلے پانچ سال میں ملزم کے معمولات آپ کی نظروں کے سامنے تھے؟''
گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جی ہاں، یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے۔''
''آپ کی فرم میں لنچ کا وقفہ کب سے کب تک کیا جاتا ہے؟''
وکیل استغاثہ کے اس سوال نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ جرح کے رخ کو کس طرف لے کر جانا چاہتا ہے اور اسی لمحے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ اس نے ملزم کے ہمدردوں کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر استغاثہ کا گواہ کیوں نکال لیا تھا۔ بہر حال، مجھے اس سے کوئی تشویش یا پریشانی نہیں تھی۔ میرا ہوم ورک اور ہاشم کا فیلڈ ورک مکمل تھا لہٰذا میں بڑے اطمینان سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔
استغاثہ کے گواہ نے اپنے وکیل کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ہمارے ہاں روزانہ دو بجے سے ڈھائی بجے تک لنچ کا وقفہ کیا جاتا ہے۔''
''یہ ٹائم مقررہ ہے یا آگے پیچھے بھی ہوتا رہتا ہے؟''
''ٹائم تو مقرر ہی ہے وکیل صاحب!'' گواہ نے بتایا۔ ''تاہم کبھی کبھار پانچ دس منٹ آگے پیچھے بھی ہو جاتا ہے۔''
''اتنا تو چلتا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے بے پروائی سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ملزم لنچ آفس ہی میں کرتا تھا یا اس مقصد کے لیے باہر جایا کرتا تھا؟''
''آفس ہی میں کرتا تھا۔''
''کھانا یہ گھر سے لایا کرتا تھا یا بازار سے منگواتا تھا؟''
''بازار سے منگواتا تھا۔''
''کھانا لینے کون جاتا تھا؟''
''میں ہی سب کے لیے کھانا لایا کرتا تھا۔''
''کیا وقوعہ کے روز بھی ملزم نے آپ سے لنچ منگوایا تھا؟''
گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔
''اس کا مطلب ہے، اس کا کھانا کھانے کا موڈ تھا؟''
''جی ہاں، جبھی تو اس نے منگوایا تھا۔''
''منگوایا تھا تو پھر کھایا کیوں نہیں......؟''
''اس بارے میں تو آپ اسی سے سوال کریں۔'' گواہ بڑی سادگی سے بولا۔
''جب تک آپ کھانا لے کر واپس دفتر پہنچے تو کیا ملزم اپنی سیٹ پر موجود تھا؟''
''جی نہیں......''
''تم کتنے بجے واپس آئے تھے؟''
''اس روز مجھے تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''میں عموماً پونے دو بجے کھانا لینے کے لیے دفتر سے نکل جاتا ہوں اور دو بجے واپس بھی آ جاتا ہوں لیکن وقوعہ کے روز میری واپسی دو، دس پر ہوئی تھی۔''
''دو بج کر دس منٹ پر جب تم واپس آئے تو ملزم دفتر میں موجود نہیں تھا؟'' وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں یہ کہاں غائب تھا......؟''
''میں جب دفتر واپس آیا تو ملزم کو موجود نہ پا کر میں نے دوسرے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو مجھے پتا چلا کہ وہ تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔'' گواہ امتیاز نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وضاحت پیش کر دی۔ ''لیکن پھر اگلے روز پتا چلا کہ اسے اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔''
وکیل استغاثہ نے غیر مطمئن نظر سے جج کو دیکھتے ہوئے سوالات کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ استغاثہ کے گواہ امتیاز نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو بیان دیا تھا اور اس کے بیان پر وکیل استغاثہ نے جس قسم کی جرح کی تھی اس کا ایک خاص زاویہ تھا اور میں اس زاویے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وکیل استغاثہ محض عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ملزم نے وقوعہ کے روز نہایت ہی عمدہ پلاننگ کر رکھی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو کچھ اس انداز میں قتل کرنا چاہتا تھا کہ سب کچھ انتہائی فطری نظر آئے اور کسی کو بھی اس کی ذات پر شک نہ ہو۔
میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ''امتیاز صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ کو ''منصور ٹریولز'' میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ پانچ سال ہو گئے ہیں؟''
''جی ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یہی کہا ہے۔''
''پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔'' میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران میں کسی انسان کو سمجھنے اور پرکھنے کے ہزاروں مواقع ملتے ہیں اور پھر چونکہ ملزم آپ سے پہلے سے اس فرم میں کام کر رہا تھا لہٰذا اس کو سمجھنے کے لیے تو آپ کے پاس اسٹاف کا تجربہ بھی موجود تھا یعنی فرم میں کام کرنے والے لوگ بھی آپ کو ملزم کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے تھے اور انہوں نے بتایا بھی ہوگا......اور آپ نے پوچھا ہوگا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ملزم کی ذات، شخصیت، رویے اور کردار سے اچھی طرح واقف ہوں گے......ہوں گے یا نہیں؟''
''جی ہاں، بالکل...... کیوں نہیں!'' وہ جلدی سے بولا۔
''آپ کو ذاتی طور پر ملزم سے کسی قسم کی کوئی شکایت تو نہیں؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
''جی بالکل نہیں۔''
''اسٹاف کے دیگر افراد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''
''جی...... میں سمجھا نہیں؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''میں نے یہ پوچھا ہے کہ ملزم کا آفس میں کام کرنے والے دیگر افراد کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟''
''ٹھیک ٹھاک تھا۔'' اس نے جواب دیا۔
''سابق ریکارڈ کو آپ ایک طرف رکھ دیں۔'' میں نے جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے پانچ سال پر آپ نگاہ دوڑائیں اور مجھے بتائیں کہ کیا اس دوران میں ملزم کا اسٹاف کے کسی شخص سے کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا؟''
''نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا بالکل نہیں ہوا۔''
''گویا...... آپ یہ بات مانتے ہیں کہ ملزم ایک صلح جُو، امن پسند اور باکردار شخص ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔
''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ماننے والی بات تو ماننا پڑے گی نا۔''
''امتیاز صاحب! آپ روزانہ کتنے بجے اسٹاف کے لوگوں کا لنچ لینے جاتے ہیں اور کتنے بجے واپس آتے ہیں یہ ایشو نہیں ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کی واپسی میں دس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ لنچ لے کر واپس آئے تو ملزم اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں یہی بتایا ہے نا؟''
''جی...... جی یہی بتایا ہے اور میں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اگر اس وقت ملزم آفس میں موجود ہوتا تو میں ایسی بات کیوں کرتا......!''
''تم نے کچھ غلط نہیں کہا امتیاز......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے بعد گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔''
''کیسی گڑبڑ......؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''ایسی گڑبڑ کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''ملزم کو آفس میں موجود نہ پا کر آپ نے سب سے اس کے بارے میں پوچھا مگر ایک شخص کو نظر انداز کر دیا......آخر کیوں؟''
''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کس شخص کو نظر انداز کیا ہے؟''
''باری صاحب کو۔'' میں نے کہا۔ ''میں حامد باری کی بات کر رہا ہوں۔''
''اوہ وہ......!'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے باری صاحب سے نہیں پوچھا تھا۔''
''کیوں نہیں پوچھا تھا؟'' میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''
''باری صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔''
''موجود نہیں تھے کیا مطلب......!'' میں نے اسے گھورا۔ ''کیا وہ اس روز آفس نہیں آئے تھے؟''
''جی...... وہ آفس تو آئے تھے مگر لنچ پر موجود نہیں تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''باری صاحب لنچ نہیں کرتے۔''
''باری صاحب لنچ نہیں کرتے......'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے اور پوچھا۔ ''وہ اگر لنچ پر موجود نہیں تھے تو پھر کہاں تھے؟''
''وہ نماز پڑھنے آفس سے باہر گئے ہوئے تھے۔'' گواہ نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''ہمارے ساتھ والی بلڈنگ کے میزانائن فلور پر باقاعدہ باجماعت نماز کا اہتمام موجود ہے۔ باری صاحب لنچ نہیں کرتے لہٰذا وہ لنچ کے ٹائم والا ایک گھنٹا اسی ''مسجد'' میں گزارتے ہیں۔ اس دوران میں وہ ظہر کی نماز بھی ادا کر لیتے ہیں......''
اس نے اپنے جواب میں لفظ ''مسجد'' کا استعمال کیا تھا۔ اس سے گواہ کی مراد کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی۔ وہ پڑوسی بلڈنگ کے اسی میزانائن فلور کا ذکر کر رہا تھا جہاں نماز کی ادائیگی کے لیے کوئی جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ کمرشل علاقوں میں ایسا ہوتا ہے۔ آفس میں کام کرنے والے درجنوں، سیکڑوں بلکہ ہزاروں افراد کی سہولت کے لیے کسی بلڈنگ میں کوئی خاص جگہ نماز کے لیے چھوڑ دی جاتی ہے جہاں باقاعدہ جماعت کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ ایک مستحسن عمل ہے۔
''اس کا مطلب ہے، حامد باری صاحب ایک نمازی اور پرہیزگار شخص ہیں۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ جیسے انتہائی خطرناک گناہ سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہوں گے اور آفس کے اسٹاف کو ان سے کم ہی شکایت رہتی ہوگی......؟''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باری صاحب اپنے آپ میں مگن رہنے والے ایک نیک انسان ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو ان کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔''
''اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''میں سمجھا نہیں وکیل صاحب!'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو بھی حامد باری سے کوئی شکایت نہیں ہے؟'' میں نے اپنی بات کو واضح کرتے ہوئے کہا۔
''جی بالکل...... مجھے باری صاحب سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔''
میں نے پچھلے چند منٹ میں استغاثہ کے گواہ امتیاز کے ساتھ سوال جواب کرتے ہوئے حامد باری کے کردار اور شخصیت کو عدالت کی نظر میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور مجھے اپنے اس مقصد میں صد فیصد کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''آپ کو تو باری صاحب سے کوئی شکایت نہیں لیکن باری صاحب کو آپ سے سخت شکایت ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب......!'' وہ بھونچکا گیا۔ ''باری صاحب کو بھلا مجھ سے کیا شکایت ہے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔''
''آپ سے نہیں کیا مگر مجھ سے ایسا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کی معنی خیزی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔
''کیا...... کیا کہا ہے انہوں نے......؟'' وہ گنگ جھرجھراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔
میں نے اپنے ڈرامے کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''باری صاحب کو آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ انہیں نظرانداز کرتے ہیں۔''
''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ سخت الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ ''میں بھلا انہیں کیوں نظرانداز کروں گا...... انہوں نے مجھ سے تو کبھی ایسی کوئی شکایت نہیں کی...... اگر وہ اس وقت یہاں ہوتے تو میں ان سے ضرور پوچھتا کہ انہوں نے میرے بارے میں ایسی شکایت کیوں کی......!''
''وہ اس وقت یہاں موجود ہیں امتیاز صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن عدالت کے کمرے کے اندر نہیں بلکہ باہر کوریڈور میں۔ میں نے انہیں اس کیس میں ایک اہم گواہی کے لیے یہاں بلایا ہے لیکن افسوس کہ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''
''جب وہ یہاں موجود ہیں تو پھر میری ان سے

ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی؟''
''اس لیے کہ آپ کی گواہی مکمل ہونے کے بعد آپ عدالت کے کمرے سے باہر چلے جائیں گے اور اگلے ہی لمحے باری صاحب گواہی دینے اندر آئیں گے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ عدالت کے اندر ان سے کوئی سوال و جواب نہیں کر سکیں گے...... اور باہر جب آپ لوگوں کو آپس میں بات کرنے کا موقع ملے گا تو اس وقت تک بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں رہے گا کیونکہ جب تک میں اپنا مقصد حاصل کر چکا ہوں گا۔''
''میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا وکیل صاحب۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تو آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں نے کب اور کہاں باری صاحب کو نظرانداز کیا ہے......؟''
''کمال ہے، یہ چھوٹی سی بات بھی آپ کو میں ہی بتاؤں گا۔'' میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لنچ لے کر لوٹے، ملزم آفس میں موجود نہیں تھا۔ آپ نے سب سے ملزم کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھا لیکن نہیں پوچھا تو صرف حامد باری سے...... آپ نے انہیں نظرانداز کیا کہ نہیں؟''
''جناب! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب میں لنچ لے کر واپس آیا تو باری صاحب آفس میں موجود نہیں تھے۔'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ لنچ کے وقفے کے دوران میں ظہر کی نماز ادا کرنے جاتے ہیں۔''
میں نے اس کی وضاحت پر توجہ نہیں دی۔ اس لیے توجہ نہیں دی کہ میں جانتا تھا، وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے تو یہ سارا ڈراما ایک خاص مقصد کے تحت رچایا تھا لہٰذا میں اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔
''حالانکہ......'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''حالانکہ اگر آپ باری صاحب سے بھی ملزم کے غیاب کے بارے میں پوچھ لیتے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا۔''
''تو کیا باری صاحب کو پتا تھا کہ ملزم اپنے گھر گیا ہے؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم باری صاحب کو سب کچھ بتا کر گیا تھا؟''
''جی...... میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''جنابِ عالی! حامد باری اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے انہیں صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اندر بلانا چاہتا ہوں لیکن......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ میں حامد باری کو اندر بلانے سے پہلے ملزم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں تاکہ صفائی کے گواہ حامد باری کو یہاں بلانے کا جواز واضح ہو سکے اور......'' میں نے استغاثہ کے گواہ امتیاز کی طرف دیکھا اور اضافہ کیا۔ ''اور امتیاز صاحب کی تشنگی بھی باقی نہ رہے......''
اگلے ہی لمحے جج نے مجھے ملزم سے جرح کی اجازت دے دی۔
میں اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) کے پاس آیا اور ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز آپ دوپہر دو اور تین کے درمیان اپنے آفس میں موجود نہیں تھے؟''
''جی ہاں...... یہ درست ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔
''اور کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ ٹھیک تین بجے اپنے گھر میں موجود تھے؟''
''جی ہاں یہ بھی درست ہے۔''
''کیا وقوعہ کے روز تین بجے آپ کا اپنے گھر میں موجود ہونا کسی خاص پروگرام کا حصہ تھا؟'' میں نے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سوال کیا۔
''نہیں...... وہ محض ایک اتفاق تھا۔''
''کیسا اتفاق؟''
''دراصل، مجھے پلازا کے علاقے میں ایک شخص سے ملنا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس شخص سے ملاقات نہیں ہو سکی اور اس وقت مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی لہٰذا میں کھانا کھانے اپنے گھر چلا گیا۔''
''اور گھر پہنچ کر آپ نے کیا دیکھا؟''
''اپنی بیوی ہما کو مردہ حالت میں دیکھا......'' اس کی آواز رندھ گئی۔
''بہت خوب......'' وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ملزم کو کسی شخص سے ملاقات کرنے پلازا کے علاقے میں جانا تھا اور وہ اپنے بیان کے مطابق پلازا گیا بھی مگر اس کی مذکورہ شخص سے ملاقات نہ ہو سکی لہٰذا وہ کھانا کھانے اپنے گھر چلا گیا......''
''تو اس میں ایسی پریشانی والی کون سی بات ہے
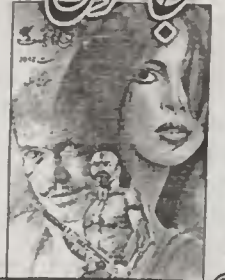
میرے فاضل دوست؟‘‘ میں نے ترکی بہ ترکی پوچھ لیا۔

’’حیرانی اور پریشانی والی بات یہ ہے کہ ملزم کا کسی شخص سے ملاقات کے لیے جانا طے تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے آفس کے چپراسی سے لنچ منگوایا اور خود غائب ہوگیا......‘‘

’’ہاں......تو......؟‘‘ میں نے وکیل استغاثہ کو گھور کر دیکھا۔’’میں سمجھا نہیں، آپ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں؟‘‘

’’سیدھی سی بات ہے میرے فاضل دوست!‘‘ وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔’’جب کسی شخص کو لنچ کے اوقات میں آفس سے باہر جانا ہوتا ہے تو وہ اپنے لیے لنچ نہیں منگوایا کرتا اور اپنے موکل کی تو پلازا کے علاقے میں کسی شخص سے ملاقات طے تھی اور وہ ملاقات ہو بھی نہیں سکی تو پھر اسے سیدھا آفس واپس آجانا چاہیے تھا۔ گھر جانے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

’’گھر جانے کی ضرورت کی ملزم نے وضاحت کردی ہے۔‘‘ میں نے متحمل انداز میں کہا۔’’اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس میں ملزم کا کوئی قصور نہیں۔ بہرحال......‘‘ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

’’وقوعہ کے روز دوپہر میں آپ کی کسی شخص سے ملاقات طے تھی؟‘‘

’’امجد حسین سے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔’’امجد حسین ایک پراپرٹی ڈیلر ہے اور پلازا کے علاقے میں اس کی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔‘‘

’’آپ کس سلسلے میں امجد حسین پراپرٹی ایجنٹ سے ملاقات کرنے والے تھے؟‘‘

’’دراصل، ہم جس بلڈنگ میں رہ رہے ہیں وہاں بھانت بھانت کے لوگ آکر آباد ہوگئے ہیں۔‘‘ وہ معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔’’بلڈنگ کا ماحول فیملی والوں کے لیے مناسب نہیں رہا۔ ہم گھر تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اسی سلسلے میں امجد حسین سے میری بات چل رہی تھی۔ وہ مجھے ایک اچھا فلیٹ دکھانے والا تھا۔‘‘

’’لیکن وقوعہ کے روز امجد حسین سے آپ کی ملاقات نہیں ہوسکی۔‘‘ میں نے کہا۔’’اس کی کوئی خاص وجہ؟‘‘

’’جی ہاں......‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔’’جب میں امجد حسین کی ایجنسی پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ کسی پارٹی کو کوئی فلیٹ دکھانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے وہیں ایجنسی میں بیٹھ کر پانچ دس منٹ ان کا انتظار کیا لیکن جب ان کی واپسی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں ایجنسی [illegible] سوچ کر واپس آگیا کہ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کر [illegible] کوئی فائدہ نہیں۔ میں بعد میں کسی وقت امجد حسین [illegible] ملاقات کرلوں گا۔‘‘

’’اور جب آپ ایجنسی سے باہر نکلے تو آپ کو [illegible] نے ستایا۔‘‘ میں نے جرح کے سلسلے کو لپیٹتے ہوئے کہا۔’’آپ نے گھر کا رخ کیا۔‘‘

’’جی ہاں...... میں کھانا کھانے اپنے گھر آگیا تو [illegible]‘‘ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے استغاثہ کی تکلیف دور کرنے کی غرض [illegible] نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے موکل سے پو[illegible]

’’ایک بات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دیں......!‘‘

میں نے ٹھہر ٹھہر کر...... انتہائی سنجیدہ لہجے میں است[illegible] کیا۔’’جب آپ کی، وقوعہ کے روز...... امجد حسین پرا[illegible] ایجنٹ سے ملاقات طے تھی اور...... یہ ملاقات آپ نے [illegible] کے وقفے ہی میں کرنا تھی...... تو پھر آپ نے امتیاز سے ا[illegible] لیے...... لنچ کیوں منگوایا تھا......؟‘‘

’’بات یہ ہے جناب کہ...... لنچ تو میں روزانہ [illegible] منگوایا کرتا تھا۔‘‘ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔’’ان[illegible] نہایت ہی پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ جو کام کرتا چلا آ[illegible] ہو وہ اس کی پختہ عادت یا ’’فطرت ثانی‘‘ بن جاتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ امجد حسین سے میری ملاقات طے تھی اور مجھے [illegible] آفس سے باہر ہی کہیں لنچ کرنا تھا لیکن معمول کے مطا[illegible] جب میرا چپراسی امتیاز لنچ کا پوچھنے آیا تو میں نے روزمرہ [illegible] عادت کے مطابق اس سے لنچ لانے کے لیے کہہ دیا لیکن چ[illegible] منٹ کے بعد مجھے یاد آیا تو میں حامد باری کو اپنے جانے کا [illegible] کر آفس سے نکل آیا تھا۔‘‘

’’حامد باری کو آپ نے کیا بتایا تھا؟‘‘

’’میں نے باری صاحب سے کہا تھا کہ مجھے ایک شخ[illegible] سے ضروری میٹنگ کے لیے پلازا تک جانا ہے۔ میرا [illegible] آجائے تو وہ کوئی بھی کھا سکتا ہے۔‘‘

’’پھر اس پر باری صاحب نے کیا جواب دیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’انہوں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بھائی! اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ اگر لنچ آرہا ہے تو آ[illegible] دیں۔ جس کی قسمت میں وہ رزق لکھا ہوگا وہ کھالے گا۔ آپ [illegible] جائیں جہاں جانا ہے۔‘‘ ملزم نے بتایا۔’’پھر ہم دونوں [illegible] ایک ساتھ ہی آفس سے نکلے تھے۔ باری صاحب نماز [illegible]

[illegible] کے لیے دوسری بلڈنگ کی طرف چل دیے تھے اور [illegible] اپنا بائیک پر بیٹھ کر پلازا کی جانب روانہ ہوگیا تھا۔‘‘

’’حامد باری صاحب تو اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ وہ اپنے بیان اور گواہی سے آپ کی بات کی تصدیق کرسکتے ہیں۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔’’کیا پراپرٹی ایجنٹ امجد حسین اس بات کی گواہی [illegible]ے گا کہ وقوعہ کے روز دو اور تین بجے کے درمیان آپ کی اور اس کی ملاقات طے تھی؟‘‘

’’جی ہاں...... وہ ضرور یہ گواہی دے گا۔‘‘

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

’’مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔‘‘

اس کے بعد آج کی کارروائی کے لیے بس اتنا وقت بچا تھا کہ حامد باری کی گواہی ہوسکے اور یہ گواہی سراسر میرے موکل کی حمایت میں جاتی تھی حامد باری ایک سنجیدہ اور معقول شخص تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا فرض پورا کردیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر تین گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن میں سے دو استغاثہ کے اور ایک صفائی کا گواہ تھا۔ میں سب کا احوال ترتیب وار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے امجد حسین پراپرٹی ایجنٹ کی گواہی جس سے میرے موکل کی پوزیشن اور مضبوط ہوگئی۔ وکیل استغاثہ نے امجد حسین سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن اس سے حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ امجد حسین اور حامد باری کی گواہوں نے ملزم عاطف کی ذات کو کافی حد تک معتبر بنا دیا تھا لیکن یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ابھی مجھے اور زور لگانا تھا اور یہ زور میں ہاشم انور کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں لگانے والا تھا۔ ہاشم انور نے ملزم کے لیے ایک سچے اور کھرے دوست کا کردار ادا کیا تھا۔ میں نے ہاشم کے ذمے جو بھی کام لگایا اس نے چراغی جن کے مانند میرے ہر حکم کی تعمیل کی تھی۔ اسے وکیل بننے کا شوق تھا۔ اس میں ایک جاسوس، ایک سیکریٹ ایجنٹ کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔

استغاثہ کی جانب سے مقتولہ ہما کی ماں رئیسہ بیگم گواہی کے لیے پیش ہوئی۔ رئیسہ بیگم کو روز اول ہی سے ملزم عاطف سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ ہما کی شادی اپنی آپا نفیسہ بیگم کے بیٹے نوید صدیقی سے کرنا چاہتی تھی لیکن یہ کام ہما اور اس کے باپ خاور حمید کی ضد کے باعث ہو نہیں سکا

تھا۔ رئیسہ بیگم کو اپنی شکست کا گہرا ملال تھا لہٰذا اس نے ملزم کے خلاف منہ بھر کر زہر اگلا۔ اس کے بیان کے الفاظ آگ کے گولوں کے مانند تھے تاہم اس کے اندر کام کی بات کوئی نہیں تھی لہٰذا میں نے مختصر سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا۔

رئیسہ بیگم کے بعد استغاثہ کا سب سے اہم گواہ نور علی کی حیثیت عینی شاہد کی تھی اور استغاثہ اس گواہ پر بہت زیادہ انحصار کر رہا تھا۔ جب میں عاطف کی ضمانت کے لیے زور مار رہا تھا تو وکیل استغاثہ نے اس عینی شاہد کا بہ طور خاص ذکر کیا تھا۔ بعدازاں انکوائری آفیسر نے بھی اس عینی شاہد پر بہت زور دیا تھا۔

نور علی کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ اپنے نام کے بالعکس توے کے مانند سیاہ رنگت کا مالک تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کی آنکھوں کے اندر ایک مستقل نوعیت کی ہلکی سی سرخی بھی پائی جاتی تھی۔ کالے رنگ پر سرخ آنکھیں ایک خوف ناک تاثر پیدا کرتی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ پر مختصر سی جرح کی پھر میں جج کی اجازت حاصل کر کے اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے ہاشم انور کو جن افراد کے بارے میں خاص نوعیت کی معلومات جمع کرنے کی ذمے داری سونپی تھی ان میں ایک شخص یہ نور علی بھی تھا۔

"نور علی صاحب!" میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کے پاس کام کرتے ہیں جس کا نام نوشاد عادل ہے۔"

"جی ہاں، آپ کی معلومات درست ہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"نوشاد عادل کا آفس ٹاور کے علاقے میں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ روزگار کے سلسلے میں لوگوں کو مڈل ایسٹ کے ممالک میں بھجوانے کا کام کرتا ہے۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"نور علی صاحب!" میں نے بڑے دھیمے انداز میں سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نوشاد عادل آپ کو کتنی تنخواہ دیتے ہیں۔"

"دو ہزار روپے......" اس نے جواب دیا۔

"گویا آپ کی آمدنی دو ہزار روپے ماہانہ ہے؟"

"نن...... نہیں......" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میری آمدنی ڈھائی ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔"

"کوئی آپ کے کام میں اوپر کی کمائی بھی ہے؟" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "آپ پانچ چھ سو تنخواہ کے علاوہ بھی کما لیتے ہیں؟"

"آپ اسے اوپر کی کمائی نہیں کہہ سکتے۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ کمیشن کا معاملہ ہے، صاحب بعض کیسوں پر مجھے کمیشن دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہم اوپر کی آمدنی کو کمیشن کا نام دے لیتے ہیں۔" میں نے مصالحت آمیز انداز میں کہا۔ "آپ ایک ماہ میں لگ بھگ ڈھائی ہزار روپے کما لیتے ہیں اس سے بھی زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"ایک، دو سو اوپر بھی ہو جاتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

میں زیر سماعت کیس کے موضوع کی مناسبت سے انتہائی غیر متعلقہ سوالات کر رہا تھا اور یہ بات گواہ کو ذہنی طور پر الجھا بھی رہی تھی تاہم اس نے یا وکیل استغاثہ نے کوئی سوال یا اعتراض نہیں کیا۔

"نور علی صاحب! میں فرض کر لیتا ہوں کہ آپ کی ماہانہ آمدنی زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہوگی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس سے زیادہ تو ممکن ہی نہیں۔"

"آپ کی فیملی میں کل کتنے افراد ہیں؟"

"چار......!" اس نے جواب دیا۔ "دو ہم میاں بیوی اور دو ہمارے بچے۔"

"آپ اپنی فیملی کے واحد کفیل ہیں یا کوئی اور بھی معاشی طور پر آپ کی مدد کرتا ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں جناب! ہمارا کوئی مددگار نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "میں ہی اول آخر اپنے گھر کو چلاتا ہوں۔"

"آپ جس فلیٹ میں رہتے ہیں کیا وہ آپ کی ذاتی ملکیت ہے؟"

"آپ بھی کمال باتیں کرتے ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "دو ڈھائی ہزار کمانے والا انسان کراچی میں اپنا فلیٹ بھلا کیسے خرید سکتا ہے......!"

"گویا آپ کرایے کے فلیٹ میں رہتے ہیں......؟"

"جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"نور علی صاحب!" میں نے سوالات کے زاویے کو یکسر تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اس کیس میں استغاثہ کی جانب سے عینی شاہد ہیں؟"

"جی ہاں، معلوم ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"عینی شاہد...... یا آئی وٹنس کے معنی پتا ہیں آپ کو؟"

"جی ہاں......" اس نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"نور علی صاحب!" میں نے اپنے لہجے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ ہما کی موت سترہ اگست دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کے سینے میں دو گولیاں اتاری گئی تھیں جو تیس بور کے بے آواز ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی تھی۔ واقعات کے مطابق اس کی لاش ڈرائنگ روم میں ایک صوفے کے اوپر پڑی ملی تھی۔ سترہ اگست......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سترہ اگست کو سرکاری یا پرائیویٹ چھٹی کا دن نہیں تھا اور آپ اس کیس کے عینی شاہد ہیں یعنی آپ نے مقتول کا قتل اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ دو اور تین بجے کے درمیان جائے وقوعہ پر موجود تھے......"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس دن آپ اپنی نوکری پر نہیں گئے تھے؟"

"اس روز صبح ہی سے میری طبیعت خراب تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اسی لیے میں نے چھٹی کر لی تھی۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ طبیعت خراب ہو تو چھٹی بھی کر لینا چاہیے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تو آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ یعنی ہما کا قتل ہوتے دیکھا تھا؟"

"جی...... جی ہاں......" وہ تھوڑا رک کر بولا۔

"مقتولہ کی لاش ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر پڑی ملی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ مقتولہ کے ڈرائنگ روم میں اس وقت کیا کر رہے تھے...... یہ نہ بھولیں کہ آپ اس کیس کے عینی شاہد ہیں......؟"

"میں درحقیقت مقتولہ کے ڈرائنگ میں موجود نہیں تھا۔" وہ بات کو نبھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے واردات کا منظر دروازے میں سے دیکھا تھا۔"

"دروازے میں سے؟" میں نے اس کے الفاظ دہرائے۔ "ذرا وضاحت کریں گے نور علی صاحب؟"

"اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی اس لیے میں فلیٹ کے داخلی دروازے کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا ہوا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس مقام سے مقتولہ کے ڈرائنگ روم کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور وہ صوفہ جس پر مقتولہ کی لاش پائی گئی وہ بھی دکھائی دیتا ہے۔"

"یہ تو اسی صورت ممکن ہے جب مقتولہ کے فلیٹ کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہو۔" میں نے کہا۔ "آپ دونوں کے فلیٹ آمنے سامنے ضرور ہیں لیکن دروازہ بند ہونے کی صورت میں آپ اپنے سامنے والے فلیٹ کے اندر کیسے جھانک سکتے ہیں؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "پہلے مقتول کے فلیٹ کا دروازہ بند ہی تھا۔ لگ بھگ ڈھائی بجے ملزم اپنے گھر آیا تو میں نے دروازے کو کھلتے ہوئے دیکھا۔ ملزم اپنے فلیٹ میں داخل ہو گیا لیکن دروازہ مکمل طور پر بند کرنا بھول گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ان میاں بیوی کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اس طرف دیکھا تو مقتولہ مجھے صوفے پر بیٹھی نظر آئی۔ ملزم اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ ان دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ملزم نے ریوالور سے دو گولیاں چلائیں۔ اگرچہ اس سے فائرنگ کی آواز پیدا نہیں ہوئی لیکن میں نے مقتولہ کی ہلکی سی چیخ سنی اور اسے صوفے پر ایک جانب جھکتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا اور میں نے فوراً اپنا دروازہ بند کر دیا......"

"پھر آپ نے اپنی بیوی کو تو اس واقعے کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب! میری بیوی اور بچے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" وہ چالاکی سے بولا۔ "گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر آئیں گے۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا ہی تھا۔"

"نور علی صاحب! گرمیوں کی چھٹیاں دو ہفتے پہلے ختم ہو چکیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس وقت کراچی کے تمام اسکول کھل چکے ہیں، پھر آپ کے بیوی بچے گاؤں میں کیا کر رہے ہیں؟"

"بس جی انہیں دیر ہو گئی ہے۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک دو دن میں آنے ہی والے ہیں

وہ......ا''

''نور علی صاحب! میری ریسرچ کے مطابق آپ کے بیوی بچے وقوعہ سے دو تین دن پہلے ہی گاؤں گئے ہیں یعنی اس وقت جب چھٹیوں کے بعد اسکول کھل چکے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں یہ بات ایسے ہی زبانی کلامی نہیں کہہ رہا بلکہ اسے ثابت بھی کرسکتا ہوں۔ آپ جھوٹ بول کر اپنی جان نہیں بچا سکتے......؟''

''میں اپنی جان کیوں بچاؤں گا۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔'' وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''آپ کے پاس جو بھی ثبوت ہیں انہیں عدالت میں لے آئیں۔''

''وہ ثبوت تو میں بعد میں لے آؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ اس وقت میرے پاس ہے پہلے آپ اس سے تو نمٹ لیں......''

اس کی گھبراہٹ، پریشانی اور غصہ اس امر کا ثبوت تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے اسے کند چھری سے ذبح کرتے ہوئے پوچھا۔

''نور علی! آپ نے ڈھائی بجے اپنے سامنے والے فلیٹ میں قتل کی ایک واردات ہوتے دیکھی اور دروازہ بند کر کے گھر میں بیٹھ گئے۔ کیا پڑوسی ہونے کے ناتے آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ فوراً پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دیں؟''

''میں نے بتایا تو ہے کہ میں ڈر گیا تھا، خوف زدہ ہوگیا تھا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''اس روز صبح ہی سے میری طبیعت بھی بہت خراب تھی۔''

''اس وقت آپ کیا ڈرے ہوں گے جو میں اب آپ کو ڈرانے والا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہا۔ میرے انداز میں ادب واحترام بھی اڈ گیا تھا۔ ''آپ جس فلیٹ میں رہ رہے ہو، اس کا کرایہ کتنا ہے؟''

''کک......کرا......یہ......!'' وہ شکستہ آواز میں بولا۔

''ہاں میں نے کرایہ ہی پوچھا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''سولجر بازار کی ایک صاف ستھری عمارت میں شفٹ ہوئے ابھی آپ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وقوعہ سے ایک آدھ ماہ پہلے ہی آپ نے وہاں رہائش اختیار کی ہے۔ اس سے پہلے آپ کھارادر کے ایک تنگ وتاریک گھر میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

میری معلومات کے مطابق، آپ کے موجودہ فلیٹ کا کرایہ دو ہزار روپے ماہوار ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں......؟''

''تمہاری ماہانہ آمدنی زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہے۔'' میں نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورا۔ ''اماؤنٹ میں سے تم دو ہزار کرایہ ادا کرنے کے بعد کس طرح اپنے بیوی بچوں کو پال رہے ہو...... مجھے یہ بھی پتا چلا ہے اس فلیٹ کو کرایے پر حاصل کرنے کے لیے بیس ہزار ایڈوانس بھی دیا گیا ہے جبکہ تم معزز عدالت کے روبرو تھوڑی دیر پہلے اس حقیقت کا اقرار کر چکے ہو کہ تمہارا کوئی سپورٹر نہیں ہے۔ تم خود ہی اپنے گھر کو چلاتے ہو...... وہ بیس ہزار روپے تمہیں کس نے دیے؟...... اور ڈھائی ہزار روپے کمانے کے بعد تم دو ہزار پر کرایے کا فلیٹ کس طرح افورڈ کر رہے ہو......؟ اور تم نے وقوعہ سے اپنی فیملی کو چند روز پہلے کیوں گاؤں روانہ کر دیا تھا......؟ اور تم میرے سوالات سے اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟...... تمہارے چہرے پر پسینا کیوں چمک رہا ہے...... تمہاری آنکھوں میں دہشت کیوں ہلکورے لے رہی ہے؟...... تمہاری ٹانگیں کیوں کپکپا رہی ہیں......؟ اور تم دھڑام سے کٹہرے کے فرش پر کیوں گرنے والے ہو......؟''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر استغاثہ کا سب سے معزز گواہ...... عینی گواہ...... تیورا کر کٹہرے کے فرش پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

☆☆☆

پچھلی پیشی کے اختتام پر عدالت کے کمرے میں جو حالات پیش آئے تھے ان سے صورتِ حال روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔ عدالت نے جب نور علی کو پولیس کے حوالے کیا اور پولیس نے اس کی گھسائی منجھائی کی تو اس کی زبان کسی برساتی نالے کے مانند رواں ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے گرو شریک جرم نوید صدیقی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ نوید صدیقی، ہما (مقتولہ) کا کزن اور امیدوار تھا۔ اس نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے نور علی سے کام لیا تھا اور وہی نور علی کا فنانشل سپورٹر بھی تھا۔ نوید صدیقی کے ایما پر نور علی نے ہما کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ ایک ایسی پیش رفت تھی کہ پس منظر، پیش منظر بن گیا تھا۔

پولیس نے نور علی اور نوید صدیقی کے خلاف نیا چالان تیار کر کے عدالت میں دائر کر دیا اور آیندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل عاطف کو باعزت بری کر دیا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

محبت کی قوسِ قزح اور دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کا حساب

زندگی میں ایک وقت ایسا گزرتا ہے جب انسان باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے مگر... کچھ وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اندر کا منظر باہر دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ یہ دل کی لگی ہوتی ہی اتنی بری ہے۔ بقول شاعر... اے عشق ترا تو نام برا... آغاز برا، انجام برا... سناٹوں کے حصار میں قید اس نے بھی ایک روزن تلاش کرلیا تھا جہاں سے عہدِ گزشتہ کی کچھ یادیں خوشگوار جھونکے کے مانند اس کی تنہائی میں چلی آتی تھیں۔

روزنِ دل

زاہد نقوی

جاوید نڈھال اور جھکے ہوئے قدموں کے ساتھ فٹ پاتھ پر جا رہا تھا کہ اچانک قریب آتی ہوئی بے ہنگم آوازیں سن کر وہ چونک پڑا، اس نے دیکھا بغیر سائلنسر کی موٹر سائیکلوں پر کئی نوجوان لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے ریس لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں ایک موٹر سائیکل فٹ پاتھ پر آگئی، جاوید کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ اس سے بچنے کے لیے کیا کرے۔ وہ گھبراہٹ میں فٹ پاتھ کے دائیں طرف مکان کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا تیز رفتاری سے آتی ہوئی موٹر سائیکل پر سوار لڑکے نے بھی کوشش کی کہ کوئی حادثہ نہ ہوجائے لیکن اس کا ہینڈل جاوید

کے پیٹ کے ساتھ ٹکرا گیا۔ لڑکا موٹر سائیکل کے ساتھ سڑک پر پھسلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ جاوید کی آنکھوں میں اندھیرا سا آ گیا اور چند لمحوں بعد وہ اپنا پیٹ پکڑے ہوئے فٹ پاتھ پر بے سدھ ہو کر گر گیا۔

❖❖❖

جاوید کی جب آنکھ کھلی تو وہ اپنے پورے حواس میں تھا، اسے احساس ہوا کہ وہ ایک اسپتال میں ہے۔ چہرے پر آکسیجن ماسک لگا ہوا ہے۔ ہاتھوں میں ڈرپس لگی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور آلے سے دل اور سینے کی کیفیت معلوم کرنے لگا اس نے پاس کھڑی ہوئی نرس سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے یہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر خطرے سے باہر آجائے۔''

جاوید نے کچھ بولنا چاہا تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔

''آپ خاموشی سے لیٹے رہیں بولنے یا ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش نہ کریں، چھ سات گھنٹے پہلے جب آپ کو یہاں لایا گیا تھا تو پیٹ پر ایک زخم تھا لیکن جب اس کی ڈریسنگ ہو رہی تھی تو آپ کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس چھوٹے سے شہر میں خوش قسمتی آپ کی یہ ہے کہ وہ انجکشن مل گیا جس نے آپ کی جان بچالی لیکن ابھی آپ مزید دو روز تک آئی سی یو میں اور رہیں گے پھر کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔'' اسے ڈاکٹر کی آواز بہت دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایک اور انجکشن لگایا گیا اور وہ چند لمحوں بعد گہری نیند سو گیا۔

جاوید کو اسپتال میں آئے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے، اب اس کی صحت تسلی بخش تھی۔ وہ کسی سہارے کے بغیر اپنے ہی کمرے میں چلنے پھرنے لگا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اس کی خواہش کے باوجود فرید کوٹ جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے کہ دو ڈھائی کلومیٹر کا راستہ یا تو پیدل کا تھا یا پھر وہاں گھوڑا گاڑی یا بیل گاڑی کے ذریعے جایا جاسکتا تھا۔ جاوید کی صحت کے پیش نظر فی الحال یہ سفر اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ شام ہو رہی تھی اس نے کھڑکی بند کی اور اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت نرس، ڈاکٹر اور کئی لوگوں کے ساتھ ایک بیڈ پر ایک مریض کمرے میں لایا گیا اور خالی بیڈ کو ہٹا کر اس کا بیڈ کمرے کے کونے میں لگا دیا گیا۔ جاوید نے دیکھا کہ اس کے ایک پیر ایک ہاتھ پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا۔ ماتھے اور چہرے پر بھی زخم نظر آ رہے تھے اس کی آنکھیں بند تھیں یقیناً اسے آپریشن اور پلاسٹر چڑھانے کے دوران بے ہوشی کی دوا دی گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں کمرے میں موجود دو عورتیں اور ایک مرد باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر اور نرس بھی تھوڑی دیر بعد مریض کی حالت سے مطمئن ہونے کے بعد چلے گئے تھے۔ ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بنچ پر بیٹھ گیا جس سے پتا چلا کہ آنے والے مریض کا نام نثار تھا اور وہ گھر کی سب سے اوپر کی سیڑھی سے گر کر بری طرح زخمی ہوا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔

❖❖❖

دو تین دن ہی میں جاوید اور نثار ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کافی عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جاوید اکثر آنکھیں بند کر کے خود جانے کیا کیا سوچتا رہتا یا جب دل گھبراتا تو نثار سے کچھ باتیں کر لیتا تھا۔ آج صبح بھی گفتگو کی ابتدا جاوید نے کی۔

''آپ کی دیکھ بھال کرنے والا لڑکا شاید بازار گیا ہے!''

''نہیں جاوید صاحب، میں نے اسے گاؤں روانہ کر دیا ہے گھر اور کھیتوں کو دیکھنے والا وہاں کوئی تو ہو۔ یوں بھی آپ کے سامنے ہی ڈاکٹر نے کل رات کہا تھا کہ پلاسٹر کٹنے میں چھ سے آٹھ ہفتے لگ سکتے ہیں۔ ہر دس روز بعد ایکسرے بھی ہوگا، گاؤں سے آنا جانا آسان نہیں ہے ورنہ سردار کو اتنے دن یہاں روک سکتا تھا۔''

''ہاں ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ۔'' جاوید کا مختصر سا جواب تھا۔

''ویسے جاوید صاحب آپ باتیں کم کرتے ہیں لیکن جو بھی کہتے ہیں بڑے کام کی ہوتی ہیں، بس جو شعر وغیرہ آپ سناتے ہیں وہ اپنے پلے نہیں پڑتا، چھ جماعت پاس ہونے والا یہ سب کیسے سمجھے گا۔''

''کیا کروں نثار صاحب، لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے کچھ مشکل الفاظ ادھر ادھر کی بے سروپا باتیں کرنے لگتا ہوں، آپ بور ہوتے ہوں گے۔''

''ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ جاوید صاحب۔ آپ نہ ہوتے تو اس اندھیرے کونے میں پڑے پڑے میرا دم گھٹ جاتا۔ آپ کی باتوں سے دل بہلا رہتا ہے۔ اچھا یہ بتائیں آپ کھڑکی کھول کر بہت خاموشی کے ساتھ نظریں جمائے کیا دیکھا کرتے ہیں؟''

''میں...... ہاں بس یار کچھ الٹی سیدھی باتیں ہیں۔'' نثار بے تابی سے بولا۔ ''مجھے بھی تو بتائیے کہ کھڑکی کی دوسری طرف کیا ہے۔ کیا ہوتا رہتا ہے...... آج آپ نے کھڑکی نہیں کھولی۔''

جاوید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کھڑکی نہیں روزن دل......''

''پھر آپ انگریزی بولنے لگے......''

جاوید نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''روزنِ دل، یہ انگریزی نہیں فارسی ہے۔ دل کا دروازہ سمجھ لیجیے۔''

''دل کا سوراخ تو سنا ہے۔ یہ دروازہ کیسا؟'' نثار یہ کہہ کر اس طرح ہنسا جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے پھر رٹ لگائی۔

''جاوید صاحب بتائیے نا...... باہر کیا کچھ ہے۔ کیا ہوتا رہتا ہے؟''

جاوید نے کھڑکی کھول دی اور سرہانے کھسک کر باہر دیکھنے لگا۔ پھر ایک لمبے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''کھڑکی کے دائیں طرف آدھے حصے میں ایک کمرا نظر آتا ہے، کمرے کی کھڑکی بالکل میرے سامنے ہے، جب وہ کھلتی ہے تو عموماً ایک جوان سا لڑکا کرسی پر بیٹھا کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اسی کمرے میں میز سے تھوڑی دور ایک تخت سا ہے جس پر ایک بزرگ یا تو بیٹھے رہتے ہیں یا لیٹے رہتے ہیں، وہ لڑکے کے باپ ہیں۔''

''آپ کو پتا ہے یہ بات؟'' نثار نے سوال کیا۔

''ہاں یہ کمرا اتنا واضح ہے کہ کمرے کے اندر ہونے والی ساری باتیں میں سن سکتا ہوں اور کمرے کے اندر ہر ایک چیز ہر ایک فرد کو دیکھ سکتا ہوں۔ لڑکے کو بزرگ بزمی کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ انہیں ابی کہتا ہے۔ اکثر دونوں میں کسی نہ کسی موضوع پر بات ہوتی رہتی ہے۔''

''اچھا...... کیا باتیں کرتے ہیں دونوں؟'' نثار کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

''سب تو یاد نہیں لیکن کل ہی بزمی سے وہ کہہ رہے تھے 'یہ جو تم کو افسانے لکھنے کا خبط ہوا ہے اس کا کیا فائدہ......' اور بزمی نے جواب دیا 'ابی آپ صرف مالی فائدے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے پڑھنے والوں کو جو بتانا چاہتا ہوں وہ ان تک پہنچ رہا ہے یہی میری تسلی کے لیے بہت ہے۔'' اس کے باپ نے ایک اور سوال کیا تھا۔ ''اور یہ جو تم ناول لکھ رہے ہو، یہ چھپے گا کیسے؟''

اور بزمی نے صرف اتنا کہا تھا۔ ''کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے......'' پھر اس نے اٹھ کر اپنے باپ کا کھانا لا کر تخت پر رکھ دیا اور پانی کا گلاس بھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کمرے میں یا اس گھر میں بس یہی افراد رہتے ہیں۔'' نثار نے تجزیہ پیش کیا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' جاوید کا جواب تھا۔

''اب یہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟''

''ابھی کمرے کی کھڑکی بند ہے۔''

نثار نے پھر اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''ایسا لگتا ہے بزمی کے والد صاحب چل پھر نہیں سکتے۔''

''ہوسکتا ہے آپ کا خیال درست ہو یا شاید کوئی اور معاملہ ہو۔''

''اچھا جاوید صاحب اور کیا دیکھ رہے ہیں آپ باہر۔''

جاوید نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''باہر...... ہاں۔ میں نے کہا تھا کہ آدھی کھڑکی کے سامنے تو بزمی کا کمرا ہے۔ لیجیے سامنے کی کھڑکی بزمی کے والد نے آ کر ابھی کھولی ہے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے بزمی کے پاس گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ کہہ رہے ہیں۔

''تمہارا بخار کچھ اور تیز ہو گیا ہے۔''

''سعید صاحب نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے، انہوں نے اگر دوائیں نہ بھیجی ہوتیں تو کیا ہوتا۔ میں گٹھیا کا مریض، بھلا کیا کرتا...... دونوں وقت کا کھانا بھی وہ بھیج رہے ہیں......'' یہ ساری باتیں جاوید نے رک رک کر کہیں۔ وہ ہر بات سننے کے بعد دہرا دیتا تھا۔ ''بزمی اب اٹھ کر بیٹھ گیا ہے اور اس کے والد اسے شاید دوا پلا رہے ہیں۔''

''بہت سخت بیمار ہو گیا ایک دم بزمی۔'' نثار نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

جاوید نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے بتایا۔ ''گھر کا سامنے والا دروازہ ابھی ابھی کھلا ہے اور ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی سیڑھیوں سے اتر کر کار کی طرف آ رہی ہے۔ کالج کی طالبہ لگتی ہے۔''

''یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟''

''ارے بھائی اس طرح کہ اس کے ہاتھ میں صرف دو کاپیاں ہیں کوئی بھاری بھر کم بیگ نہیں ہے۔ ہائیں 'یہ کار میں نہیں بیٹھی بلکہ دائیں طرف چلی گئی ہے اور نظر نہیں آ رہی۔''

''نظر نہیں آ رہی، یہ تو برا ہوا۔'' نثار نے بے تابی سے کہا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اسے لڑکی کے بارے میں اور بھی کچھ معلوم ہو......

چند ہی لمحے بعد جاوید بولا۔ ''یہ کیا...... وہ لڑکی تو سامنے والے کمرے میں آ گئی ہے۔ بزمی کے پاس آ کر

اسی کے بستر پر بیٹھ گئی ہے۔'' جاوید اب ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نثار بھی بے چینی سے منتظر تھا کہ اسے معلوم ہو کہ دونوں میں کیا باتیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد جاوید نے بتایا۔

''لڑکی چلی گئی ہے، بزمی نے اسے دانیا کہہ کر مخاطب کیا تھا اور پوچھا تھا۔'' آج کون سا پیپر ہے؟''

دانیا نے کہا۔ ''اردو کا۔''

''اور کل......؟''

''کل انگریزی کا پرچہ ہے۔ آپ کو تیز بخار ہے خدا کرے آپ ٹھیک ہو جائیں جلدی سے۔'' دانیا بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہو جاؤں گا، گھبراؤ نہیں۔ میں ٹھیک ہوتا تو گھر میں آ کر کل کے پرچے کے بارے میں کچھ نوٹس بنوا دیتا۔''

''نہیں نہیں...... آپ نہ آیئے گا میں خود آ جاؤں گی شام کو۔''

''ارے نہیں تم نہ آنا سعید انکل کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ میرا مطلب تمہارا یہاں آنا۔''

''میں انہیں سمجھا لوں گی۔'' دانیا نے جاتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ چلی گئی اب؟'' نثار نے تصدیق کرنی چاہی۔

''ہاں وہ روانہ ہو گئی ہے۔''

''اور بزمی کیا کر رہا ہے؟'' نثار نے جاننا چاہا۔

''وہ اب بھی بستر پر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے والد اسے سمجھا رہے ہیں۔'' جاوید نے رک رک کر ان کی باتیں بتائیں۔ ''وہ کہہ رہے ہیں۔

''بزمی، بیٹے میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اگر وہ سچ ہوا تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔'' سعید صاحب کو دانیا کا یہاں آنا پسند نہیں لیکن وہ مانتی نہیں۔ بیٹے ایک بات ذہن نشین کر لو۔ برابر والوں کے درمیان تو رابطے بڑھنے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن اگر زمین آسمان کا فرق ہو تو اچھا نتیجہ کبھی سامنے نہیں آتا۔ تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں میں سعید صاحب کے والد کے زمانے سے وہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ انہوں نے اور پھر سعید میاں نے مجھے گھر کے فرد کی طرح سمجھا۔ میں جب معذور ہوا تو انہوں نے مجھے تسلی دی۔ تمہاری تعلیم کے حصول میں ہر طرح مدد کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے تمہیں بہت اچھی ملازمت دلوائی۔ اب تم سوچو۔''

''ابی......'' بزمی نے بات کاٹ دی۔ ''میں خود بھی یہ سب کچھ سوچتا ہوں۔ دانیا کو ایک بار نہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں لیکن وہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کیا چاہ رہی ہے لیکن......''

''میں اس سے بات کروں؟'' بزمی کے والد نے پوچھا۔

''نہیں ابی آپ مطمئن رہیں میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ دانیا کو میری باتیں ماننا ہوں گی۔''

''اب وہ دونوں خاموشی سے لیٹے ہیں، میں بھی آرام کر لوں، تھک گیا ہوں۔'' جاوید نے کھڑکی بند کی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

***

جاوید جب کمرے میں داخل ہوا تو نثار کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ، بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ خیریت تو ہے؟'' نثار نے بے تابی سے پوچھا۔

''میری سانس پھول رہی ہے، سر میں درد بھی ہے ذرا سانس سنبھل جائے تو بتاتا ہوں۔'' جاوید نے اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے پانی پیا۔ ایک گولی کھائی، پھر کچھ دیر بعد وہ نثار سے مخاطب ہوا۔

''میں اس وقت ٹہلتے ٹہلتے اس گھر کی طرف چلا گیا تھا۔''

''اچھا۔ خوب!'' نثار نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''بزمی صاحب سے یا ان کے والد سے ملاقات ہوئی؟''

''کسی سے بھی نہیں ہوئی۔'' جاوید نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دروازے پر سعید افضال کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے اور نیچے ناظم اعلیٰ لکھا ہوا ہے۔''

''اچھا تو کچھ اور بھی معلوم ہوا ہوگا؟'' نثار سب کچھ جلد سے جلد جان لینا چاہتا تھا۔

''بس یہ معلوم ہوا کہ سعید افضال کے والد اس علاقے کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ چاروں طرف جو دکانیں ہیں، آگے جا کے کئی ایکڑ کھیت ہیں، سب کے یہی مالک تھے۔ اب ان کا بیٹا اس علاقے کا گویا انتظامی سربراہ ہے۔ بڑی سخت سیکیورٹی ہے۔ میں نے بزمی سے ملنا چاہا، ان کے والد سے ملنا چاہا تو گارڈز نے بتایا کہ اقبال چاچا ابھی ابھی قریب ہی اپنے ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں اور بزمی صاحب بیمار ہیں لہٰذا وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔''

''یہ تو برا ہوا۔'' جاوید نے نثار کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ ''معلوم ہوا ہے کہ گھر میں دانیا کی امی اور پھوپی رہتی ہیں۔ اقبال صاحب سعید صاحب کے والد کے زمانے سے

گھر کی ساری دیکھ بھال کے ذمے دار تھے۔ مالی، ملازمین، گھر کا سودا سلف، صفائی غرض یہ کہ گھر سے متعلق ہر کام کے نگران تھے۔ بڑی عزت ہے ان کی، سب انہیں یہاں تک کہ سعید صاحب بھی اقبال چاچا ہی کہتے ہیں انہیں، پھر وہ گٹھیا کے مرض کا شکار ہو گئے اور ایک طرح سے پنشن پر چلے گئے۔ بزمی اور دانیا بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے تھے حالانکہ سعید صاحب کو یہ بات پسند نہیں تھی لیکن دانیا کی امی کا کہنا تھا کہ جب کوئی اس کے ساتھ کھیلنے والا نہیں تو وہ بھلا کس کے ساتھ کھیلے۔

بزمی صاحب تین چار سال سے چھوٹی بی بی کو شام کو پڑھانے کے لیے گھر آتے ہیں۔ بی بی بارھویں کلاس میں پڑھتی ہیں۔'' جاوید خاموش ہو گیا۔ نثار اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا ہے...... جاوید نے یہ محسوس کر کے بات ختم کر دی۔ ''بس بھائی اتنا ہی معلوم ہوا ہے اب تک۔ سوچتا ہوں کسی دن بزمی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ گارڈز کہہ رہا تھا کہ وہ آٹھ بجے ہی ملازمت کے لیے گھر سے باہر جاتے ہیں۔ کوشش کروں گا کسی دن، ان سے ملاقات کرنے کی۔''

''ہاں ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ تب ہی کوئی صحیح بات معلوم ہو سکے گی۔ ویسے جاوید صاحب جس طرح آپ یہ سب بتا رہے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کہانی سنا رہے ہوں...... بہرحال بزمی صاحب سے ملیئے گا تو اور بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔''

''ہاں دیکھیے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ دس پندرہ دن بعد جب میں اسپتال سے فارغ ہو جاؤں گا تب آپ اکیلے تو بہت گھبرائیں گے۔''

''نہیں میں نے ڈاکٹر اور نرس دونوں سے وعدہ لے لیا ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میرا بیڈ اس کھڑکی کے پاس آ جائے گا۔''

''اچھا...... یہ تو اچھی خبر ہے......'' جاوید نے پھر پانی پیا۔

''ویسے جاوید صاحب شام تو ہو گئی ہے۔'' نثار بولا۔

''ہاں تو...... کیا کروں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''بھول گئے آپ۔ شام کو دانیا بزمی سے اس کے کمرے میں پڑھنے کے لیے کہہ گئی تھی۔'' نثار نے یاد دلایا۔

''ارے ہاں۔ دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جاوید نے کھڑکی کھول دی اور غور سے باہر دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد بولا۔ ''کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ دانیا پڑھنے کے بجائے بزمی سے باتیں کر رہی ہے۔''

''سنائی دے رہا ہے کچھ؟'' نثار کی بے تابی بڑھ گئی۔

''ہاں ہاں خاموش رہیے میں بتاتا رہوں گا......'' وقفے کے بعد جاوید بولا۔ ''دانیا بزمی کے سوال کا جواب دے رہی ہے۔''

''بزمی صاحب یہ بات آپ کتنی بار سمجھا چکے ہیں لیکن میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور آج پھر کہہ رہی ہوں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ یہ کوئی جرم نہیں اور پھر مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ آپ کا ناول پورا ہونے والا ہے۔ مجھے دیجیے گا میں اسے چھپواؤں گی اور اس کی اشاعت کے بعد جب اس کی دھوم ہوگی تو ڈیڈی کو معلوم ہوگا کہ آپ کے پاس دولت کے علاوہ بہت کچھ ہے۔''

''مگر میرے ابی جی تو ان تمام باتوں سے مطمئن نہیں ہیں۔'' بزمی کہہ رہا ہے دانیا سے۔ ''ان کا خیال ہے کہ ان کی جو عزت ہے سعید میاں کے گھر میں وہ ختم ہو جائے گی اور نہ تم خوش رہو گے اور نہ دانیا۔''

جاوید خاموش ہو کر پھر کچھ سننے لگا۔

''دانیا کہہ رہی تھی یہ ان کا خیال ہو سکتا ہے کچھ دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر میری امی میرے ساتھ ہیں انہیں سب معلوم ہے......'' جاوید پھر خاموش ہو گیا۔

''شاید کوئی ملازمہ آ گئی ہے، کچھ کہہ رہی ہے۔'' وہ پھر سننے میں مشغول ہو گیا۔ ''دانیا چلی گئی کمرے سے۔''

''ارے ایکدم......'' نثار نے مایوسی سے کہا۔ ''ابھی تو دونوں کو کچھ طے کرنا تھا۔ یہ ایکدم کیوں چلی گئی؟''

''آپ سنیے تو ساری بات۔'' جاوید مخاطب ہوا۔ ''اس ملازمہ نے آ کر کہا تھا بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں فوراً گھر آ جاؤ تمہارے ڈیڈی آنے والے ہیں دفتر سے، انہیں معلوم ہوگا کہ بزمی صاحب کے کمرے میں اقبال چاچا بھی نہیں ہیں تو بہت سخت خفا ہوں گے...... ظاہر ہے نثار صاحب، اسے جانا چاہیے تھا۔''

نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ جاوید سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''گھنٹی بجائی تھی آپ نے؟''

''ہاں میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور یہاں بھی، سینے کے اوپر...... بھی ہلکا سا درد ہے۔'' جاوید نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، آپ بیڈ پر لیٹ جایئے، میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔'' نرس نے جاتے ہوئے کہا۔

جاوید بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے سینے پر اس جگہ ہاتھ رکھ لیا جہاں درد ہو رہا تھا۔ ”کیا زیادہ تکلیف ہے؟“ نثار نے پوچھا۔

”نہیں لیکن پھر بھی ڈاکٹر دیکھ لیں تو زیادہ مناسب ہے۔“

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ نثار یہ دیکھ کر خاموش ہوگیا۔

***

صبح تک جاوید کی حالت تشویش ناک ہوگئی۔ اس کے سینے کا درد اس حد تک شدید ہوگیا کہ ڈاکٹروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نہ جانے کتنے انجکشن، کتنی دوائیں، کتنے ٹیسٹ ہوئے لیکن صورت حال میں کوئی بہتری نظر نہیں آرہی تھی۔ ڈاکٹر مایوس ہوتے جارہے تھے۔ اس نازک اور تشویش ناک صحت کی بنا پر جاوید کو کسی بڑے شہر میں بھی منتقل کرنا مناسب نہیں تھا۔ ایک جونیئر ڈاکٹر کی رائے کے مطابق آخری کوشش کے طور پر اسے ایک انجکشن اور لگایا گیا اور تقریباً دو گھنٹے بعد جاوید کی حالت معجزانہ طور پر ایکدم بہتر ہوتی چلی گئی۔ شام کو جب اس نے آنکھ کھولی اور اس سے پوچھا گیا تو اس نے یہی بتایا، درد تو اب بالکل ختم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد یہ طے کیا کہ ابھی چوبیس گھنٹے تک یہ مکمل طور پر بیڈ پر رہیں گے، بخار کے لیے دوائیں تجویز کیں اور جاوید کو صاف گوئی کے ساتھ یہ بتا دیا کہ آٹھ دس روز اور حالت مکمل طور پر قابو میں آجائے گی آپ فوراً حیدرآباد یا کراچی جائیں، انجیوگرافی ضروری ہے جس کی سہولت یہاں نہیں ہے...... ورنہ اب تیسرا دورہ اگر پڑا تو بچنا ناممکن ہوگا شاید......“ جاوید نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”میں کراچی تو نہیں جاؤں گا۔ ہاں حیدرآباد کے بارے میں سوچوں گا۔“ نثار نے یہ تمام مراحل خود دیکھے اور ساری باتیں سنیں۔ اس کی بے چینی ختم ہوگئی تھی شاید اس وجہ سے کہ اب اسے امید ہوگئی تھی کہ جاوید صاحب دو تین روز بعد اس قابل ہوجائیں گے کہ بزمی اور وانیا کے بارے میں اس درمیان ہونے والی صورت حال سے آگاہ کریں۔ نثار نے نرس سے کھڑکی کھولنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کردیا۔

”جاوید صاحب کو بخار ہے اور ٹھنڈک بڑھ رہی ہے لہٰذا ان کے لیے ٹھنڈی ہوا نقصان دہ ہوگی۔“ شاید نثار، نرس کے ذریعے کچھ باہر کے حالات جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرس نے جاوید کو ایک اور انجکشن لگایا اور نثار کو ہدایت کی کہ ان سے باتیں نہ کیجیے گا اب۔ انہیں بہت اچھی نیند کی ضرورت ہے۔

***

تین چار روز گزرنے کے بعد آج نثار بہت مطمئن تھا۔ ڈاکٹروں نے جاوید کو چلنے پھرنے اور باہر ٹہلنے کی اجازت دے دی تھی اور جاوید، بزمی سے ملنے کے لیے کافی دیر ہوئے جاچکا تھا۔ جاوید واپس آیا تو نثار کا انتظار ختم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بزمی سے ملاقات کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ ”میں نے بزمی کو راضی کرلیا کہ وہ میری خواہش پر قریب ہی ہوٹل میں میرے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرلے۔ جب میں نے اسے باتوں باتوں میں اس کی ان باتوں کے اشارے دیے جو میں نے کھڑکی کے ذریعے سنی تھیں تو وہ کچھ دیر حیران نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آخر آپ کو ان تمام باتوں سے کیا مطلب اور یہ سب جاننے کا مقصد کیا ہے؟ دوستانہ لہجے میں مشورہ دیا کہ آپ نے اپنے دل کی بات نہ اپنے والد کو بتائی نہ وانیا صاحبہ کو مگر مجھے یہ سب بتا کر آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بچپن سے لے کر اب تک تمام اہم واقعات اور احساسات سے آگاہ کیا۔“

”جیسا کہ آپ کو علم ہوچکا ہے جاوید صاحب کہ میرے والد سعید صاحب کے گھرانے سے تقریباً چالیس سال سے وابستہ ہیں اور سب احترام کی نظروں سے انہیں دیکھتے ہیں۔ اسی لیے میں اور وانیا بچپن ہی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ وانیا کی کوئی دس سال کی عمر تھی کہ وہ ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہوگئی۔ میں اور میرے والد دن رات اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ سعید صاحب اور بیگم صاحبہ کے سمجھانے کے باوجود میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ وانیا کو اکیلا چھوڑوں حالانکہ دیکھ بھال کرنے والی خود اس کی امی تھیں، ملازمین تھے۔ وانیا بھی مجھے اپنے پاس پاکر بے حد خوش رہتی۔ سعید صاحب کو میری یہ بات بہت اچھی لگی۔ اب جو چیز وہ وانیا کے لیے لاتے میرے لیے بھی لے آتے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ میں نے گریجویشن کرلیا تو مجھے سعید صاحب نے اسکول میں ملازمت دلوادی۔ اب وانیا کو بھی میں پڑھانے لگا تھا۔ ابی کے کہنے کے مطابق اب میں نے گھر میں آنا جانا بہت کم کردیا ہے۔ جب میں وانیا کو پڑھاتا تھا تو اکثر وہ ایک آدھ جملہ ایسا کہہ دیتی کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ مثلاً یہ کہ آپ کی، بڑی سوچتی ہوئی اور خوب صورت آنکھیں ہیں یا کہ آپ کے الجھے ہوئے بال مجھے بے حد پسند ہیں۔ ایک دن کہنے لگی یہ آپ کا سادہ سا لباس آپ پر بڑا بھلا لگتا ہے۔“ اور دل کی بات میں بھی کہہ دوں جاوید صاحب آپ سے وانیا کے مزاج اور رویے سے میں بے حد متاثر تھا۔ مجھے بھی وہ بہت اچھی لگنے لگی۔ میں نے انٹر میں داخلے کے بعد رسالوں کے لیے افسانے لکھنے شروع کردیے جو بہت پسند کیے گئے۔ وانیا ان افسانوں کی اتنی تعریف کرتی کہ میں دم بخود رہ جاتا۔ تقریباً دو سال پہلے جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ایک دن اس نے کہا۔ آپ میرے استاد ہی نہیں، میرے آئیڈیل بن گئے ہیں۔ صاف گوئی تو اس کی عادت تھی۔ ایک دن اس نے کہہ دیا، آپ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں جب آپ میرے پاس نہیں ہوتے تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں یہ تمام باتیں سنتا لیکن جواب کبھی نہیں دیتا تھا، میں جانتا تھا کہ اگر میں نے بھی اس قسم کی باتیں کیں تو پھر وانیا کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ میں البتہ اسے سمجھایا کرتا تھا کہ ایسی باتیں مت سوچا کرو کیونکہ مجھے احساس تھا اور اب بھی ہے کہ سعید صاحب کا اس شہر میں، اس معاشرے میں کافی اونچا مرتبہ ہے، میں وہ سب خواہش بھی کرسکتا تھا جو وانیا چاہتی تھی اور نہ میں نے آج تک اس سے اپنے دل کی بات کی ہے۔ لیکن وہ ذہین ہے سمجھدار ہے۔ ایک دن اس نے کہا۔ بزمی صاحب، آپ کب تک خاموش رہیں گے، میں خاموشی کی آواز بھی سن سکتی ہوں، آپ بھی وہی سب کچھ چاہتے ہیں جو میں چاہتی ہوں۔ میں اس کی یہ بات سن کر دنگ رہ گیا۔ مجھے دل پر جبر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا۔ حماقت کی باتیں نہ کرو...... اس بات پر وہ ہنسنے لگی، بولی اور کچھ نصیحت استاد جی...... وہ ہنس رہی تھی۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ وہ یہ مسکراہٹ دیکھ کر بول اٹھی۔ دل کی بات چہرے تک آگئی نا۔“

جاوید باتیں کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ نثار دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ جاوید نے پانی پیا اور چند لمحوں بعد اس نے پھر بات شروع کی۔

”بزمی نے ایک واقعہ یہ بھی بتایا کہ میں اور وانیا کتابیں خریدنے دکان پر گئے وہاں اس نے ضد کی کہ آج ہم دونوں ایک ساتھ کوئی فلم دیکھیں گے۔ میں نے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانی۔ سینما تو ہم دونوں نے ساتھ دیکھ لیا لیکن اس کی اطلاع سعید صاحب کو بھی ہوگئی اور بعد میں ابی کو بھی۔ آپ جان سکتے ہیں مجھے کتنی ڈانٹ کھانی پڑی ابی سے اور وانیا کو بھی سزا ملی۔ وہ دو روز تک نہ کالج جاسکی، نہ مجھے پڑھانے کے لیے بلایا گیا۔ بزمی کو اپنی ملازمت پر جانا تھا لہٰذا میں نے اسے بس یہی تجویز دی کہ آپ سمجھدار ہیں اور جو کر رہے ہیں اور جس طرح وانیا صاحبہ کو سمجھا رہے ہیں یہی مناسب ہے۔ بزمی آئندہ ملنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔“

”بس!“ نثار نے بے بسی کے ساتھ خاموشی توڑی۔

”فی الحال تو اسی پر گزارہ کیجیے۔“ جاوید نے مری ہوئی اور تھکی ہوئی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں اب آرام کروں گا تھک گیا ہوں۔“

”بالکل بالکل۔“ نثار کا جواب تھا۔

***

دوسرے روز جاوید کی دن میں تقریباً ایک بجے آنکھ کھلی۔ اس نے اٹھ کر برش کیا، منہ دھویا اور بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ ناشتا ٹرے میں ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ اس نے سلائس اٹھا کر کھانا شروع کیا۔ نثار بے تابی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جاوید کو مخاطب کیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“

”میں آج تو بے حد فریش محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔“

”ویسے آپ ذرا اور ٹھیک ہوجائیں تو حیدرآباد علاج کے لیے چلے جائیں۔“

”سوچوں گا، جب میں بس میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرنے کے قابل ہوجاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نثار یہ کہہ کر خاموش ہوگیا لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ”آج آپ بزمی سے نہ مل سکے۔“

”دیکھو بھئی آپ ابھی تو میری آنکھ کھلی ہے۔ کل کوشش کروں گا۔“ جاوید نے تسلی دی۔

”لیکن کھڑکی کھول کر تو دیکھ سکتے ہیں۔ باہر اب کیا ہو رہا ہے؟“

جاوید نے اٹھ کر کھڑکی کھولی، بولا۔ ”کمرا نظر آرہا ہے۔ بزمی تو ابھی واپس آیا نہیں لیکن اس کے والد کے پاس تخت پر کوئی بڑا بارعب سا آدمی بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے سعید صاحب ہیں۔“

”سعید صاحب!“ نثار نے تعجب سے کہا۔

جاوید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بات کرنے سے روکا اور کمرے کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا...... نثار بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ کمرے میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ پانچ چھ منٹ کی خاموشی کے بعد جاوید نے اپنا چہرہ کمرے کی طرف سے موڑ کر نثار کی طرف کیا اور بتایا۔

”سعید صاحب بھی آئے تھے...... ان کو دیکھ کر ابی نے پوچھا تھا ”خیریت تو ہے میاں، اس وقت آپ نے زحمت کی۔“

”خیریت تو نہیں ہے اقبال چاچا۔ پانی سر سے اونچا

ہوگیا ہے۔ آپ سے رائے لینے اور اپنا فیصلہ سنانے آیا ہوں۔'' سعید میاں نے بڑے تلخ لہجے میں گفتگو کی تھی۔

''ہوا کیا، کچھ بتایئے تو سہی۔'' ابی بولے۔

''آج دوپہر کے لنچ پر میں کسی کے ساتھ یہاں کے ایک ہوٹل پہنچا تو میں نے کونے کی میز پر بزمی اور وانیا کو دیکھا، وہ دونوں مجھے دیکھتے ہی کیبن میں چلے گئے۔ یہ بات مجھے بری لگی، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ چھپنا چاہ رہے تھے، آخر کیوں؟ اس کا مطلب اقبال چاچا یہ ہے کہ ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے مجھے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

ابی نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن میاں صاحب، ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں...... اس لیے نہیں کہ میں اپنے بیٹے کی طرف داری کروں گا بلکہ سچ یہ ہے کہ کئی بار میرے سامنے بزمی نے وانیا بیٹی کو سمجھایا لیکن آپ جانتے ہیں وہ سمجھ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ضدی بھی ہے۔'' ابی کی بات سن کے بعد سعید میاں بولے۔

''یقیناً آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن آپ میرے خاندانی ماحول اور اسٹیٹس سے واقف ہیں۔ میں نے مجبوراً فیصلہ کیا ہے کہ وانیا کو اس کی ماں کے ساتھ اس کی خالہ کے پاس پرسوں شام کو لندن بھیج دوں کچھ دنوں کے لیے۔ دوری ہوگی تو فرق یقیناً پڑے گا۔ کیا خیال ہے آپ کا......؟''

سعید صاحب نے ابی کی رائے معلوم کی وہ بولے۔

''میرا خیال ہے آپ کا فیصلہ سو فیصد درست ہے اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔''

سعید میاں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ نے میرے دل سے بوجھ اتار دیا، میں چلتا ہوں۔ بزمی آنے والا ہوگا میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا......'' سعید میاں یہ کہہ کر چلے گئے۔ ابی سر جھکائے اس وقت تخت پر بیٹھے ہیں۔'' جاوید خاموش ہوا تو نثار نے کہا۔

''ویسے یہ ظلم ہے دونوں کے ساتھ۔''

''کیوں ظلم ہے۔ سعید میاں کی جگہ اور ایسی پوزیشن والا کوئی بھی ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا۔'' جاوید نے کھڑکی بند کی۔ ''میں چائے پینے کینٹین تک جا رہا ہوں۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔

❖❖❖

نثار کے بار بار اصرار کے بعد دوسرے دن سہ پہر کو جاوید نے کھڑکی کھولی۔ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

''گھر کے پورچ میں کچھ لوگ آ جا رہے ہیں، کار بھی کھڑی ہے غالباً وانیا اور اس کی امی لندن کے لیے روانہ ہونے والی ہیں اور سامنے کمرے ہیں...... ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ بزمی اور ان کے والد میں کچھ بات ہو رہی ہے۔ جاو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ مجھے سننے دو، خاموش رہنا۔'' خا وقفے کے بعد اس نے بتایا کہ ابی نے بہت سختی سے بزمی پوچھا۔ ''آخر تم لوگ ہوٹل کیوں گئے؟ بزمی نے جواب تھا۔ ابی وانیا میرے اسکول آ گئی اور مجھے لے کر ہوٹل پہنچ میں نے منع بھی کیا لیکن وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اس چائے پیتے ہوئے بتایا کہ اس نے میرا ناول پڑھ لیا ہے۔ کا خیال تھا کہ بیس سال سے اتنا اچھا ناول اب تک نہیں گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی امی نے ناول کے چھپوانے سارے اخراجات اپنے ذمے لے لیے ہیں۔''

وانیا کا خیال تھا کہ یہ ناول چھپنے کے بعد نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے حد پسند کیا جائے گا۔ اتنی دیر میں سعید صاحب کئی لوگوں کے ساتھ آ گئے۔''

ابی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ ''بیٹے میں نے تمہیں سمجھایا تھا نا کہ برابر والوں کے درمیان کے رابطے بڑھنے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن زمین آسمان کا فرق ہو تو اچھا نتیجہ کبھی نہیں نکلتا۔ یہی ہوا نا اب وانیا ابھی تھوڑی دیر میں لندن چلی جائے گی۔ تمہیں علم ہے نا۔'' بزمی نے گردن ہلائی۔ ''مجھ سے سعید میاں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا ہے اور مناسب بھی ہے، تم دونوں کچھ دن دور رہو گے تو فرق یقیناً پڑے گا۔''

بزمی خاموش تھا۔ ابی نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کیا۔

''میں کوٹھی کی طرف جا رہا ہوں، وانیا بیٹی کو رخصت کرنے۔ تم وہاں نہ آ جانا...... خدا کے لیے۔'' وہ لنگڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔''

''تو گویا وانیا لندن جا رہی ہے۔'' نثار نے جاوید کی باتیں سننے کے بعد کہا۔

''ہاں بالکل...... میں دیکھ رہا ہوں دو برقعہ پہنے خواتین سیڑھیوں سے اتر رہی ہیں یقیناً وانیا کی امی اور اس کی پھوپی ہوں گی۔''

''اور وانیا نظر نہیں آ رہی ہے؟'' نثار نے جاننا چاہا۔

''نہ وہ کہیں ہے نہ سعید میاں نظر آ رہے ہیں۔ ہاں بزمی کے والد پورچ تک پہنچنے والے ہیں۔''

''اور کمرے میں بزمی اکیلا ہے؟''

''ہاں وہ اپنے ابی کے تخت پر گردن جھکائے بیٹھا ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''کیا ہوا؟'' نثار نے بے تابی سے پوچھا۔

''وانیا بھاگتی ہوئی اور روتی ہوئی کمرے میں آئی ہے اور...... اور...... بزمی بھی کھڑا ہو گیا ہے اور شاید بزمی بھی رو رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ سننے دو۔'' پھر کافی دیر خاموشی رہی۔ نثار بے تابی سے بزمی اور وانیا کی باتیں سننے کا منتظر تھا۔ جاوید نے بولنا شروع کیا۔

''آج پہلی بار گفتگو بزمی نے شروع کی۔ ''وانیا تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟''

''کیا کروں بزمی صاحب۔ حالات نے مجبور کر دیا لیکن آپ گھبرایئے گا نہیں۔ دل چھوٹا نہ کیجیے گا میں چار پانچ ہفتے بعد آ جاؤں گی۔'' وانیا نے روتے ہوئے بزمی کو تسلی دی، پھر بولی۔

''میں آپ کا ناول وہیں لندن میں چھپواؤں گی اور پھر آپ کو شہرت بھی ملے گی اور دولت بھی۔'' اور تب پھر بزمی نے وہ بات کی جس کا یقین اب بھی نہیں آ رہا۔''

''کیا کہا اس نے......؟'' نثار جلد سے جلد جاننا چاہ رہا تھا۔

اس نے کہا ''وانیا اب تک میں نے تمہارے جذبات کا جواب نہیں دیا، آج میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ اقرار کرتا ہوں۔ وانیا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا مجھے نہ دولت چاہیے نہ شہرت۔ مجھے صرف اپنی وانیا چاہیے...... وانیا...... جاؤ وانیا۔ خدا حافظ! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہم دونوں ایک دن ایک دوسرے کو پا لیں گے، مجھے یقین ہے۔'' وانیا روتی رہی، نہ جاؤ۔ آنسو پونچھ لو اور اس یقین کے ساتھ جاؤ کہ ہم جلدی ملیں گے۔ ہنستی ہوئی جاؤ وانیا تاکہ میرے وجود کے اندر تمہارا انتظار کرنے کی قوت قائم رہے۔''

وانیا نے اپنے آنسو پونچھے اور بڑی حیرت اور خوشی کے ساتھ بزمی کو دیکھا۔ ''کاش یہ باتیں میں پہلے سن لیتی، کاش آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو پہلے آ جاتے تو میں چٹان بن گئی ہوتی۔'' اور پھر ایک ملازمہ بھاگی ہوئی آئی...... ''چلیے سرکار بے حد خفا ہو رہے ہیں۔ جلدی چلیے۔'' اور وانیا خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ بڑا عجیب منظر تھا نثار صاحب!''

''ہاں...... یقیناً...... سوچتا ہوں دونوں کس دل سے جدا ہوئے ہوں گے۔''

جاوید پھر بولنے لگا۔ ''میں اب دیکھ رہا ہوں وانیا بھی کار میں بیٹھ گئی اور سعید میاں بھی، پاس ہی ملازمین کھڑے تھے۔ ابی بھی جھک کر کچھ وانیا سے کچھ کہہ رہے ہیں...... اور...... اور......''

فوری سزا

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ظلم و زیادتی اور قطع رحمی دو جرم ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا کے ساتھ، دنیا ہی میں ان کی فوری سزا بھی دے دیتا ہے۔ ان جرموں کے علاوہ اور کوئی جرم ایسا نہیں کہ جس کی سزا کا اللہ تعالیٰ اس طرح اہتمام کرتا ہو۔''

صحیح بخاری سے اقتباس

مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن

''اور کیا......؟'' نثار نے پوچھا۔

''اور بزمی بھی کمرے سے نکل کر لان کے وسط میں آ گیا ہے۔ کار چلی تو بزمی نے ہاتھ ہلایا۔ اور کار سے وانیا کا ہاتھ بھی فضا میں بلند تھا۔ کار چلی گئی۔ پورچ میں کھڑے ہوئے تمام لوگ افسردہ سے کھڑے ہیں۔ وانیا سب کی چہیتی تھی نا۔''

جاوید نے کھڑکی بند کی...... اور بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بھی تکلیف ہوئی۔ سچ بات تو یہی ہے۔''

❖❖❖

تین دن اور گزر گئے۔ آج صبح جاوید جب کمرے میں باہر سے آیا تو اس کے چہرے پر تھکن تھی، بے چینی سی تھی۔ وہ آتے ہی بیڈ پر لیٹ گیا۔ نثار نے جھٹ پوچھ لیا۔

''ٹہلنے گئے تھے شاید؟''

''ہاں......'' جاوید پھر خاموش ہو گیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' نثار نے معلوم کیا۔

''ہاں ٹھیک ہی ہے۔ کچھ الجھن سی ہو رہی ہے۔'' کچھ دیر ٹھہر کر پھر بولا۔ ''میں نے گھنٹی بجا دی ہے۔ نرس آ کر کوئی دوا دے دے گی......'' کچھ وقفے کے بعد نثار سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں، بہت ہی تھوڑی دیر کے لیے بزمی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔''

''اچھا، کیا حال ہے اس کا؟'' نثار کی جستجو بڑھ گئی۔

جاوید نے بہت آہستہ آواز میں بتایا۔ ''ٹھیک ہے بے حد خوش بھی ہے، اسے یقین ہے کہ وانیا بہت جلد واپس

آئے گی۔ وہ بے حد مطمئن تھا...... لیکن اس نے بتایا کہ سعید میاں نے اس کا تبادلہ کسی گاؤں میں کروا دیا ہے۔''

''یہ تو برا کیا۔'' نثار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

جاوید نے جواب دیا۔ ''وہ بہت خوش تھا، دو چار روز میں وہ جا کر چارج لے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود اس ماحول سے کچھ دنوں کے لیے دور جانا چاہ رہا تھا۔''

''پھر......''

''پھر وہ چلا گیا اپنی ملازمت پر۔'' نرس آچکی تھی اس نے جاوید کو ایک گولی کھلائی اور کہا۔ ''آرام کیجیے، اب بات نہ کیجیے گا۔''

شام کو جاوید کی حالت پھر بگڑ گئی اس حد تک کہ آکسیجن ماسک لگانا پڑا۔ ای سی جی اور ایکسرے ٹیسٹ ہوئے، کئی ڈاکٹر آگئے۔ دوائیں اور انجکشن دیے جانے لگے۔

ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''ہوسکتا ہے آج یا کل تک اسے ایک اٹیک اور ہو جائے۔ یوں اب تو حالت ٹھیک لگ رہی ہے۔''

نو بجے رات تک جاوید نے آنکھیں کھولیں، نرس نے آکر اسے بٹھایا۔ اس نے کھانا کھایا پھر تھوڑی دیر میں نرس نے آکر دوائیں دیں۔ جاوید نرس سے مخاطب ہوا۔

''یہ گھنٹی شاید خراب ہو گئی ہے۔''

''آپ نے بجائی تھی؟'' نرس نے بھی کوشش کی۔

''ہاں گھنٹی تو خراب ہو گئی ہے اب صبح ہی ٹھیک ہو گی۔ کیوں بلایا تھا آپ نے؟''

''اس لیے کہ آپ نیند کی دوا دے دیں، میں سونا چاہتا ہوں۔''

نرس بولی۔ ''میں نے دوا دے دی ہے آپ کو جلد ہی نیند آجائے گی، گھبرائیے نہیں اس وقت آپ بالکل ٹھیک ہیں۔'' نرس کمرے سے نکلنے سے پہلے نثار کے پاس گئی۔

''دیکھیے ہوسکتا ہے رات میں پھر انہیں کوئی تکلیف ہو جائے۔ آپ اپنی گھنٹی بجا کر کسی کو بلا لیجیے گا اگر ضرورت پڑے۔'' یہ کہہ کر نرس چلی گئی، جاوید نے آنکھیں بند کرلیں۔

نثار نے بھی تھوڑی دیر بعد نیند کی گولی کھائی...... لیکن پھر اس کی آنکھ تھوڑی دیر بعد کھل گئی، عجیب سی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے جاوید کی طرف دیکھا، وہ سینے پر ہاتھ رکھے زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ''سینے کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی کو بلا لیجیے......'' یہ کہہ کر وہ پھر کراہنے لگا اس کی سانس زیادہ پھولنے لگی تھی۔ نثار نے گھبراہٹ میں گھنٹی تلاش کی لیکن اسی لمحے اس کے ذہن میں ڈاکٹر کی ایک بات گونجی جو اس نے ایک ہفتے پہلے جاوید سے کی تھی۔ ''دیکھیے آپ ٹھیک ہوتے ہی کسی شہر میں جا کر انجیو گرافی کروا لیں۔ اب اٹیک ہوا تو بے حد مشکل ہوگا علاج کرنا اس شہر میں۔''

نثار کو گھنٹی مل گئی لیکن اس کے وجود کے اندر سے شیطان نے نکل کر اس کے ذہن اور دل کو مفلوج کر دیا۔ پھر اسی نے نثار کے کان میں سرگوشی کی۔

''کل صبح یہ سامنے والا بستر خالی ہوسکتا ہے، تمہارا بیڈ پھر وہاں ہوگا۔ کھڑکی کھلے گی، سبز گھاس، پھول، باہر دوڑتی ہوئی زندگی نظر آئے گی۔'' سرگوشی جاری تھی۔ ''تم کانوں میں روئی ٹھونس لو اور نیند کی ایک گولی اور کھا لو...... کھا لو......''

نثار نے یہ سب کچھ جلدی جلدی کیا۔ اس کے ہاتھ گھنٹی پر سے ہٹ گئے، اس نے آنکھیں بند کر کے ان پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کچھ دیکھ نہ لے، کچھ سن نہ لے۔

دوسرے دن نثار دوپہر تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر بیٹھ گیا لیکن نیند کی دو گولیوں کا اثر اب بھی تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی...... اس نے رات کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کی لیکن سارے واقعات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس نے جاوید کے بیڈ کی طرف دیکھا وہاں جاوید کا بیڈ بھی نہیں تھا، اسے رات کی باتیں یاد آنی شروع ہو گئیں لیکن ایک دم وہ چونک پڑا۔ ایک بے حد فیشن ایبل جوان لڑکی غالباً اپنی ملازمہ کے ساتھ کمرے میں آگئی تھی اور اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بے تاب لہجے میں نثار سے پوچھا۔

''بزمی صاحب کہاں ہیں؟''

''بزمی۔'' نثار کا اپنا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے یاد آیا، اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ ''بزمی صاحب کا تو تبادلہ کسی گاؤں میں ہو گیا ہے۔''

لڑکی بڑی بے تابی کے ساتھ تیز لہجے میں بولی۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے کل شام میں لندن سے کراچی آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ بزمی صاحب کا تبادلہ فرید کوٹ ہو گیا۔ وہاں آج صبح پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان کی درخواست آئی ہے، انہیں دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اس اسپتال میں داخل ہیں۔ یہاں آئی تو کوریڈور میں ایک لڑکے نے اس کمرے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ان کا بیڈ یہاں ہے۔ مگر یہاں تو صرف آپ

ہیں، بزمی صاحب کہاں ہیں؟''

''اس کمرے میں بزمی صاحب نہیں تھے جاوید صاحب تھے۔'' نثار نے بڑی حیرت سے جواب دیا۔

''جی جی وہی، ان کا پورا نام جاوید بزمی ہے......''

''جاوید بزمی!'' نثار نے زیرلب اپنے آپ سے کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ دانیا ہیں؟''

''جی میں دانیا ہوں، آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''مجھے جاوید نے ہر بات بتائی تھی...... سارے واقعات۔''

''میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ میں ان کے لیے کئی خوش خبریاں لے کر آئی ہوں۔ ان کا یہ ناول (کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) روزنِ دیوار لندن میں شائع ہوا ہے، پورے یورپ اور پاکستان میں اس ناول نے دھوم مچادی ہے، بے حد پسند کیا گیا ہے یہ ناول اور دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ ایک لاکھ ڈالرز کا چیک میں لندن سے لے کر آئی ہوں اور سب سے اچھی خبر بزمی صاحب کے لیے یہ ہوگی کہ ڈیڈی نے میری ہر بات مان لی ہے، میں اور بزمی صاحب بہت جلد ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوجائیں گے۔'' دانیا نے خوش ہوتے ہوئے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ ''میں نے آپ کو اس لیے سب بتایا ہے کہ مجھے احساس ہو رہا ہے یہاں ساتھ رہتے رہتے آپ دونوں دوست بن گئے ہیں۔''

نثار کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ دانیا نے پھر پوچھا۔ ''آپ آخر بتا کیوں نہیں رہے ہیں کہ بزمی صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟''

نثار نے پوری طاقت جمع کرتے ہوئے بڑی مشکل سے بھرائی ہوئی آواز میں ایک جملہ ادا کیا۔ ''جاوید صاحب کی رات میں طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ شاید انہیں ایکسرے وغیرہ کے لیے لے گئے ہیں۔ آپ نرسوں کے کمرے میں جاکر پوچھ لیجیے۔'' دانیا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی نثار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ آہستہ آہستہ خود اپنے آپ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ ''گویا جاوید صاحب اپنی آپ بیتی، اپنی زندگی کی داستان اس لیے سناتے رہے کہ میں بہلا رہوں، مجھے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ تاکہ مجھ میں تکلیفیں برداشت کرنے کا حوصلہ قائم رہے۔ انہوں نے مجھے زندگی کی خوشیاں دیں اور میں نے اس صلے میں خود ان کی زندگی چھین لی۔ میں نے اپنے سب سے بڑے محسن ہی کو نہیں ایک نہایت شریف، اچھے، ایک بڑے ادیب، ایک عظیم ناول نگار کو مار ڈالا۔ مجھ ایسے لالچی انسان کو جس نے پہلے اپنے بڑے بھائی کا خون کیا اور کل رات ایک بڑے انسان کو قتل کر دیا...... مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔'' نرس دو وارڈ بوائز کے ساتھ داخل ہوئی۔

''آپ جاگ گئے۔ ارے یہ آپ رو کیوں رہے ہیں۔'' وہ سمجھی شاید میں غم زدہ ہوں لہٰذا بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''صبر کیجیے نثار صاحب، اللہ کی یہی مرضی تھی...... صبر کیجیے۔''

''نہیں سسٹر۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے جاوید صاحب کو مار دیا......''

''اتنے دن جاوید صاحب کے ساتھ رہتے رہتے یقیناً ان کی موت کا آپ نے بہت اثر لیا ہے۔ صبر کیجیے۔''

نرس نے یہ کہتے ہوئے وارڈ بوائز کی مدد کے ساتھ نثار کا بیڈ کھڑکی کے سامنے کر دیا۔ نثار کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ نرس نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

''لیجیے میں نے کھڑکی بھی کھول دی، آپ بار بار یہی کہتے تھے نا۔'' نثار نے آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے سکتہ سا ہوگیا۔ ''یہ دیوار...... اور وہ منظر، حسین منظر، وہ گھر......'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔ نرس نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔ ''جی یہ سامنے بہت اونچی اور لمبی سی دیوار لڑکوں کے ہاسٹل کی پچھلی دیوار ہے......'' نثار پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوار دیکھ رہا تھا۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

اسپتال سے باہر سڑک پر ایمبولینس میں جاوید کی میت رکھی جا چکی تھی۔ اس ایمبولینس کے آگے کھڑی ہوئی مرسڈیز کار کی طرف دانیا کو کئی نرسیں اور ان کی ملازمہ سہارا دے کر لے جا رہی تھیں۔ دانیا کے جسم کی ساری طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی اور وہ کہتی جا رہی تھی...... ''میں تو دنیا کی ساری خوشیاں آپ کے دامن میں ڈالنے آئی تھی۔ آپ نے دامن ہی سمیٹ لیا۔ کچھ گھنٹے اور انتظار کر لیتے۔ ہم دونوں کو وہ سب مل جاتا جس کی ہمیں ضرورت تھی، جس کی ہم دونوں کو خواہش تھی......'' تھوڑی دیر بعد کار اور ایمبولینس روانہ ہوگئیں۔ سڑک پر کھڑا ہوا مجمع، نرسیں، اسپتال کے ڈاکٹر اور دوسرا عملہ سب دم بخود اس قافلے کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ ایمبولینس کی تیز رفتار سے پیدا ہونے والی گرد نے فضا کو اور بھی سوگوار بنا دیا تھا۔

دولت کا رشتہ

ابوالمنصور

رشتوں کا بیوپار کرنے والے اکثر بھول جاتے ہیں کہ خود ان کا بھی کسی سے کوئی رشتہ ہے... مگر سفاکی اور عجلت ان باریکیوں کو سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی... اور جب انہیں یہ بات سمجھ آتی ہے تو اس وقت زندگی عجلت کا شکار موت کی جانب محو سفر ہوتی ہے۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے کے مصداق بالخصوص جرائم کی دنیا ان ہی اذیتوں کا شکار مگر... پھر بھی رواں دواں ہے۔

گھر کے بھیدی کی سفاکانہ کارروائیوں کا دلخراش ماجرا

نوجوان کچھ خوفزدہ سا تھا۔

''بیٹھو۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا مجھے دیر ہوگئی۔'' اس نے کہا۔ ''راستے میں ٹریفک جام ہوگئی تھی۔''

''بیٹھو'' میں نے دوبارہ کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ پائی جاتی تھی۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور پہلے ہی کش کے بعد کھانسنے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس سوال پر وہ قدرے متعجب ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا نظر آنے لگا۔

’’میرا نام فلائیڈ ٹالمن ہے۔ کیا مسٹر گرینڈ نے تم سے میرے بارے میں بات نہیں کی؟‘‘ اس نے مدھم آواز میں کہا اور کچھ اس انداز میں دائیں بائیں دیکھنے لگا گویا کسی غلط جگہ پر آگیا ہو۔

لیکن وہ بالکل ٹھیک جگہ پر آیا تھا۔ مجھے اس کا نام معلوم تھا‘ لیکن میں تسلی کرنا چاہتا تھا۔ میرے کام میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ کیونکہ ان باتوں کو نظرانداز کرنے سے کسی وقت بھی مصیبت نازل ہوسکتی تھی۔

’’تمہارے بال بہت لمبے ہیں فلائیڈ۔‘‘ میں نے سرسری طور پر کہا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ’’لمبے بالوں میں کیا برائی ہے؟‘‘ اب اس کی گھبراہٹ دور ہوچکی تھی اور چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔

’’کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو بہت زیادہ نمایاں کردیتی ہیں۔‘‘ میں نے وضاحت کی۔ ’’مثلاً تمہارے بال۔! لمبے بالوں کی وجہ سے تم بالکل منفرد نظر آتے ہو۔ تمہارا حلیہ ایسا ہونا چاہیے جو تمہیں عوام کے ہجوم میں گم کردے اور کوئی شخص ایک دفعہ دیکھنے کے بعد یاد نہ رکھ سکے۔‘‘

’’بات تو ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

’’میں آج ہی بال کٹوالوں گا۔‘‘

’’آج شام سے پہلے پہلے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

اس نے ٹیسٹ پاس کرلیا تھا اور کام کے لیے بالکل موزوں تھا۔ تاہم اس جیسے نوجوان کے ساتھ کام کرنے میں ایک قباحت تھی۔ یہ لوگ بہت جلد طیش میں آجاتے ہیں اور بعض اوقات خوامخواہ ہی موت کے منہ میں کود پڑتے ہیں اور نہ صرف بلکہ اپنے ساتھی کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔

’’کھڑے ہوجاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ ’’کیا میں نے امتحان پاس کرلیا ہے؟‘‘

’’ہاں۔ کیا تمہارا قد چھ فٹ اور وزن ایک سو اسی پونڈ ہے۔‘‘

’’قد ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’لیکن وزن تمہارے اندازے سے دس پونڈ کم ہے۔ میں ہمیشہ اپنے وزن کو مناسب سطح پر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘

دفعتاً میں نے میز پر پڑی ہوئی ایش ٹرے اس کی طرف اچھال دی۔ وہ ایک طرف جھک کر بچ گیا۔ تاہم اس نے ایش ٹرے کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔

’’بہت خوب بہت خوب۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’بیٹھ جاؤ۔‘‘

وہ دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ’’اس حرکت کا کیا مطلب تھا؟‘‘

’’یہ بھی ایک قسم کا ٹیسٹ تھا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’مگر تم نے مناسب چستی کا مظاہرہ نہیں کیا جو ایک خطرناک بات ہے۔ تمہیں فوراً اپنی اس کمزوری کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ورنہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں پھنسا سکتے ہو۔‘‘

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس حرکت سے بہت متاثر ہوا ہے۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھا۔

’’گرینڈ نے میرے بارے میں تمہیں کیا بتایا تھا؟‘‘

’’صرف اتنا بتایا تھا کہ تمہیں ایک ساتھی ...... ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے مزید استفسار کیا تھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔‘‘

’’یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔‘‘ گرینڈ میرا... پرانا دوست اور نہایت قابلِ اعتماد شخص تھا۔ ’’اس سے پہلے تم کیا کرتے رہے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’صرف دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ مارے تھے۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’پہلی مرتبہ گرینڈ کے ساتھ مل کر ایک شراب خانہ لوٹا تھا اور دوسری مرتبہ فریڈ الیگزینڈر کے ساتھ ایک بینک پر ڈاکا ڈالا تھا۔‘‘

میں نے سرہلاتے ہوئے الیگزینڈر کے بارے میں سوچا، وہ اچھا آدمی تھا اور وہ دو مرتبہ میرے ساتھ بھی کام کرچکا تھا۔

’’بینک کون سا تھا؟‘‘

اس نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ’’نام نہیں بتا سکتا۔ یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔‘‘

یہ بات مجھے پسند آئی۔ گویا وہ نہایت محتاط آدمی تھا اور بلاضرورت اپنا منہ نہیں کھولتا تھا۔

’’بہت خوب۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے جو شخص میرے پاس تھا وہ سات سال سے میرے ساتھ کام کررہا تھا۔ بہت ہوشیار آدمی تھا۔ بہترین ڈرائیور اور بہترین نشانہ باز تھا۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی کمزوری تھی اور یہی کمزوری اس کی موت کا باعث بن گئی۔

اسے کہیں سے ایک خوبصورت لڑکی مل گئی جسے اس نے گھر میں رکھ لیا۔ اس لڑکی نے دوسرے کے سامنے باتیں کرنا شروع کردیں۔ بہت زیادہ باتیں ...... نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے ایک روز ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کردی۔ اس نے اپنی محبوبہ کا بدلہ لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور خود بھی قتل ہوگیا۔‘‘

فلائیڈ کے چہرے پر افسردگی چھاگئی۔ ’’کیا وہ پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا تھا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ’’میرے ہاتھوں سے۔‘‘ فلائیڈ کی افسردگی ایک دم دور ہوگئی۔

’’ایک بات واضح کردوں کہ چوری میرا پیشہ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’چوری کے ذریعے میں خاصی بڑی رقم کمالیتا ہوں۔ میرے پاس کالج کی ڈگری بھی ہے۔ بلکہ دو ڈگریاں ہیں۔ لیکن ان کی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں۔ مجھے دولت کی ضرورت ہے اور میں پوری شان و شوکت سے رہتا ہوں۔ لیکن میں ایک بات کبھی نہیں بھولتا اور تم بھی یہ بات نہ بھولنا۔ میں نے خود کو کبھی سوسائٹی کا فرد خیال نہیں کیا۔ میں ایک رد کیا ہوا آدمی ہوں۔ سوسائٹی میرا کوئی حصہ نہیں ...... میرے پاس جو کچھ ہے میں اس پر مطمئن ہوں۔‘‘

اس نے ہلکی سی چھینک ماری اور کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ میں تمہارا مدعا سمجھ گیا۔‘‘

’’اچھا......!‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔ ’’ابھی نہیں میرے دوست یہ بات سمجھنے کے لیے بہت عرصہ چاہیے۔ یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ بشرطیکہ تم زندہ رہے۔ ایک مجرم یا تو جیل سے باہر رہتا ہے یا اندر۔ ایک پیشہ ور مجرم ہمیشہ باہر رہتا ہے اور اس مقصد کی خاطر اسے زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔‘‘

’’اور اس کے کچھ اصول بھی ہوں گے؟‘‘ فلائیڈ نے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں سے دور رہو۔ کوئی ایسی عادت نہ ڈالو جس سے تمہارا پتا چلانا آسان ہوجائے۔ کبھی ایک ہی ہوٹل میں کھانا نہ کھاؤ۔ ایک ہی سینما ہال میں فلم دیکھنے نہ جاؤ۔ ایک ہی قسم کی چیز استعمال نہ کرو۔ بات بہت سیدھی سی ہے لیکن بہت اہم ہے۔ عادت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو محسوس نہیں ہوتی لیکن پیچھے اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے۔‘‘

’’پولیس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’پولیس میں ہوشیار آدمی بھی ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’کچھ لوگ صحیح معنوں میں جینئس ہوتے ہیں۔ پولیس کے پاس کتے بھی ہوتے ہیں جو مجرم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ پولیس کے مقابلے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کسی شخص کو قتل نہیں کرو۔ خصوصاً پولیس کے آدمی پر گولی نہیں چلاؤ۔ ورنہ وہ قبر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔‘‘

کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوجوان ذہین اور پُراعتماد تھا۔

’’گرینڈ نے بتایا تھا کہ تم نے ایک منصوبہ بنایا ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’شہر کا ایک وکیل سوٹ کیس میں پچیس ہزار ڈالرز لے کر جانے والا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کب یہ پیسے لے کر نکلے گا اور کس راستے سے جائے گا۔‘‘

’’وہ یہ پیسے لے کر کہاں جائے گا؟‘‘

’’ایک مضافاتی فارم میں اس کے ایک مؤکل نے کسی فوری ضرورت کے تحت منگوائے ہیں۔ وہ خاصا امیر آدمی ہے لیکن دیانتدار نہیں۔‘‘

’’کیا تمہیں نوٹوں کی تفصیل معلوم ہے؟‘‘

’’نہیں۔ لیکن مجھے سوٹ کیس کا سائز معلوم ہے۔ تقریباً اتنا بڑا ہے۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس کا سائز بتایا۔

’’خاصا پُرکشش معاملہ ہے۔‘‘ میں نے تبصرہ کیا۔

’’کیا ہم ایک دوسرے کے پارٹنر بن چکے ہیں؟‘‘ اس نے پوچھا لیکن میں نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

’’اور یہ وکیل کب پیسے لے کر جانے والا ہے؟‘‘

’’کل صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان۔‘‘

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟‘‘

’’میں یہ بات بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’وقت آنے پر تمہیں خود پتا چل جائے گا؟‘‘

’’او۔ کے۔‘‘ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے پاس تمہارا فون نمبر ہے۔ میں چھ بجے تمہیں فون کروں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘

"اس وقت تم کہاں جارہے ہو؟"

"بال کٹوانے۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے گرینڈ کو فون کیا۔

"لڑکا تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔" رابطہ ملنے کے بعد میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے چل جائے گا۔"

"ضرور چل جائے گا۔" گرینڈ نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ یہ لڑکا کارآمد ثابت ہوگا۔ نہایت ٹھنڈے مزاج کا اور تجربہ کار شخص ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ملاقات پر تفصیلی باتیں ہوں گی۔"

"ضرور لیکن ذرا محتاط قدم اٹھانا۔"

پھر گرینڈ نے مجھے فلائیڈ کا ایڈریس بتانے کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔

فلائیڈ کی رہائش شہر کے خستہ و خراب علاقے میں تھی۔ چند ایک کے سوا تمام عمارتیں پرانی اور کہنہ سال تھیں۔ اس علاقے کی گلیاں گندی اور جابجا اکھڑی پڑی تھیں۔ بعض جگہوں پر گٹر کا پانی جمع تھا۔ جہاں خودرو گھاس اگ آئی تھی ......تھوڑی سی تلاش کے بعد میں مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت تھی جس میں چھوٹے چھوٹے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں بنے ہوئے صحن میں جہاں کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی فولڈنگ کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا اور پوچھا۔

"کیوں جناب۔ کیا آپ فلائیڈ ٹالمن کا فلیٹ بتا سکیں گے؟"

بوڑھے نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا اور جواب دیا۔

"پچھلی طرف فلیٹ بی میں رہتا ہے لیکن اس وقت وہ گھر میں نہیں ہوگا۔"

"کیا آپ فلائیڈ کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"بڑا اچھا لڑکا ہے۔ بالکل خاموش طبیعت۔ آج کل کے رنگین مزاج چھوکروں سے بالکل مختلف ہے۔ بلکہ وہ ان سے دوستی کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے فلیٹ سے کبھی موسیقی کا شور سنائی نہیں دیا۔"

"ہاں، فلائیڈ نہایت سنجیدہ نوجوان ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

پھر میں عمارت کے پچھلے حصے میں فلیٹ بی کے سامنے پہنچ گیا۔ سامنے کا دروازہ مقفل تھا۔ داہنی طرف ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ البتہ اس پر جالی لگی تھی، میں نے کھڑکی پر نگاہ دوڑائی۔ کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے جالی کے کنارے پر لگی ہوئی پٹی اکھیڑ کر راستہ بنایا اور اندر داخل ہوگیا۔

فلیٹ بالکل مختصر تھا۔ ایک ڈرائنگ روم، ایک چھوٹی سی خواب گاہ اور باورچی خانہ۔ ڈرائنگ روم میں سستے قسم کا فرنیچر نظر آرہا تھا۔ ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ فلیٹ کے اندر کوئی کتاب۔ آٹوگراف بک یا گراموفون ریکارڈ وغیرہ موجود نہیں تھے۔ کوئی فوٹو البم بھی نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔

مجھے میکس سنائیڈر کی گرفتاری کا حال خوب یاد تھا۔ وہ بڑا ماہر چور تھا لیکن کتابوں کی وجہ سے پکڑا گیا۔ وہ جرائم کی کتابیں پڑھتا تھا اور ہمیشہ ایک ہی اسٹور سے کتابیں خریدتا تھا۔ ہر کتاب کے اوپر اسٹور کی مہر لگی ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ ایک جرم کے سلسلے میں پولیس نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی جہاں سے انہیں ایک ہی اسٹور سے خریدی ہوئی تقریباً تیس کتابیں ملیں۔ گو میکس روپوش ہوگیا تھا۔ لیکن پولیس نے اس کی تلاش میں زیادہ تگ و دو نہیں کی۔ صرف مذکورہ اسٹور میں دو آدمی بٹھا دیے۔ چند روز کے بعد میکس وہاں کتاب خریدنے آیا اور پکڑا گیا۔

یہ بات خوش کن تھی کہ فلائیڈ اس قسم کی کسی عادت میں مبتلا نہیں تھا، نہ ہی اس کا کوئی گہرا دوست تھا۔ اس کے سامان میں کوئی خط، تصویر یا ذاتی قسم کی کوئی اشیا نہیں تھیں۔ اس کی الماری میں تھوڑے سے کپڑے تھے لیکن کسی پر لانڈری کا نشان یا لیبل وغیرہ نہیں تھا۔ گویا وہ نہایت محتاط شخص تھا۔

میز کی نچلی دراز میں مجھے ریوالور پڑا ہوا ملا۔ وہ بالکل نیا تھا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے ریوالور واپس رکھ دیا اور کھڑکی کے راستے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

"وہ ...... وہ سامنے والی کار ہے۔" فلائیڈ نے ایک کیڈلاک کار کی طرف اشارہ کیا اور جلدی سے اپنی کار اسٹارٹ کرکے ٹریفک کے ہجوم میں اس کے پیچھے لگ گیا ...... میں خاموشی سے کار کی طرف دیکھنے لگا۔

صبح خوشگوار تھی۔ چاروں طرف چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ جن میں بے شمار سیاح بھی تھے۔ فلائیڈ بڑا اچھا ڈرائیور تھا

اور بڑی عمدگی سے کیڈلاک کا تعاقب کررہا تھا۔ اب اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور میرے بالوں سے بھی چھوٹے تھے۔ وہ خاصا فاصلہ چھوڑ کر تعاقب کررہا تھا۔ ہمارے درمیان چار پانچ گاڑیاں تھیں۔

کچھ دور جانے کے بعد کیڈلاک شہر سے باہر جانے والی شاہراہ پر مڑ گئی۔ ہماری کار خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ لیکن چونکہ فلائیڈ کو کیڈلاک کی منزل معلوم تھی اس لیے وہ زیادہ فکرمند نہیں تھا۔ شہر سے چند میل دور پہنچ کر سڑک بالکل ویران ہوگئی۔ فلائیڈ نے ایکدم رفتار بڑھادی اور فی الفور اپنی کار کیڈلاک کے بالکل برابر لے آیا۔ اس اثنا میں اس نے اپنے چہرے پر نقاب بھی چڑھالیا تھا۔ چند قدم آگے ایک تنگ موڑ تھا جہاں پہنچ کر فلائیڈ نے اپنی کار کو ٹیڑھا کرکے کھڑا کردیا۔

کیڈلاک والے شخص نے جلدی سے بریک لگا کر کار روک دی اور مکا ہلاتا ہوا بولا۔ "کیا تماشا کررہے ہو۔ گاڑی ہٹاؤ آگے سے۔"

پھر جیسے ہی اس کی نظر ہمارے چہروں پر پڑے ہوئے نقابوں پر پڑی وہ چپ ہوگیا۔ میں جلدی سے دروازہ کھول کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔

"جلدی سے پیسے میرے حوالے کردو۔" میں نے پستول ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک دم دہشت طاری ہوگئی۔

"کک ...... کیا؟"

"جلدی۔ وہ سوٹ کیس مجھے دے دو۔"

اس اثنا میں فلائیڈ دوسری کھڑکی کے سامنے پہنچ چکا تھا اور وکیل کے سر کا نشانہ باندھے کھڑا تھا۔ وکیل نے قدرے تامل کے بعد سوٹ کیس میرے حوالے کیا ...... سوٹ کیس لیتے ہی میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر جیسے ہی میں نے کار کا دروازہ کھولا میرے کانوں میں فائر کی آواز آئی یکے بعد دیگرے چار فائر کیے گئے تھے۔

وکیل مرچکا تھا اور فلائیڈ بھاگتا ہوا کار کی طرف آرہا تھا۔

"او پاگل کے بچے! یہ تم نے کیا کیا؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور تیزی سے کار آگے بڑھادی۔ دس منٹ کے بعد ہم دونوں ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ فلائیڈ نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اسے قتل کیوں کیا؟"

"وہ مجھے جانتا تھا۔"

"کیا ...... کون تھا وہ؟"

"میرا باپ۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جس نے میری کبھی پروا نہیں کی۔ وہ شراب کے نشے میں مجھے مارتا تھا اور ہوش میں مجھے بالکل نظرانداز کردیتا تھا۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"نہیں، یہ بہت اچھا ہوا۔ اب کوئی شخص ایسا نہیں رہا ہو مجھے جانتا ہو۔"

مجھے یہ جواب بہت پسند آیا۔ اس کا انداز فکر بالکل میرے جیسا تھا اور یہ نوجوان حوصلہ مند بھی تھا۔ چند دنوں کے بعد یقیناً یہ پچاس فیصدی سے زیادہ حصہ طلب کرے گا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پائی جاتی تھی۔ میں نے اپنا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر سائیلنسر لگے ہوئے پستول کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلیا۔

"مبارک ہو۔ آج سے تم میرے نئے پارٹنر ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن افسوس ہے کہ یہ پارٹنر شپ بہت مختصر ثابت ہورہی ہے۔"

یہ سن کر اس کے ماتھے پر ایک دم شکنیں ابھر آئیں اور ہاتھ جیب کی طرف بڑھا لیکن میں نے فی الفور اپنا پستول باہر نکال لیا اور کہا۔ "نہیں میرے دوست! تم اتنی چستی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے اپنے ہاتھ اوپر کرلو۔ ابھی ایک آدمی اور ہے جو تمہیں جانتا ہے۔"

"لیکن ...... ہم تو ایک دوسرے کے پارٹنر بن چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تم نے اپنے باپ کو قتل کرکے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میری حیثیت تمہارے باپ سے زیادہ تو نہیں ہوسکتی۔ تمہارے پستول کا رخ میری طرف بھی ہوسکتا ہے۔"

اچانک اس نے جھپٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے ٹرائیگر دبادیا اور وہ فرش پر لڑھک گیا۔ پھر میں گرینڈ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یقیناً وہ منصوبے کی کامیابی اور اپنے حصے کے لیے متفکر ہوگا۔ میں نے اپنے پارٹنر کے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کیا۔

محفلِ شعر و سخن

❄ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی......خوشاب
تکلف کی حدوں کو خود گرا کر اب وہ کہتا ہے
تیرا بے باک سا لہجہ مجھے اچھا نہیں لگتا

❄ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح
ڈوب جائے گا جس روز یہ خورشیدِ انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

❄ نوید انجم بٹ گہیاں......گجرات
ان رتجگوں کا آخر کب تک عذاب دیکھیں
ہم کو بھی نیند آئے ہم بھی خواب دیکھیں

❄ عرفان سیال.بی......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا، میرا مجبور ہو جانا

❄ عمران حیدر بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہم ہی وفا شکن تھے چلو ہم ہی بے وفا
تم تو وفا شناس تھے تم کیوں بدل گئے

❄ بابر عباس، مسز بابر عباس.....کھاریاں
جو مجھے کہہ رہے ہیں دیوانہ
وہ تعصب کی رو پہ بہتے ہیں
میں وہی ہوں جو میں سمجھتا ہوں
وہ نہیں ہوں جو لوگ کہتے ہیں

❄ رائے نعیم احمد بھٹی......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

❄ تفسیر عباس بابر.....اوکاڑہ
خوابوں کے کچھ سفینے ساحل تلک نہ پہنچے
بے سمت کارواں تھے منزل تلک نہ پہنچے
اک ہم کہ عمر بھر کی چاہت کے باوجود
تیرے در تلک تو پہنچے تیرے دل تلک نہ پہنچے

❄ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
یار کا ملنا ہے ارمانوں کی عید
شمع کا جلنا ہے پروانوں کی عید

❄ کنول زریں......گلبرگ، لاہور
ورق ورق پر تیری عبادت تیرا فسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تری محبت کا باب نکلا

❄ عون عباس بابر......اوکاڑہ
خشک آنکھوں سے جل نکال لیتے ہیں
گفتگو کے لیے ایک دو پل نکال لیتے ہیں
میرا مسئلہ محبت ہے اور تیرا مسئلہ انا
کبھی ملتے ہیں کوئی حل نکال لیتے ہیں

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

❄ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
اور آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل!

❄ احمد حسن عرضی......قبولہ شریف
مجھ سے کہتی ہے سدا تیرے پاس رہوں گی فراز
دیکھ کتنا پیار کرتی ہے مجھ سے میری اداسی

❄ حسنین عباس بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
میرے احساس سے تیری خوشبو نہیں جاتی
لاکھ چاہا دل سے مگر تیری آرزو نہیں جاتی
کیسے سمجھاؤں دل کو مسافتوں کی بات
کہ تجھ سے ملنے کی جستجو نہیں جاتی

❄ مظہر علی خان......مسلم ٹاؤن، کوٹری
بے سمت نہ چل اتنا، منزل ہی بدل جائے
آوارگی کر اتنی، دل جس سے بہل جائے

❄ بلقیس خان.....واہ کینٹ
ہم اپنی وضع کے بندے ہیں، ہم اپنی طرز کے انساں ہیں
جو زیست مرا سرمایا تھی وہ زیست بھی تجھ پہ واری ہے

❄ عدنان ساحل......سرگودھا
تم کیا جانو پیار کے کھیل میں جان کے ہم کیوں ہار گئے
جانتے تھے ہم جیت ملے گی دل کی ساری ماتوں میں

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
جس جس کو ملی خبر اسی نے گلہ کیا
کیوں کی تم نے محبت؟ تم تو سمجھدار تھے

❄ محمد طلحہٰ......کوئٹہ
اک میری جان ہے کہ لبوں تک آ پہنچی
اک تو ہے کہ ابھی "اگر مگر" پہ ہے

❄ امداد علی......نوشہرہ
میں نہ کہتا تھا! وقت ظالم ہے
دیکھ لو! خواب ہو گئے تم بھی

❄ زرمین اعجاز......نواب شاہ
دل روز سجاتا ہوں میں دلہن کی طرح
غم روز چلے آتے ہیں بارات کی مانند

❄ حسنین عباس، کمیل عباس.....کھاریاں
یونہی مشقِ تصورات سہی، شوق کو آزما کے دیکھوں گا
بند کر لوں گا اپنی آنکھوں کو، تجھ کو تجھ سے چھپا کے دیکھوں گا

❄ محمد شہیر اسامہ سیال......سکھر
ذرا سی دیر میں دل میں اترنے والے لوگ
ذرا سی دیر میں دل سے اتر بھی جاتے ہیں

❄ صوبیہ تفسیر.....اوکاڑہ
ثابت ہوا کہ تجھ کو محبت نہیں رہی
لیکن ہمیں بھی کوئی شکایت نہیں رہی

❄ ڈاکٹر وسیم خالد گہیاں...... گجرات
ہر اک روپ میرے واسطے ہے بے معنی
کہ بس چکا ہے میری آنکھ میں جمال اس کا

❄ شوکت علی......گلبرگ، لاہور
غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کہ اس کا محبت نام ہو جائے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
شاید اسے عزیز تھیں آنکھیں میری بہت
وہ میرے نام اپنی بصارت بھی کر گیا

❄ لائبہ علی......کراچی
پھر پلٹ آئی ہیں ساون کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں جلنے کے زمانے آئے

❄ میرو شاہ......لاہور
یہ تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے

❄ امتیاز علی......سرگودھا
میں نے اس واسطے دروازہ کھلا رکھا ہے
کوئی آئے گا مجھے عید مبارک کہنے

❄ دین محمد......گوادر
مجھے ضرور کوئی چاہتوں سے دیکھے گا
مگر وہ آنکھیں تمہاری کہاں سے لائے گا

❄ محمد یونس چوہدری......سلطان پورہ، لاہور
دعا ہے آپ دیکھیں زندگی میں بے شمار عیدیں
خوشی سے رقص کرتی، مسکراتی، پر بہار عیدیں

❄ ارشد عباس.....حافظ آباد
وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ تو پھول کا ہے وہ کدھر جائے گا

❄ پرویز شاہ......آزاد کشمیر
لوگ عجب ہیں رسوائی کے قصے بھی دہراتے ہیں
دل کا سکوں بھی ڈھونڈتے ہیں وہ جذبوں کی تشہیر میں

❄ بشیر احمد بھٹی......بہاولپور
مسلسل خامشی یوں بھی تو ہم کو مار ڈالے گی
تو پھر اب خوف کیسا ہے چلو انکار کرتے ہیں

❄ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
اپنی رہ مسدود کر دے گا یہی بڑھتا ہجوم
یہ نہ سوچا ہر کسی کو راستہ دیتے ہوئے

❄ عاقب اقبال جسپال......سالم
جسے یہ ضد تھی محبت میں فاصلہ نہ رہے
وہ کہہ رہا ہے کہ ایفاء صلہ ضروری ہے

❄ محمد لطیف ساحل......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں

❄ سجاد علی ترگوی......عیسیٰ خیل، میانوالی
اک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے لوگوں کو خفا سوچ کے کرنا

❄ سبحان احمد......اٹک
سوچتا ہوں وہ مری اپنی ہی تصویر نہ ہو
میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں تری تصویروں میں

❄ ملک آصف نعیم......پھلوال
لگا کے آگ شہر کو یہ بادشاہ نے کہا
اٹھا ہے دل میں تماشے کا آج شوق بہت

❄ راجا افتخار علی افتی......چوآسیدن شاہ
یاد رہے گا یہ دورِ حیات بھی ہم کو
کہ ترستے تھے زندگی میں زندگی کے لیے

❄ پلوشہ......پشاور
آج پھر رات نے چھیڑا ہے غمِ یار کا قصہ
کچھ کرو یارو مجھے آج بھی نیند نہیں آئے گی

❄ اختر شاہ عارف......ڈھوک جمعہ، جہلم
محبت کی تمنا ہے تو پھر وہ وصف پیدا کر
جہاں سے عشق چلتا ہے وہاں تک نام پیدا کر

❄ محمد طاہر......لاہور
دل سوزِ غمِ ہجر سے جو گھبرائے بہت ہے
ساون کا مجھے ابر بھی ترسائے بہت ہے

❄ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
اک عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
وہ کون شخص تھا جسے دیکھا تھا خواب میں

❄ رئیس احمد......چارسدہ
مجھ سے ہر چند بہت پیار کیا جاتا ہے
پر مرے ہونے سے انکار کیا جاتا ہے

❄ مہناز قریشی......گوجرانوالہ
ناؤ بن جائے کوئی شور مچاتی ہوئی لہر
کیا خبر ڈوبنے والوں کو کنارہ مل جائے

❄ محمد بشارت......کنگر دودرہ
دل کے زخم کا رنگ تو شاید آنکھوں میں بھر آئے
روح کے زخموں کی گہرائی کیسے دکھائیں تمہیں

❄ حکیم سید محمد رضا شاہ......میانوالی
لکھا جائے گا یہ تاریخ کی پیشانی پر
عہدِ تاریک کی کس کس نے حمایت کی تھی

❄ عرفان احمد عاجز......آڑہ چوا
بھولوں اسے میں مجھ میں بھلا یہ سکت کہاں
بھولا تو وہ ہے جو مجھے ویران کر گیا

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
نشانی اس کی اپنے پاس جو بھی تھی مٹا ڈالی
مگر اک یاد ہے اس کی جواب تک پاس رکھتے ہیں

❄ شہلا قریشی......ماڈل ٹاؤن، لاہور
مانا اب اظہار محبت کرنا بھی آسان نہیں ہے
لیکن اے فرقت کے مارے آخر یہ خاموشی کب تک

کوپن
برائے شمارہ
اکتوبر 2012

محفل شعر و سخن

نام : --

پتا : --

وہ اختتام مئی کی ایک گرم رات تھی۔ دوپہر تک حبس کی سی کیفیت رہی تھی اور پھر گرم ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ نک ویلوٹ نے ہوا کے رخ اور فائر بریگیڈ کی عمارت کے فاصلے کو مدِنظر رکھ کر خشک گھاس میں آگ لگائی تھی، شعلے تیزی سے اس کی جانب لپک رہے تھے۔ وہ ایک جست لگا کر ٹوٹے پھوٹے فارم ہاؤس سے پیچھے ہٹ گیا۔ لکڑی سے بنے ہوئے اس شیڈ کی دیواروں نے آگ پکڑ لی تھی۔ نک کو یقین تھا کہ شعلے کئی سمتوں میں دور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ویسے بھی دریا کنارے دور دور تک کسی قسم کی کوئی عمارت بنی ہوئی نہیں تھی۔ علاوہ فائر بریگیڈ کی عمارت کے جو اس فارم ہاؤس سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھی۔

نک ویلوٹ نے عافیت اسی میں جانی کہ فارم ہاؤس سے دور چلا جائے۔ لہٰذا وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اس جانب چل دیا جہاں اس نے اپنی...... کار کھڑی کی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور درختوں کے ایک جھنڈ میں لے جا کر کھڑی کر دی۔ پھر وہ دوڑتا ہوا کھیل کے میدان میں داخل ہو گیا جس کے اختتام پر فائر بریگیڈ کی عمارت تھی۔ وہ میدان کے وسط میں پہنچا ہی تھا کہ عمارت کا گیٹ کھلا اور آگ بجھانے

محض ذاتی مفاد کی خاطر گھروں کو آگ لگانے والوں کا قصہ

ہلمٹ کی چوری

بابر نعیم

چوری کرنا ایک تو ویسے ہی بری بات... اور اس پر اسے کاروبار بھی بنا لیا جائے تو "کریلے اور نیم" کی بھرپور عکاسی محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال... یہ تو نک ویلوٹ کی ہی ادا ہے کہ وہ اتنے خطرناک کام کو پیشہ بنائے ہوئے ہے... اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "چوری چاہے لاکھ کی ہو یا خاک کی" چوری ہی کہلاتی ہے... اس بار نک ویلوٹ نے ہلمٹ کی چوری کی تو کچھ عجیب سا لگا مگر... حالات کی سنسنی خیزی نے واقعات کو طول دیا اور بالآخر اس چوری نے ایک دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیا۔ یہ اور بات کہ اس بار وہ قانون کے شکنجے میں بری طرح پھنس گیا... اور ایسے میں اسے اپنے شیطانی دماغ کو استعمال کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ ادھر شکنجہ کھلا ادھر وہ باہر۔ بس یہی اس کا کمال تھا۔

والا انجن شور مچاتا ہوا باہر نکلا۔ آگ زیادہ بڑھی نہیں تھی۔ لیکن آگ بجھانے والے عملے کو آدھے گھنٹے تک مصروف رکھنے کے لیے کافی تھی۔ نک کو اتنا ہی وقت درکار تھا کہ وہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔

نک ویلوٹ عمارت کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک چھوٹی سی سفید بلی نے اس کا استقبال کیا۔ وہ دائیں طرف کی دیوار کی جانب بڑھ گیا جس پر کئی ایک آہنی لاکرز لگے ہوئے تھے۔ پہلے تین لاکرز خالی تھے لیکن چوتھے لاکر میں وہ چیز موجود تھی جس کی تلاش میں نک یہاں آیا تھا۔ اس نے لاکر میں رکھے ہوئے سیاہ ہیلمٹ کا جائزہ لیا جو عموماً آگ بجھانے والے عملے کے افراد گرتے ہوئے ملبے سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پہنتے تھے۔ آگ بجھانے والے اس مرکز کا نمبر چوبیس تھا اور اس لحاظ سے ہیلمٹ پر چوبیس نمبر اور قصبہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ نک کو معلوم تھا کہ ڈیوٹی پر موجود فائر مین عموماً انجن پر اپنے ہیلمٹ چھوڑ دیا کرتے تھے تاکہ عجلت میں وہ انہیں بھول نہ جائیں۔

اس کے باوجود نک نے جوا کھیلنے کا فیصلہ محض اس امید پر کرلیا تھا کہ ممکن ہے دن کی شفٹ کے فائر مین اپنے ہیلمٹ لاکر میں بند کر گئے ہوں۔ نک نے ہیلمٹ بغل میں دبایا اور دوڑتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا رخ کھیل کے میدان کی طرف تھا جس کے اختتام پر درختوں کے جھنڈ میں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے بائیں طرف فارم ہاؤس کی طرف دیکھا جہاں فائر مین فلیش کی تیز روشنی میں آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ نک نے ہیلمٹ پچھلی سیٹ پر اچھال دیا اور کار اسٹارٹ کر کے کچی سڑک پر آگیا۔ پانچ منٹ بعد اس کی کار بڑی شاہراہ پر شہر کی جانب رواں دواں تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ شہر کی حدود میں داخل ہوگیا۔ اب اس کا رخ ایک سپر مارکیٹ کے پارکنگ پلاٹ کی طرف تھا جہاں اس نے اپنے گاہک سے ملاقات کا وقت طے کیا کر رکھا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے دس منٹ قبل ہی وہاں پہنچ گیا لیکن رافنز اپنی کار لیے اس کا انتظار کررہا تھا۔ نک نے دروازہ کھولا اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"یہ لیجیے جناب! آپ کا ہیلمٹ۔" اس نے کہا۔

"اور یہ رہے تمہارے بیس ہزار ڈالرز۔ ایک گھنٹے کے کام کا یہ مناسب ترین معاوضہ ہے۔"

سام رافنز پستہ قد تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمکدار تھیں۔ اس کے چہرے پر ٹوٹی ہوئی ناک بہت بری لگ رہی تھی۔ رافنز کا کام اپنے ہم پیشہ لوگوں کی خامیوں سے فائدہ اٹھانا تھا۔ وہ عموماً چھوٹے بدمعاشوں پر ہاتھ مارتا تھا جو بڑا ہاتھ مارنے کے بعد مال کو سنبھال نہیں پاتے تھے۔ نک اسے برسوں سے جانتا تھا مگر اس نے آج تک اسے کسی کام کے لیے نہیں کہا تھا۔ اب سے دو گھنٹے قبل اس نے فون کر کے نک سے کہا تھا کہ اسے فوری طور پر کسی بھی فائر مین کا ہیلمٹ درکار ہے۔ نک اس سے فیس وغیرہ طے کر کے نزدیک ترین فائر بریگیڈ چوبیس نمبر کی جانب چل دیا تھا تاکہ وہاں سے کسی شخص کا ہیلمٹ چرا سکے۔ اس نے فارم ہاؤس میں آگ لگا کر عملے کو عمارت سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا تھا اور یوں اس نے آسانی سے بیس ہزار ڈالرز حاصل کرلیے تھے۔

"تمہیں آج رات ہیلمٹ کی ضرورت کیسے پڑ گئی؟" نک نے بڑے نوٹ گنتے ہوئے رافنز سے پوچھا۔

"آج رات ہم ایک لمبا ہاتھ مار رہے ہیں۔ اگر تم بھی شامل ہونا چاہو تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔"

"نہیں شکریہ!"

رافنز نے پچھلی نشست پر کمبل کے نیچے ہیلمٹ رکھ دیا اور بولا۔

"آج رات شمالی برونکس کے علاقے میں چند بدمعاش ہیروئن آپس میں تقسیم کرنے والے ہیں۔ دس لاکھ ڈالرز کی یہ کھیپ آج صبح ہی چین سے یہاں پہنچی ہے۔ منشیات کی اسمگلنگ کے لیے ان دنوں جو روٹ استعمال کیا جارہا ہے۔ اس سے تم واقف ہی ہوگے۔ اسمگلر سیاحوں کے بھیس میں ہیروئن لے کر بحری جہازوں پر چڑھ جاتے ہیں اور پورٹو ریکو کے قریب ہیروئن کے پیکٹ سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔

پورٹو ریکو اور مین لینڈ کے درمیان کوئی کسٹم نہیں ہے لہٰذا ان کے پاس کوئی چیز برآمد نہیں ہوتی۔ ہیروئن کا خاص انداز میں بنا ہوا پیکٹ تیرتا ہوا نیویارک پہنچ جاتا ہے اور پھر اسے فروخت کے لیے مختلف لوگوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ گاہکوں تک پہنچتے پہنچتے ہیروئن کی اس کھیپ کی مالیت پچاس لاکھ سے تجاوز کر جائے گی۔"

رافنز ہیروئن کا ذکر اس انداز میں کررہا تھا جیسے اس کی اہمیت سگریٹ یا اشیائے خورونوش سے زیادہ نہ ہو۔

"اور تم وہ مال اڑانے کی فکر میں ہو؟" نک نے پوچھا۔

"ظاہر ہے! شمالی برونکس کے اس فلیٹ کی بیس لڑکیاں ہیروئن کی اس کھیپ کو مختلف حصوں میں تقسیم کررہی ہوں گی۔ لڑکیوں نے غسل کے مختصر سوٹ پہن رکھے ہوں گے تاکہ وہ ہیروئن کی تھوڑی سی مقدار بھی کپڑوں میں چھپا کر نہ لے

جاسکیں۔ انتظام کچھ اس قسم کا کیا گیا ہے کہ کوئی شخص بھی اس فلیٹ میں داخل نہیں ہوسکتا۔"

"اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ تمہیں فائر مین کے ہیلمٹ کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔"

"تم ٹھیک سمجھے۔ ہم اس عمارت کے ہال میں کوڑے کے ڈرم میں تھوڑی سی آگ لگا دیں گے۔ آگ اس انداز میں لگائی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ دھواں پیدا ہو۔ عمارت میں مقیم لوگ خوفزدہ ہوجائیں گے پھر میکس یا کوئی اور شخص فائر مین کا لباس پہن کر اوپر جائے گا اور فلیٹ کے دروازے کو بری طرح دھڑدھڑانے لگے گا۔ وہ سوراخ میں سے میکس کو فائر مین کے لباس میں ملبوس دیکھیں گے اور ممکن ہے گھبرا کر دروازہ کھول دیں۔ ممکن ہے وہ ایک آدھ منٹ ہیروئن کو تھیلوں میں بھرنے میں لگا دیں لیکن دروازہ وہ بہر حال کھول دیں گے۔ یہی وہ سنہری موقع ہوگا جب میں اور میرے ساتھی دندناتے ہوئے فلیٹ میں داخل ہوجائیں گے۔ شمالی برونکس کے علاقے میں اکثر و بیشتر آگ لگنے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں لہٰذا عمارت سے دھواں نکلتے دیکھ کر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

"ہیلمٹ تو تم خود بھی چوری کر سکتے تھے اس طرح تم اپنے ڈالرز بھی بچا سکتے تھے۔" نک نے شانے اچکا کر کہا۔

"لعنت ہے میکس پر!" رافنز نے کہا۔ "اسے فائر مین کے لباس کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور آخری لمحوں میں وہ ہیلمٹ حاصل نہیں کرسکا۔ ربڑ کی برساتی، مخصوص قسم کے جوتے اور کلہاڑی کا انتظام اس نے بہ آسانی کرلیا تھا۔ مگر ہیلمٹ سب سے ضروری چیز ہے اور وہی وہ حاصل نہیں کرسکا۔ ہم لوگوں کا وقت پر وہاں پہنچنا انتہائی ضروری تھا۔ لہٰذا ہمیں تم ایسے تیز اور قابلِ اعتماد آدمی کی ضرورت تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہیروئن کی وہ کھیپ اتنی بڑی ہے کہ ہم تمہاری فیس کے متحمل ہوسکتے ہیں۔"

"اچھا بھئی! تم عیش کرو۔ میں چلتا ہوں۔" نک نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا تم واقعی میں ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم پستول لے کر ہمارے ساتھ موجود رہو اور اس کام کا معاوضہ میں تمہیں پانچ ہزار ڈالرز دوں گا۔ تمہاری موجودگی سے مجھے اطمینان رہے گا۔"

"شکریہ رافنز! میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا کیونکہ یہ میری لائن نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے بھی تم بہت بڑے اور مشہور چور ہو۔"

نک ویلوٹ نے کار اسٹارٹ کی اور لانگ آئی لینڈ میں واقع اپنے گھر کی طرف چل دیا جو اس نے گلوریا کے ساتھ مل کر خریدا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو گلوریا ٹیلی وژن پر ایک جاسوسی فلم دیکھ رہی تھی وہ چھوٹتے ہی بولی۔

"تم کہاں گئے تھے نکی؟"

"ایک ارجنٹ کام آگیا تھا۔" نک نے کہا۔ وہ اب کوئی بات اس سے چھپاتا نہیں تھا۔ اس کی تمام سرگرمیوں کا علم گلوریا کو ہوچکا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے تم کوئی چیز چرانے گئے تھے۔"

نک نے نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ گلوریا کی گود میں پھینک دیا اور بولا۔ "یہ رہے بیس ہزار ڈالرز۔ کل اس رقم کو مختلف بینکوں میں جمع کرا دینا۔"

"تم نے کیا چیز چرائی تھی نکی؟ کیا تمہارا کام آسانی سے ہوگیا تھا؟"

"مجھے کسی فائر مین کا ہیلمٹ چوری کرنا تھا اور میں نے وہ کام بڑی آسانی سے ایک گھنٹے میں انجام دے دیا۔"

نک اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا کیونکہ وہ اس بارے میں مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک چھوٹے فلیٹ میں ہیروئن کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھیں وہ سام رافنز کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس مال پر جھپٹنے والا تھا۔ نک نے اپنا کیریئر معمولی چیزوں کو چرا کر بنایا تھا کیونکہ اس کا ہمیشہ سے یہ نقطہ نظر رہا تھا کہ اس طرح کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس نے آج تک کوئی قیمتی چیز نہیں چرائی تھی لیکن آج رات ہیلمٹ چرانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اس مرتبہ کسی نہ کسی کو ضرور نقصان پہنچے گا کچھ لوگوں کے زخمی ہونے کا بھی احتمال تھا اور وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے صبح اٹھ کر سب سے پہلے اخبارات کا جائزہ لیا۔ ان میں ہیروئن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ ہیروئن تقسیم کرنے والی لڑکیوں کا کوئی ذکر تھا۔ اس نے مختلف اخبارات کے دوپہر.... کے ایڈیشن خریدے مگر ان میں بھی اس قسم کی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔ بالآخر شام کو ٹیلی وژن پر اس نے وہ منحوس خبر تفصیل سے سن لی۔ شمالی برونکس کے علاقے میں فائرنگ کی واردات ہوئی تھی جس میں ایک انیس سالہ خوبصورت لڑکی ہلاک ہوگئی تھی اور کئی دوسری لڑکیاں شدید زخمی ہوئی تھیں۔ پولیس ابھی واردات کے اسباب پر تفتیش کررہی تھی۔ خبر میں ہیروئن کا کوئی ذکر نہیں تھا جس سے نک نے اندازہ لگایا کہ

سام رانفرا اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے فائر بریگیڈ سے ہیلمٹ جمعرات کی رات کو چرایا تھا۔ اس سے اگلے پیر کو وہ اپنی چھوٹی سی خوبصورت کشتی کو سمندر میں اتار رہا تھا کہ ایک دبلا پتلا گنجا شخص اس کی طرف بڑھا۔ اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

''تمہارا نام نک ویلوٹ ہے؟''

نک نے سر سے پیر تک اس کا بہ غور جائزہ لیا۔ پھر خشک لہجے میں بولا۔ ''ہاں میرا نام نک ویلوٹ ہے۔''

''میں سارجنٹ لارنس ہوں۔ میں تم سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سوالات کس سلسلے میں پوچھے جائیں گے؟''

''سوالات کا تعلق ایک قتل سے ہے، اس واردات کی تفتیش میرے سپرد کی گئی ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم فوری طور پر کسی وکیل کا انتظام کرلو تاکہ اس کی موجودگی میں سوالات کیے جاسکیں ویسے اگر تم خاموش رہنا چاہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے کیونکہ یہ تمہارا قانونی حق ہے۔ سوالات کے دوران جو بات بھی کہو گے اسے تمہارے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا سارجنٹ! کیا مجھے گرفتار کیا جارہا ہے؟'' نک نے پوچھا۔

''فی الحال تو تم زیرِ حراست نہیں ہو۔''

نک ویلوٹ کو یہ سب ایک بھیانک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ قتل کا نام سنتے ہی اس نے تصور میں انیس سالہ حسین لڑکی کی لاش دیکھ لی تھی جسے برونکس میں گولی ماردی گئی تھی؟ کیا یہ قتل وہی ہے۔ اس نے سارجنٹ کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا اور جھلّا کر بولا۔

''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم کس قتل کی بات کر رہے ہو؟ میں تو کسی ایسے فرد کو نہیں جانتا جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہو۔''

''تم نے فائر مین ونس آرتھر کا نام تو سن رکھا ہوگا؟''

''تم کس آرتھر کا ذکر کر رہے ہو؟ میں اسے نہیں جانتا۔''

''فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا نک! تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اس واردات کی تفتیش کے سلسلے میں مجھے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور تم اپنے طرزِ عمل سے معاملے کو مزید پیچیدہ بنا رہے ہو۔''

نک نے گلوریا کو پولیس اسٹیشن سے ٹیلی فون کرکے اس صورتِ حال سے مطلع کیا اور کہا کہ وہ اسے حالات سے پوری طرح باخبر رکھے گا پھر وہ سارجنٹ کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں عموماً مجرموں سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ وہاں دو افراد پہلے ہی موجود تھے۔ ایک سیکریٹری دوسرا ایک پولیس افسر تھا۔

''بہتر ہوگا کہ تم شروع سے ہمیں سارا معاملہ بتادو۔''

نک نے کہا۔ ''بخدا مجھے اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''اچھی بات ہے۔'' سارجنٹ نے کہا۔ ''جمعہ کی شام بندرگاہ کے قریب ایک گودام میں آگ لگ گئی تھی۔ ممکن ہے تم نے اس کے بارے میں خبارات میں پڑھا ہو۔''

نک کو وہ خبر یاد آگئی۔ اس نے کہا۔

''آگ بجھاتے ہوئے ایک فائر مین ہلاک ہوگیا تھا۔''

''بالکل۔ میں اسی واردات کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہلاک ہونے والے فائر مین کا نام ونس آرتھر تھا اور وہ دھوئیں کے سبب آکسیجن ماسک لگائے ہوئے تھا۔ آکسیجن کی ٹنکی اس کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی ٹنکیوں میں اتنی ہوا ہوتی ہے کہ انسان تیس منٹ تک سانس لے سکتا ہے۔ آگ بجھاتے ہوئے چونکہ دباؤ شدید ہوتا ہے لہٰذا یہ آکسیجن پندرہ منٹ تک کام دے جاتی ہے۔ ٹنکی پر ایک میٹر اور والو بھی نصب ہوتا ہے جس سے یہ جاننے میں آسانی ہوتی ہے کہ ٹنکی میں کتنی ہوا باقی ہے اور وہ کتنی دیر تک کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ آرتھر جلتے ہوئے گودام میں آگ بجھا رہا تھا کہ اس کی ٹنکی کی ہوا ختم ہوگئی۔ اور وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوگیا۔ ٹنکی کا معائنہ کرنے پر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہوا کی مقدار ظاہر کرنے والے آلے کو ایک جگہ فکس کردیا گیا تھا۔ گویا ٹنکی میں اتنی ہوا نہیں تھی جتنی کہ میٹر سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ ٹنکی کو جان بوجھ کر خالی کیا گیا تھا اور اس میں اتنی ہوا رہنے دی گئی تھی کہ پانچ منٹ تک سانس لیا جاسکے۔''

''تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو سارجنٹ؟ میرے پلے تمہاری ایک بات بھی نہیں پڑی۔'' نک نے کہا۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آرتھر کو جان بوجھ کر ہلاک کیا گیا تھا۔''

''اس بات کو درست مان لیا جائے تو پھر بھی اس کا مجھ سے کیا تعلق؟''

''کوئی شخص فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہوا تھا اور اس نے ہوا کی ٹنکی میں گڑبڑ کردی تھی، ہمیں اس عمارت میں ایک لاکر کے دروازے پر تازہ انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ انگلیوں کے وہ نشانات ہماری فائل میں موجود تمہاری انگلیوں کے نشانات سے مل چکے ہیں۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' نک نے کہا۔

''کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم گزشتہ چند دنوں میں فائر بریگیڈ کی عمارت میں نہیں گئے تھے؟''

''میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے آکسیجن ٹنکی کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تھی۔ ونس آرتھر سے میری کبھی واقفیت نہیں رہی اور اس کی موت سے میرا تعلق نہیں ہے۔''

اب تک سارجنٹ لارنس کا رویہ خوشگوار رہا تھا مگر نک کی اس بات سے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ کڑی نظروں سے نک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر پولیس افسر اور اسٹینوگرافر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میرا خیال ہے تم لوگ باہر انتظار کرو، میں ان سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

نک کو معلوم تھا کہ سارجنٹ کی یہ حرکت اس پر رعب ڈالنے کی ایک کوشش ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کمرے میں کی جانے والی گفتگو ٹیپ کی جارہی ہوگی۔ اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اور چپ چاپ سارجنٹ کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا سارجنٹ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

''تم ایک چور ہو نک ویلوٹ۔ ہمارا شعبہ تم پر برسوں سے نگاہ رکھے ہوئے ہے اور ہم نے تمہارے بارے میں تین انچ موٹی فائل تیار کر رکھی ہے۔ اب تک تمہیں گرفتار اس لیے کیا نہیں جاسکا کہ تم عموماً دوسرے علاقوں میں وارداتیں کرتے ہو اور یہ کہ جو چیزیں تم چراتے ہو ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن مجھے افسوس ہے نک ویلوٹ! کہ تم اس مرتبہ بری طرح پھنس چکے ہو۔''

''اگر میں چور ہونے کا اعتراف کرلوں تو سارجنٹ! اس سے میں قاتل تو ثابت نہیں ہوتا۔''

''ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں تمہاری خدمات کا بھاری معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تمہیں کوئی چیز چرانے کے لیے بھاری رقم دے سکتا ہے تو آکسیجن کی ٹنکی خالی کرنے کے لیے بھی تمہاری خدمات معقول رقم دے کر حاصل کی جاسکتی ہیں۔''

''نہیں سارجنٹ!'' نک نے کہا۔ ''میں نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔ میں اتنی گھٹیا حرکت بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی نہیں کروں گا۔'' نک کو برونکس کے فلیٹ میں ہلاک ہونے والی لڑکی کا خیال آرہا تھا۔ اگر وہ فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہونے کا اعتراف کرلیتا اور سارجنٹ کو بتادیتا کہ وہ کیوں وہاں گیا تھا تو اس کا ناتا مرنے والی لڑکی سے جوڑا جاسکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے قتل میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ نک دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ لاکر پر اس کی انگلیوں کے نشانات کس طرح رہ گئے۔ عمارت میں داخل ہوتے وقت اس نے دستانے نہیں پہنے تھے کیونکہ اس طرح وہ لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ اتنے گرم موسم میں دستانے پہننے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن اس نے لاکرز کھولتے ہوئے کافی احتیاط سے کام لیا تھا۔ ممکن ہے کہ آخری لاکر کھولتے ہوئے وہ بے پروائی کا مظاہرہ کرگیا ہو۔ ماضی میں اس نے جو چیزیں چرائی تھیں ان کی کوئی قیمت نہیں تھی اور اسی وجہ سے پولیس نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اپنی حماقت سے بری طرح پھنس چکا تھا۔ انگلیوں کے ان نشانات نے اسے ایک ایسے جرم سے وابستہ کردیا تھا جس سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق بغیر پلکیں جھپکائے سارجنٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اگر تم بے قصور ہو تو تمہیں بتلانا ہوگا کہ تم فائر بریگیڈ کی عمارت میں کیا کر رہے تھے؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انگلیوں کے تمام نشانات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔''

نک نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

''میں وہاں اپنے ایک گاہک کے کہنے پر گیا تھا لیکن اس کا تعلق آرتھر سے ہرگز نہیں ہے اور نہ میں نے وہ آکسیجن ٹینک دیکھا تھا۔''

''اگر تمہاری بات کو تسلیم کرلیا جائے تو کیا تم بتانا پسند کروگے کہ تم وہاں کیا چیز چوری کرنے گئے تھے؟ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ وہ چیز تم کس کے لیے چرا رہے تھے۔''

نک کو اپنے سر پر تلوار لٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس چکا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کرکے صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

''مجھے اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔ میں اس شخص کو تلاش کروں گا جس نے ونس آرتھر کو قتل کیا ہے۔''

سارجنٹ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی، اس نے کہا۔

''ہم بھی قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کیا تمہیں اس بات سے اختلاف ہے؟''
''لیکن اس وقت تمہاری نظروں میں میرے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں ہے۔ تم یہ ثابت کرسکتے ہو کہ میں فائر بریگیڈ کی عمارت میں گیا تھا مگر تمہیں آرتھر کا قتل میرے سر تھوپنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اس کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تم یہ بات بھی ثابت نہیں کرسکتے کہ میں نے آکسیجن کی ٹنکی کو چھوا تھا۔ تمہارا کیس خاصا کمزور ہے سارجنٹ!''

سارجنٹ نے چند لمحے نک کی بات پر غور کیا پھر بولا۔
''تم اڑتالیس گھنٹوں میں کس شخص کو میرے حوالے کرو گے؟ کیا تم اس شخص پر ہاتھ ڈالو گے جس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں؟''
''نہیں! کسی شخص نے فائر مین کو ہلاک کرنے کے لیے میری خدمات حاصل نہیں کیں۔'' نک نے جلدی سے کہا۔ ''دیکھو سارجنٹ! مجھے اڑتالیس گھنٹوں کے لیے رہا کردو اور میں کچھ نہ کچھ ضرور کرکے دکھاؤں گا۔ یہ ایک خطرہ ہے جسے تمہیں مول لینا پڑے گا۔ تمہارے پاس میری انگلیوں کے نشانات موجود ہیں اور بعد میں بھی فائر بریگیڈ کی عمارت میں داخل ہونے کا الزام مجھ پر عائد کرسکتے ہو۔ اگر میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرے خلاف کیس اور بھی مضبوط ہوجائے گا۔ اگر میں مقدمہ سے بچنے کی کوشش کروں گا تو تمہیں میرا جرم ثابت کرنے میں آسانی رہے گی۔''
''کیا خیال ہے تم، ہم سے بہتر طور پر تفتیش کرسکتے ہو؟''

''نہیں! نجی طور پر پوچھ گچھ کی جائے تو بعض اوقات اس کے بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ تمہیں یہ خطرہ مول لینا ہوگا سارجنٹ! اس سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔''
''ممکن ہے تم اس شخص کو مطلع کرنا چاہتے ہو جس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں۔''
''میں یہ کام بہ آسانی جیل سے بھی کرسکتا ہوں۔''
سارجنٹ لارنس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھی بات ہے ویلوٹ! میں تمہیں اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں لیکن ہمارا ایک آدمی مسلسل تمہارا تعاقب کرتا رہے گا۔ تمہیں اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

نک ویلوٹ پولیس ہیڈ کوارٹر سے رخصت ہوگیا۔ عمارت سے باہر آکر اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے، بہت دیر بعد اس نے سکون کا سانس لیا تھا ورنہ سارجنٹ لارنس نے تو اس کی جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی کیفیت قتل کے اس مجرم کی سی ہورہی تھی جس کو سزائے موت دی گئی ہو۔ نک کو معلوم تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ بہ دیر یا بہ دیر اسے مصیبت کا سامنا کرنا ہی تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آرتھر کے قاتل کا پتا کیسے چلائے؟ وہ اس موضوع پر سکون سے سوچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے اپنی پہلی فرصت میں فائر بریگیڈ نمبر چوبیس کے چیف فنلے سے ملاقات کی۔ اس کی عمر چالیس سال تھی اور وہ گزشتہ پندرہ برس سے آگ بجھا رہا تھا۔ نک ویلوٹ نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔
''آپ کے اسٹیشن کا جو فائر مین آگ بجھاتے ہوئے ہلاک ہوگیا تھا، میں اس کے بارے میں ایک فیچر تیار کررہا ہوں۔ آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتا سکیں گے؟''
''میں اس بارے میں پہلے ہی مختلف لوگوں سے بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔'' فنلے نے کہا۔ ''اگر تمہیں تفصیلات جاننے کا شوق ہے تو تم ان دنوں کے اخبارات دیکھ سکتے ہو۔''
''میرا خیال ہے آپ سے گفتگو کے بعد میں اس کہانی کو ایک نئے رخ سے دیکھ سکوں گا۔'' نک نے کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟''
''وہ ایک حادثہ تھا، ایک سیدھا سادا اتفاقی حادثہ جو ہم میں سے کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ آکسیجن کی ٹنکیاں برساتیوں اور ہیلمٹ کی طرح انفرادی طور پر فائر مینوں میں تقسیم نہیں کی جاسکتیں۔ وہ فائر انجن پر بنی ہوئی مخصوص الماری میں رکھی رہتی ہیں۔ آکسیجن کی ٹنکیاں کل چار ہیں۔ ان میں صرف ایک خراب تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر آکسیجن ٹینک میں سے ہوا نکال دی ہو کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آرتھر اس ٹنکی کو استعمال کرے گا۔ میں اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ کسی نے آرتھر کو ہلاک کرنے کے لیے ٹنکی میں سے ہوا نکال دی ہوگی۔ ٹنکی کے میٹر کی طرف اسپتال کا ایک ڈاکٹر متوجہ ہوا تھا۔ اس نے یہ بات پولیس افسر کو بتادی جو آرتھر کا معائنہ کرنے پہنچا تھا۔ ہم آرتھر کو لے کر اسپتال پہنچے تو اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔ میٹر کو دیکھ کر اس ڈاکٹر اور پولیس افسر نے یہ احمقانہ کہانی گھڑلی کہ آرتھر کو قتل کیا گیا ہے۔''
''لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ آکسیجن کی یہ ٹنکیاں تیس منٹ تک کارآمد رہتی ہیں۔''

''اس کا انحصار آکسیجن استعمال کرنے والے فرد پر منحصر ہے۔ اگر وہ جسمانی طور پر شدید محنت کر رہا ہو تو ٹنکی اس سے کہیں کم وقت میں ختم ہوسکتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آگ بجھانا آسان کام نہیں ہے۔ اس میں بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور یوں آکسیجن کی ٹنکیاں جلد ختم ہوجاتی ہیں۔''

''گویا آپ مطمئن ہیں کہ یہ محض ایک حادثہ تھا؟''

''یقیناً۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ بہر صورت پولیس پوری تندہی سے نامعلوم قاتل کی تلاش کر رہی ہے۔ وہ لوگ انگلیوں کے نشانات وغیرہ کے لیے یہاں آئے تھے اور گھنٹوں سر کھپاتے رہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' نک نے کہا۔ ''کیا میں آپ کے عملے کے دیگر افراد سے مل سکتا ہوں؟''

''یقیناً۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ رات کی شفٹ میں ہم سات آدمی ہیں۔ آرتھر کی جگہ فی الحال کسی کو نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ چھ آدمی اس وقت عمارت میں موجود ہیں۔''

فائر چیف نک کو عمارت کے عقب میں بنے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا وہاں دو فائر مین پنگ پانگ کھیل رہے تھے۔ دو فائر مین ان کا کھیل دیکھ رہے تھے اور باقی دو کتابیں پڑھ رہے تھے۔ چیف نے فرداً فرداً سارے فائر مینوں کا تعارف نک سے کرایا۔ وہ تمام تندرست و توانا اور مضبوط کسرتی جسم کے مالک تھے۔

''میں آرتھر کی ناگہانی موت پر اپنے رسالے کے لیے فیچر لکھ رہا ہوں۔'' نک نے انہیں بتایا۔ ''اس ضمن میں آپ کے چیف نے میری خاصی مدد کی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آرتھر کی موت ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے کسی نے اسے جان بوجھ کر ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی، کیا آپ حضرات اس بات سے متفق ہیں؟''

''آگ بجھانا جان جوکھوں کا کام ہے۔'' ایک فائر مین نے سر اٹھا کر کہا۔ ''آگ بجھاتے ہوئے حادثے تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔''

''کیا اس رات کسی اور فائر مین نے بھی آکسیجن کی ٹنکی استعمال کی تھی؟''

''میں نے استعمال کی تھی۔'' ایک پستہ قد فائر مین بولا۔ ''چیف نے بھی پندرہ منٹ کے لیے ایک ٹنکی کو اپنی پشت پر باندھا تھا، وہ آگ بہت تیز اور خطرناک تھی۔''

''کیا آکسیجن کی ٹنکیاں افراتفری میں اٹھائی گئی تھیں؟''

''ٹنکی آرتھر کو بہ طور خاص نہیں دی گئی تھی۔ وہ ... کے بھی حصے میں آسکتی تھی۔'' ایک دراز قد فائر مین بولا۔ پنگ پانگ کھیلنے والے دونوں فائر مین میز کی ... جا چکے تھے۔

''فائر بریگیڈ کی عمارت میں کوئی اور غیر معمولی ... ہوئی تھی؟ خاص طور پر گزشتہ ہفتے کوئی خاص واقعہ وقوع ... ہوا تھا؟''

دراز قد فائر مین نے سر ہلا کر کہا۔

''دن کی شفٹ کے ایک فائر مین نے اپنے ہیل... کے چوری ہونے کی شکایت کی تھی۔ میری سمجھ میں اب تک ... بات نہیں آئی کہ کسی کو اس کا ہیلمٹ چرانے کی ضرو... کیوں کر پڑ گئی؟''

''واقعی عجیب بات ہے۔'' نک نے اپنے پیڈ پر لکھتے ہوئے کہا۔ ''آرتھر کے خاندان کے دیگر افراد تو ہو ... گے؟ اخبارات کے مطابق وہ آج کل شادی شدہ نہیں تھا۔ میں ... کے پسماندگان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔'' ... چیف فنلے نے کہا۔ ''وہ ویسٹ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ کیا تم اس کی سابقہ بیوی سے بھی ملو گے؟ ممکن ہے ... تمہیں اس کے بارے میں کوئی خاص بات بتا سکے۔''

نک کا خیال تھا کہ وہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے ... لیکن اس نے اس معاملے میں اپنی دلچسپی ظاہر کردی اور اس ... کا نام اور پتا نوٹ بک میں لکھ لیا۔ اس نے الوداعی کلمات کہے اور فائر بریگیڈ کی عمارت سے رخصت ہوگیا۔ اب وہ کوئی لائحہ عمل تیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملے کو آگے کیسے بڑھایا جائے۔ ساتوں فائر مینوں میں سے کوئی بھی ایسا انتظام کرسکتا تھا کہ آکسیجن کی خالی ٹنکی آرتھر کے ہاتھ لگ جائے اور وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوجائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فائر مینوں میں سے کوئی ایسا کیوں کرنا چاہے گا۔ آرتھر کے ساتھیوں کے پاس اسے قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نک کو کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے اڑتالیس گھنٹوں کی مہلت اسے کم محسوس ہو رہی تھی، وہ آرتھر کی موت کو اتفاقی حادثہ ثابت کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد نک نے آرتھر کی سابقہ بیوی سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ قاتل کی تلاش کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

لیزا آرتھر فائر بریگیڈ نمبر چوبیس سے ایک میل کے ... پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل کے ... کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ نک ویلوٹ لیزا کے ... آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ ... کے طرز عمل سے وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے دل میں آرتھر کے لیے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔

''آرتھر اچھا آدمی نہیں تھا۔'' لیزا نے ٹانگ پر ٹانگ ... کر کہا۔ ''میں اس کی تدفین میں شرکت کے لیے گئی تھی ... لیکن مجھے اس کی موت کا افسوس نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ... نہ ایک دن یہ ہو کر رہے گا۔''

لیزا کی عمر بتیس اور پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک ... سیدھی سادی گھریلو عورت نظر آرہی تھی۔ اس نے ہلکا میک ... اپ کر رکھا تھا اور بال بڑے سلیقے سے باندھ رکھے تھے۔

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔'' نک نے کہا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کن معنوں میں اچھا آدمی نہیں تھا؟ ... میرا مطلب ہے اس میں کیا برائی تھی؟''

''اس کی سرگرمیاں شروع سے میرے لیے ناپسندیدہ رہی تھیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم دونوں اگر محنت سے کام کریں تو اسے وہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی جو وہ کر رہا تھا۔ لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ تنگ آکر میں نے اس سے طلاق لے لی۔ وہ ایک لالچی آدمی تھا، اسے دولت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔''

''کیا آپ اس کی سرگرمیوں کی کچھ وضاحت کریں گی؟''

لیزا کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ اس کے کالے کرتوت اخبارات میں شائع ہوں۔ اب اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔''

''اگر میں اس بات کو چھپانے کا وعدہ کرلوں تو کیا آپ مجھے بتائیں گی؟'' نک ڈرامائی انداز میں اپنی نوٹ بک بند کر کے بولا۔ ''اصل میں اس سے مجھے آپ کے سابق شوہر پر فیچر لکھنے میں آسانی رہے گی۔''

لیزا نے ایک سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے کش لے کر بولی۔ ''بات یہ ہے کہ میں یہ بات بتا کر کسی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتی۔ اس چیز کے اخبارات میں آجانے سے مجھے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس بارے میں ایک لفظ بھی اخبارات میں شائع نہیں ہوگا۔''

''وہ معقول رقم کے عوض لوگوں کے لیے کام کرتا تھا۔ جو لوگ اس سے کام کرواتے تھے ان میں زیادہ تر کا تعلق برونکس کے علاقے سے ہے لیکن اس علاقے میں بھی کچھ لوگ اس کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔''

''وہ لوگوں کے لیے کس قسم کے کام انجام دیا کرتا تھا؟ وہ کس قسم کے لوگ ہیں؟''

لیزا نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا پھر بے بسی سے نک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو جانتے ہیں کہ اس کا پیشہ کیا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایسے کام کرتا تھا جو اسے کسی صورت میں زیب نہیں دیتے تھے۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔''

''افسوس! کہ میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔''

لیزا خجالت سے اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ معقول معاوضے کے عوض لوگوں کے لیے عمارتوں میں آگ لگایا کرتا تھا۔''

لیزا کی اس بات سے نک کو ذہنی طور پر شدید دھچکا پہنچا تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لیزا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ہاں یہی وہ اس کے کالے کرتوت تھے جنہیں میں آپ سے چھپا رہی تھی۔ جو لوگ انشورنس کمپنیوں سے بھاری معاوضہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ معقول رقم کے عوض آگ لگانے کے لیے آرتھر کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ آرتھر نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے آج تک کسی ایسی عمارت کو آگ نہیں لگائی جس میں لوگ موجود ہوں۔''

''وہ اس قسم کے کام کس شخص کے لیے انجام دیتا تھا؟'' نک نے پوچھا۔ اس کا ذہن تیزی سے اس پہلو پر سوچ رہا تھا۔

ممکن ہے آرتھر کو اس شخص نے اس خدشہ کے پیش نظر قتل کردیا ہو کہ کہیں وہ یہ راز فاش نہ کردے۔

''زیادہ تر وہ یہ کام برونکس کے ایک جرائم پیشہ شخص کے لیے کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کا پورا نام معلوم نہیں ہے۔''

''آرتھر اسے کسی نام سے تو پکارتا ہی ہوگا۔''

''میں یہی تو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے...... مگر مجھے یقین ہے...... غالباً اس شخص کا نام میکس تھا۔''

میکس، سام رانفر کے ایک ساتھی کا نام بھی تو تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو فائر مین کی مکمل وردی لانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور جس کی وجہ سے رانفر نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ کہیں یہ وہی میکس تو نہیں ہے؟

’’بہت بہت شکریہ خاتون!‘‘ نک نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔’’اس تعاون کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔‘‘

لیزا اسے صدر دروازے تک رخصت کرنے آئی۔ اس نے نک کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

’’مجھے یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آرتھر اس قسم کا کام کیوں کرتا تھا؟ یہ ٹھیک ہے کہ آگ لگانے کا اسے معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس کی کوئی اور وجہ بھی تھی۔ بعض اوقات تو میں سوچتی ہوں کہ یقیناً اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔‘‘

’’میں آپ کی بات سمجھ چکا ہوں۔‘‘ نک نے کہا۔

☆☆☆

نک ویلوٹ نے اگلا دن شمالی برونکس کے علاقہ میں میکس نامی شخص کو تلاش کرنے میں گزار دیا۔ مکس کو تلاش کرتے ہوئے وہ خاص طور پر آس پاس کی ان جلی ہوئی عمارتوں پر توجہ دے رہا تھا۔ جنہیں آرتھر نے معاوضہ کے لیے آگ لگا دی تھی۔ وہ ان عمارتوں کو حیرت اور افسوس کے ساتھ دیکھتا رہا جنہیں انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے جلا دیا گیا تھا۔

نک نے اس علاقے میں سام رافٹر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جن علاقوں کے بارے میں اسے معلوم ہو گیا کہ رافٹر یہاں پہچانا جاتا ہے، نک نے ان علاقوں میں میکس کے بارے میں مختلف لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا۔

ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد بالآخر اسے مطلب کی بات معلوم ہو ہی گئی۔

’’یقیناً تم میکس ونکل کی تلاش میں ہو؟‘‘ ایک سگار اسٹور کے مالک نے اس سے کہا۔’’وہ کبھی کبھار یہاں رافٹر کے ساتھ آتا ہے۔‘‘

’’میں اسے کہاں تلاش کر سکتا ہوں؟‘‘ نک نے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘ سگار اسٹور کے مالک نے اپنی آواز دھیمی کر کے کہا۔’’گزشتہ ہفتے جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے بعد سے وہ دونوں دکھائی نہیں دیے۔‘‘

نک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔’’تم اسی واردات کی بات کر رہے ہو نا جس میں ایک لڑکی فائرنگ سے ہلاک ہو گئی تھی۔‘‘

’’میری مراد اسی ہنگامے سے ہے، میں نے سنا ہے کہ ہیروئن تقسیم کی جا رہی تھی کہ کچھ بدمعاش حملہ آور ہوئے اور سارا مال لے اڑے۔‘‘

’’وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب کس طرح ہو گئے؟‘‘

’’انہوں نے عمارت کے ہال میں پڑے ہوئے کوڑے دان میں آگ لگا دی تھی اور پھر ایک بدمعاش فائر مین کا مخصوص لباس پہنے فلیٹ میں گھس گیا۔‘‘

’’کیا رافٹر اور میکس اس میں ملوث ہیں؟‘‘

’’مجھے کچھ نہیں معلوم، میں کچھ نہیں جانتا۔‘‘ وہ شخص گھبرا کر بولا۔’’میں نے تو محض اتنی بات کہی ہے کہ وہ کئی دنوں سے دکھائی نہیں دیے۔‘‘

’’شکریہ!‘‘ نک نے کہا۔

نک نے اس علاقے کے کئی شراب خانوں میں جا کر میکس کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن کوئی شخص اسے میکس کے بارے میں کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ شام ہو رہی تھی لہٰذا نک نے طے کیا کہ سارجنٹ لارنس کے الزام سے بچنے کے لیے اسے کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس نے ایک فون بوتھ میں داخل ہو کر سام رافٹر کے نجی ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کے استفسار پر ایک خاتون نے شیریں لہجے میں بتایا کہ رافٹر فلوریڈا جا چکا ہے۔

’’میکس ونکل کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟ کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟‘‘

’’میں کسی میکس ونکل کے بارے میں نہیں جانتی۔‘‘

نک نے ایک آہ بھر کر کہا۔’’دیکھیے محترمہ، مجھے ان دونوں سے ملنا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ آپ ان سے رابطہ قائم کر کے کہہ دیں کہ نک ویلوٹ میکس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے۔‘‘

نک نے سلسلہ منقطع کر دیا اور واپس اپنے فلیٹ پہنچ گیا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ نک کی توقع کے مطابق رات دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سام رافٹر اس سے مخاطب تھا۔

’’میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں سے میکس کے بارے میں پوچھتے پھر رہے تھے۔‘‘ اس نے سرد لہجے میں کہا۔’’بات کیا ہے؟‘‘

’’میں اس کے کاروبار کے بارے میں ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس بزنس کا تعلق تم سے بھی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس موضوع پر فون پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرو گے۔‘‘

’’کیا ہم اسی جگہ ایک گھنٹے کے اندر مل سکتے ہیں جہاں ہماری گزشتہ ملاقات ہوئی تھی؟‘‘

’’ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔‘‘

☆☆☆

رافٹر کی کار مقررہ جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ نک نے اپنی کار بھی پارکنگ پلاٹ کے شروع میں کھڑی کی اور پیدل اس طرف چل دیا۔ رافٹر اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ نک نے اس کے برابر کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

’’اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ میکس کے بارے میں تمہارے ارادے کیا ہیں؟‘‘ رافٹر نے پوچھا۔

’’میں کسی بھی شخص سے نہیں ملا لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے تعلقات آرتھر نامی کسی فائر مین سے تھے جس کا گزشتہ ہفتے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔‘‘

’’ان دونوں کے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟‘‘

’’وہ آرتھر کو معاوضہ دے کر برونکس کے علاقے میں عمارتوں کو آگ لگوایا کرتا تھا۔ پولیس میرے سر پر کھڑی ہے رافٹر۔ ان کا خیال ہے کہ کسی نے جان بوجھ کر آرتھر کو ہلاک کیا ہے اور وہ اس معاملے میں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟‘‘

’’آرتھر فائر مین تھا اور انہوں نے میری انگلیوں کے نشانات فائر بریگیڈ کی عمارت سے حاصل کر لیے ہیں۔‘‘

’’یہ تو تمہاری سیاہ بختی ہے نک۔ میرا تو خیال تھا کہ تم اس سے کہیں زیادہ چالاک ہو۔‘‘ رافٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

’’اگر آرتھر اور میکس مل کر کام کر رہے تھے تو ممکن ہے میکس کو اس کی موت کے بارے میں کچھ علم ہو۔‘‘

’’تمہیں یہ بات کیونکر معلوم ہوئی کہ اس کے میکس کے ساتھ اس نوعیت کے تعلقات تھے؟‘‘

’’آرتھر کی سابقہ بیوی کا بیان ہے کہ اس کا شوہر شمالی برونکس کے علاقے میں ایک شخص میکس سے معقول معاوضہ لے کر اس کے لیے عمارتوں کو آگ لگوایا کرتا تھا۔‘‘

’’تم جانتے ہو کہ شمالی برونکس کے علاقے میں کتنے میکس ہیں؟‘‘

’’تمہارے ساتھی میکس کو تمہارے لیے فائر مین کا لباس مہیا کرنا تھا اور یہ بات تم نے ہی مجھے بتائی تھی۔ آرتھر سے [illegible] نہ ملنے کے بعد تم نے میرے بارے میں سوچا تھا کیونکہ میں اسی علاقے میں رہائش پذیر ہوں۔ میں نے ہیلمٹ چرانے کے لیے فائر بریگیڈ نمبر چوبیس کو اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہ میرے گھر سے نزدیک ہے۔ تم نے بھی یہی سوچ کر میری خدمات حاصل کی تھیں کہ میں اسی اسٹیشن سے ہیلمٹ چرانے کی کوشش کروں گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں ہیلمٹ چرانے کے لیے اس اسٹیشن کو منتخب کر بیٹھا لیکن حالات کے پیشِ نظر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اس میں تمہاری سوچ کا خاصا دخل تھا۔‘‘

’’تمہارا خیال ہے اس معاملے میں میکس ملوث ہے؟‘‘

’’مجھے اس بارے میں پورا یقین ہے۔‘‘ نک نے کہا اور اسی لمحے اس نے اپنی گردن کی پشت پر پستول کی سرد سی نال لگتی محسوس کی۔

’’تمہیں کار میں بیٹھتے ہوئے پچھلی نشست کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔‘‘ پیچھے سے ایک سرد آواز سنائی دی۔

نک اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔’’تو تم میکس ونکل ہو؟‘‘

’’ہاں میرا نام میکس ہے۔ رافٹر! تم اس کا پستول نکال لو۔‘‘

رافٹر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

’’میرا خیال ہے نک ویلوٹ کے پاس پستول نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے نک؟‘‘

’’پستول میرے گھر پر موجود ہے۔‘‘

میکس نے اب بھی پستول کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔

رافٹر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔’’اب تم کیا چاہتے ہو نک؟‘‘

’’میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے مقامی پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس وقت بھی پولیس کے دو تین افسران قریب ہی منڈلا رہے ہوں گے۔‘‘

’’خیر! اس وقت تو تم میکس کے قبضے میں ہو۔‘‘ رافٹر نے کہا۔

’’لعنت ہو آرتھر پر!‘‘ میکس نے کہا۔’’اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔‘‘

’’ایک بات تو بتاؤ میکس! تم نے گزشتہ ہفتے آرتھر سے فائر مین کا ہیلمٹ کیوں نہیں لے لیا تھا؟ رافٹر کو ہیلمٹ کے لیے میری خدمات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟‘‘

میکس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔’’آرتھر خوفزدہ ہو چکا تھا، اسے خدشہ تھا کہ فائر بریگیڈ میں اس کے ساتھی اس کی تمام حرکتوں سے واقف ہو جائیں گے۔ ان خدشات کا سبب وہ نوٹ بک تھی جس میں اس نے تمام وارداتوں کے بارے میں لکھ رکھا تھا اور یہ نوٹ بک اس سے فائر اسٹیشن کی عمارت میں کھو گئی تھی۔ وہ اتنا زیادہ فکر مند تھا کہ مجھے ہیلمٹ دینے پر تیار نہیں ہوا۔‘‘

’’میں نے جو ہیلمٹ چرایا تھا اس کا تم لوگوں نے کیا؟‘‘

سام رافٹر نے جواب دیا۔’’ہم نے اپنا مقصد حاصل کر کے

سب چیزوں سے پیچھا چھڑالیا تھا۔ ہم کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔''

''کیا تمہارا چھاپہ کامیاب رہا تھا؟'' نک نے پوچھا۔

''یقیناً! میں تمہیں پہلے ہی بتاچکا ہوں کہ ہیروئن کی بہت بڑی مقدار ہمارے ہاتھ لگے گی۔''

نک نے بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا اور بولا۔ ''کیا ہم ساری رات اسی طرح بیٹھے رہیں گے؟ کیا تم پستول کی نال اسی طرح میری گردن سے لگائے رکھو گے؟''

''اس کا انحصار تم پر ہے'' میکس نے کہا۔ ''تم سام رافٹر کے دوست ہو اور اس بنا پر میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ لیکن تم نے اپنے بے ہودہ سوالات سے مجھے پریشان کردیا ہے۔''

''میں نے تو......''

''وہ دیکھو ایک کار مڑ رہی ہے!'' سام رافٹر نے اچانک کہا۔

''کار پر لگے ہوئے اینٹینا کو دیکھو! میرا خیال ہے وہ پولیس کار ہے۔''

میکس نے اپنی نشست پر ایک جھٹکا کھایا اور نک نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر اس کی کلائی تھام لی۔ نک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر سارجنٹ لارنس قریب ہوا تو اس کی مدد کو آسکتا تھا۔

رافٹر نے مغلظات بکتے ہوئے اپنی کار کو گیئر میں ڈالا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل کو تیزی سے گھماتے ہوئے نک اور میکس کو پستول کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ رافٹر نے ایک مرتبہ پھر وہیل کو تیزی سے گھمایا۔ اب کار پارکنگ پلاٹ سے نکل رہی تھی۔ نک نے کراٹے کا ایک زوردار ہاتھ میکس کی گردن پر مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ معاً ایک کار تیزی سے ان کی طرف بڑھی اور نک نے اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھے ہوئے لارنس کو دیکھ لیا، اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ پھر ایک اور پولیس کار رافٹر کے سامنے آگئی اور اس نے گیئر لگا کر کار کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔ اس دوران پیچھے سے ایک اور کار آچکی تھی۔ اسی اثنا میں نک پستول اٹھا کر اس کا رخ رافٹر کے سر کی طرف کرچکا تھا۔ رافٹر نے اپنی کار روک دی اور بولا۔

''میرے تصور میں بھی نہیں تھا ویلوٹ کہ تم پولیس کے ساتھ مل کر کام کررہے ہو!''

''میں نے کبھی پولیس کے ساتھ کام کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ بعض اوقات ایسا اتفاق ہو ہی جاتا ہے۔''

لارنس نے رافٹر اور میکس کو ہتھکڑیاں پہنادیں اور انہیں ہیڈ کوارٹر لے جانے کے لیے اپنی کار میں بٹھادیا۔ پھر نک کی طرف آیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''میں تمہیں بتاچکا تھا کہ پولیس کا ایک آدمی مسلسل تمہارے تعاقب میں رہے گا۔''

''تمہاری بات مجھے یاد تھی۔'' نک نے کہا۔ ''لیکن تم نے میرے معاملے میں ایمانداری سے کام نہیں لیا۔ تم نے ان دونوں تک پہنچنے کے لیے مجھے استعمال کیا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' لارنس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں میری انگلیوں کے نشانات لاکر پر مل گئے تھے لیکن آکسیجن کی ٹنکیاں تو آگ بجھانے والی گاڑی میں ان کی مخصوص جگہ پر رکھی جاتی ہیں اور تم یہ بات قطعیت سے جانتے ہو کہ میں انجن کے نزدیک کبھی نہیں گیا۔ تم نے مجھے قتل کے جرم میں پھانسنے کی دھمکی دی تھی تاکہ میں تم کو ان دونوں تک لے جاؤں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''کم وبیش بات تو یہی ہے۔'' لارنس نے اعتراف کیا۔ ''برونکس کی پولیس کو فائرمین کا ہیلمٹ اور برساتی مل گئی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اس علاقے میں ہونے والی ایک واردات میں استعمال کی گئی تھیں۔ فائر بریگیڈ اسٹیشن کا نمبر ہیلمٹ پر پڑا تھا لہٰذا یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہیلمٹ کو کہاں سے حاصل کیا گیا تھا۔ یہیں سے اسٹیشن کی عمارت کی پڑتال کی گئی اور ہمیں تمہاری انگلیوں کے نشانات مل گئے۔ ہمیں فائرمین آرتھر کی موت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اتفاق سے ہمیں ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا تھا جسے ہم نے استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اندازہ کرلیا کہ اگر میں نے آرتھر کی موت کا ذمے دار تمہیں قرار دیا تو تم اپنی جان بچانے کے لیے ضرور تعاون کرو گے۔''

''اور اب تم نے رافٹر اور میکس کو گرفتار کرلیا ہے، تمہارے پاس ان کے خلاف کس قسم کا کیس ہے؟''

''برونکس پولیس کی تحویل میں چند خوفزدہ لڑکیاں ہیں جنہوں نے ان دونوں کو دیکھ رکھا ہے۔ ہم ہیروئن کی بھاری مقدار کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ کریں گے۔ ہیلمٹ کے اندرونی حصے سے چند بھورے بال بھی ملے ہیں جو یقیناً میکس کے ثابت ہوں گے اور یوں ان کے خلاف بڑا مضبوط مقدمہ بن جائے گا۔''

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

سارجنٹ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تمہیں کسی بڑے

مقدمے میں پھانسنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس معاملے میں تمہارا نام نہیں لوں گا لیکن میری ایک بات مان لو تو تمہارا بڑا کرم ہوگا۔ اگلی مرتبہ اپنا کام کسی دوسرے علاقے میں انجام دینا۔''

☆☆☆

نک گھر پہنچا تو گلوریا بڑے انہماک سے ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''تم کہاں رہے نکی؟''

''بڑی لمبی کہانی ہے گزشتہ ہفتے جو کام میں نے انجام دیا تھا۔ اس نے پیچیدگی اختیار کرلی تھی۔''

''تم سونے جارہے ہو؟''

اس وقت بارہ بج رہے تھے اور وہ بہت تھکا ہوا تھا مگر اس کا جی سونے کو نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا اس نے کہا۔ ''ابھی نہیں مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ہے۔''

نک نے کار سنبھالی اور تیزی سے چلاتا ہوا کھیل کے میدان میں پہنچ گیا جس کی دوسری طرف فائر بریگیڈ نمبر چوبیس کی عمارت واقع تھی اس نے کئی سو گز پہلے کار کھڑی کرلی اور پیدل عمارت کی جانب چل دیا۔ پورے چاند کی روشنی میں اس نے جلے ہوئے فارم ہاؤس کو دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ نک کی توقع تھی کہ زیادہ تر لوگ سو رہے ہوں گے اور پھر الارم کی گھنٹی بجنے لگے گی اور انہیں بھاگنا پڑے گا۔

لیکن ایک شخص عمارت سے باہر چبوترے پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ نک نے اسے دور سے پہچان لیا۔ وہ فائر چیف فنلے تھا۔

''ہیلو چیف!'' نک نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''ہیلو مسٹر!'' اس نے منہ سے پائپ نکال کر کہا۔ ''آپ نے کہانی تیار کرلی؟''

''ہاں! لیکن میں نے اسے نہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر! یہ آپ کا مسئلہ ہے میں تو اس حسین رات سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔''

''واقعی بڑی سہانی رات ہے۔'' نک نے کہا ''اتنی حسین رات میں کہیں آگ لگ جائے تو...... تو بہت افسوس ہوتا ہے۔''

''آگ کسی بھی رات کو لگے، افسوسناک ہوتی ہے۔ مجھے آگ سے نفرت ہے، شدید نفرت'' اس نے پہلو بدل کر کہا۔ ''میرا خیال ہے اسی سبب سے میں یہ پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔''

نک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''زیادہ تر فائرمینوں کے جذبات اور احساسات آپ سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دم سے بے شمار انسانی جانیں تلف ہونے سے بچ جاتی ہیں اور کروڑوں ڈالرز کی جائداد تباہ و برباد ہونے سے بچ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے ایک فائرمین کے نزدیک جان بوجھ کر آگ لگانے والا شخص دنیا کا سب سے زیادہ قابلِ نفرت انسان ہوتا ہے۔''

فنلے نے تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا ''آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں۔''

''میں نے ایک فائرمین کے بارے میں سنا ہے جو فارغ اوقات میں آگ لگانے کا کام کرتا تھا۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ظاہر ہے، مجھے ایسے آدمی سے ہمدردی نہیں ہوسکتی۔''

''وہ اپنے کرتوت ایک نوٹ بک میں لکھ لیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ان معاوضوں تک کا اندراج کرتا تھا جو آگ لگانے کے عوض اسے ملتے تھے۔ پھر ایک دن وہ اپنی یہ نوٹ بک گم کر بیٹھا اس طرح اس کے ساتھیوں کو اس بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا۔''

فنلے پائپ کے کش پر کش لگاتا رہا۔ پھر اس نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''میں آرتھر کی موت کے بارے میں آپ کو بتاچکا ہوں۔ یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ وہ کون سی ٹنکی کا انتخاب کرے گا لہٰذا کوئی فائرمین اس کی موت کا ذمے دار نہیں ہے۔''

''کسی فائرمین نے اسے ہلاک نہیں کیا۔'' نک نے کہا۔ ''لیکن تم سب مل کر اس کی حادثاتی موت کا بندوبست کرسکتے تھے۔ آخر ایک فائرمین کو اس کے بدترین مجرم ہونے پر سزا تو ملنی چاہیے تھی۔''

''تمہارا خیال ہے لوگ اس بارے میں یقین کرلیں گے؟''

''نہیں!'' نک نے کہا۔ ''پولیس مطمئن ہے اور آرتھر کی سابقہ بیوی کو بھی اس کی موت کی پروا نہیں ہے جن لوگوں کے لیے وہ کام کررہا تھا۔ اس وقت کسی دوسرے الزام میں جیل میں ہیں۔ اور میں جاسوس نہیں ہوں۔ آرتھر کی موت کس طرح واقع ہوئی، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

فنلے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایسا ہونا بھی چاہیے۔ بہرحال جو ہونا تھا ہوچکا، ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

اب کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ لہٰذا نک ویلوٹ نے الوداعی کلمات کہے اور واپس چل دیا، ابھی وہ کھیل کے میدان ... میں داخل ہی ہوا تھا کہ الارم کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس سہانی رات میں دور کہیں آگ لگ گئی تھی۔

مسافر

ناصر ملک

قسط نمبر: 7

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا۔ والد صاحب کھیتوں میں مزدوری کر کے عزت کی روزی کماتے تھے کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنایا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ حالانکہ وہ بھی کوئی آسودہ حال گھرانا نہیں تھا۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال ودیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کردیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا

خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ میرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ اکبر درزی مراد بخش دیوانہ سے بھی دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر برقرار رہا اور اپنے عشق کی روداد سے مجھے آگاہ کرتا رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن دریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ دریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مریض کو اسپتال لایا جائے جس پر دریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں دریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی میں نے سوچا کہ حیات خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور جب ماسٹر جی اس کا رشتہ لے کر شاہ جی کے پاس آئے تو شاہ جی نے انہیں سخت سست سنا کر انکار کر دیا۔ پھر زیتاں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا اور یہ کام سونپا کہ ہم اس کی جاسوسی کریں۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے اسی دوران لمبے بالوں والا ہیر اسٹائل نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان سونی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ شاہ جی کے مطابق اس کے ڈانڈے میری ننھیال شاہ جمال میں تھے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے میڈم کے متعلق منفی اطلاعات فراہم کیں لیکن میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ سونیا نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ اسی دوران میڈم کے اظہار الفت سے میں سخت پریشان تھا۔ پروین ہنوز لاپتا تھی لیکن میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ ہم جب ڈیرے تک پہنچے تو ہمیں جھاڑی میں ایک لاش نظر آئی، اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کھالے کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑی۔ ''اوئے شہرے! اِہ تاں ماشی دا بھرا، سجاول کریانے آلے دا پتر وحید ہے......''

(اوئے شہرے! یہ تو عاشی کا بھائی اور سجاول کریانہ مرچنٹ کا بیٹا وحید ہے)

میں بھی وحید کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ پیا نے کھالے سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

کھالا اُسے سجاول اور وحید کی ماں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں اس دوران کھالے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا کر اُس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ وحید کا سرخ و سپید چہرہ اِس وقت پیلا پڑ چکا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے اور مٹی میں اَٹے تھے جبکہ بال بری طرح کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اُسے کئی مرتبہ پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو شاید پہچاننے میں تامل ہوتا۔ میں نے اُس کے گال کو چھوا۔ سرد اور بے جان...... فوراً یہ خیال ذہن میں اُبھرا کہ وہ زندہ نہیں تھا مگر میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میرے ہاتھوں کی باریک لوؤں نے سانسوں کی بہت خفیف آمد و رفت کو محسوس کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُس کی کلائی تھامی۔ کمزور سی نبض چل رہی تھی۔ اُس کے سینے پر ہاتھ رکھا، دل دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔

میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ ''یہ زندہ ہے، اِسے گاڑی میں لے چلو۔''

کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

ایسے ہی وقت میں پیا کی آواز سنائی دی۔ ''اِسے یہیں چھوڑ دو اور اپنے مشن کی فکر کرو۔ اگر ہم اِسے گاڑی میں لے کر گئے تو بہت سارا وقت ضائع ہو جائے گا۔''

وہ درست کہہ رہا تھا مگر میں نے کھالے کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا، کہا۔ ''کھالے! زیادہ دیر تو نہیں لگے گی۔''

پیا نے جلدی جلدی لاش کی طرح ساکت پڑے وحید کا ماہرانہ انداز میں معائنہ کیا۔ اُس کی بائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ گردن اور چھاتی پر کئی زخم لگے تھے جن سے خون رِس کر جم گیا تھا۔ دائیں کندھے کے جوڑ پر بھی ایک نسبتاً بڑا زخم تھا۔ پیا نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''یہ مرنے والا ہے۔ اِسے یہیں پڑا رہنے دو ورنہ یہ قتل مفت میں ہمارے کھاتے میں پڑ جائے گا۔ یہ تو سوچو، اِس حالت میں اِسے لے کر کہاں جائیں گے؟''

کھالے نے کہا۔ ''اِسے کسی اسپتال میں ڈال آتے ہیں۔''

''تاکہ جاتے ہی دھر لیے جائیں...... ہیں؟'' پیا نے تلخی سے کہا۔

پیا نے درست کہا تھا۔ وحید کی سانس کی رفتار اُس کی طرف بڑھتی ہوئی اندوہ ناک موت کی خبر دے رہی تھی۔ میں نے ایک پل کو سوچا۔ وحید کی ہمدردی میں ہاتھ سے نکلنے والا ہر لمحہ مجھے پروین سے دور کر رہا تھا۔ یہ بھی سوچا، اگر میں وحید کو ایسے ہی پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہوں تو واپسی پر اِسے جانور نوچ چکے ہوں گے۔

اچانک دل میں ہمدردی کا جذبہ پوری شدت سے بیدار ہو گیا۔ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ''نہیں پیا جی! اِسے لے جا کر فرسٹ ایڈ دیتے ہیں اور گاڑی میں لٹا دیتے ہیں۔ واپسی پر اگر یہ زندہ ہوا تو ملتان لیے چلیں گے۔ اگر مر گیا تو اِس کی قسمت...... بیلے میں کہیں پھینک کر اپنی راہ چل دیں گے۔ پلیز!''

پیا نے بیزاری سے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے جلدی سے وحید کے نیم جان وجود کو اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔ کھالے نے میرا ساتھ دیا۔ پیا عقب سے بولا۔ ''ہم اِدھر ہی کھڑے ہیں، جلد آ جانا۔''

چونکہ اُس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا، اِس لیے میں نے اُسے چھیڑنا اور ساتھ چلنے پر مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وحید کو کاندھے پر ڈالے گاڑی تک لے آیا۔ ڈالے کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر میں نے برق رفتاری سے میڈیکل کٹ کھول لی۔ مجھے ایک ٹیکے کی تلاش تھی جو خوش بختی سے مل گیا۔

پیا جی نے جب اُس کا طبی معائنہ کیا تھا، تب مجھ پر باور ہوا تھا کہ وحید پر زخموں کی وجہ سے گہری بے ہوشی نہیں طاری تھی۔ وہ یا تو خوف کی شدت سے کوما میں چلا گیا تھا یا اُسے کوئی تیز نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ دوا کی مقدار میں زیادتی سے بھی اس کی یہ حالت ہو سکتی تھی۔ گردن، چھاتی اور ٹانگ پر لگنے والے زخم گہرے تو تھے مگر عام نوعیت کے تھے۔

گاڑی کی چھت والی بتی روشن کی، انجکشن تیار کیا اور اُس کے بازو کی وین تلاش کر کے دوا انجیکٹ کر دی۔ زود اثر دوا نے چند لمحوں میں ہی اپنا کام کر دکھایا اور وحید کی ماند پڑتی ہوئی سانس اور نبض میں جان پڑ گئی۔

میں نے فوری طور پر پٹی کا رول کھولا، اِسی دوران کھالے نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کاٹن رول سے روئی کے ٹکڑے نکال کر اسپرٹ اور ٹنکچر میں بھگو لیے۔ پھر میں نے ماہرانہ انداز میں اُس کے زخموں کی صفائی کی اور بینڈیج کرنے کے بعد نبض اور دھڑکن چیک کی، پتا چلا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو توانائی دینے اور انفیکشنز پر قابو پانے کے لیے دو ٹیکے لگائے اور کھالے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اَب یہ ہماری واپسی تک زندہ رہے گا۔''

وہ بولا۔ ''اگر یہ ہوش میں آ گیا تو گاڑی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرے گا اور جنگلی جانوروں کے کام آجائے گا۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''اگر اِس ڈبے میں کوئی بے ہوشی کا ٹیکا ہے تو لگا دو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''ہے تو سہی پر اِس حالت میں اسے لگایا نہیں جا سکتا۔ فوری موت واقع ہو سکتی ہے۔''

اُس نے کندھے اُچکائے، بتی گل کی، دو انچ کے قریب عقبی دروازے کا شیشہ اُتارا اور بولا۔ ''اللہ سائیں اِیندھے تے کرم کریسی...... چل نی تاں پیا لڑن وات آویسی۔''

(اس پر اللہ کرم کرے گا۔ چلو ورنہ پیا لڑنے مرنے پر تُل جائے گا)

آگے پیچھے دوڑنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے ہم پیا اور عقیل کے پاس پہنچے۔ وہ وہیں پیروں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔

پیا بولا۔ ''یار! تم لوگوں نے بہت سارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ کیا بنا اُس کا؟''

کھالے نے بتایا۔ ''امید ہے کہ زندہ بچ جائے گا۔''

میرے دل سے دعا نکلی۔ ''یا اللہ! اُسے زندگی دیدے ورنہ اُس کی ماں اور بہن جیتے جی مر جائیں گی۔''

پیا نے درست کہا تھا۔ ہم نے وحید کے چکر میں نصف گھنٹے کے قریب وقت وحید کی طبی امداد پر صرف کر دیا تھا۔

میں اپنی توجہ کا ارتکاز اپنے مشن پر ثبت رکھنا چاہتا تھا مگر بار بار وحید کا پیلا چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا۔ اُسے کس نے یہاں لا پھینکا تھا؟ اس معصوم بچے سے کسی کو کیا دشمنی تھی؟ وہ کن حالات سے گزر کر اِس بیلے میں پہنچا تھا؟ وہ بھی اس حالت میں کہ نہ جی رہا تھا اور نہ ہی مر رہا تھا۔ اُسے ایک خونخوار بھیڑیے نے دیکھ لیا تھا اور اُسے کھینچ کر اپنی کہیں قریب واقع کچھار کی طرف گھسیٹ رہا تھا جہاں اُس کے خاندان کے کئی درندے موجود تھے۔ اگر ہم اس طرف نہ آتے تو یقینی طور پر اُسے بھیڑیوں کا غول کھا چکا ہوتا۔

میں سر جھٹک کر ان سوالات سے پہلو تہی برتنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہاں راستہ نہیں تھا، بس جھاڑیاں، کیچڑ اور قدِ آدم کوندر تھی جس کو چیر کر کھالا آگے بڑھتا جا رہا تھا اور ہم تینوں اُس کی تقلید میں چلے جا رہے تھے۔ بڑی سڑک سے اُترنے کے بعد اب تک ہم نے جتنا بھی سفر طے کیا تھا، سب ویرانی اور بیابانی کا تھا۔ سوائے چھوٹے بڑے خنزیروں، گیدڑوں اور سیہہ کے کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ اگر سردار حیدر خان نے اپنے خفیہ اَڈّے کے لیے اِس علاقے کا انتخاب کیا تھا تو بے وجہ نہیں تھا۔

کوئی دَس منٹ کے بعد کھالا رُک گیا۔ اس نے پلٹ کر سرگوشی کی۔ ''ہم اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں؟ اِس جھنگی سے نکلیں گے تو سامنے حویلی کا پچھواڑا نظر آئے گا۔''

پیا کی ہدایت پر ہم سبھی نے ہتھیار سنبھالے، اپنی سانسیں معتدل کیں اور جھنگی سے نکل آئے۔ کھالے کی بات درست تھی۔ تقریباً سو قدموں کے فاصلے پر کیکر اور شہتوت کے درختوں میں گھری ہوئی حویلی کے آثار دکھائی دیے۔ گاگلز کی مدد سے کافی دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پیا بولا۔ ''یہاں تو کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔''

کھالے نے کہا۔ ''جب باہر کی دنیا سوتی ہے، تب حویلی کا اندر جاگتا ہے۔ چونکہ یہاں بجلی نہیں ہے، اِس لیے روشنی دکھائی نہیں دیتی۔''

پیا نے سرگوشی کی۔ ''اٹیک کے لیے یہ موزوں ترین وقت ہے۔ ہمیں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا کام کر کے یہاں سے نکلنا ہے۔ میں اور عقیل گیٹ کی طرف سے حویلی میں داخل ہوتے ہیں، تم دونوں پچھواڑے کی دیوار سے اوپر چڑھو گے اور چھت پر پہنچ کر اٹیک کر دو گے۔ یہ یاد رکھنا، ہم نے صرف حویلی میں موجود لوگوں کو اُلجھانا ہے، تم نے ٹارگٹ پر پہنچ کر لڑکی کو باہر نکالنا ہے۔ سمجھ گئے ناں؟''

اس کے ساتھ ہی اُس نے ہمیں مزید ہدایات دیں۔ طے پایا کہ ہم دونوں اپنے طور پر پروین کو تلاش کریں گے۔ وہ اپنے طور پر آگے بڑھیں گے اور حویلی کے محافظوں پر فائر کر کے انہیں اُلجھا دیں گے جس سے ان کا دھیان حویلی کی طرف سے ہٹ جائے گا۔ اکٹھے نہ ہو پانے کی صورت میں حویلی سے نکلنے کے بعد ہر کوئی اپنے طور پر ڈالے تک پہنچے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم سبھی اکٹھے جائیں مگر پیا نے میری رائے کو سختی سے رَد کر دیا، بولا۔ ''جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے ہی کرو۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''تمہیں کس طرح خبر ہوگی کہ ہم نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''کھالے کے پاس بیلٹ میں اسٹیل کی ایک وِسل لٹک رہی ہے۔ اُسے پوری قوت سے بجا کر ڈالے کی طرف نکل جانا۔ کھالے! مجھے ذرا گیٹ کی صورتِ حال کے بارے میں بتاؤ؟''

کھالے نے بتایا۔ ''اس ہاتھ سیدھے چلے جاؤ۔ پانچ سات سو فٹ کی دوری پر حویلی کی نکڑ واقع ہے جس کے ساتھ ہی بڑا سا لکڑی کا گیٹ نصب ہے۔ گیٹ کے سامنے کچا راستہ چند قدموں کے فاصلے پر بل کھا کر بلوچ نگر والی سڑک کی طرف جاتا ہے۔ اس وقت حویلی کا دروازہ اندر سے بند ہو گا۔ یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری مڈبھیڑ بل ٹیرر کتوں سے ہو سکتی ہے۔ ویسے تو یہ خطرہ ہمارے لیے بھی موجود ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ کتوں کا علاج میرے پاس موجود ہے۔ اب جاؤ، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔''

میں نے کھالے کی طرف دیکھا۔ اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ہم دونوں حویلی کے پچھواڑے کی طرف بڑھ گئے۔ کھالے نے کتوں کی موجودگی کی خطرناک خبر دی تھی۔ چونکہ ہم دونوں دیہاتی تھے، اِس لیے کتوں سے بخوبی نمٹنا جانتے تھے مگر پیا اور عقیل کی طرف سے پریشانی لاحق تھی۔ بل ٹیرر، جسے مقامی زبان میں بگاڑ کر 'گل ٹرینے' کہا جاتا ہے، بڑے خونخوار اور ضدی کتے سمجھے جاتے ہیں اور لڑائی بھڑائی میں طاق اور شکست تسلیم نہ کرنا ان کے امتیازی اوصاف ہیں۔

ہم دونوں چوکس انداز میں برابر چلتے ہوئے، درختوں کے بیچ سے گزر کر حویلی کی بلند دیوار تک پہنچے۔ ایسے ہی وقت میں ایک درخت کے عقب سے سفید رنگ کے بڑے قد والے کتے نے جست لگائی۔ اس کا نشانہ کھالا تھا۔ چونکہ ہم دونوں بہت محتاط تھے، اِس لیے کھالے نے جسیم کتے کے عزائم کو بھانپنے اور خود کو بچانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہوا، جونہی کتا اپنی جھونک میں آگے جا کر پلٹا، کھالے نے گن نیچے پھینک کر اس پر چھلانگ لگائی اور آنِ واحد میں دبوچ لیا۔ کتا سنبھلنے سے قبل ہی اُس کے مخصوص داؤ میں آ گیا تھا۔ میں نے اُس کی جانب سے توجہ ہٹائی اور چاروں جانب بہ غور دیکھا۔ کوئی اور کتا دکھائی نہیں دیا۔

کھالا کتے کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر کتے کا نرخرہ دبا رکھا تھا۔ ڈیڑھ دو منٹ میں ہی کتے کے حلق سے خارج ہونے والی موہوم سی خرخراہٹ دم توڑ گئی اور کتا بے جان انداز میں زمین پر گر گیا۔ وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ کھالا اپنے اِس داؤ سے نور پور میں اَن گنت کتوں کی جان لے چکا تھا۔

اپنا کام نمٹا کر وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی گن اُٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے تقلید کی۔ پختہ اینٹوں کی دیوار پر پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ بارشوں نے اینٹوں کے بیچ کی چکنی مٹی نکال لی تھی جس کی وجہ سے دیوار میں بڑی بڑی درزیں بن چکی تھیں۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ''شہرے! اِیں دِوار تے چڑھن تاں بہوں سکھا ہے۔''

(شہرے! اس دیوار پر چڑھنا تو بہت آسان کام ہے)

اس نے درست کہا تھا۔ میں نے جلدی سے گن کندھے پر لٹکائی اور اپنی انگلیاں دیوار کی اینٹوں میں پھنسا دیں۔ جوتے اُتارے بغیر میں بڑی آسانی سے بلند دیوار پر چڑھتا گیا۔ میرے متوازی کھالا بھی چھپکلی کی طرح دیوار سے چپک کر بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے منڈیر سے سر نکال کر احتیاط سے چھت پر دیکھا۔ کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میدان صاف پا کر میں چھت پر چڑھ گیا اور کھالے کو اوپر آنے کا اشارہ کر دیا۔ کچھ دیر تک ہم محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے رہے۔ اسی دوران ہم نے اپنی گنوں کو فائرنگ پوزیشن دی، پستول نکال کر ہاتھوں میں تھام لیے اور خود کو کسی بھی ناگہانی صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ پھر چھت پر دھمک پیدا کیے بغیر دبے پاؤں چلتے ہوئے صحن کی جانب والی منڈیر تک آئے۔ میں نے کھالے کو اپنے پیچھے رُکنے کا اشارہ کیا اور آہستگی سے جھانک کر صحن میں دیکھا۔ غیر متوقع طور پر صحن خالی تھا۔

میرا اشارہ پا کر کھالا بھی آگے بڑھ آیا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''کچھ نظر آیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میرے سامنے طویل و عریض صحن واقع تھا جس میں کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کی اگلی داہنی نکڑ پر بڑا سا چوبی گیٹ نظر آ رہا تھا جو اِس وقت چوپٹ کھلا تھا۔ اسے کھالے کے بقول اس وقت بند ہونا چاہیے تھا۔ بائیں ہاتھ پر اگلی دیوار تک قطار میں

کمرے واقع تھے۔ کسی کمرے میں بتی روشن نہیں تھی۔ سبھی سوئے ہوئے تھے یا حویلی میں اِس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ''شہرے! جو بھی ہے، اسی چھت کے نیچے ہے جس پر ہم کھڑے ہیں۔ چلو، نیچے اُترتے ہیں۔''

اُس نے بائیں ہاتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں اس طرف بڑھا۔ چھت کے اختتامی حصے میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ گاگلز کی مدد سے میں یہ دیکھ پانے میں کامیاب رہا کہ سیڑھیوں کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ تبھی پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ کھالا میرے عقب میں چلا آ رہا تھا۔ سیڑھیاں کشادہ برآمدے میں ختم ہوئیں۔ اس دس فٹ چوڑے برآمدے میں تین پرانی طرز کے چوبی دروازے دکھائی دے رہے تھے مگر ان میں بھی کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔

کھالے نے تشویش ناک لہجے میں سرگوشی کی۔ ''شہرے! کوئی گڑبڑ ہے یار!''

اس کی آواز میں چھپی ہوئی خنکی مجھے وجود میں اُترتی محسوس ہوئی۔ میں نے کان لگائے، کچھ سننے کی کوشش کی مگر سوائے درختوں کی مخصوص سرسراہٹ کے فضا بالکل خاموش تھی۔ پہلے دروازے کے پاس پہنچ کر کھالے نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ کھالے نے اندر جھانکا۔ مطلق اندھیرے میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیلی۔ میں خود پر اختیار نہ رکھتے ہوئے کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ کھالا ایک ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ لیے کمرے کے صحن میں کھڑا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کمرا بالکل خالی تھا۔

کوئی وقت ضائع کیے بغیر ہم دونوں نے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ اُس کمرے میں بھی سوائے چارپائیوں، ٹرنکوں اور روایتی بندوقوں کے کچھ نہ ملا۔

کھالے نے سرگوشی کی۔ ''شہرے! کام خراب ہے۔ لگتا ہے کہ حیدر خان کے کارندوں کو ہماری آمد کی خبر مل گئی ہے۔ وہ یا تو یہاں سے کسی اور ٹھکانے میں منتقل ہو گئے ہیں یا پھر چھپ کر ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے کے چکر میں ہیں۔ جلدی کرو...... ہمیں جلد از جلد تلاشی لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

ہم دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرا بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں آگ بھر گئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''کھالے! میں حیدر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور ٹارچ کی روشنی اردگرد مارنے لگا۔ کمرے میں موجود سامان کو دیکھنے پر بہ آسانی احساس ہوتا تھا کہ کمرے میں رہنے والے فوری طور پر کمرے سے نکل گئے تھے۔ انہیں اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ وہ اپنا سامان سمیٹ لیتے۔ کونے والے کمرے کے آگے اسٹور بنا ہوا تھا۔ میں نے جونہی اسٹور کی کنڈی کھولی اور ٹارچ کی روشنی میں سیلن زدہ اسٹور کے اندر جھانکا، میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ٹارچ کی ناکافی روشنی میں دکھائی دینے والے ملگجے منظر نے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ میرے بدن میں اُتار دیا تھا۔

کمرے کی داہنی دیوار کی جڑ میں چار لاشیں آڑھی ترچھی فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے زمیں بوس ہونے کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر کھالے کو دیکھا جو میری جانب پشت کیے چوکس انداز میں کھڑا اِردگرد دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے پکار دیا اور خود محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ چاروں چہروں پر باری باری ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ وہ سبھی میرے لیے اجنبی تھے۔

میں نے پیروں کے بل بیٹھ کر پہلے شخص، جس کے بدن پر بڑا سا جانگیہ اور سفید رنگ کی عام سی بنیان تھی، کی کلائی تھامی۔ نبض تھامنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اُس کے بدن میں موت کی خنکی اُتر چکی تھی۔ ٹھنڈی کلائی نے سمجھا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سرد ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیا۔ چہرے کو غور سے دیکھا تو پتا چل گیا کہ اُس کی موت سانس گھٹنے سے واقع ہوئی تھی کیونکہ اُس کے موٹے ہونٹ نیلگوں ہو چکے تھے۔ بند آنکھوں کے پپوٹوں پر نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اُس کی گردن میں رسّی کا پھندا دکھائی دیا تو میں اک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر اُٹھا اور دوسری لاش کے پاس جا بیٹھا۔ وہ زندگی میں دبلے پتلے جسم کا مالک رہا تھا۔ اِس وقت ڈھیلی سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس تھا اور اُس کی گردن میں نائیلون کی باریک مگر بہت مضبوط رسّی پھنسی ہوئی تھی۔ چہرہ نیلاہٹ پکڑ چکا تھا۔ آنکھیں وحشت

ناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔

تیسرا شخص کافی فربہی مائل تھا۔ اُس نے تہ بند اور سفید رنگ کا میلا سا سلوکا پہن رکھا تھا۔ اُس کا کسرتی بدن بھی موت کا پیرہن اوڑھ چکا تھا۔ اُسے قتل کرنے کا طریقہ بھی وہی تھا یعنی گلے میں رسّی باندھ کر پھانسی دی گئی تھی۔ چوتھا شخص خاصا لمبا تڑنگا تھا۔ اُس کا چہرہ گھنی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں میں چھپا ہوا تھا۔ سر کے بال بھی خاصے بڑے بڑے تھے۔ اِس وقت وہ کمرے کی نکڑ میں گردن کے بل یوں ڈھیر ہوا پڑا تھا جیسے اُس کا منکا ٹوٹ چکا ہو۔ گلے کی رسّی بڑے کالروں والی قمیص کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ اس کے گلے میں بھی موت کی رسّی تن چکی تھی۔

اس کے باوجود کہ میں یہاں مرنے مارنے کی نیت سے ہی آیا تھا، چار مردہ بدن دیکھ کر میرے تن بدن میں خوف کی لہریں سرسرانے لگیں۔ میرے سامنے ایک قطار میں چار انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کاٹھ کباڑ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔

اس ہولناک کمرے سے نکل کر کھالے کے پاس پہنچا، اُسے ہولے سے پکارا۔ وہ میری جانب پلٹا۔ ''ہاں! کیا ہے وہاں؟''

میں نے کہا۔ ''کھالے! کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں۔''

وہ چونکا، میرے پہلو سے نکل کر کمرے میں گیا، پلٹا تو اُس کے تن بدن میں غیر معمولی پھرتی بھری ہوئی تھی بولا۔ ''جلدی کر شہرے...... اُن کمروں کی تلاشی لیتے ہیں۔''

وہ مجھے دیکھے بغیر تیزی سے صحن کو چیرتے ہوئے قطار میں بنے ہوئے کمروں کی طرف بڑھا۔ اَب اُس نے احتیاط پسِ پشت ڈال دی تھی۔ میں ہیجان آمیز انداز میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں تین جھلنگا سی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی پر کٹی ہوئی رسیوں کے ٹکڑے اور سرخ رنگ کا دوپٹا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کر دوپٹا اُٹھا لیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''کھالے! اِہ تاں پینوں دی چنی اے......''

(کھالے! یہ تو پروین کا دوپٹا ہے)

کھالے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ اس کے ساتھ والی چارپائی کے نیچے ٹارچ کی روشنی پھینک کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں نے دوپٹے کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور چارپائی کے گرد برق رفتاری سے چکر لگایا۔ فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دکھائی دے رہی تھیں اور بلاشبہ یہ پروین کی کلائیوں سے ٹوٹ کر گری تھیں۔

کھالے نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ عقل کے ناخن لے، ہماری تھوڑی سی حماقت ہماری جان لے لے گی۔''

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ کھالے نے اچانک میرے سامنے آ کر مجھے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ وہ شاید ایسا نہ کرتا تو میں اپنے حواس میں نہ رہتا اور واقعتاً کوئی حماقت کر بیٹھتا۔ یوں لگا جیسے میں یکایک ہوش میں آ گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہمیں پروین کا ایک جوتا، ٹوٹا ہوا نقرئی کنگن اور مردانہ کھیڑی چپل کی جوڑی نظر آ گئی۔ کمرے میں دو بارہ بور کی بندوقیں، ایک پستول اور استعمال کی کئی اشیا موجود تھیں۔ فرش پر جگہ جگہ سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

کھالا بولا۔ ''یہ تو طے ہو گیا کہ پروین کو یہیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اِس چارپائی پر کسے باندھا گیا تھا؟ یہ سوچنے والی بات ہے۔''

''مگر پروین کہاں ہے اِس وقت؟'' میں تیز لہجے میں بولا۔

کھالا مجھے کھینچ کر کمرے سے باہر لے آیا۔ کمرے کے باہر پیا اور عقیل ہمارے منتظر تھے۔ پیا نے پوچھا۔ ''اس کمرے میں کیا ہے؟''

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان کُن انداز میں بولا۔ ''پوری حویلی خالی پڑی ہے۔ نکڑ والے چھوٹے کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں جو یقیناً اس حویلی میں رہنے والے حیدر خان کے غنڈوں کی ہیں جنہیں کسی نے بے دردی سے قتل کیا ہے۔ قاتل نے انہیں مزاحمت کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم سے پہلے یہاں آنے والے یا آنے والوں نے سوتے میں ہی ان کا قلع قمع کر دیا ہے۔''

''کیا تم نے یہ کمرے دیکھے ہیں؟'' کھالے نے پوچھا۔

''ہاں......'' پیا بولا۔ ہم اس دوران چلتے ہوئے صحن کے بیچ آن کھڑے ہوئے تھے۔ ''ایک کمرے میں ایسے آثار دکھائی دیے ہیں جیسے وہاں کسی لڑکی کو باندھ کر رکھا گیا ہو۔ رسیوں اور چوڑیوں کے ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ حویلی کا بڑا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔''

ہم چاروں متفکر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''مگر اِس کمرے میں، جس کمرے کی ہم

نے تلاشی لی ہے، ایسا سب کچھ ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پروین کے علاوہ بھی کسی لڑکی کو یہاں باندھ کر رکھا گیا تھا؟''

پیا نے کندھے اُچکائے۔ ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کھالا تیز تیز قدموں سے پیا کے بتائے ہوئے کمرے میں گھسا۔ چند لمحوں کے بعد اس کمرے سے نکل کر حویلی کے آخری کمرے میں گھس گیا۔

میں مایوس انداز میں اردگرد دیکھ رہا تھا۔ میری تمام تر ریاضت اکارت گئی تھی۔ حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر میں نے جن امیدوں کا دامن تھاما تھا وہ بے جان انداز میں میرے گلے سے لپٹ گئی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ میری سانسیں تنگ کرنے لگی تھیں۔ کھالے نے واپسی پر بتایا۔ ''پیا نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کمرے میں بھی کسی لڑکی کو رکھا گیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور آخری کمرے میں؟''

''وہ تو خان کا عشرت کدہ ہے۔'' اس کے لہجے میں غیر معمولی نفرت گھل گئی۔ پھر پیا کے کہنے پر ہم سب نے پوری حویلی چھان ماری۔ یہ تو حتمی تھا کہ ہم سے پہلے یہاں کوئی آیا تھا اور خان کے شاہ زوروں کی خوابیدگی کو موت کی اتھاہ گہرائی میں بدلتے ہوئے پروین سمیت دویا تین لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گیا تھا۔ کھالے کا خیال تھا کہ حملہ آور دو لڑکیوں اور ایک مرد کو حیدر خان کے چنگل سے نکال کر کہیں لے گیا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت کون تھے؟ یہ علم نہیں ہو سکا تھا۔ کوئی کلیو ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آسمان سے سیدھا حویلی میں اُترا تھا اور چار زور آوروں کو ہلاک کرنے اور تین مغویوں کو کاندھوں پر لاد کر واپس آسمان کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

پیا کا ذہن جاگ رہا تھا۔ اُس پر مایوسی کی تھکن طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے سے ایک چھوٹا سا چوبی صندوق کھینچ کر باہر نکال لایا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے مسکرا کر بتایا۔ ''اس میں جدید اسلحہ ہے، ایسا کہ میڈم دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے ناکام دورے کا مالِ غنیمت ہے......''

ہمیں حویلی میں دندناتے ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ کسی نے دخل نہیں دیا تھا۔ جہاں دن کے اُجالے میں کوئی آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، وہاں رات کے اس پہر، کسے آنا تھا۔ حویلی کا اندر مردہ ہو چکا تھا۔ حویلی کا باہر زندہ تھا مگر گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ مایوسی میرے رگ و پے میں سرایت ہو چکی تھی۔

جب پیا نے واپسی کا حکم دیا، یوں لگا جیسے میری ہمت شل ہو گئی ہوں اور واپسی کی راہیں تاریک...... میں نے کھالے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر ہو گیا۔ ''کھالے! پروین نہیں ملی۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟''

کھالے نے مجھے سینے سے لگایا، تسلی دی اور کمر میں ہاتھ ڈال کر حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسلحے والا صندوق عقیل نے اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اُس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ صندوق خاصا وزنی تھا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے، اُسی پر چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے۔ ابھی تک چہار سو دبیز اندھیرا طاری تھا۔ گاڑی میں وحید کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس حلق میں اُتاری۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا یا گہری نیند میں تھا۔ پیا کی مدد سے عقیل نے صندوق گاڑی کے عقبی حصے میں رکھا اور ہاتھ جھاڑ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہم چاروں نے لباس بدلا، غیر ضروری اسلحہ چھپا دیا اور واپسی سفر کا آغاز کیا۔ پروین کا سرخ دوپٹا میں نے اپنی جھولی میں رکھ چھوڑا تھا اور عجیب یاس بھری سرد نگاہیں اُس پر جما دی تھیں۔

پیا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بیک مرر میں میرے اور کھالے کے درمیان گردن ڈھلکائے پڑے ہوئے وحید کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بچ جائے گا؟''

میں نے غیر ارادی طور پر وحید کی نبض ٹٹولی اور مطمئن انداز میں کہا۔ ''ہاں...... یہ خطرے سے باہر ہے۔''

کھالے نے وحید کی کمر میں بازو حمائل کیا اور اُسے بڑی نرمی سے اپنی جھولی میں لڑھکا لیا۔ میں نے کہا۔ ''کھالے! وہ کون ہو سکتا ہے جس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر پروین کو حیدر خان کی حویلی سے نکال لے جانے کی جرأت کی؟''

کھالے نے کندھے اُچکائے، بولا۔ ''ہمارا کوئی نہیں...... جو بھی ہے، وہ یا تو حیدر خان سے پرخاش رکھتا ہے یا اُس دوسری لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ شہرے! اگر ہماری قسمت جاگ رہی ہے تو پھر میرا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔''

''مگر پھر وہ پروین کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟''

''بچوں جیسی باتیں کرتے ہو یار!'' کھالا حسبِ عادت جھنجلا گیا، ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔ ''اگر ہم پروین کے ساتھ کسی اور قسمت ماری کو قید میں پڑا دیکھتے تو کیا اُسے یہیں چھوڑ جاتے؟''

مجھے اپنے احمقانہ سوال پر ایک ذرا خفت ہوئی۔ میں

نے کہا۔ ''اس کا کیا قصہ ہے؟''

میرا اشارہ اُس کی گود میں پڑے وحید کی طرف تھا۔ پیا کی آواز گاڑی میں گونجی۔ ''میرو شاہ کے غنچے کا خیال ہے کہ یہ سارا اسٹیج پہلے تم نے سجایا ہے۔ کیوں خالد؟'' یہ کہہ کر اُس نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ کھالے نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ میں نے خشمگیں نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔ ''مجھے تم دونوں کا یوں ہنسنا بہت برا لگ رہا ہے۔''

کھالے نے جلدی سے کہا۔ ''تو کیا تمہاری یہ بے معانی تفتیش ہمیں اچھی لگ رہی ہے؟ تم نرے گاؤدی ہو۔ پیا جی نے سچ کہا ہے۔ کیا میں نے یہ سارا ناٹک رچا رکھا ہے جو تم مجھ سے سوال پر سوال کیے جا رہے ہو؟ جو کچھ تم نے دیکھا، وہی کچھ ہم سب نے دیکھا ہے۔ جو اندازہ ہم لگا سکتے ہیں، تم بھی لگا سکتے ہو۔''

میں نے ایک نگاہِ شکایت کھالے کو دیکھا۔ وہ بدل گیا تھا یا پھر میری نظر بدل گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کھالے یار! میں بہت پریشان ہوں۔ دیکھو! ہمارے ساتھ قسمت نے کیا کھیل کھیلا ہے۔ وحید کی نیم مردہ حالت، چار لاشوں والی خالی حویلی، ہمارا ناکام سفر...... کیا یہ سب کچھ پریشان کن نہیں ہے؟''

کھالے کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری، بولا۔ ''سامنے کی بات ہے، سمجھنے کی کوشش کرو تو سمجھ جاؤ گے۔ وحید کی یہاں موجودگی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ پروین کے ساتھ یہاں قید میں رکھی گئی لڑکی عاشی کے سوا کوئی دوسری نہیں تھی۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ خان کے غنڈوں نے وحید کو مردہ تصور کر کے یہاں بیلے میں پھینک دیا تھا کہ اِس کی لاشیں جنگلی جانور نوچ کھائیں۔ اس کی قسمت بھلی تھی کہ ہم غیر متوقع طور پر عین اُس وقت یہاں پہنچ گئے جس وقت یہ ایک ناہر (بھیڑیے) کا نوالہ بننے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تیسرا قیدی امیر نواز تھا جسے پروین کے ساتھ یہاں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اب یہاں ہم سے پہلے کون پہنچا، اُسے کس کی تلاش تھی، پروین، عاشی یا امیر نواز کی...... یہ تو اللہ سوہنا ہی جانتا ہے۔ یہ بھی علم نہیں کہ باہر سے کوئی آیا یا اندر موجود مغوی جو امیر نواز بھی ہو سکتا ہے یا کوئی اور بھی، خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا ہو اور اس نے یہ کارروائی کی ہو...... بہر حال ان باتوں کا وقت آنے پر پتا چلے گا۔''

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ شرمندگی ہوئی۔ خواہ غلط ہی ثابت ہوتی، اس کے ذہن نے اندازوں کی بنیاد پر ایک کہانی تیار تو کر ہی لی تھی جبکہ میرے ذہن نے اَب تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ تیسرا قیدی امیر نواز ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بھی نور پور سے غائب تھا۔ اُس کے پُر اسرار غیاب نے اُس کی ذات مشکوک کر دی تھی۔ اغوا کاروں نے عاشی کو جب اغوا کیا ہوگا، تب وحید بھی اُس کے ساتھ ہو گا۔ انہوں نے وحید کو بھی عاشی کے ساتھ اغوا کر لیا ہوگا تا کہ ان کی کارروائی کا عینی شاہد کسی کو کچھ بتا نہ پائے۔ حیدر خان کے پالتو غنڈے حد درجہ ظالم فطرت اور سفاک تھے۔ زندگی، عزت اور رحم ان کے قرب کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ علاقے کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ حیدر خان کے پاس اشتہاریوں اور قاتلوں کا ایک گروہ ہے جو اُس کے ہلکے سے اشارے پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ان اشتہاریوں میں سے آج چار دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔

ہچکولوں کی تال پر نئی اور آرام دہ گاڑی عازمِ سفر تھی جبکہ میرے ذہن میں خان کی سالخوردہ مگر محفوظ اور بھیانک حویلی کے مناظر جاگ رہے تھے۔ چاروں مردہ نیلگوں چہرے، ان کی گردنوں میں دھنسی ہوئی نائیلون کی سرخ ڈوری اور سکوت اور اندھیرے کا ڈراؤنا راج...... چشمِ تصور میں ایک بہت ہی جسیم اور طاقت ور وجود اُبھرا جس نے آن کی آن میں چاروں شہ زوروں کا زندگی سے ناتا کاٹ دیا اور تین قیدیوں کو اُٹھا کر چلتا بنا۔ کیا کوئی شخص اتنا دلیر ہو سکتا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چاروں پر ٹوٹ پڑنے والا کوئی ایک شخص نہ ہو بلکہ کوئی مضبوط اور ان سے بھی زیادہ ظالم فطرت گینگ ہو...... سردار حیدر خان کا کوئی دشمن بھی یہ وار کر سکتا تھا۔ اس صورت میں میری پروین ایک بھیڑیے کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے بھیانک جبڑوں میں جا پھنسی تھی۔ میں نے جب اپنے اس خدشے کو کھالے پر آشکار کیا تو وہ بولا۔ ''یہ بعید از قیاس بھی نہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص ہی تھا، دل جلا، یا کوئی من چلا...... رہی بات تین قیدیوں کو اُٹھا کر لے جانے کی، تو ممکن ہے کہ تینوں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوں اور اس کے ساتھ روانہ ہو گئے ہوں۔''

اچانک میری توجہ وحید کی طرف مبذول ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟''

پیا نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو تمہارا کیس ہے، جہاں کہو گے، وہیں پھینک کر ملتان چلے جائیں گے۔''

میں نے گاڑی کے باہر قدِ آدم پھیلے ہوئے سرکنڈوں

سے الجھتے ہوئے رات کے آخری پہر کو دیکھا، کچھ سوچا پھر پوچھا۔ ’’ہم اسے کہاں اُتار سکتے ہیں؟‘‘

’’چوک قریشی کے آس پاس......‘‘ کھالے نے جلدی سے کہا۔

’’کیا ہم اسے اپنے ساتھ ملتان نہیں لے جاسکتے؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں۔‘‘

پیا نے کہا۔ ’’نہیں شہر یار! یہ صرف یہی بتا سکتا ہے کہ اسے اور اس کی بہن کو کس طرح اغوا کیا گیا۔ ہمیں اس منظر کشی کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’تو...... پھر کیا چوک قریشی میں اتار دیں؟‘‘

’’بہتر تو یہی ہے...... مگر......‘‘

’’کیا مگر......؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ...... کہ......‘‘ پیا سوچ میں پڑ گیا۔ ’’اسے ساتھ لے جانا ہی بہتر ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اسے پھر اغوا کرلیا جائے۔‘‘

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا اندیشہ بے محل نہیں تھا۔ پھر کچھ سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ وحید کو اپنے ساتھ ملتان لے جانا چاہیے۔

ڈیرا روڈ پر چڑھتے ہی گاڑی کا میٹر سو کا ہندسہ عبور کر گیا۔ چوک قریشی، بصیرہ اور مظفر گڑھ کے باسی ابھی گہری نیند میں ہی تھے جب ہم گزر کر دریائے چناب کے پُل پر پہنچے۔ ٹول پلازے اور دریا کے پُل کے درمیان پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا۔ پیا نے گردن موڑے بغیر تیز لہجے میں کہا۔ ’’شہر یار! یہ تمہارا بیٹا ہے اور سخت بیمار ہے، اِسے ہم ڈیرہ غازی خان سے نشتر اسپتال میں داخل کروانے کے لیے لے جارہے ہیں۔ ہم بہت جلدی میں ہیں۔ او کے؟‘‘

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اسی دوران ہماری گاڑی لین میں رُک چکی تھی۔ ہم سے آگے چار پانچ کاریں کھڑی تھیں۔ ایک ویگن بھی لین میں لگی ہوئی تھی پیا بولا۔ ’’یار! یہ تو بڑی سخت چیکنگ کر رہے ہیں اور کاروں کی ڈگیاں بھی کھول کر دیکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے کسی بھائی بند نے کوئی بڑا ہاتھ مارا ہے کہیں پر......‘‘

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہماری باری آگئی۔ دونوں جانب سے وردی پوشوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ پیا کی طرف آنے والے اہلکار نے اُسے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ پیا نے شیشہ اُتار کر نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ’’بھائی! ہم ایمر جنسی میں ہیں۔ ہمارا بچہ بیمار ہے۔ اسے فوری طور پر نشتر اسپتال میں پہنچانا ہے۔‘‘

ساتھ ہی اُس نے ہماری سمت ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اہلکار نے عقبی دروازے کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنا چاہا مگر اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پیا نے فوراً لائٹ آن کی، شیشہ اُتارا اور کہا۔ ’’دیکھ لیجیے...... ہم ڈیرہ غازی خان سے آرہے ہیں۔ اپنی تسلی کرلیجیے اور خدارا ہمیں جلد فارغ کردیجیے۔‘‘

اہلکار کو بے ہوش بچہ دکھائی دیا۔ بچے کی بینڈیج بھی نظر آگئی۔ بولا۔ ’’یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟‘‘

پیا نے کہا۔ ’’یہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ یہ سردار احمد بخش کھوسا کا نواسہ ہے، میں اس کا ڈرائیور ہوں۔‘‘

سردار احمد بخش کھوسا ڈیرہ غازی خان کا معروف سیاست دان تھا۔ جونہی اُس کا نام کانسٹیبل کے کانوں میں پڑا، اُس کی تمام حسیں یکایک بیدار ہوگئیں، بولا۔ ’’ٹھیک ہے سائیں...... تم جاسکتے ہو۔‘‘

ساتھ ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص انداز میں بیریئر ہٹانے کا اشارہ کردیا۔ پیا نے دونوں شیشے چڑھائے اور گاڑی نکال لی۔ طویل سانس لے کر بولا۔ ’’نئی اور بڑی گاڑی کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے افسر پر اس کی چمک کا دبدبہ پڑ جاتا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اگر وہ سردار سے کنفرم کرلیتا تو......‘‘

ہم اس وقت چناب کے پُل کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔ وہ فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’یہ کانسٹیبل تھا۔ اگر ایس ایچ او بھی ہوتا تو کنفرمیشن کی جرأت نہ کرتا۔ ایک بات ہے...... یہ منڈا ہمارے کام آگیا ورنہ انہوں نے تلاشی لیے بغیر ہمیں گزرنے نہیں دینا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی میں اتنا اسلحہ رکھ کر گھومنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے فوراً دھر لیے جاتے۔‘‘

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے پاس جدید طرز کے اسلحے کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ حیدر خان کی حویلی سے اٹھایا گیا اسلحہ میں نے دیکھا تو نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس کی نوعیت بہت خطرناک تھی۔ پیا جی نے عام نوعیت کی بارہ بور رائفلوں اور سیمی آٹو میٹک گنوں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر ان گنوں کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی تو حویلی میں موجود گنوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں گاڑی میں رکھنے کی گنجائش بھی نہ نکل پاتی۔

ابھی رات کا اندھیرا ملتان کے در و دیوار سے لپٹا ہوا تھا جب ہم اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ ظاہر شاہ نے چیک کرنے کے بعد گیٹ کھولا۔ پورچ میں گاڑی روکنے کے بعد پیا نے کہا۔

’’شہر یار! تم اس بچے کو اُٹھا کر گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ ہم اسلحے کو اسٹور کر کے چلے جائیں گے۔ میرو شاہ سے رابطہ کر کے اُسے رپورٹ دے دینا۔ او کے؟‘‘

میں نے ’او کے‘ کہا اور گاڑی سے اُتر کر بچے کو کھینچ کر کندھے پر ڈال لیا۔ کھالا میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ گیسٹ ہاؤس کے مین لاؤنج میں کرسی پر براجمان گن مین سے میں نے میڈم اور میرو شاہ کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے وحید کو آسان سے بیڈ پر لٹا دیا اور خود صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ کھالا بیڈ پر بیٹھ کر وحید کو دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ’’کھالے! اب کیا ہوگا؟‘‘

کھالے کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا، ایک نظر وحید پر ڈالی اور کہا۔ ’’میں کیا کہہ سکتا ہوں یار؟ ایک کوشش ناکام ہوگئی ہے، دوسری کوشش بھی ناکام ہوسکتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شکست تسلیم کر کے بیٹھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم کسی بھی وقت پروین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔‘‘

تھوڑی سی تاخیر نے میری بہن کو مجھ سے نجانے کتنا دور کردیا تھا۔ اگر ہم گھنٹا بھر پہلے پہنچ جاتے تو وہ ہمیں مل جاتی۔ مجھے افسردہ اور متاسف دیکھ کر کھالے نے ہمدردی سے کہا۔ ’’غم نہ کرو شہرے خان! مجھے یقین ہے کہ پروین کے ساتھ امیر نواز ہے، وہ مر تو جائے گا مگر اُس پر آنچ نہیں آنے دے گا۔‘‘

میں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔ اس یقین کا پس منظر کوئی نہیں تھا میں نے کہا۔ ’’کھالے! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سردار حیدر خان کے کسی دشمن نے یہ کارروائی کی ہو اور وہ بھی اِسی قماش کا آدمی ہو، پھر؟‘‘

کھالے کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ تیر گئی بولا۔ ’’شہرے! تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے۔ بھلے آدمی! یہ کارروائی اکیلے آدمی کی ہے۔ اگر وہ بھی خان کے قبیل کا کوئی فرد تھا تو اُسے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ امیر نواز کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جہاں چار آدمیوں کو قتل کرچکا تھا، وہیں ایک اور قتل بھی کردیتا۔ وہ ہمارا خیر خواہ تھا یا نہیں، وہ اغوا ہونے والوں کا ہمدرد ضرور تھا۔‘‘

میں نے فون پر میرو شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کئی مرتبہ بیل بجنے کے بعد بھی فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔ میرے پاس میڈم کا نمبر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو میں اس سے اس وقت رابطہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

چونکہ ہم اپنے مشن میں ناکام رہے تھے، اِس لیے کسل مندی اور نقاہت بدنوں پر طاری تھی۔ میں نے جماہی لی، پانی کا ایک گلاس حلق سے اُتارا اور وحید کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک غلطی ہوگئی تھی۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے میں میڈیکل کٹ اُٹھانا بھول گیا تھا۔ وحید کے لیے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وحید کی نبض کی رفتار نارمل تھی۔ دھڑکن بھی ٹھیک تھی۔ وہ ٹیکوں کے گہرے اثر میں تھا اور اسے جگانا مناسب نہیں تھا۔ تبھی میں اُس کے برابر لیٹ گیا۔ کھالے نے بھی میری تقلید کی۔ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ’’شہرے خان! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری نیکی ہمارے گلے کا پھندا بن جائے۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں چونکا۔

’’اس کی آنکھ کھلے تو اسے پچھلے منظر بھول جائیں اور ہمارے چہرے یاد رہ جائیں۔ یہ ہمیں ہی اغوا کار سمجھنے لگے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’نہیں یار! یہ اتنا بھی بچہ نہیں ہے۔‘‘

میں نے اس کی آنکھوں میں تشکیک کے ڈورے بدستور لہراتے دیکھے تو میں نے کہا۔ ’’تم نے ابھی تک اپنے بارے کچھ نہیں بتایا۔‘‘

اس نے کشن سے ٹیک لگالی، سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر تک ایسی ہی حالت میں پڑا رہا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ’’میرے پاس بتانے کے لیے لمبی کہانی نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں چمن زار سے بھاگا تو میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ ایسا کوئی ٹھکانا ذہن میں نہیں تھا جہاں پہنچ کر خود کو محفوظ خیال کرلیتا۔ بس ناک کی سیدھ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، جب میں نے سوچا کہ میں آخر کب تک بھاگ سکتا ہوں، تو رُک گیا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ اُسے میں نے لاری اڈے چلنے کا کہا۔ جونہی اُس نے رکشا سڑک پر ڈالا، پولیس کے سائرن چاروں طرف بجنا شروع ہوگئے۔ اُس نے بیک مرر میں مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے عجیب حرکت کی اور رکشے کو گھما کر ایک کشادہ گلی میں ڈال لیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تم مجھے کہاں لے کر جارہے ہو؟ تو اُس نے کہا۔ ’’وہاں، جہاں پہنچ کر تم پولیس والوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔‘‘

’’میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب بھری داستان کو غور سے سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ’’شہرے خان! وہ استاد ببلو کا کارندہ تھا۔ وہ مجھے گلیوں میں گھما پھرا کر ایک کوٹھی میں لے گیا جہاں استاد ببلو کا نائب میرا استقبال کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے مجھے پناہ دی اور کئی روز تک چھپائے رکھا۔ پولیس میری

تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ زور آور نامی غنڈا اپنے جگری یار موبی کے قاتل کی تلاش میں اپنے گروہ کے ساتھ ملتان شہر میں دندناتا پھرتا ہے۔ تب مجھے پتا چلا کہ میں نے عام آدمی کو نہیں، ملتان کے ایک معروف غنڈے کو قتل کر دیا تھا۔ پھر مجھے استاد ببلو کے نائب ریاض ملغانی نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اب میرے پاس واپسی کا راستہ نہیں ہے، میں اگر نور پور جاؤں گا بھی تو پکڑا جاؤں گا کیونکہ پولیس نے اسما کا سراغ لگا لیا تھا۔ اس کے بقول پولیس کو میرا نام و پتا بھی معلوم ہو گیا تھا۔''

میں نے اس کی بات میں دخل نہیں دیا تھا۔ ہمہ تن گوش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سانس لی اور کہا۔ ''میں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس کے گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ جونہی خطرہ ٹلا، نور پور سدھار جاؤں گا۔ پھر مجھے پروین کے اغوا کا پتا چلا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی دوران مجھے استاد ببلو سے ملنے کا موقع ملا۔ تب پتا چلا کہ اس سارے گورکھ دھندے کا ماسٹر مائنڈ اور سرپرست سردار حیدر خان تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا گینگسٹر ہے۔ مجھے تحفظ کا احساس ہوا کہ اب مجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پھر کچھ دن گزر گئے۔ ایک مرتبہ مجھے نور پور جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی کہ وہاں تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرے گھر والے تو جو پریشان تھے، سو تھے، تمہارا گھر برباد ہو چکا تھا۔ میں چاچی اور چاچے سے ملا۔ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ شہرا بدنامی سے ڈر کر کہیں بھاگ گیا، کہیں منہ چھپا کر نکل گیا۔ سائیں دل جیت کا پتا چلا کہ وہ کسی نامعلوم جگہ پر چلّہ کاٹنے کے لیے چلا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر شاہ جی سے بھی ملا تھا۔ وہ تمہارے اور تمہاری بہن کے لیے بہت متفکر تھا۔ اس نے مجھے راز رکھنے کا وعدہ لے کر بتایا تھا کہ شہرے، امیر نواز، پروین اور سائیں دل جیت کا غیاب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں سردار حیدر خان کی ٹوہ لگاؤں، کہیں اس نے تو سبھی کو اغوا کر کے نہیں رکھا ہوا۔''

وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ وہ جب بھی اپنا کوئی واقعہ مجھے سنایا کرتا تھا، ایسے ہی ٹھہر ٹھہر کر، ہاتھ لہرا لہرا کر بولا کرتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''پھر؟''

اس نے پانی پیا، بھرپور انگڑائی لی اور بولا۔ ''شہرے! جب میں بہت سارے پیسے گھر والوں کو دے کر ملتان پہنچا تو اپنے پورے گروپ کو مضطرب اور برانگیختہ پایا۔ معلوم ہوا کہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے بھی بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ نہ صرف میری محبوبہ تھی بلکہ میرے چیف باس کی بیٹی تھی۔ استاد ببلو اور اس کا نائب ریاض ملغانی بھوکے بھیڑیوں کی طرح شہر بھر میں پھیل کر اسما کے اغوا کار کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ پھر پتا چل گیا کہ اسما کو میڈم شکیلہ نامی گینگسٹر نے اغوا کیا تھا۔ میڈم کا بڑا دبدبہ تھا۔ استاد ببلو سمیت سبھی لوگ اُس سے خائف رہتے تھے۔ سردار حیدر خان نے استاد ببلو اور ریاض ملغانی کو اپنی کوٹھی پر بلا لیا۔ انہیں فی الفور اسما کو بازیاب کرانے کا حکم دیا۔ اشتہاری غنڈوں کا ایک خونخوار گروہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ پورے شہر میں میڈم کے ٹھکانوں کی تلاش جاری ہو گئی ــ بالآخر اس کی کوٹھی پر ہمیں حملے کا حکم صادر ہوا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم میڈم کے پاس ہو، وگرنہ میں کبھی گروہ کے ساتھ نہ جاتا۔ چونکہ مجھے اسما کی سلامتی عزیز تھی، اس کی بازیابی میرے نزدیک دنیا کا سب سے اہم کام تھا، اس لیے میں نے سود و زیاں کا شمار نہیں کیا اور اسلحہ اٹھائے میڈم کی کوٹھی پر ہلا بول دیا۔ آگے کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔''

کھالے کی کہانی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں اپنے گروہ میں لوٹ جاؤں، میں تمہارے ساتھ میڈم کے گینگ میں شامل ہو جاؤں، یہ فیصلہ مجھ سے نہیں ہو پا رہا۔ چونکہ اسما میڈم کے قبضے میں ہے اور میں جان چکا ہوں کہ میڈم نے محض تمہاری وجہ سے سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالا ہے، اِس لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اسما کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں۔ نہ ہی یہ میرے بس کی بات ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تم اس صورتِ حال میں میرا ساتھ دو۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میڈم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اگر میں چاہوں بھی تو تمہاری اس معاملے میں مدد نہیں کر سکتا۔''

''ہاں شہرے! میں سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے اس موقعے پر میڈم کو دھوکا دیا تو وہ تمہارا خون پی جائے گی۔ ویسے بھی تمہاری رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ تجھ سکتا

ہے، جل سکتا ہے مگر بے وفائی نہیں کر سکتا۔ مگر شہرے! اب جبکہ پروین سردار حیدر خان کی جیل سے نکل چکی ہے، کیا اسما کو آزاد کر دیا جانا بہتر نہیں ہو گا؟''

''میں اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میڈم کو رپورٹ کر دوں گا۔ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہیں سردار حیدر خان پر کیوں شک گزرا؟''

اس نے یکایک سوال داغا تھا۔ میں چونک سا گیا، بولا۔ ''کیا مطلب؟ کیسا شک؟''

اُس نے سگریٹ نکالا، سلگایا اور لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا۔ کمرے کی فضا بڑی صاف ستھری تھی۔ سگریٹ کا تیز دھواں آنِ واحد میں پورے کمرے میں پھیل گیا اور سانسوں پر ناگوار بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھ کر ایگزاسٹ فین کا بٹن پش کر دیا۔

''یہی کہ پروین کو اُس نے اغوا کرایا ہے۔'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے بہ عجلت آنکھیں موند لیں۔ سائیں دل جیت میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے سوچا، کھالے کو سائیں کے بارے بتاؤں یا نہ بتاؤں، کیا مناسب رہے گا؟ پھر میں نے اپنے تئیں اس معاملے کو آئندہ کسی وقت پر موقوف کیا اور کہا۔ ''ہمارے علاقے میں اتنی بڑی حرکت کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، سیدھی طرح بتاؤ۔ کیا تمہیں ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''سردار بخت خان نے؟''

میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا۔ ''تو کیا میڈم نے؟''

میں نے کہا۔ ''کوئی اور بات کرو یار...... یہ فضول سا موضوع پکڑ بیٹھے ہو۔''

وہ بولا۔ ''یہ فضول موضوع نہیں ہے مگر خیر...... تم اس وقت کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہو تو پھر سہی۔ یہ تو بتا دو کہ تمہاری میڈم کو تجھ میں کیا نظر آ گیا ہے جو اتنا تعاون کر رہی ہے؟''

میرے پاس اس کے اس سوال کا جواب بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''کھالے! یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ میں عام سا آدمی ہوں۔ وہ اتنی امیر، بلند شوخ اور خوب

پُرلطف

بیوی: ''اگر میں پاکستان کی سب سے بڑی چوٹی K-2 پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟''

شوہر: ''ہلکا سا دھکا۔''

تین لڑکوں نے ایک لڑکی کو پروپوز کیا۔

پہلا لڑکا: ''میں تمہارے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں۔''

لڑکی: ''وہ تو سب کہتے ہیں۔''

دوسرا لڑکا: ''میں تمہارے لیے چاند تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔''

لڑکی: ''پرانا ڈائیلاگ ہے۔''

تیسرا لڑکا: ''میں تمہیں شادی کے بعد جنریٹر لگوا دوں گا۔''

لڑکی خوشی سے بولی: ''پاگل! اتنا چاہتے ہو مجھے؟''

دو عورتیں ایک درخت کے نیچے بیٹھی کافی دیر سے باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک درخت سے ایک آم گرا۔ پہلی عورت بولی۔ ''یہ آم کیسے گرا؟'' دوسری عورت کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ آم خود بول پڑا۔

''اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ تمہاری باتیں سن سن کر پک گیا تھا اس لیے گر پڑا ہوں۔''

سیکریٹری باس سے ''سر آپ ہمیشہ شادی شدہ مرد درخواست گزاروں کو ہی ملازمت کیوں دیتے ہیں؟''

باس (مسکراتے ہوئے) ''اس کی دو وجوہات ہیں۔ 1 ان کو بے عزتی سہنے کی عادت ہوتی ہے۔ 2 اس کے علاوہ ان کو گھر جانے کی بھی جلدی نہیں ہوتی۔''

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی مخانیوال

صورت ہے کہ مجھ جیسے کئی جوان خرید سکتی ہے۔ پتا نہیں اُسے مجھ میں ایسا کیا نظر آ گیا جو آج تک مجھے یا تجھے بھی دکھائی نہیں دیا۔''

وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''یار شہرے! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ تم جیسا خوب صورت اور سڈول شخص لاکھوں میں ایک ہی ہو سکتا ہے۔ گوری رنگت، شفاف اور معصوم آنکھیں، چست اور متوازن جسم...... مگر...... یہ ایسی خوبیاں نہیں ہیں جو میڈم جیسی عورت کو متاثر کریں۔''

میں ہنسا۔ ''نہ تم میڈم جیسے ہو، نہ میں اس لیے ہم اس کی ترجیحات کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ مجھ پر مہربان ہے، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔ رہی بات سونہپ (خوب صورتی) کی، تو کیا اسما تمہاری شکل وصورت سے متاثر ہوئی تھی؟''

وہ قدرے شرمسار ہو کر بولا۔ ''بڑے لوگوں کی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔''

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ کھالے کو آرام کرنے کا مشورہ دیا، وحید کا بہ غور جائزہ لیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ چونکہ میڈم کی کوٹھی میں صبح خاصی دیر سے اُترتی تھی، اس لیے میں بہ آسانی دو چار گھنٹے کی نیند حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے سونا چاہا مگر یہ میرے لیے سہل نہیں رہا تھا۔ ذہن ان گنت ہولناک اندیشوں اور واہموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں ایک ایسی ہشت پہلوی کہانی کا مرکزی کردار بن کر رہ گیا تھا جس کا کہیں انت ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان زندگی کے ناگفتہ بہ حالات میں بھی اپنی محبت کو ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ حالات ایسا کھیل کھیلتے چلے آرہے تھے کہ میں نے کسی پل بھول کر بھی غزالہ کو یاد نہیں کیا تھا۔ کجا وہ فراغت بھری زندگی کہ ہر لمحہ اُسی کی طرف دھیان رہتا تھا، کجا یہ مصروف لمحات کہ اس کی یاد بھی بھولے سے نہیں آتی تھی۔ میں پروین کی تلاش میں اس سے یکسر بیگانہ ہو گیا تھا۔ مجھے چاچا چراغ اور چچا زاد بہنوں کی یاد نے بھی کسی پل نہیں ستایا تھا۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی یاد نے بے چین نہیں کیا تھا۔ ایک وقت تھا جب میں عاشی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چوک قریشی تک کھنچا چلا جاتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس کی شکل بھی بھول چلی تھی۔ اگر یاد تھا تو بس پروین کا چہرہ جس سے میں دن بہ دن دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی ذات اس گھڑی خود غرض محسوس ہوئی۔

کھالے کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ وہ گہری نیند میں مستغرق ہو گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود سو نہیں پایا۔ پہلو بدلا اور وحید کے گرد آلود بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ بہت معصوم صورت اور خوب رو بچہ تھا مگر اِس وقت اُس کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ اس کی گردن اور چھاتی پر ننھے ننھے کئی زخم تھے۔ ٹانگ بھی زخمی تھی۔ میں نے اُس کی بینڈیج بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔ شکر یہ تھا کہ کسی بھی زخم کی اسٹچنگ نہیں کرنا پڑی تھی۔ میں نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جسم نے از حد حدت پکڑ لی تھی۔ گردن پر چپکی ہوئی پٹیوں کو چھیڑا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں آجائے۔ پھر میرے چھیڑنے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ہلکا سا کسمسایا۔ ایسے میں اُس کے ہونٹ تھوڑے سے سکڑے، ننھی سی آہ خارج ہوئی اور وہ پھر غیر متحرک ہو گیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ اَب وہ بے ہوش نہیں تھا، محض نیند اور انجکشن کی وجہ سے غنودگی میں تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے پھٹے کپڑوں کو جائزہ لیا۔ یہ بھیڑیے کے نوکیلے دانتوں کا کمال تھا۔ یہ بھی عیاں تھا کہ اُس کے جسم پر لگنے والے زخم بھی بھیڑیے کی کارستانی تھی۔ کوئی بھی زخم ایسا نہیں تھا جو انسانی ہاتھوں سے اُس کے بدن پر لگا ہو۔ پھر...... اُسے مردہ کیوں کر تصور کر لیا گیا؟

میں نے اُس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی کو چھوا۔ اس نے فی الفور ٹانگ کھینچ کر دوہری کر لی۔ وہ کسی پل بھی جاگنے والا تھا۔ میں نے اپنا منہ اُس کے کان کے قریب کر کے آواز دی۔ ''وحید...... وحید...... جاگو......''

وہ بیدار نہیں ہوا تو ناچار مجھے اُس کی ناک دبانا پڑی۔ سانسوں کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے ناک چھوڑ دی۔ اُس نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک پھٹی پھٹی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔ پھر ارد گرد دیکھنے لگا۔ ایسے میں مجھ پر نگاہ پڑی اور ٹھہر گئی۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی لمحوں کے بعد اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی لہر موجزن ہوئی جو رفتہ رفتہ توانا ہو گئی۔ وہ نہایت دھیمے انداز میں بولا۔ ''باجی...... امی...... آپ کہاں ہیں؟''

میں نے پھر پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتا رہا، پھر بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ''بھائی جان آپ......؟ شہر یار؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں وحید! میں شہر یار ہوں۔ تمہیں موت کے منہ سے نکال لایا ہوں۔ ہوش میں آؤ اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

وہ کافی دیر تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ساکت

بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی گردن اور چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔ منہ سے سسکاری نکلی اور وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عجیب سی نظروں سے اپنی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹیوں کو دیکھنے لگا بولا۔ ''میں زندہ ہوں ناں؟''

وہ ابھی تک نارمل نہیں تھا۔ اُسے پوری طرح سنبھلنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ میں نے اُس کی دل جوئی کی، پیار کیا اور یقین دلایا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اُس کی یادداشت پوری طرح لوٹ آئی وہ بولا۔ ''باجی کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، مگر یہ جانتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے، خیریت سے ہے۔''

''نہیں بھائی جان!'' اس کی آواز مزید مدھم ہو گئی۔ ''وہ خیریت سے نہیں ہے۔ وہ لوگ اُسے مار دیں گے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔''

میں نے پچکارا، پوچھا۔ ''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''وہی...... جنہوں نے ہمیں باندھ کر کمرے میں رکھا ہوا تھا۔''

''وہ کون تھے؟''

''بھائی جان......'' وہ جواب دینے کے بجائے رونے لگا۔ اس کا ننھا سا بدن ہچکیوں کے بل پر ننھے ننھے جھٹکے لینے لگا۔ میں نے کھالے کی طرف دیکھا جو سوتے میں کروٹ بدل کر نئی ٹیون میں خراٹے لینے لگا تھا۔ میں نے وحید کو سینے سے لگا لیا اور اُس کی پشت کو سہلانے لگا۔ وہ کئی منٹوں تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا پھر اچانک مجھ سے علیحدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''وہ بڑا کتا کہاں ہے؟''

میں چونکا۔ ''بڑا کتا؟''

اُس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھیلنے کو آگئیں۔ جھرجھری لے کر بولا۔ ''وہی...... جس نے میری گردن پر......''

ساتھ ہی اُس کے دونوں ہاتھ گردن سے چپک گئے۔ میں سمجھ گیا۔ وہ اُس بھیڑیے کی بات کر رہا تھا جس کے پنجوں سے اسے ہم نے چھڑایا تھا۔ چونکہ بھیڑیے کی شکل بگھیاڑی کتے سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور اس نے زندگی میں پہلے کبھی بھیڑیا نہیں دیکھا ہوگا، اِس لیے اُسے کتا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہوگا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا کہ اس کتے کو میں نے مار بھگایا ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں نے اُس پر کچھ وقت صرف کیا۔ وہ جب سنبھل گیا، اسے قید سے نکلنے کا یقین ہو گیا تو اس نے مجھے کچھ یوں اپنی روداد سنائی۔

اُس کا باپ، سجاول عشرت عرف عاشی کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتا تھا۔ عاشی کی ماں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کے دل سے اپنے خاندان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت محو نہیں ہوئی تھی۔ عاشی اپنے کسی کزن سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ حقیقت میں کوئی اُس کے ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور نفیس مزاج کی لڑکی تھی جبکہ اُس کے باپ کے خاندان میں تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ سبھی کاشتکاری کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ عاشی کی ماں چاہتی تھی کہ اُس کی شادی کسی پڑھے لکھے خاندان میں ہو۔ عاشی نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مظفر گڑھ کے ایس پی سلیم شہزاد کے بیٹے شاہد سلیم میں دلچسپی رکھتی ہے۔ دونوں بارہا مل چکے تھے اور ایک دوسرے پر اپنی پسندیدگی عیاں کر چکے تھے۔ وہ فوج میں بہ طور سیکنڈ لیفٹیننٹ ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس نے عاشی کو یقین دلایا تھا کہ جونہی اُسے کمیشن ملا، وہ اپنے گھر والوں کو عاشی کے بارے بتا دے گا اور اس کے گھر شادی کا پیغام بھجوا دے گا۔ عاشی اپنی ماں کو ایک مرتبہ ساتھ لے کر مظفر گڑھ گئی تھی جہاں اس نے بہانے سے شاہد سلیم کو بلا کر ماں سے ملوا بھی دیا تھا۔ عاشی کی ماں کو بیٹی کا انتخاب اچھا لگا تھا۔

یہی گھر میں فساد کا بنیادی سبب تھا۔ عمومی طور پر ناکامی اور مایوسی کی کیفیت میں دیہاتی لوگ پیروں کی درگاہیں اور تعویذ دھاگوں کا سہارا لیتے ہیں۔ عشرت کی ماں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود مایوسی کے عالم میں اپنی بیٹی کو سائیں جگ جیت کے مزار پر بھیجنے لگی۔

سائیں جگ جیت نیک آدمی تھا مگر منوں مٹی تلے دبا ہوا تھا۔ جو مٹی کے اوپر تھا، وہ اُس کا بیٹا سائیں دل جیت تھا جو دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس نے عاشی کا دکھڑا سنا اور اُس کی مدد کا وعدہ کیا۔ تعویذ دیے جنہیں گھول کر سجاول کو اکیس دنوں تک پلایا جانا تھا۔ عاشی تعویذ گھول گھول کر اپنے باپ کو پلاتی رہی مگر وہ بہ دستور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ سائیں دل جیت نے دوسرا پتا پھینکا۔ عشرت سے کہا کہ وہ اُس کی خاطر چلہ کاٹے گا۔ اسی امید پر وہ اپنی ماں سے رقم لاتی رہی اور دل جیت کے ہاتھ پر رکھتی رہی۔ اس نے کبھی تو کالے بکرے کا تقاضا پورا کیا، کبھی سیاہ مرغوں کی جوڑی پہنچائی اور کبھی نذر نیاز کے نام پر سیکڑوں روپوں کی قربانی دی مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔ اسی دوران سجاول نے اپنے بھانجے کے حق میں حتمی فیصلہ سناتے ہوئے منگنی کے دن کا اعلان کر دیا۔

عشرت موقع پا کر اپنے بھائی وحید کے ساتھ موٹر

سائیکل پر بھاگی بھاگی سائیں دل جیت کے پاس پہنچی۔ یہ وقت مریدوں کی آمدورفت کا نہیں تھا۔ شام کو مزار پر کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ پہنچ گئی۔ سائیں دل جیت نے اُسے دیکھا تو دونوں کو اپنے حجرے میں لے گیا اور عاشی سے پوچھا۔ ''کیا تم کسی کو بتا کر آئی ہو کہ یہاں آرہی ہو؟''

عاشی نے کہا۔ ''نہیں...... سائیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔ صرف دو دن باقی ہیں۔ کچھ کیا جاسکتا ہے تو کریں ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سائیں سے مدد مانگنے لگی۔ سائیں نے پوچھا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی تک بہت رعایت سے کام لے رہا تھا کہ کہیں اُس بدبخت کو نقصان نہ پہنچے ورنہ وہ کیا، اُس کی اوقات کیا، ایک ہی وار میں پچھاڑا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ کیا تم نے اپنی ماں کو بتایا ہے؟''

عاشی نے کہا۔ ''نہیں وہ گھر میں نہیں تھیں۔ مجھے بڑی مشکل سے یہاں آنے کا موقع ملا ہے۔ شاید دوبارہ نہیں آسکوں گی۔''

وہ اُٹھ کر اس کے بھائی کے قریب گیا اور وحید سے بھی یہی سوال پوچھا۔ جب تسلی ہوگئی تو اُس نے عاشی اور وحید کو حجرے میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور کچھ دیر کے لیے اندر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اُس نے ہاتھوں میں ایک نفیس ٹرے تھام رکھی تھی۔ ٹرے میں تین بڑے بڑے گلاس پکڑے ہوئے تھے۔ پیار سے بولا۔ ''لو...... شربت پیو۔ پھر بیٹھ کر تمہیں ایسا تعویذ لکھ کر دیتا ہوں جو فوری طور پر اپنا کام شروع کردے گا۔ دیکھنا، وہ تمہارے احمق باپ کو کیسے چند منٹوں میں سیدھا کرتا ہے۔''

اُس نے عاشی اور وحید کو گلاس تھمائے اور خود بھی بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ شربت بڑا خوش ذائقہ تھا۔ تینوں نے پی لیا تو اُس نے برتن سمیٹ لیے اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر تعویذ تیار کرنے لگا۔ عاشی اُس کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ وحید سائیں کا اشارہ پاکر اندرونی کمرے میں جاکر بیٹھ گیا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی۔ بے اختیار اُس نے صوفے پر سر ڈال دیا۔ یہی حال عاشی کا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھی رہی، پھر جماہیاں لینے لگی۔ چند ہی منٹوں میں نیند کی یلغار سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اُس کے حواس نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد کیا ہوا، کون آیا، کس نے اٹھایا، ان باتوں کا نہ تو وحید کو علم تھا، نہ عاشی کو معلوم ہوا تھا۔ دونوں کو بے ہوشی کے عالم میں حجرے سے اُٹھا کر بڑے خان کی بیلے والی حویلی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وحید کو علم نہیں تھا کہ اُنہیں کہاں رکھا گیا تھا۔ وہ محض اُس کمرے کے بارے میں جانتا تھا جہاں دونوں بہن بھائیوں کو قید رکھا گیا تھا۔ کمرے کے باہر کا ماحول کیسا تھا، اُس نے نہیں دیکھا تھا۔

وحید کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو کمرے میں بان کی چارپائی پر لیٹے پایا۔ اُٹھ کر چیخنے چلانے لگا۔ کم سن تھا، یہ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اُسے اور اس کی جوان بہن کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ باہر سے بند تھا۔ چیخ و پکار سے تھکا تو چارپائی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی اثنا میں اس کی نظر برابر والی چارپائی پر آڑھی ترچھی لیٹی عشرت پر پڑی۔ اس نے جھنجوڑ کر باجی کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ بیدار ہوگئی۔ پاگلوں کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی پھر چیخ اُٹھی۔ وہ جوان تھی، عورت ذات تھی، فوراً سمجھ گئی کہ اُس کے ساتھ بہت بڑی گڑبڑ ہوچکی تھی۔ دونوں نے بہت شور کیا، چیخ چیخ کر مدد طلب کی مگر قریب میں کوئی ہوتا تو ان کی مدد کو آتا۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولنے اور توڑنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ دروازے کی درزوں سے باہر جھانکنے پر سوائے اندھیرے کے کچھ معلوم نہ پڑا۔ کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پاکر دونوں تھک کر چارپائیوں پر گر گئے۔ زندگی کی طرح طویل رات بڑی مشکل سے گزری۔ صبح جب انہیں ناشتا دیا گیا، تب اجنبی اور خوفناک چہرے دیکھ کر ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ عاشی نے ان لوگوں کی بہت منت سماجت کی، روئی پیٹی اور خدا رسول کے واسطے دیے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا اور ناشتا لانے والے پر حملہ کردیا۔ ناخنوں اور دانتوں سے اُسے اچھا خاصا زخمی کردیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بلانے پر اس کے دو ساتھی کمرے میں آگئے جنہوں نے دونوں کو چارپائیوں پر نائیلون کی رسیوں سے باندھ دیا۔

انہوں نے پھر یہ معمول بنا لیا تھا کہ رفع حاجت اور کھانے پینے کے اوقات میں ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیتے۔ پھر باندھ کر باہر سے کنڈی لگا کر چلے جاتے۔ دو راتیں ایسے ہی گزر گئیں۔ عاشی ہر مرتبہ کھانا لانے والے سے اپنا قصور اور مستقبل کے بارے میں پوچھتی تو اُسے یہی جواب ملتا کہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔

تیسری رات کے پچھلے پہر میں دروازے کی کنڈی کھلی۔ ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے کندھوں پر

ایک لڑکی لدی ہوئی تھی جسے اُس نے وحید کے برابر والی چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش تھی اور صبح تک مردوں کی طرح پڑی رہی۔ دن چڑھے وحید کو اُس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ حویلی میں آنے والے لوگوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ مستقل طور پر حویلی میں رہائش پذیر رہنے والے چھ افراد تھے جن میں سے چار کو میں اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وحید نے بھی ان سب کے حلیے مجھے بتائے تھے۔ وہ جن ناموں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے، وحید کو وہ بھی نام یاد تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان ناموں کو ازبر کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چار تو اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوچکے تھے جبکہ باقی لوگوں سے ہمارا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔

وحید ان کے نزدیک فالتو پرزہ تھا۔ شاید سردار حیدر خان کے حکم کا انتظار تھا یا کوئی اور مصلحت کارفرما تھی کہ انہوں نے وحید کو آتے ہی موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا بلکہ اسے لڑکیوں کے ساتھ قید میں زندہ رکھا گیا تھا۔ پھر ایک دن کمرے میں ہل چل پیدا ہوئی۔ شور اُٹھا کہ بڑا خان آگیا ہے۔ سبھی ایک دم کمرے سے بھاگ نکلے۔ بڑا خان اس کمرے میں نہیں آیا تھا جس میں وحید کو باندھ رکھا گیا تھا اس لیے وہ بڑے خان کو دیکھنے سے محروم رہا تھا۔ بڑا خان وحید کے اندازے کے مطابق عاشی کے کمرے میں گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حویلی میں رہنے والے بدمعاشوں کا رویہ یک لخت وحید سے بدل گیا۔ انہوں نے نہ صرف اسے نہلایا بلکہ اچھا کھانا بھی کھلایا۔ کھانے کے بعد اسے سلور کے گلاس میں ایک شربت پینے کو دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گلاس میں پانی نہیں، آگ بھری ہوئی تھی جس نے اُس کے حلق سے شکم تک آگ لگا دی۔ ذائقہ بھی اُسے پسند نہیں آیا تھا مگر اُسے پینا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کردیا اور وحید خود کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایسے حالات سے وہ زندگی میں کبھی نہیں گزرا تھا۔ ماں باپ نے ہمیشہ پیروں تلے اپنی ہتھیلیاں رکھی تھیں اور زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھا تھا۔ تبھی نہیں سمجھ پایا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وحید کی سنائی ہوئی کہانی کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ بڑے خان نے اسے مار کر پھینک دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ تبھی اس کے کارندوں کی ہوس کے گھوڑے اچانک بے لگام ہوگئے تھے۔ جب ایک وجود کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا ہی دینا تھا تو پھر اس سے کچھ عرصہ سفلی آتش کدہ دہکائے رکھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ آنے والے کئی دنوں تک چاروں نے اس کی خوب صورتی کو اس کی بدقسمتی بنا کر اپنی اپنی بھوک غیر فطری انداز میں مٹائی اور انسانیت کی دھجیاں کسی خوف و اندیشے کے بغیر اُڑائیں۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا، کھلونا بن کر چارپائیاں بدلنا نہیں چاہتا تھا مگر برسوں عورت کے سائے تک کو ترسنے والے بھیڑیے اُس کی ایک نہیں سنتے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ وہ کبھی ہوش میں ہوتا تو کبھی لڑھک رہا ہوتا۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑتی جارہی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بے حس ہوکر رہ گیا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوکر رہ گئیں۔

پھر ایک دن اسے بھنبھوڑنے والوں کی بھوک مٹ گئی یا انہیں کوئی اور مشکل درپیش آگئی تھی کہ اسے مار پھینکنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس نے منت سماجت نہیں کی، زندگی کے لیے واویلا نہیں کیا بلکہ بڑی خاموشی اور بے پروائی سے بیٹھا ان کے درمیان اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔ یوں جیسے اُسے مارنے کا نہیں، کسی اور کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہو۔ بڑی مونچھوں والے لمبے تڑنگے شخص نے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر پھینکا۔ اس کی گردن پر دونوں ہاتھ جمائے اور جبڑا بھینچ لیا۔ وحید کو یہی یاد تھا کہ اس سے اُس کا سینہ پھٹنے کو آگیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ بے ہوش ہوگیا اور اسے مردہ تصور کرکے بیلے میں پھینک دیا گیا۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بھیڑیے کے رحم و کرم پر پایا۔ شاید اسی کے نوکیلے دانتوں کی بدولت ہونے والے تیز درد نے اُسے موت جیسی اندھی بے ہوشی سے نکالا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بھیڑیے کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اس کی چھاتی اور گردن پر بھیڑیے نے دانت گاڑے اور خون بہہ نکلا۔ جب وہ چیختے چلاتے اور مزاحمت کرتے تھک گیا تو نڈھال اور بے جان انداز میں سرکنڈے میں گر گیا۔ بھیڑیے نے اُس کی ٹانگ اپنے جبڑے میں دبوچی اور جھاڑیوں سے کھینچ کر باہر نکالا۔ وہ اُسے اپنی کچھار تک لے جانا چاہتا تھا۔ یہ وحید کی خوش بختی تھی کہ عین اُسی لمحے ہم پیا کی سربراہی میں وہاں سے گزرے اور ہماری نگاہ اُس پر جا پڑی ورنہ اس کا نازک اور کم سن وجود اب تک جنگلی درندوں کے پیٹ کی آگ بجھا چکا ہوتا۔

چونکہ وہ پوری طرح نارمل نہیں تھا، اس لیے بے ربط انداز میں اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا۔ میں اپنی سوچ کے مطابق

اس کی کہانی کے خالی حصوں کو پُر کرتا جاتا تھا۔ میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ اس نے نئی لانے والی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے اوندھے منہ چارپائی پر ڈالی گئی تھی۔ علیحدہ کمرے میں لے جائے جانے کے بعد اس نے اپنی بہن کو ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے جب وہاں کسی مرد قیدی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے کسی مرد قیدی کو وہاں لائے جاتے یا رکھے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے ایسا کچھ سنا تھا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ عاشی یا عاشی کے بعد لائی جانے والی لڑکی کو اغوا کرنے کا کیا مقصد تھا اور وہ اس کے حویلی سے نکلنے تک وہیں موجود تھیں۔ وہ مزید کوئی کارآمد بات نہ بتاسکا اور گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے بار بار اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آتے تھے۔ چونکہ میرے پاس میڈیکل کٹ نہیں تھی، اس لیے میں نے اس کے زخموں پر بندھی ہوئی پٹیوں کو چھیڑنے یا کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی سوچ کر خاموش رہا کہ دن چڑھے میڈیکل باکس منگوا کر اُس کی از سرِ نو بینڈ تیج کردوں گا اور اگر ضروری ہوا تو میڈم سے کہہ کر اسے کسی ڈاکٹر کے پاس بجوا دوں گا۔

کھالا اس رام کہانی کے دوران مسلسل خراٹے لیتا رہا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اچھا تھا کہ اس کی کسلمندی اور تھکاوٹ دور ہوجاتی اور وہ بیدار ہونے پر ہشاش بشاش ہوتا۔ میں نے پانی پیا، وحید کو پلایا پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اس وقت نور پور مکمل طور پر جاگ چکا ہوتا تھا۔ کھیت آباد ہو چکے ہوتے تھے۔ یہ چونکہ بڑا شہر تھا۔ یہاں تصنع اپنے آکٹوپس پوری طرح پھیلا چکی تھی، اس لیے لوگ آدھی رات کے بعد بستر پر گرتے تھے اور دن چڑھے جاگتے تھے۔

وحید نے میرے استفسار پر بتایا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ بھوک مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے نکلا۔ ظاہر خان کا پتا کیا۔ وہ سونے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ بڑا کارآمد بندہ تھا۔ ایک ہی وقت میں گن مین، گیٹ کیپر اور کک کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بھی خوش باش اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ اس کی جگہ پرزدار سیکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ اس سے ابھی تک میری علیک سلیک اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اسے چائے پانی کا کہہ سکتا۔ اس لیے میں گیسٹ ہاؤس کے کچن میں گیا۔ وہاں شبو کو موجود نہ پاکر اپنی مدد آپ کے تحت میں نے چائے کے تین کپ تیار کیے۔ کچن کیبنٹ میں پڑے ہوئے بسکٹ پیکر اور کریم رول اُٹھائے اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

لدی پھندی ٹرے بیڈ پر رکھی اور کھالے کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ چائے کے پیالوں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر خوشی سے بولا۔ ”واہ خانزادے! ایک دم فرسٹ کلاس...... تمہاری یہی مہربانیاں تو مرتے دم تک مجھے یاد رہیں گی۔ اوہ! تو یہ بھی جاگ گیا۔ کیسے ہو بھئی؟“

اس کی اچانک وحید پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ وحید اسے نہیں جانتا تھا مگر اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بھی میری طرح اس کا ہمدرد تھا۔ اس نے پھیکے رُو کہا۔ ”ٹھیک ہوں بھائی!“

کھالے نے بغیر منہ ہاتھ دھوئے چائے کا کپ اور ایک کریم رول اُٹھالیا۔ میں نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر وحید کو تھما دیا اور خود بھی کپ اٹھالیا۔ کھالے نے وحید کا انٹرویو لینا چاہا تو میں نے اُسے ٹوک دیا۔ ”اسے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں اس سے تمام باتیں معلوم کر چکا ہوں۔“

وحید نے کہا۔ ”مگر آپ نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں اور باجی کہاں ہے؟“

میں نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم دھیان سے ناشتا کرو۔ پھر میں کچھ دیر سوؤں گا۔ تم بھی سونا چاہو تو سو لینا ورنہ یہ ساری کہانی تمہیں کھالا سنائے گا۔“

اس نے بے چارگی کے عالم میں پہلے مجھے پھر کھالے کو دیکھا اور چائے پینے میں رُجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے تفکر اور اضطراب کی پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔ اس کے اعصاب پر سوار شراب کا نشہ بتدریج اپنا تسلط ختم کرتا جاتا تھا اور اس کی گم شدہ حسیں جاگنے لگی تھیں۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ اس کا پاگل یا نفسیاتی مریض ہو جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ وہ بہ دقت تمام بسکٹ نگل رہا تھا۔ حلق سے گزارتے ہوئے اسے شدید نوعیت کے درد کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر میرے حکم پر سرِتسلیم خم کرتے ہوئے وہ جیسے تیسے بسکٹوں کو نگل رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی صحبت نے مجھے آدھا ڈاکٹر بنا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی کافی دیر تک اس کے جسم میں اینٹھن ہوتی رہے گی۔ اس کا خون شراب طلب کرتا رہے گا اور دم بہ دم اس کی رگوں میں کشیدگی اور اضطراب کی لہریں دوڑاتا رہے گا۔ اسے انالجائسک میڈیسن کی ضرورت تھی جو فی الوقت ناموجود تھی۔

پیٹ کی آگ بجھی تو مجھ پر غنودگی نے حملہ کر دیا۔ میں نے دونوں کو باتیں کرتے چھوڑا اور لیٹ گیا۔ میرا نہ صرف بدن بلکہ ذہن بھی طویل مشقت کے بعد تھک گیا تھا۔

مجھے کسی نے جگایا نہیں تھا بلکہ میں ازخود نیند پوری ہونے کے سبب بیدار ہوا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دو بجنے والے تھے۔ کھالا صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وحید میرے بائیں ہاتھ بیڈ پر برابر میں سویا ہوا تھا۔

کھالے نے کہا۔ ”تمہیں میڈم نے بلایا ہے۔ تیار ہو کر اس سے مل لو۔“

میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ تیار ہو کر کھالے سے پوچھا۔ ”کیا تم نے کھانا کھالیا ہے؟“

وہ تلخی سے بولا۔ ”کسی نے پوچھا تک نہیں۔“

مجھے اُس کے انداز سے پتا چل گیا کہ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ چائے کا رسیا تھا۔ دوپہر تک وہ پانچ سات پیالے چائے کے پیٹ میں اُتار لیا کرتا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا! میں میڈم سے مل لوں، پھر کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

وہ مجھے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ کر جلدی سے بولا۔ ”کھانا تو آتا رہے گا، بھلے آدمی! چائے کا کچھ کرو ورنہ میرا سر دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔“

میں مسکرا کر کمرے سے نکل آیا۔ کچن میں گیسٹ روم کا اکلوتا چست وجود والا کک شبو کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے چائے تیار کر کے کھالے کو دینے کا کہا اور بالائی منزل پر واقع میڈم کے کمرے کا رُخ کیا۔ دستک کے جواب میں اس کی مترنم مگر تحکمانہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”کم اِن!“

میں نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ میڈم اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کا نفیس گلاس دبا ہوا تھا جس میں ہلکے اورنج کلر کا مشروب دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اعلیٰ قسم کی کسی ولایتی شراب سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک ذرا مسکرائی اور بولی۔ ”شہر یار! مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگوں کو جزوی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے ٹھیک سنا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی میڈم!“

”تفصیلی رپورٹ دو۔“

اس نے کہا، پھر ایک ادائے دل کشا سے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ننھا سا گھونٹ بھرا۔ میں لمحاتی طور پر اُس کے حسن کی جولانی میں کھو کر اس کا حکم بھول گیا۔ یاد آیا تو جھٹ سے ٹیپ پلیئر کی طرح بول پڑا۔ الف سے یے تک تمام شب بیتی کہہ سنائی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی، شراب سے کھیلتی رہی، پھر میرے خاموش ہونے پر بولی۔ ”یہ تو نہ سمجھ میں آنے والی سچویشن ہے۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کا سیل فون بج اُٹھا تھا۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور کال ریسیو کرلی۔ ”بول رہی ہوں۔“

دوسری طرف کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ”تم کبھی بھی سدھر نہیں سکتے میرو شاہ...... گڈ مارننگ صبح کے سلام کو کہتے ہیں، اب دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ تم نے یہ لفظ کس سے سنا ہے؟“

میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ تیر گئی۔ میرو شاہ فون پر میڈم کو گڈ مارننگ کہہ رہا تھا۔ میڈم اس کی بات بڑی توجہ سے سننے لگی۔ بیچ بیچ میں ٹوک کر کچھ پوچھ بھی لیتی پھر قدرے اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرو شاہ! تم بے دھڑک جا کر خان بازو خیل سے ملو۔ اس سے فیئر ڈیلنگ کرو۔ مخدوم جی نے تمہاری ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے، اس کا احسان ہے مگر ہمیں اپنے بزنس کی سیکریسی کا بھی خیال رکھنا ہے اور ہاں! بازو خیل پر بھی واضح کر دینا کہ مخدوم جی کا کردار بس رابطہ کرانے تک محدود ہے۔ اسے کوئی بھی بزنس سیکریٹ نہ دیا جائے۔ اوکے؟“

اس نے فون بند کر دیا۔ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”آپ نے ہماری کارگزاری کو عجیب سچویشن قرار دیا تھا۔“ میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ ”ہاں! پیا واپس چلا گیا؟“

”جی میڈم!“ میں نے کہا۔ ”اس نے کہا تھا کہ میں ہی آپ کو یا میرو شاہ کو رپورٹ دے دوں۔“

”وہاں سے جو اسلحہ ہاتھ لگا تھا، تم نے دیکھا تھا؟“

”نہیں میڈم......“

”کیوں؟ کیا تم میں تجسس کا مادہ نہیں ہے؟“

”ہے تو سہی پر اُس وقت میں بہت نروس تھا۔“

”کیوں؟ کیا تم یہ طے کر کے گئے تھے کہ اپنی بہن کو بازیاب کرا کر ہی لوٹو گے؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔

میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولی۔ ”شہر یار! جب بھی کسی کو جلانے کا ارادہ کرو تو یہ بھی دھیان میں رکھو کہ تم خود بھی جل سکتے ہو۔ خیر...... کیا وہ بچہ، جو تمہیں بیلے سے ملا، اب ٹھیک ہے؟ اس نے کیا کہانی سنائی؟“

میں نے وحید کی سنائی ہوئی داستان کو من و عن بیان

کر دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ اوپر والے پر چڑھایا، سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور کہا۔ ”کوئی فائدہ نہیں، اس کہانی میں کوئی کلیو نہیں ہے۔“

میں خاموش کھڑا رہا وہ بولی۔ ”تمہارے خیال میں تمہاری بہن کو وہاں سے نکالنے کی جرأت کون کرسکتا ہے؟“

میں اپنے تئیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا بولا۔ ”میرے خاندان میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔“

”کوئی دوست؟“

”کھالا میری خاطر اوکھلی میں سر دے سکتا ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔“

”تم نے مجھے بخت خان اور ڈاکٹر منور شاہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ تمہیں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کرسکتے ہیں؟“

میں نے ایک لمحے کو سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا امیر نواز کا باپ اس کی تلاش میں وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟“

میری نظروں کے سامنے سردار حیات خان کا بوڑھا چہرہ گھوم گیا۔ وہ دلیر تو تھا مگر اس کے جھریوں بھرے بازوؤں میں اتنا دم نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے مگر یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر اس نے مجھے اپنے خالی گلاس میں شراب ڈالنے کا حکم دیا۔ میں شراب کو پسند نہیں کرتا تھا مگر وہاں انکار کی تاب نہیں تھی۔ میں نے شیشے کی خوب صورت سی تپائی پر پڑی ہوئی بوتل کھولی، گلاس میں آگ بھری اور اسے تھما دی۔

وہ فریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس میں تھوڑا پانی ڈالو...... ٹھنڈا......“

میں نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے سامنے گلاس رکھ دیا۔ اس نے ایک گھونٹ حلق میں انڈیلا، مجھے اَدھ کھلی مدھ بھری آنکھوں سے دیکھا اور مسکرائی، بولی۔ ”شہر یار! تم نے کبھی شراب نہیں پی؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہا۔ ”نہیں میڈم! مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

وہ ایک ادا سے بولی۔ ”بن پیئے یہ رائے کیونکر قائم کی جاسکتی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پڑھا سنا ہے کہ یہ اچھی چیز نہیں۔ انسان کے حواس کو مختل کر دیتی ہے۔“

”کیا اس دنیا میں کسی کے حواس اس کے اختیار میں ہیں بھی؟“

وہ شاید بہکنے لگی تھی یا مجھے چھیڑنے کے لیے نیم باتیں کر رہی تھی۔ میں نے کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا لیا۔

اس نے شاید بھانپ لیا کہ مجھے اس موضوع سے دلچسپی نہیں، تبھی بولی۔ ”شہر یار! تمہاری راہوں میں کانٹے پھیلائے جاچکے ہیں اور تم اس وقت سخت امتحان میں ہو۔ کیا تم میری بات کو سمجھ رہے ہو؟“

میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ وہ میری نظروں کے تعجب خیز تاثر کو بھانپ کر بولی۔ ”ہاں! تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ تمہیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے خطرات کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ میں بتاتی ہوں...... ایک ذرا ٹھہرو......“

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور تین چار گھونٹ ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا، نہ تو اس نے مجھے بیٹھنے کی اجازت دی تھی اور نہ ہی میں نے بیٹھنا چاہا تھا۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی، آنکھیں موندے سوچتی رہی، پھر اَدھ کھلی آنکھیں مجھ پر مرتکز کر کے بولی۔ ”شہر یار! وہ حرام زادہ حیدر خان...... اس وقت باؤلے کتے کی طرح اپنی بانہیں کاٹ رہا ہوگا۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اس کی حویلی پر حملہ کیا اور اس کے چار قیمتی بندوں کو ہلاک کر کے مغوی لوگوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چونکہ اس کی بیٹی میری تحویل میں ہے اور اسے احساس ہوچکا ہے کہ وہ مجھ تک اور اپنی بیٹی تک طاقت اور سیاسی اختیارات کے بل پر نہیں پہنچ سکتا، اس لیے وہ کوئی اور کھیل کھیلے گا، کوئی چکر چلائے گا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے میرے معاملات طے پا چکے ہیں۔ پہلے کی طرح یہاں اپنے غنڈوں کو نہیں بھیجے گا۔ اگر بھیجے گا تو تبھی کی لاشیں وصول کرے گا۔“

وہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لکھی ہوئی کسی عبارت کو پڑھ رہی ہو۔ میں نے ’جی میڈم‘ کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ سانس لے کر بولی۔ ”وہ سمجھ رہا ہے کہ اسے مات ہو چکی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو حاصل نہ کرسکا اور نہ ہی تمہاری بہن کو اپنی حراست میں رکھ سکا۔ مجھ پر بھی کامیاب حملہ نہیں کرسکا اور نہ ہی آئندہ کرسکتا ہے۔ تم بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اب سوچو، وہ کیا کرسکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم! جو آپ سوچ سکتی ہیں، وہ میں نہیں سوچ سکتا۔“

وہ تعریف پر کھل اُٹھی، احساسِ تفاخر سے مسکرائی اور بولی۔ ”تمہیں اپنے دماغ کو وسعت دینا ہوگی ڈیئر! ہاں...... اب دندناتا ہوا نور پور میں جائے گا اور تمہارے خاندان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ تمہاری کمزوریوں پر ہاتھ ڈالے گا۔ اب تم سوچو، تمہاری ذات کے کون سے پہلو کمزور ہیں جن پر دشمن ہاتھ ڈالنا چاہے گا؟“

میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سانس رکنے کو آگئی۔ وہ واقعتاً اتنا کمینہ تھا کہ میرے خاندان پر چڑھ دوڑتا۔ مجھے اب تک یہ خیال نہیں آیا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اس نے گلاس اُٹھایا۔ ایک دو گھونٹ بچے تھے، حلق میں اُتارے اور سر جھکا کر خالی گلاس سے کھیلنے لگی۔ میں نے اس کی سوچ کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کافی دیر کے بعد سر اُٹھائے بغیر بولی۔ ”تم نور پور جاؤ، اپنے گھر والوں کو فوری طور پر وہاں سے نکال لاؤ اور محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔“

”اکیلا؟“ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

”نہیں...... اپنے دوست خالد، بیا اور عقیل کو ساتھ لے جاؤ۔ سبھی انتظامات میرو شاہ کر دے گا۔ آج رات ہی یہ کام نمٹا لو ورنہ تمام عمر پچھتاؤ گے۔ اور ہاں! نور پور میں کوئی ایسا سنسر بھی فٹ کر دینا جو وہاں کی خبریں تم تک پہنچاتا رہے۔“

”میں سمجھا نہیں میڈم؟“

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ نور پور میں کسی آدمی کو آنکھیں کھلی رکھنے پر مامور کر دو۔ وہ گاہے بہ گاہے ملتان آئے، کسی مقررہ مقام پر تم سے ملاقات کرے اور نور پور کی صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ تمہیں اپنے گاؤں سے باخبر رہنا چاہیے۔ اگر وہاں سیلولر سگنلز موصول ہوتے ہیں تو کسی کو موبائل فون لے کر دے دینا۔ اگر کوئی دوست اس کام پر راضی نہ ہو تو کسی کو خرید لینا۔“ اس نے مجھے سمجھایا۔ ”یارن خان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا۔ کیا وہاں تمہارا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو تمہارے کام آئے؟“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی میڈم! میرا ایک دوست ہے...... بڑے کام کا آدمی ہے...... مراد بخش دیوانہ......“

”ٹھیک ہے، اس سے مل لینا۔“

”وحید کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وحید؟“

الو کی نصیحتیں

کہتے ہیں ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس الو آیا اور کہا السلام علیک یا نبی اللہ علیہ السلام آپ نے سلام کا جواب دیا۔ پھر آپ علیہ السلام نے پوچھا بتا کہ تو دانے کیوں نہیں کھاتا؟ کہا اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسی دانے کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا، پوچھا تو پانی کیوں نہیں پیتا؟ کہا...... قوم نوح علیہ السلام ڈوب کر ہلاک ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں پیتا۔ پوچھا تو نے آبادی کو کیوں خیر باد کہہ دیا اور تجھے ویرانے میں رہنا کیوں پسند ہے؟ عرض کی ویرانہ اللہ تعالیٰ کی میراث ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی میراث میں رہتا ہوں۔ پوچھا کہ جب تو کسی ویرانے میں بیٹھتا ہے تو کیا بولتا ہے۔ میں کہتا ہوں، وہ لوگ کہاں گئے جو اس جگہ مزے سے رہتے تھے۔ پوچھا۔ جب تو آدمی کے پاس سے گزرتا ہے تو کیا کہتا ہے۔ عرض کی، ہلاکت ہو اس آدم پر کہ ان کو نیند کیسے آجاتی ہے۔ حالانکہ مصائب کے طوفان ان کے سامنے ہیں۔ پوچھا تو دن میں کیوں نہیں نکلتا۔ کہا انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم کرنے کی وجہ سے۔ پوچھا تو برابر بولتا رہتا ہے اس میں تیرا کیا پیغام ہے؟ کہا...... اے غافل لوگو! زادِ راہ اور اپنے سفرِ آخرت کے لیے تیار رہو۔

اس وقت آپ علیہ السلام نے فرمایا!

الو سے زیادہ انسانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد کوئی نہیں اور جاہلوں کے نزدیک الو سے زیادہ کوئی پرندہ برا نہیں۔

بحوالہ: حیاۃ الحیوان

انتخاب: طالب حسین طلحہ

قیدی سزائے موت، نیو سینٹرل جیل بہاولپور

''وہی جسے ہم بیلے میں سے اُٹھا کر لائے ہیں۔''

''اچھا...... ہاں! میں اسے زرمینا کی تحویل میں دیدیتی ہوں۔''

میں نے زرمینا کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ سونیا نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کے گھر پہنچا دیں۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا، بولی۔ ''نہیں...... ابھی اسے اس کے گھر پہنچانا مناسب نہیں ہوگا۔''

''اس کی ماں بہت پریشان ہوگی میڈم!'' میں نے سہارا لیا۔

''مجھے اندازہ ہے۔ مگر تمہیں ایسے حالات سے روشناسی نہیں ہے۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''ہر الجھن سیدھے طریقے سے حل نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کی ماں نے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی پولیس کو بلالیا، آس پاس کے لوگوں کو اکٹھا کرلیا اور تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی، وہ کہاں ہے، تو تم کیا جواب دو گے؟ تمہارے پاس تو اس سوال کا جواب بھی نہیں ہے کہ تمہیں یہ بچہ کہاں سے ملا؟ کیا بیلے کا کہو گے؟...... پولیس نے پوچھا کہ تم بیلے میں کیا کرنے گئے تھے، تو کون سی کہانی سناؤ گے...... کہا ناں کہ ابھی اسے گھر پہنچانے کا مناسب وقت نہیں آیا، جب آئے گا، تب کوئی وقت ضائع کیے بغیر اسے یہاں سے روانہ کردیا جائے گا۔ وہ یہاں محفوظ ہے، یہاں سے نکل کر محفوظ نہیں رہے گا۔ کیا میری بات کو سمجھ گئے ہو؟''

اس کی باتیں سیدھی میرے دل میں اُتر گئیں۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ بعید نہیں تھا کہ میں وحید کی ہمدردی میں پھنے خان بن کر اس کی ماں کے پاس چوک قریشی میں جاتا اور مفت میں دھرلیا جاتا۔ میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

''اگر تم اپنے اردگرد سچائیوں اور ہمدردیوں کے گلاب اگانے لگو گے تو شک اور بے یقینی کے چھتوں سے اٹھنے والی مکھیاں اپنے زہریلے ڈنک تمہارے بدن میں اتار دیں گی۔ ان کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ اور ہاں! میں آج رات، ساڑھے نو بجے دبئی کے لیے فلائی کر جاؤں گی۔ بہت ضروری معاملات ہیں جنہیں نمٹانے میں ہفتہ لگ جائے گا، زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ میرے بعد میرو شاہ تمہیں کمانڈ کرے گا۔ نہ صرف اس سے رابطے میں رہنا، بلکہ اس کا حکم بھی ماننا۔ وہ مجھے بہت پیارا ہے۔ تمہیں یہ تو یاد ہے ناں کہ تمہیں یہاں لانے والا وہی تھا؟''

میں اسے چند دن دبئی جانے سے روکنا چاہتا تھا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لیے بڑی طمانیت بخش تھی۔ میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ''میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

اس نے جو کہنا تھا، کہہ چکی تھی اور اب آنکھیں موندے، سر صوفے پر ٹکائے، لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ شراب نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال تمتما رہے تھے۔ گردن پر سرخ سرخ لہریں نمودار ہوگئی تھیں۔ اس کے حسنِ تاب ناک پر سے میری نگاہیں ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ بہت متوازن الاعضا عورت تھی۔ نہ صرف اس کی ہر ادا یکتا تھی بلکہ اس کے پاس اعتماد اور دلیری جیسے اوصاف بھی موجود تھے جو عموماً عورتوں کے ہاں نہیں دیکھے جاتے۔

اس وقت اس نے گہرے سبز رنگ کا کڑھائی دار کرتہ اور پیرٹ کلر کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ لانبے لانبے بلیک اور براؤن کلر کے امتزاجی بال بکھر کر دونوں شانوں پر سے آبشاروں کی طرح بہہ کر چھاتی پر پھیلے ہوئے تھے۔ میک اَپ سے یکسر بے نیاز گلابی چہرہ، سوجے پپوٹوں اور پلکوں والی بڑی بڑی آنکھیں، اَن چھدی ستواں ناک...... میں آنکھیں پھاڑے اس نیم خوابیدہ حسن کی زیارت میں مشغول تھا جب اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں ایک دم شرمسار سا ہوگیا۔

اس کی ناراضی کا احتمال ہوا مگر وہ ناراض نہیں ہوئی بلکہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ ''تم نے خیال کیا کہ پینے کے بعد میرے حواس مختل ہوگئے اور میں سوگئی...... ہاں؟ تبھی بے خوفی سے دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔''

میں نے کہا۔ ''جی میڈم! آپ بہت خوب صورت ہیں۔ میں نے آپ جیسا دنیا میں کوئی اور نہیں دیکھا۔''

''مرد جب بھی عورت کی تعریف کرتا ہے تو عورت کا دل گدگدانے لگتا ہے۔'' وہ ہاتھ لہرا کر بولی۔ ''وہ قریب آتی ہے تو مرد کی آنکھیں بے وفا ہوجاتی ہیں اور وہ کسی اور کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ سکندرِ اعظم بھی ایسا ہی تھا۔ ایک سلطنت کو فتح کرنے کے بعد دوسری کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔ سبھی مرد سکندرِ اعظم ہوتے ہیں؟...... ہاں، شاید نہیں...... کیا

کبھی لوگ اپنی جستجو اور فتوحات سے ایک دن تھک جاتے ہیں اپنی رکسونا کی طرف لوٹ جاتے ہیں؟''

اس کا لہجہ ٹوٹنے لگا تھا۔ آواز بھی کچھ بھاری ہوگئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! میں سکندرِ اعظم نہیں، ایک معمولی سا انسان ہوں۔''

''تم شہر یار ہو...... شہر یار بادشاہوں کا نام ہے۔ بادشاہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''مگر تم یہ سن لو، سبھی عورتیں رکسونا جیسی نہیں ہوتیں، میرے جیسی بھی ہوتی ہیں جو منہ پھیرنے والے کو ہمیشہ کے لیے اندھا کردیتی ہیں۔ آنکھوں میں سلاخیں پھروا دیتی ہیں۔ ہرجائی ماس کو کتوں کے آگے پھینکوا دیتی ہیں۔ تم جب بھی مجھ سے بے وفائی کرکے جانے لگو، یہ دھیان میں ضرور رکھنا...... میری ڈکشنری میں معافی کا لفظ شامل نہیں ہے۔''

میں اس کی بلاغت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی بڑی گہری اور عالمانہ باتیں کرتا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا مگر کبھی میڈم جیسی ہستی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ کبھی دھوکا دے کر، بے وفائی جیسے جرم کا ارتکاب کرکے یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی میں ایسے گرداب میں پھنسا تھا کہ میرے پاس کہیں جانے کا راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ یہاں سے نکل کر کہاں جاتا؟

وہ میرے چہرے کے مدوجذر کو بہ غور پڑھتی رہی، پھر بولی۔ ''تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، پتا نہیں کیوں؟ ادھر آؤ، مجھے اُٹھا کر بیڈ پر ڈال دو...... آرام سے اُٹھانا...... جیسے کوئی پھول کو بڑی نرمی سے اُٹھاتا ہے...... آؤ ناں......''

میں سن ہوگیا۔ قدم بڑھانے کی سکت نہ رہی۔ اس قتالۂ جاں کو چھونا دل گردے کا کام تھا، کجا اُسے یوں بکھرے ہوئے وجود سمیت بانہوں میں بھر کر اُٹھانا اور بیڈ پر لٹانا......

میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''میڈم! یہ بہت مشکل ہے؟''

وہ ہنسی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ کمرے میں کافی دیر تک جلترنگ بجتی رہی۔ پھر نصف برہنہ بانہوں میں اپنے سیاہ بال چھاتی پر بھینچ کر شرارت سے بولی۔ ''بہت مشکل ہے...... مگر...... میرا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں ہے، اولمپک فورتی ایٹ کے جی...... اُٹھالو مجھے...... میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔''

میں گھبرا رہا تھا۔ اس افتاد سے بچنے کی میرے پاس کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ شرارت اور دعوت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میری ہچکچاہٹ پر تلملانے کے بجائے دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''شہر یار! تم کیسے مرد ہو؟ دعوت دیتی ہوں تو گھبرا جاتے ہو۔ قریب کرتی ہوں تو دور بھاگنے کے لیے پر تولنے لگتے ہو، کیا تم جستجو اور فتح کے جذبوں سے ناواقف ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میڈم! میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گستاخی سرزد نہ ہوجائے۔''

وہ تھوڑا اوپر اُٹھی۔ ''ہوں...... میں اگر چاہوں کہ تم کوئی گستاخی کرو...... تو؟''

''میں آپ کو گنوانا نہیں چاہتا۔'' میرے لہجے سے بے بسی عیاں تھی۔

''اوہ نو......'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا آگے چلتی رہتی ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے۔ میں نہ رہوں گی تو میری جگہ کوئی دوسری آجائے گی۔ جیسے تم سے پہلے کوئی اور شہر یار یہاں کھڑا تھا۔ تمہارے انداز میں ہی باور کرا رہا تھا کہ وہ مجھے گنوانا نہیں چاہتا۔ مجھے گنوانے

کشادگی

اللہ تعالیٰ کے عام بندوں کے حقوق
رزق میں کشادگی اور عمر میں اضافے کا باعث
سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔
''جسے یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی اور اس کی عمر میں اضافہ ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ صلۂ رحمی (یعنی رشتے داروں کے حقوق ادا) کرے۔
صحیح بخاری سے اقتباس
مرسلہ: محمد قیصر شہزاد، داجل، ضلع راجن پور

لڑکا۔ ''سوئٹر اچھا پہنا ہے۔''
لڑکی۔ ''شکریہ۔''
لڑکا۔ ''میک اپ بھی بہت اچھا کیا ہے۔''
لڑکی۔ ''تھینکس۔''
لڑکا۔ ''مہندی بھی بہت اچھی لگائی ہے۔''
لڑکی۔ ''شکریہ بھائی جان۔''
لڑکا۔ ''مگر خوبصورت تم پھر بھی نہیں لگ رہی ہو۔''
مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

کے بعد کسی اور وجود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تم اس کی فکر نہ کرو...... آؤ اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر اُٹھاؤ۔‘‘

اس کی حکم عدولی کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ اسے ناراض کرنے کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں بھری دنیا میں بے چھت اور بے سہارا ہو جاتا۔ میں نے کندھے اچکائے اور قدم بڑھا دیے۔ اس نے فاتحانہ انداز میں ہنس کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسے احتیاط سے اپنی بانہوں میں بھر کر اُٹھا لیا۔ اس نے سچ کہا تھا کہ اسے اٹھانا مشکل کام نہیں تھا۔ ایک تو اس کا وزن زیادہ نہیں تھا دوسرا اس نے اپنی بانہیں میری گردن میں حمائل کرلی تھیں۔ اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا اور میری بانہیں لرزنے لگیں۔

وہ بولی۔ ’’ابھی یہیں رُکو......‘‘

میں تھم گیا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب کیا۔ میری آنکھوں میں بہ غور جھانکا، ایک نئی ادا سے میرے ہونٹوں پر پھونک ماری اور کہا۔ ’’شہریار! آئی لو یو...... تم بہت مختلف انسان ہو۔‘‘

میری سانسیں غیر معتدل ہو چکی تھیں۔ بہ دقت تمام میرے ہونٹوں سے نکلا۔ ’’تم...... مگر یہ امتحان مجھ پر بھاری ہے۔‘‘

اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی بلکہ غیر معمولی آہستگی سے اپنے سرخ تر ہونٹ میرے ہونٹوں سے مس کر دیے۔ میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ یوں لگا جیسے میرے بدن کا تمام تر خون نچڑ کر میرے ہونٹوں میں سمٹ آیا ہو۔ میں کوشش کے باوجود اپنا سر پیچھے نہ کر سکا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچانک اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر بے جان کرلیا۔ میرے جسم میں پہلے ہی جان نہیں رہی تھی، اوپر سے یہ افتاد پڑی تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا اور اسے لیے صوفے کی آرم ٹیک اور شیشے کی تپائی پر گر پڑا۔ میری داہنی کہنی کی ضرب سے تپائی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ چھناکے کی زوردار آواز میں میڈم کی تیز ہنسی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ وہ آدھی صوفے پر، آدھی تپائی کے فریم پر اور میں اُس کی ہنسی کی تال پر ہچکولے لیتے وجود پر گرا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

اچانک جلترنگ تھم گئی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ’’بس؟‘‘

مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے بازوؤں کے سوختہ اعصاب میں اپنی تمام تر توانائیاں انڈیلیں اور اُس کے ڈھیلے مگر آتشیں بدن کو ہوا میں بلند کرلیا۔ اس کا سر، زانو اور پنڈلیاں فرش کی طرف ڈھلکی ہوئی تھیں جب میں اپنے قدموں پیچھے ہٹ کر بیڈ کی طرف بڑھا۔ اُسے بڑی آہستگی سے لٹایا، بازو اس کے مرمریں وجود کے نیچے سے کھینچے اور چاہا کہ اس دہکتی ہوئی آگ سے دور ہٹ جاؤں مگر اس نے ناگاہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ وفورِ شوق سے مجھے دیکھتی رہی، دبی دبی مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی دعوت اچھالتی رہی، پھر کروٹ بدل گئی۔ بیڈ پر جوانی کے پوٹھوہار کے مقابل حسن کا ہمالیہ استوار ہو گیا۔ پہلو کے بل لیٹی ہوئی میڈم کے سڈول بدن کے اتار چڑھاؤ سے نظر ہٹانا دل گردے کا کام تھا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم کی بہکی بہکی مگر مترنم گنگناہٹ کمرے میں پھیل گئی۔ ’’سو بار جنم لیں گے، سو بار فنا ہوں گے...... اے جانِ وفا پھر بھی ہم تم نہ جدا ہوں گے......‘‘

وہ گنگنا رہی تھی۔ ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ میں نے رُخ پھیر لیا۔ ایسے ہی پل میری چشمِ تصور میں غزالہ کا وجود آن ابھرا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ سکیڑ کر شکوہ کناں ہوئی۔ ’’بس...... یہی تھا تمہارا پیار؟ کہتے تھے کہ جنم جنم سے تمہارا ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہارا رہوں گا۔ یہی کہتے تھے ناں کہ حسن دیہات میں ملتا ہے، شہروں میں میک اپ زدہ چہرے اور کھوکھلے وجود ملتے ہیں۔ پھر ایک شہزادی نے میرے ہرجائی شہریار کی سیمابی آنکھوں میں اپنی شباہت نقش کر ہی دی ناں؟‘‘

وہ سچ کہتی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا کیونکہ میں اپنی کہی پر قائم نہیں رہ پایا تھا، اَن کہی کا پہرا کیا دے سکتا تھا۔ میڈم کے حسن کا جادو مجھ پر پوری طرح چل گیا تھا۔ سانس سانس میں اُس کی خوشبو رچ گئی تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔ غزالہ کے طعنے کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، تبھی اپنی آنکھوں کی سلطنت سے اس شکوہ گو کو بھگا دیا۔ کر بھی تو یہی سکتا تھا۔

میرے عقب میں بیڈ پر شعلے اگلتا ہوا مرمریں وجود تھا۔ نظر کے سامنے شیلف میں رقص کرتی ہوئی، رنگ بہ رنگ ملبوس میں لپٹی ہوئی پتھر کی ننھی سی مورتی رقص کی حالت میں کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ یکبارگی جی چاہا کہ پلٹ کر اسے دیکھوں جسے دیکھنا عشق کی ریاضت میں شمار ہوتا تھا مگر جراُت نہ ہوئی۔ اجازت لیے بغیر کمرے سے نکلنا آداب کے منافی تھی، اجازت لینے کے لیے میڈم کو مخاطب کرنا قیامت تھا، تبھی ششش و پنج میں پڑ کر تھم گیا۔ سانسوں کی مالا میں چھپے ہوئے انتشار کو صبر کی ہوا سے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

تب میں میڈم کی گنگناہٹ تھم گئی، مدھ بھری آواز ابھری۔ ’’شہریار! میرا موبائل فون میرے پاس رکھ کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ فون پر میرو شاہ سے رابطہ کرو اور نور پور جانے کا پروگرام تشکیل دو۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔‘‘

’’جی میڈم!‘‘

صوفے پر پڑے ہوئے موبائل فون کو اٹھایا اور پہلی سی حالت میں لیٹی ہوئی میڈم کے عقب میں رکھ دیا۔ ٹوٹے ہوئے بدن کے ساتھ میڈم کے آراستہ و پیراستہ بیڈ روم کم ٹرنس سے باہر نکلا اور سر جھکائے گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ میں بے دھیانی میں اپنے ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لبوں پر ننھی ننھی چنگاریاں چپک گئی ہوں۔ میڈم نے جس وارفتگی اور شدتِ جذبات سے مجھے لمس کا اعزاز دیا تھا، وہ میرے لیے ناقابلِ بیان اور میرے قلب کی انوکھی اور شدید واردات تھی تبھی میں میڈم کے کمرے سے نکلنے کے بعد بھی اس کے حصار سے نہیں نکل پایا تھا۔

کھالا اور وحید کھانا کھا چکے تھے۔ کھالے کی جناتی اشتہا کسی انتظار کو تسلیم کرنے والی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرارت مچل گئی، بولا۔ ’’کیا بات ہے خان زادے؟ چہرے پر نور ہی نور برس رہا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میڈم نے آئندہ کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔‘‘

میرے پہلو میں میرا دل کچوکا لگا کر بولا۔ ’’کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بے وفائی کا ارتکاب کر آئے ہو۔ یہ ثابت کر آئے ہو کہ مرد ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں عورت، عورت گھومتا ہے، من مندر کے لیے نئی سے نئی مورتی تلاش کرتا ہے اور اس سفر میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ تم غزالہ کے دیوانے تھے، مگر تب تک، جب تک تم نے اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ میڈم کو دیکھ کر تمہارے عشق نے پگڈنڈی بدل لی ہے...... تف ہے تم پر!‘‘

شاید میرے اندر کی جنگ میرے چہرے سے ہویدا ہونے لگی تھی، تبھی کھالا صوفے سے اُٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میری آنکھوں میں براہِ راست جھانک کر بولا۔ ’’تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو شہرے خان! سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟‘‘

میں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ’’میں چائے کا کہہ دوں، پھر تمہیں میڈم کی پلاننگ سے آگاہ

لڑکی نے شرما کر لڑکے سے پوچھا: ”تم نے ابو سے بات کی؟“

”ہاں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے پوچھا کہ میرا بینک بیلنس کتنا ہے، میں نے کہا دس ہزار۔“

”پھر کیا ہوا؟“ لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا؟ انہوں نے وہ رقم مجھ سے اُدھار لی اور کہا کہ تم تو دو کوڑی کے آدمی بھی نہیں ہو۔“

شوکت علی قریشی، جیکب آباد، سندھ

کرتا ہوں۔ پلیز ویٹ!‘‘

وہ منہ بنا کر بولا۔ ’’پلیز ویٹ...... واہ بھئی واہ...... آ گئی ناں انگریزی بولنی اور چند دنوں تک تمہیں اپنی ماں بولی بھول جائے گی، ماں بھی ایک دن بھول جائے گی جس نے تمہیں نور پور میں جنم دیا تھا۔ پھر تم آدھے تیتر اور آدھے بٹیر بن جاؤ گے۔ نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے......‘‘

چائے پینے کے دوران میں نے کھالے کو میڈم کے تحفظات اور پیش بندی کے بارے میں بتایا۔ اس نے تائید کی اور وقت ضائع کیے بغیر میڈم کی ہدایات پر عمل پیرا ہونا ضروری قرار دیا۔ میں نے میرو شاہ کا نمبر ٹرائی کیا مگر اس نے ’بزی‘ کر دیا۔ وہ مصروف تھا۔ میرے پاس پیا کا نمبر نہیں تھا ورنہ میں اس سے بھی رابطہ کرتا۔ ایسے وقت میں وحید نے معصومانہ انداز میں گھر جانے کی ضد شروع کر دی۔ وہ اپنی ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنی بہن کے بارے میں ماں باپ کو بتانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے والدین اس کی بہن کو بہت جلد بازیاب کرا لیں گے۔ یہ غیر فطری بات نہیں تھی۔ بچے اپنے والد کو دنیا کا طاقت ور انسان سمجھتے ہیں جس کے پاس ان کی ہر مشکل کی دوا موجود ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی سمجھ رہا تھا۔ جو کچھ جانتا تھا، بہت جلد اپنی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی، اپنی مجبوری بتائی اور وعدہ کیا کہ اگلے دن اسے گھر پہنچا دوں گا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا مگر ناچار سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ نتائج میرے اور کھالے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اخذ کر لیے تھے، کچھ میری بات سمجھ لی تھی، تبھی خاموش ہو گیا۔

میں نے احتیاط سے اس کا منہ ہاتھ اور سر دھلوایا۔ میڈیکل کٹ منگوا کر اس کی پٹیاں کھولیں اور زخموں کی معائنہ

کاری کے بعد ٹنکچر لگا کرنئی بینڈیج کر دی۔ اس کے زخم گہرے تو تھے مگر خطرناک نہیں تھے۔ کندھے کے جوڑ کے زخم سے ابھی قلیل مقدار میں خون رس رہا تھا۔ دو چار مرتبہ پٹی کرنے کی ضرورت تھی، پھر کھرنڈ آ جانے پر پٹی کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس کے لباس کی حالت بہت خراب تھی مگر یہاں اس کے سائز کا سوٹ ملنا محال تھا، اس لیے اسی پر گزارا کرنا پڑا۔ اسے سکون ملا تو پھر سو گیا۔ نہ جانے اس کے دماغ کو کتنی نیند درکار تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد میرو شاہ کا فون آ گیا۔ میں نے ریسیو کیا۔ اس کی آواز کانوں میں پڑی۔ ''اڑے او غنچے! یہ نیا فساد پھوکٹ میں میری جان پر ڈال دیوے ہے، اب کے نور پور میں ریڈ کرنا ہووت۔ اڑے مروا دیا ناں لاڈے...... ادھر نفری شارٹ ہووے، ادھر ملکہ رانی کو تیرے لاڈ سوجھت ہیں۔''

''میڈم نے کہا......''

''اڑے ناں کر غنچے!'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''ماڑی میڈم نے ساری بات ماڑے کو بتا دیوت ہے۔ وہ دبئی پرواج (پرواز) کرنے کو تیار ہے اور ماڑے کو سولی پر ٹانگ دیوت ہے، ایک بات کر کے...... اپنے لاڈے کاکے کو جرمینا (زرمینا) کے حوالے کر کے تیاری کرت...... اس کالے گلاب کے پھول کھالے کو بھی تیار کر لیوت ہے۔ ماڑے کو جرا (ذرا) مصروفیت ہووے، فارغ ہو کر تیرے پاس آوت ہے۔ پھر مل بیٹھ کر پلاننگ کرت ہیں۔ اوکے؟''

''اوکے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''زرمینا کہاں ہے؟''

''وہ سالی جرورت (ضرورت) سے جیادہ (زیادہ) سووے ہے بالا خانے میں...... پر تیرے کو فکر کی جرورت نہیں ہے۔ میں سالی جرمینا کو فون کر کے تیرے کمرے میں بھیج دیوت ہے، تم کاکے کو اس کے حوالے کر دیوے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کھالا کان نزدیک کر کے اس کی باتیں سن رہا تھا بولا۔ ''یہ میرو شاہ کوئی خاص قسم کی چیز ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! توپ ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میڈم کے بعد اس سارے نیٹ ورک کا انچارج ہے۔''

''لگتا تو نہیں......'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''مگر ہے بڑی چیز......'' میں بولا۔ ''میڈم اس کی ہر بات مانتی ہے۔ اس کا ہر نخرا اٹھاتی ہے۔ وہ جس طرح میرے ساتھ باتیں کرتا ہے، بالکل اسی طرح میڈم کے سامنے بولتا ہے۔ کھالے! میڈم بڑی دھانسو قسم کی عورت ہے۔ اس کے سامنے بڑا دیکھ سوچ کے بولنا پڑتا ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''کیا بندے کھاتی ہے؟''

''ہاں...... بندے کو ایسے نگل لیتی ہے، جیسے بندہ ہو، ببل گم ہو۔''

''تمہیں نگلا؟''

''میں کیا، میری اوقات کیا؟''

''زبان کچھ اور کہتی ہے، آنکھیں کچھ اور...... جھوٹ بولنے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔''

''یار کھالے! ان باتوں کو چھوڑو، یہ سوچو، ہمیں کرنا کیا ہے؟'' میں نے موضوع بدلا کیونکہ اس کی بے مقصد طوفانی گفتگو چھڑ گئی تھی جسے روکنا ضروری تھا۔ ''کیا چاچا چراغ اور چاچی ہمارے ساتھ آنے پر تیار ہو جائیں گے؟''

وہ بولا۔ ''یہ بعد کی بات ہے، یہ دعا کرو کہ وہ خیری سلامتی (بخیر و عافیت) ہوں۔''

میرے دل سے دعا نکلی۔ ''یا اللہ! انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔'' میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتاری اور کہا۔ ''سچ پوچھو تو میں نور پور سے اودھر (اداس) ہو گیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے کئی سال ہو گئے ہوں نور پور سے نکلے ہوئے۔ وہ گلیاں، وہ گھر، وہ کھیت...... سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم یہاں آ کر غزالہ کو بھول گئے ہو۔ کیا وہ تمہارے دل سے اتر گئی ہے؟'' کھالے نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او نہیں یار! وہ میرا عشق ہے اور عشق ہمیشہ غیرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری غیرت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ جب تک پروین زندہ سلامت مجھے نہیں مل جاتی، تب تک میرے دل میں غزالہ تو کیا، کوئی اور خیال بھی نہیں آ سکتا۔''

''میڈم کا خیال بھی نہیں آ سکتا؟''

میں کہنے لگا کہ ہرگز نہیں، پھر یاد آ گیا کہ میں اس وقت میڈم کی کوٹھی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ طلسم کدہ تھا۔ کیا خبر کہ یہاں ہونے والی گفتگو بھی میڈم کے کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا۔ ''میڈم کی بات اور ہے، وہ نہ صرف میری محسنہ ہے بلکہ وہ مجھے اہمیت دیتی ہے۔''

''کیا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟'' کھالے نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ہر آن کوئی حساس

موضوع چھیڑنے پر آمادہ تھا۔ اس نے ٹھوکا دیا۔ ''بولتے کیوں نہیں؟''

''میں اس قابل نہیں ہوں کہ میڈم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ وہ آسمان ہے، میں زمین ہوں۔ ہمارا کوئی جوڑ نہیں مگر میں اس کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔''

''کب تک؟'' اس نے مزہ لیا۔

''تمام عمر۔''

''کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟''

''ہاں!'' میں نے تیقن سے کہا۔

''اسما سے زیادہ؟''

''ہاں! اسما اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔''

اس نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''خیر یہ تو نہیں ہو سکتا مگر چلو تمہارا دل رکھنے کو مان لیتا ہوں۔''

وہ اسما کا عاشق تھا۔ کیسے میری بات مان لیتا۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں اسما کی یاد ستانے لگی ہے؟''

وہ جل کر بولا۔ ''یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ تمہاری میڈم نے اسے قید کر رکھا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے......''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ مجھے احتمال تھا کہ وہ روانی میں کوئی اول فول نہ بک دے، تبھی میں نے فوراً کہا۔ ''نور پور میں موبائل فون کی سہولت نہیں ہے۔ کارڈلیس فون بھی چند لوگوں کے پاس ہیں جن سے رابطہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، ان سے کچھ پوچھا نہیں جا سکتا۔ اگر ہم وہاں دیوانے سے مل لیں، اسے ملتان آ کر رپورٹ دینے پر آمادہ کر لیں تو اسے کس جگہ پر بلائیں گے؟''

وہ بولا۔ ''اسی کوٹھی میں بلائیں گے، اور کہاں؟''

''میڈم کو یہ گوارا نہیں ہوگا۔''

''تو اسے شاہ شمس کے دربار پر بہ آسانی ملا جا سکتا ہے۔'' اس نے راہ سجھائی۔

''ڈاکٹر شاہ جی سے بھی ملیں گے۔''

''تم پاگل ہوئے ہو، کیا آدھی رات کو ہم لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھریں گے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حیدر خان کا بڑا بچہ، سردار وریام خان ہمارا شاندار طریقے سے ...ت کرنے کے لیے جاگ رہا ہو اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''وہ ہمیں کیا کہے گا؟'' میں چونکا۔

''وہ اسما بی بی کو اپنی نونہہ (بہو) بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی غیرت پر تم نے چوٹ ماری ہے، وہ تمہارا خون پی جائے گا۔''

''میں نے؟''

''ہاں تم نے......'' اس کے لہجے میں بہت خفگی تھی۔ ''جو بات حیدر خان تک پہنچ جاتی ہے، سمجھو وریام خان کے کانوں میں پڑ جاتی ہے۔ حیدر خان کی وفاداری میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ پروین اور اسما کے اغوا کی کڑیاں ملائی جا چکی تھیں اس لیے یقینی طور پر اب تک نور پور کی فضا مجھ پر تنگ کی جا چکی ہوگی۔ غنیمت تھا کہ سائیں دل جیت کی لاش جل کر خاک ہو گئی تھی اور اس کے قتل پر ہمیشہ کے لیے مٹی پڑ گئی تھی ورنہ اس کے گرگے اور بہی خواہ بھی میری تکا بوٹی کرنے کے لیے تڑپ رہے ہوتے۔

میرا رُخ اَدھ کھلے دروازے کی طرف تھا۔ چست جامنی لباس والی ایک سرو قامت لڑکی گیلری میں رُکی، کمرے میں جھانک کر بولی۔ ''مسٹر شہریار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اندر آ گئی۔ سونیا نے کہا تھا کہ زرمینا بہت حسین و جمیل ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہتا ہے۔ آنے والی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ زرمینا ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ جدید وضع کا گہرا جامنی لباس، کھلے اور گولھوں تک کمر کا احاطہ کیے ہوئے جھرنے جیسے ہلکے براؤن بال اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں...... اسے دیکھنے کے بعد واقعی کچھ اور دیکھنے کی طلب نہیں رہتی تھی۔ میں نے از راہِ اطمینان دریافت کیا۔ ''تم زرمینا ہو ناں؟''

وہ مسکرائی۔ ''جی...... میرو شاہ نے کسی بچے کو لے جانے کا حکم دیا ہے۔ کیا وہ یہی ہے؟''

اس کا اشارہ بیڈ پر پائنتی کے رُخ لیٹے ہوئے وحید کی طرف تھا۔ میں نے 'ہاں' کہا تو وہ بولی۔ ''اسے جگائیں، میں اسے اوپر لے جاتی ہوں۔''

ایسے میں کھالے کی نظر اُس پر پڑی۔ یوں لگا جیسے وہ نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس کی ندیدی آنکھیں اپنی پوری وسعت میں پھیل گئیں۔ منہ بھی کھل گیا۔

زرمینا وحید کی طرف متوجہ تھی اس لیے کھالے کا گستاخ انہماک دیکھ نہ پائی بولی۔ ''اس کے کپڑے بہت گندے ہیں، کیا بازار سے دو تین سوٹ منگوا لوں؟''

شاید وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ اتنا اہم تھا کہ اس

کے لیے کپڑے خریدنے کا تردد کیا جائے، میں نے جواب دیا۔ ''اگر ممکن ہو تو ضرور منگوا لینا۔''
میں نے وحید کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اسے زرمینا کے ساتھ جانے کا کہا تو اس کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میری موجودگی میں اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوری تھی، اس لیے اسے بہلا پھسلا کر زرمینا کے ساتھ بھیج دیا۔ قیامت کی طرح ہم دونوں پر ٹوٹ پڑنے والی زرمینا ایک ادائے بے نیازی سے وحید کا ہاتھ تھامے لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو میں نے کھالے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ''ابے او بے اوقات، نظر باز کی اولاد! اب جاگ جاؤ، جانے والی جا چکی ہے۔ تم نے شاید یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسابی بی سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی خوب صورت نہیں ہے۔''
وہ چونکا اور لمبی آہ بھر کر بولا۔ ''یار یہ تو بزی پُری (بالکل) نیلم پری تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا......''
میں نے حسبِ روایت اس کی بات کاٹ دی۔ ''کہ جیسے دنیا اس کے پیروں میں سمٹ آئی ہو، جیسے اس کے سامنے اسا جیسی سیکڑوں لڑکیاں پانی بھرنے پر لگ گئی ہوں......''
اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کا طوفانی مکا میرے کاندھے پر پڑتا۔ کم بخت کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ گرز کی طرح پڑتا تھا، وہیں نیل ڈال دیتا تھا۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ ''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی ایک ہزار دو تیس لڑکیوں پر...... اسابی بی کو ایسی پر کٹی لڑکیوں کے ساتھ نہ جوڑا کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔''
میرا قہقہہ اس کے غصے کو آنچ دینے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے دروازے میں میر و شاہ کی جھلک دکھائی دی۔
اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی اپنی مہین سی بانہیں کھول کر پُرتپاک انداز میں نعرہ لگایا۔ ''او ماڑے غنچے...... او ماڑے لاڈے...... بڑا نکھر جاوت ہے میڈم کے محل میں گھس کر......''

•:••:•

میر و شاہ کی ہدایت پر جب میں، کھالا اور پیا مظفر گڑھ کی نواحی بستی بصیرہ میں میڈم کے خاص کارندے سردار انصر حیات کے ڈیرے پر پہنچے، تب سات بج چکے تھے۔ چونکہ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا اس لیے شام جلد ڈھلنے لگی تھی۔ سات بجے ہی معمول کے مطابق دیہاتی فضا پر اندھیرے کے تسلط کی ابتدا ہو چکی تھی۔
سردار انصر کا ڈیرا بستی سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ پیا کی پہنچائی گئی معلومات کے مطابق یہاں اس کا پندرہ ایکڑ زرعی رقبہ تھا جس کے عین وسط میں اس نے شاندار وضع کا ڈیرا تعمیر کر رکھا تھا۔ اس کی رہائش بصیرہ بستی کے قریب میں واقع تھی۔ پیا نے بتایا کہ اس کی تین مربع زرعی اراضی جنوب میں گودر کے موضع میں ہے۔ سردار انصر کا یہ ڈیرا عمدہ اور جدید طرز کے گیسٹ ہاؤس کا درجہ رکھتا تھا۔ پتا چلا کہ میرو شاہ نے اسے ہماری آمد کی خبر کر دی تھی، تبھی وہ ہمارا منتظر تھا۔ ڈیرے پر دو دیہاتی حلیے کے نوکر موجود تھے جنہیں اس نے مہمانوں کی خاطر تواضع کا حکم صادر کیا اور ہمیں ایک نسبتاً بڑے اور محفوظ کمرے میں پہنچا دیا۔
طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں یہاں سے بارہ بجے کے بعد کسی وقت نکلنا تھا۔ چونکہ نور پور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور ہمارے پاس بھی نئے ماڈل کی اسوزو ٹروپر گاڑی تھی جو ہمیں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹوں میں یہاں سے نور پور پہنچا سکتی تھی، اس لیے بجائے ملتان میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے، میر و شاہ نے یہاں آرام سے بیٹھنے کا حکم صادر کیا تھا۔
سردار انصر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''سائیں! یہاں سب کچھ موجود ہے۔ ان کے بانی (کھانے) کا انتظام میں نے کر رکھا ہے۔ پینے پلانے کا اہتمام بھی ہے۔ ادھر فوٹو شوٹو بھی دیکھ سکتے ہو......''
اس نے کمرے کے کارنر میں رکھی ٹی وی ٹرالی کی طرف ہنس کر اشارہ کیا، پھر بولا۔ ''سائیں! یہ شہر تو نہیں ہے مگر یہاں میں نے شہر کی ہر رونق اکٹھی کر رکھی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ صرف پی ٹی وی نظر آئے گا، ہر چینل دیکھا جا سکتا ہے۔''
میں سمجھ گیا کہ اس نے ٹی وی پر ڈش ریسیور لگا رکھا تھا۔ اس نے ہمیں ڈیرے کے بارے میں معلومات دیں، سینے پر روایتی انداز میں ہاتھ رکھا اور اجازت چاہی۔
اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا۔ ''یہ بڑا من موجی آدمی ہے۔ اس نے سچ کہا ہے، یہاں سب کچھ ملتا ہے۔''
ابھی وہ ہمیں اس کے بارے میں بتا رہا تھا کہ نوکروں نے کمرے کے وسط میں دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ کھانا واقعتاً پُرتکلف اور مزیدار تھا۔ اصیل مرغ کا بھنا ہوا نمکین گوشت، تنوری روٹیاں، دیہاتی انداز سے تیار کیا ہوا سلاد، مکھن اور اُبلے ہوئے دیسی انڈے...... کھانے کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ اس سے بہ آسانی چھ سات آدمی سیر شکم ہو سکتے تھے۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی پیا نے ایک نوکر کو دبا کر کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ نوکر نے روایتی انداز میں جھک کر سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''حکم دی تعمیل تھیسی سائیں......''
(حکم کی تعمیل ہوگی میرا سائیں!)
کھالے کی آنکھیں جل اُٹھیں جب اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسکاچ کی میڈیم پیک بوتل اور شیشے کے گلاس دسترخوان پر رکھ دیے۔ پیا نے برف کی فرمائش کی۔ نوکر نے فریج سے برف کے ننھے ننھے ٹکڑے، اسٹیل کی ٹرے اور پانی کی یخ بستہ بوتل بھی نکال کر پیش کر دی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ان کی محفل چھوڑ دی اور چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ کھالا اور پیا بہ دستور وہیں بیٹھے رہے۔ مجھے ایک نیا کھیل دیکھنے کو ملا۔ پیا نے اسکاچ کی بوتل کھولی۔ دو گلاس آدھے آدھے بھرے، چمٹی کی مدد سے ان میں برف کے ننھے ننھے چوکور ٹکڑے بڑی نفاست سے ڈالے اور تھوڑا سا پانی شامل کیا۔ جام تیار ہو چکا تھا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے، لبوں سے لگائے اور مزہ لینے لگے۔
انہوں نے اس عمل کو اس وقت تک دہرائے رکھا جب تک بوتل خالی نہیں ہو گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پوری بوتل چڑھا لینے کے باوجود دونوں پوری طرح اپنے حواس میں تھے اور وہ بہکے ہوئے ہرگز نہیں تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان کی مے نوشی کی وجہ سے آج کا مشن التوا میں نہ پڑ جائے، مگر خیر گزری کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر چارپائیوں تک آئے اور پھیل کر بیٹھ گئے۔
کھالا بولا۔ ''خانزادے! تھوڑا او کھا تھی تے ایں ڈبے کوں کھلا بجا کر......''
(خانزادے! تکلیف کرو اور اس ڈبے پر لعنت بھیج دو)
اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر ٹی وی اور ڈش ریسیور آن کر دیا۔ وہ ریموٹ کنٹرولر اُٹھائے چارپائی پر آن بیٹھا اور عادتاً چینل بدلنے لگا۔ کھالے کو موج مستی والا چینل درکار تھا تبھی 'آگے' کا نعرہ بار بار بلند کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک مقامی نیوز چینل پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ بریکنگ نیوز نشر کی جا رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کی پُرہیجان آواز ٹی وی کے اسپیکروں سے نکل کر کمرے میں پھیلنے لگی۔ وہ بتا رہی تھی کہ غازی گھاٹ کے قریب دریائے سندھ کے بیلے میں پولیس کا اشتہاریوں کی خفیہ پناہ گاہ پر چھاپہ، چار ڈاکو ہلاک، ایک سپاہی اور ایس ایچ او زخمی...... تقریباً یہی الفاظ اسکرین کے نچلے حصے میں بہ طور سلائیڈر چل رہے تھے۔ اسکرین پر تھانے کی حدود میں چارپائیوں پر رکھی ہوئی ڈاکوؤں کی لاشیں دکھائی جا رہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ کھالا اور پیا بھی چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ جونہی اسکرین پر ڈاکوؤں کے چہرے دکھائے گئے اور ان کے سروں کی مقررہ قیمتیں بتائی گئیں، ہم بری طرح چونک گئے۔ وہ چاروں وہی تھے جنہیں ہم نے حیدر خان کی خفیہ حویلی کے اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھا تھا۔
میرے لبوں سے نکلا۔ ''یہ کیا کھالے! یہ تو وہی ہیں جنہیں کسی نامعلوم آدمی نے رتی کا پھندا دے کر قتل کیا تھا۔''
کھالے نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور توجہ سے دیکھنے لگا۔ اسکرین پر زخمی ایس ایچ او اٹک اٹک کر بتا رہا تھا۔ ''ہمیں ان ڈاکوؤں کی موجودگی کی مخبری ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے بہت بڑا کریمنل گینگ بنا رکھا تھا اور جو بڑی بڑی وارداتیں کرنے میں مشہور تھا۔ ان لوگوں پر اَن گنت مقدمات درج تھے اور حکومت نے ان کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر اٹھارہ لاکھ روپے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ ان سے کئی مرتبہ ہماری مڈبھیڑ ہوئی مگر یہ ہر مرتبہ جُل دے کر نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم نے مخبری کے بعد اپنے ریڈ کو بالکل خفیہ رکھا۔ ایس پی صاحب نے نفسِ نفیس ہماری رہنمائی کی اور میرے ساتھ تھانہ چوک قریشی کے سات دلیر اور محب وطن اہل کاروں نے ریڈ میں حصہ لیا۔ ہم نے جب ان کا گھیراؤ کیا تو انہیں متعدد بار ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کرنے کی پیش کش بھی کی۔ بار بار مائیکروفون پر اعلان کیا مگر انہوں نے مورچے سنبھال کر ہم پر فائر کھول دیا......''
وہ اپنی بہادری کی داستان بڑے جوش و خروش سے سنا کر اسکرین سے اوجھل ہو گیا۔ دوسرا زخمی اہلکار اسکرین پر نظر آیا۔ ایک مرتبہ پھر کیمرامین نے کیمرا مردہ ڈاکوؤں پر فوکس کیا۔ نیوز رپورٹر نے اپنی اینکر کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ چاروں ڈاکو پولیس کی گولیاں لگنے سے ہلاک ہوئے ہیں۔ میں نے آنکھیں مزید کھولیں، غور سے دیکھا تو ڈاکوؤں کی بنیانوں اور کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے دکھائی دیے۔
کھالا بولا۔ ''لگتا ہے کوئی تین چار کلو کا ککڑ (مرغا) حلال کر کے خون چھڑکا گیا ہے۔''
وہ خون مرغے کا تھا، یا کسی جانور کا، بہر حال ان کا نہیں تھا کیونکہ مردوں کے بدن میں گولیاں تو اُتاری جا سکتی ہیں مگر خون نہیں نکلتا۔
پیا بولا۔ ''یار یہ لوگ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے

ہیں، یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے پوری سروس میں محض جھوٹ بولنا ہی سیکھا ہے۔ زخمی اہلکاروں کو نہ جانے کس طرح ان لوگوں نے زخمی کیا ہوگا۔''

کھالا بولا۔ ''ان لوگوں کو مفت میں اٹھارہ لاکھ روپے کا انعام مل گیا ہے، دیکھو تو...... اللہ توبہ ہے بھئی......''

نوکر نے میرے سامنے چائے کا بڑا پیالہ اور دونوں عیش کوشوں کے سامنے آم کے اچار سے بھری چھوٹی سی پلیٹ رکھ دی۔ کھالے کی سنگت نے یہ سمجھا رکھا تھا کہ اچار کھانے سے شراب کے نشے میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اس لیے مجھے ان دونوں کو عورتوں کی طرح اچار کی ڈلیاں چوستے دیکھ کر مطلق حیرانی نہیں ہوئی۔ میری توجہ ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھی جہاں ڈی ایس پی کے بعد مظفر گڑھ کا ایس پی اپنے بہادر اہلکاروں کی تعریف کر رہا تھا اور محکمانہ انعامات و اعزازات کا اعلان کر رہا تھا۔

کیمرے نے زوم ان کیا۔ اب جو شخصیت اسکرین پر نظر آئی، اس کو دیکھ کر یکبارگی میرا خون کھول اُٹھا۔ وہ سردار حیدر خان تھا جو عادتاً اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کڑک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''ان ظالم درندوں نے میرے حلقے کے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ان کی وارداتوں کی شکایات میرے حلقے کے لوگ بارہا مجھے کر چکے تھے۔ میں نے ذاتی طور پر ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو درخواست کی کہ ان لوگوں کا قلع قمع کیا جائے۔ آج جب مجھے پتا چلا کہ جناب ایس پی صاحب کی زیرِ نگرانی ایس ایچ او نے کمال دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گینگ کو تہس نہس کر دیا ہے، تو میں نے اور میرے حلقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور پولیس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے ان سرکاری اہل کاروں کو جنہوں نے اس ریڈ میں حصہ لیا، بیس بیس ہزار روپے بطور انعام دینے کا اعلان کرتا ہوں۔''

میرا جی چاہا کہ میں ٹی وی اسکرین توڑ دوں۔ وہ بہت بڑا جھوٹا اور کمینہ صفت انسان تھا۔ اس نے اپنے اتنے بڑے نقصان سے بھی سیاسی فائدہ کشید کر لیا تھا۔ اب تک اس کے کارندے اس کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر عوامی حلقوں میں پیش کرنے لگے ہوں گے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے نہ صرف ان لاشوں کو ٹھکانے لگا لیا تھا بلکہ قانون اور علاقے کی نظروں میں اپنا قد بھی بڑا کر لیا تھا۔

کھالا بولا۔ ''یہ ہوتی ہے سیاست...... دیکھو...... کیسا پانسا پلٹا ہے شیر کے بچے نے! پر اندر کا بھانبڑ اس کی روح کو جلا رہا ہوگا۔''

پیا نے دانش مندانہ انداز میں کہا۔ ''نہیں کھالے! اسے کارندوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ دو چار اور اشتہاری بھرتی کر لے گا۔ ان اشتہاری ڈاکوؤں کی زندگی کی قیمت بہت کم ہوتی ہے۔ جب بھی مرتے ہیں، کتے کی موت مرتے ہیں۔''

''کیا تم بھی اشتہاری ہو؟'' کھالے نے اسے دیکھا۔

''تو اور کیا...... جب میں ڈاکو ہوا کرتا تھا تو میں نے بڑی بڑی مونچھیں اور ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جب میڈم کے پاس آیا تو اس نے مجھے جنگلی سے شہری بنا دیا۔ میڈم نے مجھ پر احسان کیا، میری شکل میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کرا دی، میرا نیا شناختی کارڈ بنوا دیا اور مجھے نئی شناخت دے دی۔ اب میری پہلی پہچان ختم ہو چکی ہے۔ نیا نام، نیا کارڈ اور نئی زندگی...... اور یہ سب کچھ میڈم کی دین ہے۔''

میں نے پلٹ کر ایک ذرا غور سے اسے دیکھا۔ شکل میں تھوڑی بہت تبدیلی کیسے ممکن تھی؟ پھر نگاہوں میں میڈم گھوم گئی۔ سوچا، اس کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہوگا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز بدل گئی۔ کسی اور علاقے کے خبر چل نکلی۔ وہ بھی پولیس مقابلے ہی کی تھی۔

پیا نے کہا۔ ''اور دیکھو...... یہاں بھی سردار حیدر خان کا کوئی بھائی بند موجود ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ چونکہ اس پولیس مقابلے کے پس منظر سے میں پوری طرح واقف تھا، اس لیے اس پر جھوٹ کی اتنی بڑی عمارت کی تعمیر دیکھی تو اب تک سنے اور ٹی وی پر دیکھے جانے والے بھی پولیس مقابلے میری نظر میں مشکوک ہو گئے تھے۔ لوگ سچ کہتے تھے کہ بڑے لوگوں کی باتیں غریب عوام کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ وہ ایک تیر سے دو نہیں، کئی کئی شکار کرتے ہیں اور پھر چہرے پر معصوم تبسم لیے ہیرو بن جاتے ہیں۔ مجھے حیدر خان کے نام سے گھن آنے لگی۔ نفرت سے ہونٹ سکیڑے اور چینل بدل دیا۔ اب کسی انڈین چینل پر ہیجان خیز رنگوں میں لپٹی جوانی تھرکنے لگی۔ کھالے نے نعرہ لگایا۔ ''بس بابا بس...... یہیں دو گھڑی سکھ کا سانس لینے دو ہمیں۔ کیوں پیاجی؟''

پیاجی نے بھی اس کی بے طرح کی حمایت کر دی تو میں نے ریموٹ کنٹرولر چارپائی پر رکھ دیا اور سرہانے پر سر ڈال دیا۔ سردار حیدر خان کو بس نظر ڈال کر اپنے درپیش مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہم تینوں اس وقت جدید اسلحے سے لیس تھے۔ عقیل میر وشاہ کے کسی اور مشن میں مصروف تھا اس لیے

ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ بڑی گاڑی میں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم واپسی پر تمام لوگوں کو ساتھ لا سکیں۔ میر وشاہ نے گل گشت کالونی میں ایک کرائے کے بنگلے کا انتظام کر دیا تھا اور اس کا پتا پیاجی کو سمجھا دیا تھا۔ اس نے بڑی سختی سے حکم دیا تھا کہ اگر میرے گھر والے نرمی سے آنے پر رضا مند نہ ہوں تو انہیں زبردستی گاڑی میں لاد لیا جائے۔ ان کا وہاں رہنا اب کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔ انہیں پہلے سردار النصر کے ڈیرے پر پہنچایا جائے، پھر موقع ملتے ہی ملتان شفٹ کیا جائے۔ اس نے اور بھی بہت سی ہدایات سے ہمیں نوازا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ خالہ کبریٰ اور غزالہ کو بھی نور پور سے نکال لاؤں یا انہیں وہیں رہنے دوں۔ بہ ظاہر تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا مگر سردار حیدر خان کی سفاک فطرت سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ چونکہ حیات خان اور وریام خان اس کے بہت قریبی ساتھی تھے جن کے توسط سے اسے میرے اور غزالہ کے باہمی تعلق کی نوعیت کا پتا چل سکتا تھا اور اس کے تمام تر غصے کا بہاؤ اس طرف ہو سکتا تھا، اس لیے میں کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔

ایک وقت تھا، جب میں سمجھتا تھا کہ ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والا ایک عنصر لاقانونیت کا ہے مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ آج جب میں نے نیوز چینل کی ڈاکومنٹری دیکھی تو یقین ہو گیا کہ اس معاشرے میں سب کچھ ممکن ہے اور لاقانونیت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کچھ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ یہاں پیسے والا، اختیارات والا رات کو دن اور دن کو رات بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ قانون اس کے چونچلوں کو تحفظ دیتا ہے۔ اس کے لیے انسانوں کے خون کو بھی پانی بنا کر گلاسوں میں بھر دیتا ہے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میرے ماں باپ کے بہیمانہ اور اندھے قتل پر پردہ کیسے پڑ گیا؟ بھری دنیا میں کسی کو بھی پتا نہ چلا کہ انہیں کس نے اور کیوں قتل کیا تو میں پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آج سمجھ میں آ گیا تھا کہ ان دونوں کو بھی کسی ایسے ہی شاہ زور نے مروا دیا تھا جس کا قانون کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ دیہاتیوں کو اکثر یہ کہتے سن رکھا تھا کہ خون کبھی چپ نہیں رہتا۔ ناحق قتل چھپا نہیں رہتا۔ میرے والدین کا قتل زمانے کی گرد کے نیچے دب کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا تھا۔ کچھ بھی تو پتا نہیں چلا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے اپنے علاقے کے تمام بڑے زمینداروں اور سیاست والوں پر شک کی نگاہ ڈالی اور سوچا کہ ان میں سے ہی کوئی ان کا قاتل ہو سکتا ہے جس کے ظلم نے یتیمی میری قسمت کر دی تھی۔ وہ سردار حیدر خان بھی ہو سکتا تھا، وریام خان بھی اور...... وسیب کا کوئی اور وڈیرا بھی......

بارہ بجے کے قریب پیاجی کے موبائل پر میر وشاہ کی کال ریسیو ہوئی۔ پیاجی 'یس باس' کہہ کر ہمہ تن گوش ہو گیا اور میر وشاہ کی آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ اپنی دی ہوئی ہدایات کو دہرا رہا تھا اور بار بار میرے بارے میں تاکید کر رہا تھا کہ میرا خیال رکھا جائے۔

میں نے کہا۔ ''پیاجی! پوچھو تو کیا میڈم چلی گئی ہیں؟''

میری آواز میر وشاہ نے سن اور سمجھ لی فوراً کہا۔ ''ہاں ماڑے غنچے...... میڈم جہاج (جہاز) میں سوار ہو جاوے ہے۔ پر تم فکر کا ہے کو کرت ہے، ماڑے کو اپنے ساتھ سمجھے ہووت......''

میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے لیے تسلی کی بات تھی کہ وہ مجھ پر مہربان تھا، میرا خیال رکھتا تھا۔

پیاجی فون بند کر کے بولا۔ ''میر وشاہ کا حکم ہے کہ ہم یہاں سے ایک بجے نکلیں اور دو بجے تک اپنا کام نمٹا کر واپس یہیں پر آ جائیں۔''

میں اور کھالے نے سرِ تسلیم خم کیا۔

میں نے کہا۔ ''پیاجی! میرا خیال ہے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہم اپنا کام کر کے لوٹ آئیں گے۔''

کھالا بولا۔ ''لگتا تو ایسے ہی ہے مگر...... مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بھیڑا ویلا (براوقت) بتا کر نہیں آتا۔ میر وشاہ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہمیں ہر لحظہ کسی بھی افتاد کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

پیا نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے اپنی بارہ سالہ سروس میں ایک یہی سبق سیکھا ہے اور ایک سبق یہ بھی سیکھا ہے کہ دنیا میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

''بارہ سالہ سروس......'' کھالے نے قہقہہ لگایا۔ ''کہہ تو ایسے رہے ہو جیسے تم نے کسی اسکول یا کالج میں نوکری کی ہو۔''

وہ نادم ہوئے بغیر بولا۔ ''سروس تو سروس ہی ہوتی ہے۔ کوئی لفظ لکھنا سکھاتا ہے، کوئی لکھے کو مٹاتا ہے اور کوئی لکھنے والا ہاتھ ہی کاٹ دیتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے مقسوم کی بات ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سجاول کریانے والے اور اس کی بیوی نے تمام عمر میں ایک بیٹے اور بیٹی کو پروان چڑھایا تھا۔

یہی ان کا مستقبل اور بڑھاپے کا سہارا تھا۔ سائیں دل جیت نے ایک ہی لمحے میں ان پھولوں کو ٹہنی سے جدا کر دیا اور پیروں تلے روندنے کے لیے سردار حیدر خان کی تحویل میں دیدیا۔ کسی کی فصل اجاڑتے ہوئے اسے رائی بھر دکھ نہیں ہوا ہوگا۔ پھر وہ چاروں اشتہاری جنہیں ان کے والدین نے نہ جانے کتنی کٹھنائیوں کے روبرو سینہ سپر ہو کر پالا پوسا ہوگا، کیا کچھ نہیں سکھایا ہوگا۔ مگر معاشرے نے فراری ڈاکو اور پھر حیدر خان نے شعلہ جوالا بنا دیا۔ قانون کے ہرکاروں نے ان کی لاشوں پر کاروبار کی شطرنج بچھائی اور لاکھوں روپے کے انعامات اور تمغے حاصل کر لیے۔

سردار النصر نہ جانے کس قماش کا آدمی تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بھی کوئی نیک پاک آدمی نہیں تھا کیونکہ وہ میڈم کے لیے کام کرتا تھا۔ کیا کام کرتا تھا؟ یہ آنے والے وقت میں ہی پتا چل سکتا تھا۔ اس کا ڈیرا مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہاں سب کچھ تھا اور سب سے بڑی سہولت تو رازداری کی حاصل تھی۔ یہاں کسی کی آمدورفت نہیں تھی تبھی یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ بات میرو شاہ نے بھی ہمیں بتائی تھی۔

اس ڈیرا نما ریسٹ ہاؤس میں تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک، جس میں ہم تینوں بیٹھے تھے، ایک میں نوکر مستقل رہائش پذیر تھے جبکہ تیسرا کمرا خاص کمرا کہلاتا تھا۔ اس میں شاید ہم سے بھی زیادہ اہم لوگوں کو ٹھہرانے کا انتظام ہوگا۔ تینوں کمرے اٹیچڈ تھے۔ ایک اسٹور، کچن اور بڑا سا برآمدہ جو کمروں کے آگے واقع تھا۔ برآمدے کے ستونوں کے بیچ میں بڑی سی آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ ایک بڑا ریکنگ گیٹ بند کرنے سے سارا ریسٹ ہاؤس بند ہو جاتا تھا۔ شاید یہاں پر اور بھی کچھ ہو...... سی تو کی طرح...... مگر فی الحال یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

ایک بجنے والا تھا جب ہم نے رختِ سفر باندھا۔ پیا کی ہدایت کے مطابق چھوٹا اسلحہ لوڈ کر کے لباس میں چھپا لیا۔ گنیں پسنجر سیٹ کے نیچے بنے ہوئے مخصوص خانے میں پڑی تھیں۔ انہیں نکال کر لوڈ کیا اور دوبارہ وہیں پر چھپا کر رکھ دیں۔ اسی اثنا میں ہماری آؤ بھگت پر مامور نوکر ہمارے پاس چلا آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر نہایت مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''سائیں جی! ڈو وجے تو ڑیں تساں پروہنیاں کوں گھن آسو؟''

(کیا آپ دو بجے تک مہمانوں کو لے کر پہنچ جائیں گے؟)

میں نے کہا۔ ''ہاں! تم ہمارا انتظار کرنا۔ کچھ دیر سویر بھی ہو سکتی ہے۔''

''جی! میں سائیں دا نوکر ہاں...... جیں ویلے وی آسو، ہتھ بدھی ملسماں۔'' وہ بولا۔

(جی ہاں! میں آپ کا نوکر ہوں۔ جب بھی آپ واپس آئیں گے، میں ہاتھ باندھے استقبال کے لیے موجود ہوں گا)

ہم تینوں اس وقت دہرے لباس میں تھے۔ اوپر عموی نوعیت کا لباس جبکہ ہم نے نیچے سیاہ رنگ کا چست لیدر سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے اوپر والا پیراہن اُتار کر ایک چارپائی پر ڈھیر کر دیا۔ آج فلک پر چاند نہیں سجا تھا اس لیے فضا پر گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کھالا ڈرائیونگ کرنا چاہتا تھا مگر پیا نے روک دیا اور خود ڈرائیونگ سنبھال لی۔ گاڑی رینگتی ہوئی ڈیرے کا مین گیٹ عبور کر کے کچی سڑک پر آ گئی۔ پیا جی نے ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں بلکہ چھوٹی بیم لائٹس روشن کی تھیں جن کا رخ زمین کی طرف تھا۔ یہ احتیاط اس لیے بروئے کار لائی گئی تھی کہ گاڑی دور سے دکھائی نہ دے۔

مین روڈ پر چڑھنے کے بعد اس نے ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اِکا دُکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اس سڑک پر دن میں بہت رش ہوتا ہے۔ رات کو صرف ٹرک، ٹرالر اور لمبے روٹ والی بسیں ہی چلتی ہیں۔ کھالا فرنٹ سیٹ پر جبکہ میں عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر بولا۔ ''شہرے! پتوار والا کچا راستہ ٹھیک رہے گا، کیا خیال ہے؟''

وہ سڑک کی نسبت زیادہ محفوظ تھا۔ مگر ایک قباحت تھی کہ وہ راستہ نور پور سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر میرے بھانے کے تقریباً برابر میں پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اتنی رات گئے اندھیرے میں پیدل اتنا سفر طے کر کے جانا اور آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہم گاڑی کہاں کھڑی کریں گے؟''

اس نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا۔ ''نہیں یار! گڑبڑ ہے۔ ہم نوری چوک والی سڑک سے ہی جائیں گے اور اگر کوئی خطرہ ہوا تو اسپتال والی سیدھی سڑک پر سیدھا نکل جائیں گے۔ چکر کاٹ کر لال پیر سے محمود کوٹ والی سڑک پر چڑھ کر بھٹہ پور کی طرف نکل جائیں گے ٹھیک؟''

میں نے اس کی شیطانی کھوپڑی کی دل ہی دل میں داد دی۔ چوک قریش پہنچ کر جونہی موڑ کاٹا، سامنے سڑک پر پولیس والوں کا چوبی بیریئر دکھائی دیا۔

میں چونکا۔ ''یہاں تو کبھی ناکا بندی نہیں ہوئی۔''

پیا ہنسا۔ ''آج تمہارے استقبال کے لیے محکمے نے یہ بندوبست کیا ہے کیا یاد کرو گے۔''

پیا نے بیریئر کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہارن ...نے پر ایک سپاہی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈھابے سے ...ر گاڑی کے پاس پہنچا۔ پیا نے شیشہ اُتار دیا۔

ادھیڑ عمر کانسٹیبل قدرے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''...ں سے آ رہے ہیں صاحب جی؟''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے کیا ...ٹ کرنا تھی جو اَپ ماڈل کی اسوزو ٹروپر دیکھ کر ہی بھیگی بلی ...کر بچھ گیا تھا۔

پیا نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''کہاں سے آ رہے ہیں، نہیں بتانا بالکل ضروری نہیں ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ہم ...دار حیدر خان کے مہمان ہیں۔''

سپاہی اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی تھا بھی تو وہ کہیں ...پ کر نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔ سردار حیدر خان کا نام ...نتے ہی بھیگی بلی کا قد مزید چھوٹا ہو گیا۔ گاڑی کے اندر ...ھیرا تھا اور باہر بلبوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، اس لیے ...ہی جھانکنے کے باوجود ہمیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ سرکاری ...ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد اُس نے عاجزانہ انداز میں ...نا ہاتھ ماتھے پر رکھا، سلام کیا اور بیریئر کی رسّی کھول دی۔ بھاری پتھر نے لمبے ڈنڈے کو اچانک فضا میں اوپر اُٹھا دیا اور پیا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیشہ ...ڑھاتے ہوئے اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''الو کے پٹھے! ٹروپر کو دیکھ کر بچھ جاتے ہیں۔ پیدل چلتے ہوئے شخص کو 'اوئے' کہہ کر بلاتے ہیں اور کپڑے اتروا کر تلاشی لیتے ہیں۔ ہونہہ! قانون کے رکھوالے...... پولیس مقابلے کرتے ہیں۔''

کھالے نے کہا۔ ''شکر ہے اس کم بخت نے گاڑی کے اندر نہیں جھانکا ورنہ وہ مجھے ضرور پہچان جاتا۔''

''کیا وہ تمہیں جانتا ہے؟ کون ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا کیونکہ میں نے اس کی شکل پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

کھالا بولا۔ ''یہ اس ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا سالا ہے۔ وہ ...ٹر، جس سے میں کپی خریدا کرتا تھا۔''

''اچھا......'' میں نے زیرِ لب کہا اور شیشے کے باہر پھیلے ...سیط اندھیرے میں نظریں پیوست کر دیں جہاں کچھ بھی ...ائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا کچھ یہاں موجود بھی نہیں تھا جسے ...یکھا جاتا، میں تو بس عادتاً ہی جھانک رہا تھا۔ اس سڑک پر ...یفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ معمول کی بات تھی۔

پیا بڑے مدبرانہ انداز میں کھالے کو سمجھا رہا تھا۔ ''دیکھ بھئی کھالے! پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرانا خود کو پھنسانے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ کوئی اسپرائی مخلوق نہیں ہیں بلکہ فطری طور پر ہم لوگوں سے بہت کمزور ہیں۔ انہیں اپنی جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ ہم جان کی بازی لگا کر روڈ پر آتے ہیں، یہ جان بچانے کے لیے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اگر ہم انہیں بتا بھی دیں کہ ہم کریمنل لوگ ہیں تو پھر بھی یہ فوراً ہی راستے سے ہٹ جائیں گے...... بلکہ بھاگ کر چھپ جائیں گے۔ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے ہمیں دیکھا ہے، سمجھے؟''

کھالے نے فرماں بردار طالب علم کی طرح 'اچھا جی' کہا۔ کھالے کی طرح میں بھی وردی پوشوں سے ڈرتا تھا، ان سے دور بھاگتا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ابھی تک سرکاری سانڈوں کو دیکھ کر میری سٹی گم ہو جاتی تھی۔ چونکہ پیا کی بارہ سالہ 'سروس' آن دی ریکارڈ تھی، اس لیے وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

ہمیں نور پور تک کسی رکاوٹ یا غیر متوقع صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کھالے نے حیات خان کی حویلی کے سامنے پہنچ کر پیا سے کہا۔ ''میں نے اس راستے کی بات کی تھی۔ ہم اس راستے سے واپس جائیں گے اور ریلوے پھاٹک کے قریب مظفر گڑھ میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بڑا محفوظ راستہ ہے۔''

پیا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر کھالے کا اشارہ پا کر دائیں جانب اسٹیئرنگ گھما دیا۔ نور پور کے در و دیوار پر خاموشی کا راج تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، نہ ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا مگر ہم جونہی اپنی گلی میں گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روک کر اُترے، میرا دل بری طرح گھبرا گیا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا خاموش سائرن بجا دیا۔ میں نے اپنے کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ کان لگایا۔ مجھے اندر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز بہت مدھم تھی مگر اتنا ضرور پتا چلتا تھا کہ ایک سے زیادہ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ رات کے اس خاموش پہر میں میرے گھر میں جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت سبھی لوگ گہری نیند میں مستغرق ہوا کرتے تھے۔

میں نے مڑ کر عقب میں کھڑے ہوئے کھالے اور پیا سے سرگوشی کی۔ ''میرے گھر میں کوئی جاگ رہا ہے کون؟ یہ علم نہیں ہے۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔''

کھالے نے بھی میری طرح دیوار سے کان لگایا۔ اس

نے کچھ مختلف سنا اور ایک جھٹکے سے ساتھ سیدھا ہوا اور برقی مستعدی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ پیا نے اس کی تقلید کی۔ دونوں نے چند لمحوں میں ہی تمن گنیں اور اضافی میگزین نکال کر دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔ ایسے ہی وقت میں جب پیا مجھے گن تھما رہا تھا، میرے عقب میں حویلی کے بند دروازے کے عقب سے تیز سرگوشی کی آواز ابھری۔

''شیت...... شیت...... گاڑی ادھر کیوں لائے ہو؟''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سرگوشی نے واضح کردیا تھا کہ اندر کوئی موجود تھا یا موجود تھے جن کا ساتھی آس پاس گاڑی لیے چھپا ہوا تھا۔ سرگوشی کی آواز پیا نے بھی سن لی اور ایک دم دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کھالا دروازے کے آگے نکل کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

اندر سے سرگوشی میں پوچھنے والے کو جواب نہیں ملا تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔ پیا نے جواباً سرگوشی کی۔ ''کیا واپس چلا جاؤں؟''

''نہیں...... اب یہیں رُکو...... تھوڑی سی دیر ہے۔''

پیا دروازے کی طرف جھکا۔ کان لگا کر کچھ سنتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''وہ اندر چلا گیا ہے۔ گڑبڑ ہے، جلدی کرو......''

ایک دم میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا خاندان خطرے میں تھا۔ پیا بلی کی سی پھرتی سے دروازے کے افقی ڈنڈوں پر پیر رکھ کر دیوار پر چڑھا اور آن واحد میں اندر کود گیا۔ بہت ہلکی سی 'دھم' کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جونہی میں دروازے کے سامنے پہنچا، اس نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کنڈی میں ہاتھ ڈال کر بھی کھول سکتا تھا، اسے ناحق اتنی تکلیف کرنا پڑی تھی۔

میں اور کھالا اندر داخل ہوئے اور اس کی تقلید میں صحن میں داخل ہو کر رُک گئے۔ وہ اچانک پلٹا اور نہایت دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''کھالے! تم باہر جاؤ۔ گاڑی تلاش کرو اور اس کے ڈرائیور کو قابو کرو۔ شور شرابا بالکل نہ ہو۔ ہری اَپ!''

کھالا پلٹ گیا۔ حکم کی فوری تعمیل اس کی سرشت کے منافی تھی مگر وقت کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بلا چوں چراں پیا کی بات مانتا۔ میرو شاہ نے پیا کو ہماری ٹیم کا ماسٹر مقرر کیا تھا اور ہم دونوں کو پیا کی اطاعت کا سختی سے حکم دیا تھا۔

پیا کمرے کی دیوار سے چپکا، سر باہر نکال کر چند لمحوں تک جائزہ لیتا رہا، پھر دبے پاؤں سرعت سے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ سے ہاتھ کو اوجھل کرنے والے اندھیرے میں میرے کمرے میں نہایت کم روشنی دور سے نظر آرہی تھی۔ فضا میں مٹی کے تیل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے اگلا کمرا چاچی کا تھا۔ اس میں بھی کوئی ٹارچ روشن تھی۔ میں پیا کے نقش پا پہ برق رفتاری سے چل رہا تھا۔ مجھے اس کے غیر معمولی اعتماد نے حیران کردیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے میرے گھر کو بخوبی دیکھ رکھا تھا حالانکہ یہ حقیقت تھی وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس گھر میں قدم رنجہ ہوا تھا۔

صحن میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر جو بھی تھا، یا جو بھی تھے، انہیں شاید کوئی ڈر خوف نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے آنے کا اندیشہ...... تبھی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ میرا دل میرے قابو سے ہر پل نکلتا جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر گراں گزر رہا تھا مگر میں اس وقت پیا کی معاملہ فہمی اور مہارت پر بھروسا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ہم جوں جوں دروازے کے قریب ہوتے جاتے تھے، مٹی کے تیل کی بو تیز ہوتی جارہی تھی۔ میرے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر پیا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور چہرہ زمین سے لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ اس نے محض چند لمحے اندر کی صورتِ حال کو سمجھنے میں لگائے اور پھر اچھل کر دروازے کے بیچ کھڑا ہوگیا۔ فضا میں اُس کی گھٹی گھٹی مگر دہشت انگیز آواز اُبھری۔ ''ہاتھ اُٹھادو ورنہ گولی ماردوں گا۔''

میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکادی اور گن کو مضبوطی سے تھام کر فائر پوزیشن سنبھال لی۔ اس وقت مجھے پیا کو کور دینا تھا تاکہ کوئی اس پر عقب سے حملہ نہ کرسکے۔ پیا نپے تلے انداز میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کے اشارے سے مجھے دروازے میں رُکنے کا اشارہ کردیا تھا۔ میں بجلی کی سرعت سے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ میرا رُخ چاچی کے کمرے کی طرف تھا جس میں کسی کی موجودگی ممکن تھی۔

میں نے بڑی احتیاط سے گردن موڑ کر اپنے کمرے میں جھانکا۔ مٹی کے تیل کا تیز اور ناگوار بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سامان والی پیٹی اور چارپائی کے درمیان دو آدمی اپنے ہاتھ سروں سے بلند کیے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ تھی جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ اچانک ٹارچ آف کردیتا تو کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور وہ چند

لمحوں میں ہی پوزیشن بدل کر پیا کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ شاید غیر متوقع طور پر پڑنے والی افتاد نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت قبض کرلی تھی، ورنہ وہ اَب تک یہ ہاتھ دکھا چکا ہوتا۔

میں نے بیلٹ میں اُڑسی ہوئی پنسل ٹارچ نکالی اور روشن کردی۔ ٹارچ کی تیز روشنی نے کمرے کا اندرونی ماحول روشن کردیا۔ اب اگر وہ اپنی ٹارچ آف بھی کرلیتا تو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

پیا دونوں چارپائیوں کے بیچ کھڑا تھا اور اس کی گن کا رُخ دونوں کی طرف تھا۔

''کون ہو تم؟'' پیا کی درشت آواز سنائی دی۔

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ ناکافی روشنی میں ان کے خدوخال دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اپنی توجہ صحن کی طرف مبذول کی۔

پیا نے کہا۔ ''میں نے پوچھا ہے تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کوئی جواب نہیں ملا۔ یوں لگا جیسے دونوں بہرے یا گونگے تھے، پیا غرایا۔ ''گھر والے کہاں ہیں؟''

ایک نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

بھاری آواز میں دھمکی دینے والے کا لہجہ مقامی تھا مگر آواز میرے لیے یکسر ناشناسا تھی۔ اس وقت میرے قلب و ذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ تبھی حکم کا غلام بن کر دروازے میں چوبند ایستادہ تھا۔

میں ابھی اسی عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت میں مبتلا تھا جب پیا کی آواز سنائی دی۔ ''میں تین تک گنوں گا...... اگر مجھے جواب نہ ملا تو ایک کو گرادوں گا۔''

پیا کا لہجہ یک لخت سرد ہو گیا تھا بولا۔ ''ون...... ٹو......'' اس نے تھوڑا توقف کیا، پھر الٹے ہاتھ سے ہولسٹر سے پستول کھینچ لیا۔ ''تھری......''

دونوں بڑے دل گردے والے تھے یا شاید انہیں یقین تھا کہ پیا محض دھمکی دے رہا ہے مگر پیا کے سائیلنسر لگے پستول سے 'ٹھش' کی آواز برآمد ہوئی اور بائیں جانب کھڑے ہوئے طویل قامت ٹارچ بردار شخص کی پیشانی میں گولی پیوست ہوگئی۔ وہ پیچھے کی جانب گرا پھر دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا ہوا فرش پر گر گیا۔ چند لمحوں تک ٹارچ کی روشنی کمرے میں تیزی سے چکراتی رہی پھر دیوار پر ایک ننھا سا

انگلستان

کے ایک سابق وزیراعظم نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ایک بار وُہ ایسے کی ایسی تقریب میں شریک تھے جو اِن کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ سرے کا میئر اس کی صدارت کر رہا تھا۔ مہمانوں کو کافی پیش کی جارہی تھی کہ صدر نے قریب بیٹھے ہوئے چیمبرلین سے سرگوشی میں کہا۔ ''کیوں جناب، کیا خیال ہے، ہم یہاں آنے والوں کو کچھ دیر اور لطف اندوز ہو لینے دیں یا آپ سے ابھی تقریر کرالیں؟''

وصیت

ایک دولت مند بوڑھا طویل عرصہ سے بیمار تھا مگر ڈاکٹر کی تمام تر ماہرانہ کوششوں کے باوجود وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوسکا تو ڈاکٹر نے لگی لپٹی رکھے بغیر اُسے اپنے دُنیاوی معاملات سمیٹ لینے کا مشورہ دیا۔

''میں تمام انتظامات پہلے ہی کر چکا ہوں، صرف وصیت لکھنا باقی رہ گئی ہے۔''

دولت مند بوڑھے نے جواب دیا۔ ''میں وصیت میں اپنا سب کچھ اس ڈاکٹر کے لیے چھوڑنے والا ہوں جو میری زندگی بچائے گا۔''

دائرہ بنا کر تھم گئی۔ وہ مردہ ہوتے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہوگئی تھی۔ پیا نے پستول کا رُخ دوسرے شخص کی جانب کرلیا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں بھی زندگی کا ایک موقع دیتا ہوں۔ ون...... ٹو......''

وہ جلدی سے بول پڑا۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

پیا بولا۔ ''مجھے اسی سوال کا جواب چاہیے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرا نام نذیر ہے۔''

''یہاں کیا کر رہے تھے؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے قدموں میں دیکھا۔ وہاں شاید اس نے کچھ رکھا ہوا تھا جو چارپائی کی وجہ

سے مجھے اور پیا کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔
پیا غرایا۔ ''جلدی بولو ورنہ......''
''آ......آ گ......'' وہ ہکلایا اور بولتے بولتے رُک گیا۔
''گھر والے کہاں ہیں؟''
''وہ......وہ......دوسرے کمرے میں ہیں۔''
''زندہ ہیں؟'' پیا کی آواز میں موت کی سردی گھل گئی۔
''ہا......ہاں......'' اس پر پیا کی بربریت بھری آواز کی دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے دائیں پہلو میں فرش پر گر کر تڑپتے ہوئے طویل قامت شخص کو دیکھ رہا تھا۔
پیا نے کہا۔ ''کیا کمرے کو آگ لگانا چاہتے تھے؟''
''ہاں......مگر تمہارا اس گھر سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے بہ دقت تمام کہا۔
''پتا چل جائے گا۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''
''کسی نے نہیں...... ہم ڈاکو ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''ڈاکو لوٹتے ہیں، آگ نہیں لگاتے۔'' پیا نے دانت پیس کر کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ نے حرکت کی اور اس کے پستول سے نکلنے والی دوسری خاموش گولی اس کی ران میں پیوست ہو گئی۔ وہ کراہ کر ایک ٹانگ پر ناچنے لگا۔
پیا سفاک لہجے میں بولا۔ ''دوسری گولی سیدھی دل میں اترے گی، جلدی بولو، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''
''وہ......وہ...... بڑے خان نے......'' وہ درد کی شدت سے چند لمحوں میں ہی بے حال ہو گیا تھا۔ ''سردار حیدر خان نے......''
''باہر کتنے آدمی ہیں؟'' پیا نے پوچھا۔
''دو......''
''دوسرے کمرے میں کتنے شیطان ہیں؟''
''کوئی نہیں......''
''وہاں بھی مٹی کا تیل چھڑک چکے ہو؟''
''ہاں......'' اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر بیٹھ گیا۔
پیا نے قدم بڑھایا اور ٹارچ بردار شخص کے سینے پر پاؤں رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ ایسے ہی وقت میں اسے گویا کرنٹ لگا اور وہ غیر معمولی تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کوئی چیز لمحہ بھر کو چمکی تھی۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے کسی تیز دھار آلے کا وار پر کیا تھا جو کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔ پیا کے پستول سے گولی نکلی اور وہ ایک دم کھڑا ہو کر ہاتھ جھٹکنے لگا۔ پیا نے قدم بڑھا کر اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی کے اوپر سے باہر گھسیٹ لیا۔ تب مجھے ایک پل کو اس ڈاکو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی شاید تمام تر بدمعاشیاں اس کے چہرے پر نقش ہو گئی تھیں، تبھی بہت خوف ناک دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لمبی قلمیں، وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔
اس نے چارپائی پر گرتے ہی اپنا گھٹنا پیا کے پیٹ میں مارا۔ پیا پچھلی چارپائی پر گرا مگر اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی بلکہ سانڈ کی طرح اس پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اڑیل بدمعاش کی درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، لاتوں اور مکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔
پیا نے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر ماری اور غرایا۔ ''جلدی بولو، یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''
''مم......مم...... میں بتاتا ہوں...... پپ......پانی......'' اس کی گھگی بندھ گئی۔
''پانی نہیں ملے گا، گولی مل سکتی ہے۔ کہو، دوں؟'' پیا کی آواز بہت ڈراؤنی تھی۔
''وہ بڑے......خان جی نے بھیجا تھا۔ دو......دو لڑکیوں کو داغ......اغوا......پانی کو فنشر......'' اس نے بہ مشکل اپنی بات پوری کی پھر ایک جانب گردن لڑھک گیا۔
پیا نے اس کی پیشانی میں عین آنکھوں کے بیچ گولی مار دی۔ وہ بالشت بھر اونچا اچھلا پھر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دماغ میں گھسنے والی گولی نے اس کے منہ سے چیخ تک برآمد نہیں ہونے دی تھی۔ سنا تھا کہ دماغ یا دل میں لگنے والی گولی کسی کو بھی بدن سے باہر نہیں نکلنے دیتی، اب اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا۔ پیا نے گن کندھے پر ڈالی، اپنی ٹارچ نکال کر روشن کی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''شہر یار! دوسرے کمرے کو دیکھو، احتیاط سے جانا، اس کا کوئی ساتھی وہاں موجود ہو سکتا ہے۔''
میں نے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ آہستہ آہستہ پورے صحن میں کیروسین آئل کی بو پھیل گئی تھی۔ میں دروازے کے پاس رُکا، پیا کے سے انداز میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور زمین سے چہرہ لگا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جو ٹرنک پر پڑی ہوئی کسی ٹارچ سے پھوٹ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے

نتھنوں میں مٹی کے تیل کی تیز بو گھس گئی اور مجھے سانس لینا دوبھر لگنے لگا۔
میں نے ٹارچ کی روشنی پہلی چارپائی پر ڈالی۔ میرے دل پر گھونسا پڑا۔ چارپائی خالی تھی۔ دوسری چارپائی کی رضائی بھی پائنتی کی جانب سمٹی ہوئی تھی۔ تیسری چارپائی پر ننھا موج دین عرف موجو لحاف میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میں نے لحاف ہٹایا، چہرہ کھلا تو پتا چلا کہ اس کے لبوں پر سفید رنگ کی چوڑی ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ بے ہوش تھا۔ مٹی کے تیل کی بو اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی اور سانس کی آمد و رفت سست پڑ گئی تھی۔
میں نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی ٹیپ کھینچ کر اُتاری۔ مڑ کر آخری چارپائی دیکھی، اوپر نیچے نظر دوڑائی، کسی کو نہ پا کر وقت ضائع کیے بغیر موجو کو کندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل آیا۔ باہر سردی تھی مگر اسے کھلی ہوا میں رکھنا ضروری تھا۔ کھلے صحن میں زمین پر لٹا کر بھاگ کر کمرے میں گیا۔ اس کی رضائی اٹھا لایا اور زمین پر رکھ کر موجو کو اس پر لٹا دیا۔ رضائی کو دہرا کر کے اس کے سینے تک کھینچ دیا اور الٹے قدموں دوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔
مٹی کے تیل کی زہریلی بو میرے دماغ میں گھس کر ہوش و حواس پر اثر انداز ہونے لگی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ فرزانہ، شبانہ، چاچی اور چاچے چراغ دین تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ میں نے چند لمحوں میں کمرے کا سامان ادھیڑ کر رکھ دیا مگر کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور میں بھاگ کر پیا کی طرف گیا۔ ایسے ہی وقت میں فضا میں فائر کی تیز آواز گونجی، ساتھ ہی ایک تیز چیخ سنائی دی۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ چیخ کھالے کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔
پھر دوسرا فائر ہوا۔ اس مرتبہ کوئی چیخ نہیں گونجی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ کھالا مجھ پر اپنا خون نچھاور کر چکا تھا۔ فائر کی آواز سائیں دل جیت کے مزار کی طرف سے سنائی دی تھی۔ میں نے گن کندھے سے لٹکائی، پستول نکال کر ہاتھ میں تھاما اور بھاگ کر اپنے گھر کی عقبی کھڑکی کی طرف دوڑا۔ عقب میں پیا کی آواز سنائی دی۔ ''بھاگ کر جاؤ اور کھالے کی مدد کرو، میں ادھر ہی موجود رہوں گا۔''
میں نے اس کی بات سنی ان سنی کی اور کھڑکی کھول کر جوہڑ اور گھنے جنگل کی درمیانی پگڈنڈی پر سرپٹ دوڑ پڑا۔

لڑکیوں کی اُلجھنیں اور پریشانیاں دُور کرنے کے مشورے دینے والی خاتون سے ایک نوجوان لڑکے نے پوچھا ''کیا آپ لڑکوں کو بھی مشورے دیتی ہیں؟''
''نہیں۔ میں صرف لڑکیوں کو مشورے دیتی ہوں۔''
''لڑکوں کو مشورے کیوں نہیں دیتیں؟''
''اگر میں لڑکوں کو مشورے دینا شروع کر دوں تو ساری لڑکیاں کنواری رہ جائیں گی۔''

کندھے پر لٹکی ہوئی بھاری گن تیز دوڑنے میں مشکل پیدا کر رہی تھی مگر میں اسے پھینکنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ یہ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا، اس لیے ٹارچ کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اسے دوڑنے کے دوران آف کر کے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔
میرے گھر پر حملہ کرنے والوں کی گاڑی لامحالہ طور پر سائیں کے احاطے میں پارک کی گئی تھی کیونکہ اگر نور پور کے اس جانب کی پانچوں گلیوں میں کہیں بھی کھڑی کی جاتی تو وہ آتے ہوئے ہماری نظروں میں ضرور آتی۔ میں نے جونہی جنگل کا موڑ کاٹا اور مزار کی دیوار کی طرف بڑھا، نور پور کی حویلیوں کے بیرونی بلب روشن ہو گئے۔ فائر کی آواز نے خاموش اور پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر کے خوابیدہ لوگوں کو جگا دیا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی مگر مجھے اس وقت کھالے اور چاچے چاچی کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔
میں نے کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر اچھل کر مزار کی دیوار پھاندی اور پارکنگ کی جانب والی احاطی دیوار کے قریب کھڑی ہوئی سفید رنگ کی لینڈ کروزر کی طرف بگٹٹ دوڑ لگا دی۔ یہ گاڑی پہلے نور پور کے علاقے میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ ابھی میں سائیں دل جیت کے حجرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ فائر کی ہولناک آواز فضا میں گونجی۔ میرے بائیں بازو کو انگارا سا چھو گیا۔ ایسے ہی وقت مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل پختہ اینٹوں کے فرش پر گر گیا۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ فائر کی تیز اور خوف ناک آوازوں سے میں یہ اندازہ نہیں کر پایا کہ مجھ پر کس سمت سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں جانب سے آواز پھوٹ پڑی ہو۔
شانے اور کہنی کے بیچ ماس پر جلن کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی جنگ میں لپٹی ہوئی موت کی ہولناکی کا بھی اندازہ

ہوا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہلو کے بل کروٹ لے گیا۔ زندگی ساتھ دے گئی۔ ایک فائر ہوا اور عین اسی جگہ سے اینٹوں کا چورا اُڑا جہاں ایک لمحہ قبل میں موجود تھا۔ میں دائیں جانب لڑھک کر ہال کے دروازے تک پہنچا۔ تب تک مجھ پر ایک اور فائر داغا گیا۔ میری خوش بختی تھی کہ سوائے ایک گولی کے کوئی مجھے چھونے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اچانک اُٹھ کر جست بھری اور ہال کی نکڑ عبور کر کے سائیں دل جیت کی سرخ ٹویوٹا کرولا کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میرے پاس گن بردار کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

فائرنگ رُک گئی۔ عارضی طور پر میں محفوظ ہو گیا تھا مگر مجھے یہیں دبک کر بیٹھنا نہیں تھا۔ بھاری گن کے ساتھ نقل و حرکت میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر میرے پاس اس کی موجودگی ضروری تھی۔ تنگ سی جگہ میں بہ مشکل گھسٹ کر پارکنگ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا، کار کے بونٹ کے اوپر سے جھانک کر سفید لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں سوائے گاڑی کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ چھپا ہوا دشمن کسی بھی لمحے بہ آسانی میرے سینے میں گولی اتار سکتا تھا۔ ہر بار قسمت ساتھ نہیں دیتی، یہی سوچ کر میں نے نئی راہ اختیار کی اور کھسک کر پارکنگ کی عقبی دیوار تک پہنچا۔ قسمت اسی راہ پر لے آئی تھی جہاں سے پہلے بھی میرا گزر ہو چکا تھا۔

میں نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دیوار پھاندی اور مشرق کی سمت جھکے جھکے انداز میں دوڑ پڑا۔ یہ جگہیں میرے بچپن کی آنکھ میں منقش تھیں، تبھی مجھے اندھیرے میں کوئی ٹھوکر نہیں لگی اور میں دیوار کی نکڑ عبور کر کے شمالی جانب لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ اندازے کے مطابق اس جگہ پر پہنچا جہاں اندرونی سمت میں گاڑی کھڑی تھی۔ پنجوں کے بل اُٹھ کر دیوار کی منڈیر سے جھانکا۔ میرا اندازہ بڑا لاجواب اور کائیاں تھا۔ میں نے عین اسی جگہ سے سر نکالا تھا، جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔

میرے سامنے لینڈ کروزر کی چھت تھی۔ میں کچھ اور اوپر اُٹھا۔ اب مجھے لینڈ کروزر کے اگلے ویل کی آڑ میں دیوار کی جانب پشت کر کے پیروں کے بل بیٹھا ہوا شخص نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گن دبی ہوئی تھی اور وہ بونٹ کے اوپر سے سر نکال کر پارکنگ میں کھڑی سرخ کرولا کی طرف دیکھ رہا تھا اور میری موجودگی کے مقام کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پستول دیوار کے اوپر سے گزارا اور اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ سائیلنسر لگے ہوئے پستول کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی اس کا سر ٹائر کور سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر گر گئی۔ میں نے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کا نشانہ لیا تھا۔ مجھے یہ تو پتا نہیں چل سکا کہ میرا نشانہ درست تھا، یا تھوڑا بہت اوپر نیچے ہو گیا تھا، یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ کام آ چکا تھا۔ وہ 'غرر غرر' کی بھیانک آوازیں حلق سے خارج کرتے ہوئے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے تڑپنے کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ وہ نزع کے عالم میں ہے اور چند لمحوں میں ہی اوپر پرواز کر جائے گا۔ میں نے بہ نظرِ احتیاط ارد گرد دیکھا مگر اس کا ساتھی دکھائی نہیں دیا۔

پیا کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے دوسرے ڈاکو نے بتایا تھا کہ گاڑی میں دو آدمی ہیں۔ دوسرا کہاں چھپا ہوا تھا؟ ابھی مجھے کالا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا جسے میں تلاش کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کی چیخ بڑی کربناک تھی جو ابھی تک میرے کانوں میں سنسنا رہی تھی۔ کہیں وہ بھی دنیا سے رخصت تو نہیں ہو گیا تھا؟ یہ خیال بڑا ہولانِ روح تھا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں دیدے پھاڑے صحن میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، میری کمر سے کوئی سرد اور نوکیلی چیز آن ٹکرائی اور ٹھہر گئی۔ ساتھ ہی ایک کرخت اور بھاری آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "خبردار! ذرا سی بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔"

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ بہت برا پھنسا تھا۔ بندر کی طرح دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، پاؤں زمین سے اُٹھے ہوئے تھے اور میں جوتوں کی نو دیوار کی فاؤنڈیشن کی باہر کو نکلی ہوئی ننھی سی گگر پر ٹکا کر بہ دقت تمام کھڑا تھا۔ میری گن میرے کندھے پر لٹک رہی تھی جبکہ پستول والا ہاتھ فائر کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے نیچے اُترنا چاہا تو میرے عقب میں کھڑے ہوئے شخص نے نوکیلی چیز، غالباً گن کی نال پر دباؤ بڑھا دیا، ساتھ میں غرایا۔ "اوں ہوں...... ذرا سی حرکت بھی کی تو گولی مار دوں گا۔ یہیں کھڑے رہو۔"

میں ساکت ہو گیا۔ میری نظروں کے سامنے لینڈ کروزر کھڑی تھی جس کے بند شیشوں کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ احساس بڑا جان لیوا تھا کہ میرے عقب میں کھڑا ہوا شخص اناڑی نہیں تھا۔ وہ میری ذرا سی حرکت پر برانگیختہ ہو کر فائر کر سکتا تھا۔ اتنے قریب سے نکلی ہوئی گولی کا خطا جانا ممکن نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

وہ غرایا۔ "بکو مت...... خاموش رہو۔"

"میں تھک گیا ہوں۔ اب تب میں گر جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ میرے گرنے کے انداز کو مشکوک حرکت قرار دے کر گن کی لبلبی دبا نہ دے۔

وہ بولا۔ "آہستہ سے نیچے اُتر آؤ، اپنا گندا منہ دیوار کی طرف ہی رکھنا...... ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔"

میں گگر سے اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس پر غلبہ پانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ مگر کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

اس کی غراہٹ گونجی۔ "کیا تم نے بابر خان کو قتل کر دیا ہے؟"

میں چونکا۔ "کون...... بابر خان کون ہے؟"

"میرا ساتھی جو جیپ کے پاس کھڑا تھا۔" اس نے میری ریڑھ کی ہڈی پر گن کی نال کا دباؤ بڑھایا۔

"ہاں...... اس نے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ فائر کا جواب فائر سے ہی دیا جا سکتا ہے، گل پاشی سے نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ تمہارا ساتھی تھا؟"

"اوہ شٹ!" اس کے منہ سے نکلا پھر اس کے حلق سے ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے اُسے شدید قلق پہنچا ہو اور وہ برداشت نہ کر پا رہا ہو۔ اس کے ردِ عمل نے مجھے باور کرا دیا کہ مجھے ملی ہوئی مہلت اب تب میں تمام ہونے والی ہے۔ مجھے اسی ایک لمحے میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ سو میں نے رِسک لے لیا اور چیتے کی سی پھرتی سے پلٹ پڑا۔ وہ فوری طور پر سنبھل نہیں پایا اور میرا پستول والا ہاتھ دائرے میں گھومتا ہوا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ 'کٹ' کی آواز ابھری اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو میں نے اس کی گن پر ہاتھ ڈال کر نال کا رُخ دائیں ہاتھ پر فصلوں کی جانب کر دیا۔ اس نے فائر نہیں کیا بلکہ زوردار کک میری دونوں ٹانگوں کے بیچ ماری۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اُٹھے اور میں توازن برقرار نہ رکھ پایا اور پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ اچھا ہوا کہ میری گرفت گن پر سے کمزور نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ بھی کھنچ کر مجھ پر آن گرا۔

اس کی گن میری پسلیوں پر لگی تو درد کی تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں پھر گئی۔ میں نے اسے خود پر سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ خاصا بھاری تھا۔ اس نے مجھ پر پورا وزن ڈالا اور اپنے سر کی زوردار ٹکر میری پیشانی پر رسید کی۔ میرا

انسان کا گھر

ایک شخص نے ایک اللہ کے بندے سے پوچھا۔ "ایک دن کے اندر اتنی ساری نیکیوں کو اکٹھا کرنا کیسے ممکن ہے؟"

وہ بزرگ مسکرائے اور جواب دیا۔ "اللہ نے انسان کے اندر ایک گھر بنا رکھا ہے جس کی زمین مغفرت ہے اور اس کا آسمان ایمان ہے۔ اس کا آفتاب شوق ہے اور اس کا چاند محبت ہے۔ اس کی مٹی ہمت اور اس کا بادل فضل ہے۔ اس کی بجلی امید، اس کی گرج خوف ہے۔ اس کی بارش رحمت اور اس کا درخت وفا ہے۔ اس کا پھل حکمت اور اس کا فراست بھرا دن ہے اور یہی اس کی روشنی ہے۔ اس کی رات برائی اور مصیبت ہے۔ اس میں ایک دروازہ علم کا ہے اور دوسرا دروازہ حلم (برداشت) ہے۔ اس میں ایک دروازہ یقین اور غیرت کا ہے۔ اس کا ستون انس اور دوسرا ستون بھروسا ہے، تیسرا ستون سچائی کا ہے۔ اس گھر پر فکر کا تالا لگا ہوا ہے جو بلاشبہ دین اسلام کے ارکان کی چابی سے ہی کھولا جا سکتا ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ

قیدی سزائے موت، نیو سینٹرل جیل، بہاولپور

***

اپنی پلیٹ لے جاؤ

ایک انگریز کا کسی گاؤں سے گزر ہوا۔ گاؤں والوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور ایک موٹی سی مکئی کی روٹی پر سرسوں کا ساگ رکھ کر پیش کیا۔ انگریز نے ساگ تو کسی نہ کسی طرح کھا ہی لیا لیکن روٹی واپس کرتے ہوئے بولا۔ "تھینک یو، اپنی پلیٹ لے جاؤ۔"

***

آج کل

آج کل تحفہ دیے بغیر کسی لڑکی سے اظہار محبت کرنا فیوز بلب سے روشنی کی توقع رکھنے کے مترادف ہے۔

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

سر چکرا گیا۔ ایک...... دو...... پھر وہ جنونی انداز میں ٹکریں مارنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میری مزاحمت دم توڑنے لگی اور حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ بہت خطرناک داؤ کھیل رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پھنسے ہوئے تھے۔ اس کی گن کی نال کے رُخ کا مجھے اندازہ تھا، اپنے پستول کے رخ کا علم نہیں تھا۔ میں اس ڈر سے ٹریگر نہیں دبا رہا تھا کہ کہیں اس سے نکلنے والی گولی میرے جسم میں ہی داخل نہ ہو جائے۔ آخری چارۂ کار جان کر میں نے 'اوغ' کی دردناک آواز حلق سے خارج کی اور آنکھیں بند کر کے سر ایک جانب لڑھکا دیا۔ میرا داؤ کامیاب رہا۔ اس نے ٹکریں مارنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میرے اوپر سے اُٹھنے کی کوشش میں وہ جونہی پیروں کے بل تھوڑا بلند ہوا، میں نے اپنا گھٹنا موڑا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ پوری قوت سے دے مارا۔

میں نے اس ضرب میں اپنی تمام تر توانائی سمیٹ دی تھی۔ زندگی اور موت کے کھیل میں جان کی بازی لگائی جائے تو بساط پلٹی جا سکتی ہے۔ وہ 'ہائے' کی تیز آواز نکال کر میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور پیٹ کے بل میرے چہرے پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ چکی تھی۔ میری گرفت بھی برقرار نہ رہ سکی اور گن زمین پر لڑھک گئی۔ وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ سر اور ناف کے نیچے کی، اوپر تلے دو چوٹیں کھا کر بھی سرعت سے اُٹھ بیٹھا مگر تب تک میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے پستول اس کی پسلیوں پر رکھا اور دانت کچکچا کر کہا۔ ''ذرا سی حرکت سے میری انگلی ٹریگر دبا دے گی۔''

وہ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح ایک دم ساکت ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات دکھائی نہیں دیتے تھے مگر مجھے علم تھا کہ وہ میرا تسلط ختم کرنے کے لیے کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میں نے پستول کی نال پر دباؤ بڑھایا، مضبوط لہجے میں کہا۔ ''کوئی چالاکی دکھائے بغیر نیچے اُترو......''

وہ اٹھنے لگا۔ میں نے فوراً کہا۔ ''خبردار! کھڑے نہیں ہونا۔''

''پھر میں نیچے کیسے اُتروں؟'' اس نے بھڑک کر کہا۔

''کوئی بات نہیں...... یہیں پڑے رہو۔'' میں بولا۔

وہ جس طرح سے بھی نیچے اُترتا، میرے نشانے سے ہٹتا تھا۔ اس لیے اس کا مجھ پر لدے رہنا ہی بہتر تھا۔ جس لمحے میں نے اسے گولی مارنا چاہی، اُسی لمحے میرے دل میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ چاروں ڈاکوؤں میں آخری زندہ شخص تھا۔ ممکن تھا کہ ہمیں اس سے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے، اس سے کچھ پوچھنا پڑے، تب اسے مارنے کا افسوس ہوگا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اسے تقویت ملی کہ میں اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بولا۔ ''نام میں کیا رکھا ہے، جو اچھا لگے، وہی رکھ لو۔''

میں نے کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے، نہیں کرتا، تم کر لو۔'' اس نے اتنی بے پروائی سے کہا کہ میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا، میں نے غرا کر کہا۔ ''یہ تم کس انداز میں بات کر رہے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے کانوں میں مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے والی امام مسجد کی آواز پڑی۔ وہ نور پور کے مکینوں کو گاؤں میں ڈاکوؤں کی موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا اور بار بار اپیل کر رہا تھا کہ نور پور والو! جاگ جاؤ ورنہ ہمیشہ کے لیے سو جائیں گے۔ اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر باہر نکل آؤ، کوئی بھی ڈاکو بچ کر نہ جانے پائے۔ یہ سردار بخت خان کا حکم ہے۔

نور پور جاگنے والا تھا۔ مجھے بخوبی احساس ہو گیا کہ ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ اس وقت ہماری پوزیشن بھی ابتر تھی کیونکہ ہم بھی ڈاکوؤں کے سے حلیے میں تھے۔ سردار بخت خان نے اپنے کارڈلیس فون پر پولیس کو بھی مطلع کر دیا ہوگا اور وہ نیلی بتی گھماتے ہوئے کسی پل پہنچ سکتے تھے۔ ابھی نہ تو کھالے کی خبر تھی، نہ ہی موجو کے علاوہ کوئی گھر والا ہمارے ہاتھ لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخی پھیلنے لگی۔ میں نے کڑا فیصلہ کیا اور پستول کا ٹریگر دبا دیا۔

اسے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ بھیانک چیخ مار کر تڑپا اور پہلو کے رُخ زمین پر گر گیا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے اُٹھا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور تڑپنے کی رفتار دگنی ہو گئی۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کی گن اس سے دور کر دی اور دیوار پر چڑھنا چاہا مگر تیورا کر زمین پر گر گیا۔ اس کی پے در پے ٹکروں نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بہ دقت تمام خود کو سنبھالا، سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور پھر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کئی کوششوں کے بعد کامیاب ہوا اور لینڈ کروزر اور دیوار کی درمیانی جگہ پر کود گیا۔ بابر خان دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھنے کے انداز میں گرا ہوا تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور فوراً گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

سیٹ پر دو وجود ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے بیلٹ سے ٹارچ کھینچی اور آن کردی۔ ننھے سے بلب کی تیز روشنی لینڈ کروزر کے اندرونی ماحول کو منور کرگئی۔ میرے حلق سے طویل سانس برآمد ہوئی۔ وہ فرزانہ اور شانو تھیں جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ نیند میں یا اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھیں۔ انہیں ہلایا جلایا، چہروں پر روشنی ڈالی، پتا چلا کہ ان کے ہونٹوں پر بھی چوڑی ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیپ کھینچ دی۔ نبضیں چیک کیں، سانسوں کی آمدورفت کا معائنہ کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ دونوں بخیریت تھیں۔

میں نے ٹارچ کی روشنی جیپ کے عقبی حصے میں ڈالی۔ کھالا اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اسے لباس اور گھنگریالے سیاہ بالوں کی وجہ سے پہچانا تھا۔ اسے لٹایا نہیں گیا تھا بلکہ ٹھونسا گیا تھا کیونکہ عقبی حصے میں جگہ کم تھی۔ میں جلدی سے لینڈ کروزر کے عقب میں آیا، بیک ڈور کھولا اور بالوں سے پکڑ کر کھالے کا سر اوپر اُٹھایا۔ چہرہ دیکھا۔ چہرہ مٹی میں اَٹا ہوا تھا۔ اس کی نبض محسوس کی، شکر تھا کہ وہ زندہ تھا۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جلدی سے جیپ میں گھس گیا اور چند ہی لمحوں میں اس کے جسم کو ٹٹولنے کے بعد بھانپ گیا کہ اسے کہیں چوٹ نہیں لگی تھی۔ اگر کوئی چوٹ آئی بھی تھی تو اس سے خون نہیں رستا تھا۔ اس کی گن اور پستول دکھائی نہیں دیا۔ بیلٹ میں سوائے ایک پستول کی میگزین کے کچھ بھی نہیں تھا۔ سردست اس کا سامان تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا، اس کے زندہ مل جانے پر اللہ کا شکر بجا لایا جاسکتا تھا۔

میں نے عجلت میں اسے ہوش میں لانے کی اپنی سی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی تو میں نے بیک ڈور بند کیا اور برقی مستعدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ حملہ آوروں اور ڈاکوؤں کی گاڑیاں ممکنہ فراری ضرورت کے تحت بھگانے کے لیے تیار حالت میں کھڑی کی جاتی ہیں۔

ایسے ہی وقت میں نور پور میں شور مچ گیا۔ لوگ نعرہ زنی کرنے لگے تھے۔ میں ان دیہاتیوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے نام پر یہ ہر موجود اسلحہ تھام کر گھروں سے نکل آتے تھے اور سینہ سپر ہوجاتے تھے۔ میں نے مزار کے گنبد کی طرف دیکھا اور آوازوں کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو علم نہ ہوسکا کہ لوگ کس جانب جمع ہوئے ہیں، مگر گنبد کے پار پیلی روشنی اور دھوئیں کا مرغولہ فضا میں اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے سمجھنے میں ذرا تاخیر نہیں ہوئی کہ میرے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ کمروں کے اندر انڈیلا ہوا مٹی کا تیل ایک دیا سلائی کا منتظر تھا۔ دیا سلائی جلانے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا مگر دیا سلائی جل کر میرے گھر کو خاکستر کرنے لگی تھی۔

میرا ذہن بری طرح جھنجھنا اُٹھا۔ یہ کیسے ہوگیا تھا؟ دو حملہ آور پیاجی کے پستول کا لقمہ بن چکے تھے، دو کو میں نے راہِ عدم دکھا دی تھی، پھر دیا سلائی جلانے والا پانچواں کون تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پیا کے شکار نے غلط بیانی کی تھی اور اس کے ساتھیوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی۔ باقی بچ جانے والوں نے پیا پر قابو پالیا ہو اور گھر کو آگ لگادی ہو...... پیا، موجو، چاچا اور چاچی آگ کا نوالہ بن گئے ہوں...... میری سانس رُکنے کو آگئی۔ میں نے گیئر لگایا۔ گاڑی آگے بڑھانا چاہی تو وہ جھٹکا لے کر بند ہوگئی۔ میں نے آج تک ایسی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ میں نے پھر چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گیئر لگانے کے بعد بڑی احتیاط سے کلچ چھوڑا۔ اس مرتبہ گاڑی بند نہیں ہوئی اور اچھل کر تیزی سے آگے بڑھی۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے یوٹرن لیا اور گیٹ عبور کرکے نا پختہ راستے پر موڑ دی۔ میرا رُخ نور پور کی طرف تھا۔ جونہی میں اپنی گلی میں پہنچا، اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی اسوزوٹروپر کو غائب پایا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں کیونکہ مجھے ناب کا علم نہیں تھا اور نہ میرے پاس ٹٹول کر اسے تلاش کرنے کا وقت تھا۔ میرے گھر کو لگی ہوئی آگ لمبے اور بھڑکیلے شعلے اگل رہی تھی اور گلی کے چوک میں اکٹھے ہونے والے لوگ آگ کی پرہیبت روشنی میں بہت پراسرار معلوم ہورہے تھے۔ کئی لوگ پانی کی بھری ہوئی گھریلو استعمال کی بالٹیاں اُٹھائے میرے گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ انہیں میری گاڑی کو دیکھنے اور سمجھنے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

پیا نکل چکا تھا یا اسے مارنے والے ہماری گاڑی لے کر نور پور سے رخصت ہوچکے تھے۔ امید جاگی کہ پیا ہی نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا ہوگا۔ وہ جاتے ہوئے میرے بقیہ گھر والوں کو بھی نکال کر، اسوزوٹروپر میں ڈال کر نور پور سے نکلا ہوگا۔ میں نے گھر کے برابر گاڑی نہیں روکی بلکہ لوگوں کی طرف بڑھا۔ نور پور سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں کم وبیش پندرہ بیس افراد اکٹھے تھے۔ شوروغوغا فضا میں بپا تھا۔ میرے گھر کا سامان جلنے کی تیز آوازیں، لوگوں کی چیخ وپکار، مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے

والی اطلاع...... آوازوں کے ہجوم میں کسی آواز کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں جونہی چوک پہنچا، لوگوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ سبھی کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار موجود تھا۔ بندوقیں، پستول، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں...... لینڈ کروزر کو دیکھ کر دو تین بندوقیں سروں سے بلند ہوئیں، ہوائی فائرنگ کی خوف ناک آواز گونجی پھر لوگوں نے گاڑی کا رُخ کیا۔

میں نے جلدی سے گردن باہر نکالی اور چیخ کر کہا۔ ''میں شہرا ہوں...... چاچے چراغ کا بھتیجا...... پرے ہٹ جاؤ، ایمرجنسی ہے......''

میرا یہ اقدام ناگزیر تھا کیونکہ میں ہوائی فائر کرکے ان لوگوں کو پرے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ قریب آنے والوں نے میری آواز سن لی۔ ایک بڑی ٹارچ نے میرا احاطہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے پہچاننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جب تسلی ہوگئی تو آگے کھڑا ہوا کالا بزدار چیخ کر بولا۔ ''اوئے شہرے! توں اِتھ کیا کریندیں تے اِہ کیا ڈراما ہے؟''

(تم یہاں کیا کررہے ہو اور یہ کیا ڈراما ہورہا ہے؟)

میں نے چیخ کر غصے سے کہا۔ ''مجھے فوراً نکلنے دو، ایمرجنسی ہے۔ میری بہنیں مررہی ہیں، انہیں اسپتال پہنچانا ہے۔''

ساتھ ہی میں نے ایکسی لریٹر دبا دیا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے لوگ مجھ پر گولی نہیں چلائیں گے۔ ان سب کو علم ہوگیا تھا کہ گاڑی میں چراغ دین کا بھتیجا شہریار موجود تھا۔

سبھی پرے ہٹ گئے۔ مجھے راستہ مل گیا۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر پکی سڑک پر چڑھ گئی۔ میں نے نوری چوک کی طرف جانے کی بجائے ناک کی سیدھ میں جانا مناسب خیال کیا۔ ایک تو ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ واپسی پر لال پیر والا راستہ لیا جائے گا۔ دوسرا یہ خوف لاحق تھا کہ پولیس اب تب میں پہنچنے والی ہوگی۔ نوری چوک والے راستے پر جانے کی صورت میں پولیس موبائل وین سے مڈبھیڑ ہونے کا احتمال تھا۔ میں نے ایک نظر دائیں ہاتھ واقع سرکاری اسپتال کی خوابیدہ عمارت پر ڈالی، ایک نظر یارن خان کی حویلی کو دیکھا، پھر گیئر بدل کر نہایت تیزی سے نور پور سے نکلتا چلا گیا۔ نور پور کی خونیں جنگ سے محفوظ نکل آنے کے باوجود ابھی تک میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دو چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پیا کہیں رک کر میرا انتظار کرے گا، اس لیے میں اردگرد

بائی چانس

ایک عورت کا شوہر گم ہوگیا۔ وہ اپنی پڑوسن کے ساتھ پولیس اسٹیشن رپورٹ درج کروانے گئی۔ پہچان کے لیے اس نے حلیہ بتایا۔ ''لمبا قد، گورا رنگ، ہینڈسم، عمر 25 سال۔''

پڑوسن نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''جھوٹ کیوں بول رہی ہو، تمہارا شوہر تو چھوٹے قد کا، موٹا اور کالا ہے اور اس کی عمر بھی 40 سال ہے۔''

عورت نے کہا ''جو گیا، سو گیا...... اب جو ملے وہ تو اچھا ہو۔''

سرزنش

ایک صاحب جھومتے ہوئے نائٹ کلب سے نکلنے لگے تو دربان ان کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے لپکا مگر کسی چیز میں الجھ کر گر پڑا۔ کلب کے منیجر نے باہر آکر اس کو ڈانٹا۔ ''ذرا احتیاط سے چلا کرو، تمہارے اس طرح گرنے سے کوئی سمجھے گا کہ تم دربان نہیں، کلب کے ممبر ہو۔''

مبالغہ آمیزی

''امی دیکھیے! ہمارے گھر کے باہر ایک بہت بڑا کالا بلا کھڑا ہے' بالکل ہاتھی کے برابر۔'' ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔

ماں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''بات کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کیا کرو۔ تمہاری اس عادت پر میں تمہیں پچاس کروڑ مرتبہ ٹوک چکی ہوں۔''

مرسلہ: فہیم تبسم، شورکوٹ

دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

میری ساری تگ و دو اسی اندازے پر استوار تھی کہ پیا میرے گھر والوں کو لے کر نور پور سے کامیاب نکل گیا ہو گا۔ میری سانس گھٹنے لگی جب اس خوف ناک سوچ نے دماغ میں بسیرا کیا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو...... اگر پیا عجلت میں بھاگا ہو اور وہ کسی کو بھی ساتھ نہ لے سکا ہو، یا وہ کسی بھی وجہ سے چاچا اور چاچی کو کمرے سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکا ہو تو...... اس کے آگے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہوگئیں اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنا ماتھا اسٹیئرنگ ویل پر مارا، پھر سر جھٹک کر اس ہولناک سوچ سے چھٹکارا پانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے فوراً بریک لگائے۔ اس ویرانے میں مجھے کون آواز دے سکتا تھا؟ حیرانی سے سر باہر نکال کر عقب میں دیکھنے لگا۔ اتنے دبیز اندھیرے میں کیا نظر آنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر آواز سنائی دی۔ ”شہریار......“

میرے کان بجے نہیں تھے۔ میں پیا کی آواز پہچان چکا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے دروازہ کھولا اور پیچھے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ کوئی تیس گز کے فاصلے پر، جہاں میرے اندازے کے مطابق پیا کو موجود ہونا چاہیے تھا، پہنچ کر رُک گیا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کماد کی فصل لہلہا رہی تھی، چند قدموں کی دوری پر اسکول کی عمارت اندھیرے کا حصہ بنی کھڑی تھی۔ میں نے پیا کی آواز پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہلکی سی آواز دی۔ ”پیا جی!“

کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو میں نے پہلے سے بلند آواز میں پکارا۔ جواب نہیں ملا مگر کماد میں مخصوص سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی وہاں موجود تھا۔ میں نے پھر پکارا۔ اسی اثنا میں ایک ہیولا برآمد ہوا اور تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔ وہ پیا تھا۔ قریب پہنچ کر بولا۔ ”شکر ہے کہ تمہیں زندہ دیکھ رہا ہوں ورنہ میں نے تو سمجھا تھا کہ تمہاری بتی گل ہوگئی ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم یہاں کیسے؟ گاڑی کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”گاڑی کو میں نے ادھر اسکول کے قریب چھپا رکھا ہے۔“ وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔

”مگر تم یہاں کیوں چھپے تھے؟“

”میں کچھ وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں تو تم دونوں کو تلاش کرنے کے لیے دوبارہ نور پور جاؤں گا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گاڑی اس جانب آرہی ہے۔“ وہ مجھے پکڑ کر اسکول کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں جلدی سے کماد میں چھپ گیا۔ میں نے سوچا تھا، اگر یہ تم ہوئے تو روک لوں گا۔ تم نہ ہوئے تو چھپا رہوں گا۔“

”پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ گاڑی میں، میں ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ میں نے لینڈ کروزر کی روف لائٹ آف کر رکھی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی آف تھیں۔ کوئی انڈیکیٹر بھی آن نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟

یہ معما اسی نے حل کر دیا۔ ”میں نے آواز دی تھی۔ تم نے سن لی اور اُتر آئے۔ کوئی اور ہوتا تو گاڑی نہ روکتا اور آگے گزر جاتا۔“

وہ واقعی بہت زیرک اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس دوران ہم دونوں اپنی اسوزوٹرو پر کے قریب پہنچ گئے تھے جسے اس نے اسکول کی دیوار کے ساتھ، بیر کے گھنے اور کم قامت درخت کے عقب میں کھڑا کر رکھا تھا وہ بولا۔ ”ہیڈ لائٹس کے بغیر اتنے اندھیرے میں گاڑی چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔“

”یہ راستے میرے دیکھے بھالے ہیں، ازبر ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”باقی لوگ گاڑی میں ہیں؟“

وہ چونک کر رُک گیا، تاسف سے بولا۔ ”باقی لوگ......“ پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ پیا کسی کو بھی نکال لانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا جو بذاتِ خود اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا۔

پیا نے مجھے دونوں شانوں سے تھام کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور ہمدردانہ انداز میں بولا۔ ”میں تمہارے دُکھ سے آشنا ہوں مگر اوپر والا جیسے بن مانگے دیتا ہے، ویسے ہی بن پوچھے واپس لے لیتا ہے۔ یہی سچائی ہے جسے بہادر لوگ حوصلے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔“

بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ”یا اللہ! رحم...... رحم......“

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

فریب کار

نگارش نصر

جب دوستی زہر سے ہو اور رشتوں سے دشمنی تو بہ مشکل جان کو امان مل پاتی ہے... وہ جو آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں تھا... جسے اپنے ہنر پر بڑا گھمنڈ تھا اور خود کو سکندرِ ثانی تصور کرتا تھا کہ اچانک اپنے ہی ایک رشتے سے مات کھا گیا۔ جس کی آنکھوں کی چمک دنیا کو شدید حیرانی میں مبتلا رکھتی تھی مگر اس ایک لمحے میں کائنات کی تمام حیرت سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اتر آئی کیونکہ حقیقت بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔

اس فریب کار دنیا میں آزمائش کن لمحات کی سنسنی خیز واردات

جسٹن گڈ چھ فٹ قد کا مالک ایک بیل جیسا مضبوط آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اتنے مضبوط دکھائی دیتے تھے جیسے فولاد کے بنے ہوں۔ اس کی بھوری رنگت قدرے سرخی مائل تھی اور چہرے پر بہت سے تل کے نشان تھے۔ اس کی موٹی ناک یوں محسوس ہوتی تھی جیسے چہرے پر غبارہ فٹ کیا ہو لیکن سب سے زیادہ اس کی توجہ کھینچی تھی جسٹن کی سبز مائل نیلی آنکھوں نے۔

”سانپ جیسی پُراسرار اور ڈراؤنی۔“ اس نے

زیرلب کہا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا پوچھنے لگا۔

''مجھ سے کچھ کہا تم نے لڑکی؟'' لنڈا نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں میں کیا کہوں گی۔'' وہ چند لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے میری آفر کے بارے میں؟'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر جیسے اسے یقین دلاتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں فورس نہیں کر رہا۔ اگر تمہیں میری آفر معقول لگے تو دو تین گھنٹوں تک مجھے بتا دینا۔ کیونکہ میں کل شام تک واپس جانا چاہتا ہوں۔'' لنڈا نے ایک لمبی سانس لے کر اس کے بدن سے اٹھتی مہک کو اپنی سانسوں میں جذب کیا پھر سوچتے ہوئے بولی۔

''خیر مجھے سوچنے کے لیے دو تین گھنٹے ہی درکار ہوں گے۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے جس کو بتانے کے لیے مجھے رکنا ہوگا۔ اگر میں تمہاری آفر قبول کرتی ہوں تو تم جب کہو گے میں تیار ہو جاؤں گی۔''

اس نے دیکھا جسٹن کی سانپ جیسی آنکھوں میں ایک تیز چمک لمحے بھر کو لہرائی تھی پھر وہ نارمل نظر آنے لگا۔ وہ بولی ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ مجھے سوچنے کے لیے تنہائی درکار ہے۔'' جسٹن نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ لنڈا نے اپنا چھوٹا سا پرس سنبھالا اور ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ لفٹ کی طرف تھا۔ جسٹن اس ہوٹل کی پانچویں منزل پر ٹھہرا ہوا تھا۔

لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ پر آئی اور تیز قدموں سے بار کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

''ہائے لنڈا! کیسی ہو۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتیں، آج پھر نئے حلیے میں، خیر تو ہے؟'' لنڈا نے ایک نمائشی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکالی۔

''اوہ دراصل بات یہ ہے جارڈن کہ میں آج کل کام کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ آج اسی سلسلے میں حلیہ بدل کر ادھر آئی تھی۔'' اس نے بائیں آنکھ دبائی۔ جارڈن کھل کر مسکرا دیا۔

''خیال ہے...... کبھی کبھی بہت بے ضرر نظر آنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔'' لنڈا نے شانے اچکا دیے پھر قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

''مجھے دراصل کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ جیسے ہی میں کچھ کما لوں گی تو تمہیں لوٹا دوں گی۔'' بات مکمل کر کے وہ پُرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جارڈن چند لمحے اپنی بڑی سی تھوڑی کھجاتا رہا پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

''لنڈا ڈارلنگ یقین کرو۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم وعدے کی پکی ہو اور پیسے لوٹا دو گی مگر اس وقت واقعی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو میں اپنے کسی ساتھی سے تمہیں کچھ رقم دلا دیتا ہوں۔''

لنڈا چند لمحے سوچتی رہی۔ اس دوران ویٹر آرڈر لے آیا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہاں کوئی رش نہیں تھا پھر بھی اِکّادُکّا لوگ اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ جارڈن اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور لنڈا خاموشی سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ آرڈر سرو کر کے وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا وہ بولی۔

''ٹھیک ہے تم کسی سے ہی دلا دو۔ اصل میں اس وقت میں رقم کے بغیر بالکل بھی گزارہ نہیں کر سکتی۔'' جارڈن سر ہلاتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ایک راہداری میں مڑ گیا۔ لنڈا جانتی تھی اس راہداری میں آگے جا کر ایک کمرا اسٹاف روم کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس میں ہوٹل کے ورکر یونیفارم تبدیل کرتے تھے اور فارغ وقت میں وہاں ستا بھی لیتے تھے۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد جارڈن واپس آتا دکھائی دیا۔ اس نے آتے ہی رقم کاؤنٹر پر رکھ دی۔

''کافی ہے؟ اس وقت یہی ملے ہیں۔'' لنڈا نے اٹھا کر گنا وہ دس ڈالرز سے کچھ زائد تھے۔ اس نے ڈالرز اٹھا لیے اور باقی واپس کرتے ہوئے بولی۔

''بس اتنا کافی ہے تمہارا شکریہ میں جلد یہ رقم لوٹانے کی کوشش کروں گی۔'' جارڈن نے مسکرا کر اس کا شکریہ قبول کیا تھا۔ لنڈا اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ ہر ایسے موقعے پر جب لنڈا کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی جارڈن اس کے کام آیا تھا۔ وہ جارڈن کو تب سے جانتی تھی جب وہ ہائی اسکول کی طالبہ تھی وہ اس سے سینئر تھا۔ بہت سادہ دل اور ہمدرد جارڈن بہت جلد لنڈا کا دوست بن گیا اور ہر موقعے پر اس کی توقع پر پورا اترا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر وہ سڑک پر پیدل چلنے لگی۔ اس کا ارادہ مارکیٹ جانے کا تھا۔ اسے کچھ ضروری اشیا خریدنا تھیں۔ کیونکہ کل شام وہ جسٹن گڈ کے ساتھ اس کے فارم

ہاؤس روانہ ہونے والی تھی۔ اگرچہ اس نے جسٹن کو یہی تاثر دیا تھا کہ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتی ہے مگر دراصل وہ اس خریداری کے لیے رقم کا بندوبست کرنا چاہتی تھی۔

جسٹن گڈ اسے ایک شام ایک بازار میں ملا تھا۔ لنڈا نے اس کے پاس بہت دولت دیکھی تھی۔ وہ تب سے اس کے پیچھے تھی۔ پھر عادت کے مطابق وہ اچانک اس سے ٹکرا گئی۔ معذرت کے کلمات ادا کرتے کرتے اس نے جسٹن کو اس طرح مسکرا کر دیکھا کہ وہ اسے ایک گلاس بیئر کی آفر کیے بنا نہ رہ سکا۔

لنڈا تو چاہتی ہی یہی تھی۔ ایک گلاس بیئر پینے کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کا تعارف حاصل کر چکے تھے۔ لنڈا نے بڑی معصومیت سے اسے بتایا تھا۔

''میں اکیلی ہی ہوں۔ میری ماں نے اکیلے میری پرورش کی تھی۔ پھر جب میں دس سال کی تھی اس نے دوسری شادی کر لی۔ میں گورنمنٹ کے فنڈ پر پلتی رہی۔ پھر تعلیم مکمل کر کے میں نے بہت سی نوکریاں کیں آج کل پھر سے فارغ ہوں اور نوکری کی تلاش میں جا رہی تھی کہ تم ٹکرا گئے۔'' تب لمحہ بھر سوچتے رہنے کے بعد جسٹن نے اس سے کہا تھا۔

''تم کل نو سے گیارہ کے درمیان مجھ سے ملو۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ میں ہوٹل گولڈن سینڈ کے پانچویں فلور پر کمرا نمبر پانچ سو ایس میں مقیم ہوں۔''

اور لنڈا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں قسمت آزمائی ضرور کرے گی۔ اسی سلسلے میں وہ آج اس سے ملی تھی۔ حسبِ توقع جسٹن نے اسے نوکری کی آفر کی تھی۔

!!!

روم سروس کے ذریعے اس نے اپنے لیے کافی منگوائی اور خود چینل بدلنے لگا۔ اسے شدت سے لنڈا کے جواب کا انتظار تھا۔ اسے کسی بھی قیمت پر ایک میڈ کی ضرورت تھی۔ اگرچہ وہ اچھا کھانا بنا لیتا تھا مگر بہت سے دوسرے کام کرنے کے لیے اسے میڈ کی ضرورت تھی۔ وہ اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔

''یس آجاؤ...... دروازہ کھلا ہے۔'' اگلے لمحے ویٹرس ایک چھوٹی ٹرے میں کافی لے کر اندر آ گئی۔ اس نے سلیقے سے کافی میز پر رکھی پھر مسکرا کر بولی۔

''مزید کوئی خدمت جناب؟'' جسٹن نے کافی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ پچیس تیس برس کی ایک فربہی مائل لڑکی تھی۔ اگر اس کی آنکھیں قدرے بڑی ہوتیں تو شاید وہ زیادہ اچھی لگتی مگر اس وقت وہ جسٹن کو بالکل نہیں بھائی تھی سو اس نے روکھے پن سے کہا۔

''نہیں اور کافی کے لیے شکریہ۔''

ویٹرس برا سا منہ بنا کر واپس مڑ گئی۔ جسٹن خاموشی سے کافی پینے لگا۔

!!!

بڑا سا کمرا مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر جار میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے سانپ رکھے ہوئے تھے۔ ایک پتلی سی لمبی لڑکی عجیب چال چلتی ہوئی ان جانوروں کے درمیان سے آگے بڑھ رہی تھی۔

اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ اسے دیکھ کر سانپ کلبلانے لگے تھے۔ مگر لڑکی نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کے ہونٹ واضح طور پر نیلے نظر آرہے تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک دم نیچے بیٹھ گئی جیسے اسے چکر سا آ گیا ہو۔ چند لمحوں بعد اس کی مدھم سی آواز ابھری۔

''لگتا ہے میں مر رہی ہوں۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے پتا نہیں وہ جار اس نے کہاں رکھ دیا ہے۔''

چند لمحوں بعد وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی کمرا پار کر کے وہ ایک اور کمرے میں داخل ہو گئی جس کا دروازہ اس ہال نما کمرے میں کھلتا تھا۔ کمرے کا فرش شیشے کا تھا۔ دیواروں پر گہرا سرمئی پینٹ کیا گیا تھا۔ اس کا عکس فرش میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی خوشی سے چلائی۔

''وہ رہا سنہرا جار۔''

کمرے کے ایک کونے میں سنہرا جار رکھا تھا۔ اس میں سنہرے مائل زرد رنگ کا ایک تین فٹ لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا، لڑکی کو دیکھتے ہی وہ دھیرے دھیرے پھنکارنے لگا۔ لڑکی کے سست قدموں میں قدرے تیزی آ گئی۔ وہ کمرا پار کر کے کونے میں رکھے جار تک پہنچ گئی۔ اکڑوں بیٹھ کر اس نے احتیاط سے جار کا ڈھکن ہٹایا۔

سانپ اچھل کر اس پر آ پڑا۔ لڑکی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پیچھے گر گئی.... سانپ اس کے جسم پر ڈنک مارنے لگا۔ ہر بار جب سانپ اسے کاٹتا تو اس کے جسم کو جھٹکا لگتا اور اس کے منہ سے سسکاری سی نکل جاتی۔ چار پانچ مرتبہ اسے ڈسنے کے بعد سانپ اتر کر تیزی سے ایک طرف کونے میں بنے چھوٹے سے بل میں غائب ہو گیا۔

لڑکی اسی طرح فرش پر پڑی تھی۔ بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہوگئی ہو اور غور سے دیکھنے پر سانس کا زیر و بم واضح دکھائی دیتا تھا۔

لڑکی کو اسی حالت میں چند منٹ گزرے ہوں گے جب باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک بہت بڑا سانپ نمودار ہوا۔ وہ سیدھا فرش پر بے سدھ پڑی لڑکی کی طرف آیا۔ سانپ کی لمبائی تو دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی مگر وہ اتنا موٹا تھا کہ لڑکی کو آسانی سے نگل سکتا تھا۔ وہ اناکونڈا کی نسل کا ایک سانپ تھا، لڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور لڑکی کا سر نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کے سامنے کے لمبے اور نوکیلے دانت جب لڑکی کے ماتھے میں چبھے تو وہ بری طرح تڑپی مگر سانپ نے اسے نگلنا ترک نہیں کیا۔ لڑکی مسلسل پھڑک رہی تھی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ استعمال کرتی۔ سانپ اپنی کوشش میں مصروف تھا۔ ایک سے ڈیڑھ منٹ میں وہ لڑکی کو گردن تک نگل چکا تھا۔ لڑکی کی مزاحمت ماند پڑتی جارہی تھی۔

زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں سانپ لڑکی کو سالم نگل چکا تھا۔ اب وہ آرام سے کمرے کے فرش پر اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔

اسکرین کے سامنے بیٹھے جسٹن کے لبوں پر ایک محظوظ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''بے چاری اینا روزا'' اور کمپیوٹر بند کرنے لگا۔ یہ وڈیو دو روز پرانی تھی۔ جسٹن کل شام ہی اپنے فارم ہاؤس پر واپس پہنچا تھا۔ لنڈا اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ اسے اس کا کمرا دکھا کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا اور تب سے اب تک وہ کوئی دس مرتبہ یہ وڈیو دیکھ چکا تھا۔

''گویا کامیابی اس سے محض ایک قدم کی دوری پر ہے۔'' اس نے مدھم سی خود کلامی کی۔ اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ لنڈا باورچی خانے میں کچھ کھانے میں مصروف تھی۔ وہ وہیں آگیا۔

''ہیلو! گرل کیا ہو رہا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔ لنڈا نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مصروف سے انداز میں بولی۔ ''ہائی ٹی بنا رہی ہوں۔ تمہیں کوئی کام تھا؟''

''ہاں مجھے ایک بڑا مگ چائے اور ساتھ کچھ کھانے کو دے دو۔ پھر میں اپنی تجربہ گاہ میں جانا چاہتا ہوں۔''

اوون کا تھرموسٹیٹ سیٹ کر کے لنڈا اس کی طرف مڑی۔ ''تم کوئی سائنس دان ہو؟'' جسٹن نے سر ہلایا۔

''ہاں تم کہہ سکتی ہو۔'' لنڈا چائے بناتے ہوئے بولی۔

''مگر تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔ تم نے تو کہا تھا کہ تمہارا ایک فارم ہاؤس ہے۔'' وہ کیبنٹ کی طرف گئی تھی ایک مگ اور ٹرے لا کر شیلف پر رکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں سائنس دانوں کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہارا فارم ہاؤس کس قسم کا ہے؟'' جسٹن نے معتدل لہجے میں کہا۔

''تم نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ بہرحال میں ویسا خشک مزاج نہیں جیسے عام طور پر سنکی سائنس دان ہوتے ہیں۔ تمہارا وقت یہاں بڑا اچھا گزر جائے گا اور رہ گئی فارم ہاؤس کی بات تو میرا فش اور سانپوں کا فارم ہے۔ یہ میری ذاتی زمین پر قائم ہے۔ کیا تم دیکھنا پسند کرو گی؟''

لنڈا نے چائے تیار کر کے ایک کیک پیس کے ساتھ اس کے سامنے رکھ دی۔

''ایک بار تو ضرور دیکھوں گی۔ اگر ماحول پسند آگیا تو روزانہ بھی وہاں جا سکتی ہوں' ویسے کتنا بڑا ہے تمہارا فارم؟''

جسٹن اسے فارم کی لمبائی چوڑائی بتانے لگا۔ لنڈا کام نمٹاتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے اب میں جا رہا ہوں۔ کام سے فارغ ہو کر تجربہ گاہ میں آجانا۔'' لنڈا سر ہلا کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

!!!

چھوٹا سا کمرا ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھا۔ اس میں ایک بیڈ، ٹو سیٹر صوفہ ایک کلر ٹی وی اور ایک دیوار گیر کپڑوں کی الماری بھی تھی۔ لنڈا نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے ساتھ لائے گئے بیگ کو الماری میں رکھ کر مقفل کیا تھا۔

اس معاملے میں وہ کبھی بے پروائی نہیں کرتی تھی۔ پھر وہ کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ اس نے بہ غور کھڑکی اور اس کے فریم کا جائزہ لیا۔ کھڑکی اگرچہ چھوٹی تھی مگر اس جیسی اسمارٹ سی لڑکی کے لیے اس میں سے گزر جانا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے دروازے اور اس کے لاک کا اچھی طرح جائزہ لیا، اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

لاک میں خرابی پیدا کی گئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ جسٹن نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے کھانا بنانے اور کپڑے دھونے کے علاوہ صفائی کا کام بھی کرنا تھا لیکن تنخواہ اتنی پُرکشش تھی کہ لنڈا نے فوراً ہامی بھر لی۔ ویسے بھی اسے تو یہ جاب ہر قیمت پر کرنا ہی تھی۔

اس کی جاب صبح سے شروع ہوتا تھی۔ رات کا کھانا وہ شہر سے لے آئے تھے۔ جسٹن کا فارم ہاؤس قریبی قصبے سے بھی بہت دور تھا۔ راستے میں جسٹن نے اسے بتایا تھا کہ ''ہفتے میں ایک بار فش ٹرالر آکر مچھلی لے جاتا ہے اور میں اپنی ضرورت کی چیزیں پندرہ بیس دنوں بعد خود جا کر لے آتا ہوں راشن سمیت۔ ویسے میں زیادہ تر تازہ گوشت ہی کھاتا ہوں۔''

اگلی صبح دوپہر کا کھانا تیار کر کے وہ جسٹن کی دعوت پر اس کی تجربہ گاہ میں چلی آئی۔ وہ ایک سانپ کے منہ سے زہر نکالنے میں مصروف تھا۔ لنڈا نے دلچسپی سے اس عمل کو دیکھا۔ ''تم تو کافی ماہر ہو۔'' اس نے جسٹن کی تعریف کی وہ ایک مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ لنڈا دیواروں کے ساتھ ساتھ رکھے جاروں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''تمہارے پاس تو سانپوں کا بڑا اچھا کلیکشن ہے۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''یہ میرا شوق ہی نہیں جنون ہے۔ اسی کی وجہ سے میں شہر سے اتنی دور اس ویرانے میں پڑا ہوں۔'' پھر وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔ لنڈا کو لگا وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ مشرقی دیوار کے ساتھ رکھے جاروں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ چھوٹے سے شیشے کے جار میں بند سرخ رنگ کے ایک بالشت بھر لمبے سانپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے جسٹن کی طرف دیکھا وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

لنڈا واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''او کے تم اپنا کام کرو میں اب فش فارم دیکھنے جارہی ہوں۔'' جسٹن خاموشی سے اس زہر کو ایک اسپرٹ لیمپ پر گرم کر کے بھاپ میں تبدیل کرتا رہا۔ لنڈا کندھے اچکا کر باہر نکل گئی۔ اب اس کا رخ فش فارم کی طرف تھا۔ جسٹن گڈ کا فش فارم بہت بڑا نہیں تھا لیکن اتنا بڑا ضرور تھا کہ وہ ہر ہفتے مچھلی مارکیٹ بھجواتا تھا۔ لنڈا کو ایک خاص مچھلی کی تلاش تھی مگر اسے وہ فش فارم میں نظر نہیں آئی۔

''گویا سب کچھ تمہارا وہ سانپوں کا کمرا ہی ہے۔'' فش فارم سے ہو کر وہ باقی جگہ کو گھوم پھر کر دیکھنے لگی۔ جسٹن کا فارم ہاؤس کل پانچ چھ ایکڑ پر محیط تھا۔ اس میں ایک بڑے سے باغ کے علاوہ رہائشی عمارت بھی تھی۔ رہائشی عمارت میں کل پانچ کمرے تھے۔ تین کمرے الگ بنے ہوئے تھے اور جسٹن کے استعمال میں تھے۔ ایک کمرا لنڈا کے پاس تھا اور ایک کچن تھا۔

گھوم پھر کر وہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے الماری کھولی اس میں سے بیگ نکالا۔ پھر بیگ کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک پیکٹ نکال لیا۔ پیکٹ میں ایک خط اور ایک تصویر تھی لنڈا نے ایک مرتبہ پھر خط پڑھا۔ نظر جما کر تصویر دیکھی اور پھر سے پیکٹ میں بند کر کے واپس رکھ دی۔

''تو گویا گیم شروع ہے۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دوپہر کا کھانا لگانے چل دی۔

!!!

جسٹن اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھا جب لنڈا اندر آئی۔ ''جسٹن یہاں تو سگنل ہی نہیں آرہے۔ مجھے اپنے دوست کو فون کرنا تھا۔'' وہ قدرے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔ سو نارمل لہجے میں بولا۔

''دراصل مجھے شور و شغب سے سخت الجھن ہوتی ہے اس لیے میں نے جامر لگایا ہوا ہے تاکہ کوئی فون کر کے مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ اگر تمہیں کہیں ضروری کال کرنا ہوگی تو میں تھوڑی دیر کے لیے جامر بند کر دوں گا۔''

وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

''او کے کل مجھے اپنے دوست کو فون کرنا ہے۔ تم کتنے بجے جامر بند کر دو گے؟'' جسٹن نے بلا توقف کہا۔

''کل دوپہر میں دو گھنٹے کے لیے بند کر دوں گا۔'' وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''پیاری لڑکی اب تم اس دنیا اور اس کی رنگینیوں کو بھول جاؤ۔'' اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

!!!

جسٹن اپنے کمرے میں نہا رہا تھا۔ لنڈا تیزی سے تجربہ گاہ میں پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ کا سنہرے رنگ کا محلول اس چھوٹے سرخ سانپ کے جار میں انڈیل دیا۔

سانپ بڑی تیزی سے اسے پی رہا تھا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے سارا محلول ختم کر دیا۔ لنڈا کو یہ

سانپ بہت بھایا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی یہ دلچسپی جسٹن کی نظر میں آئے۔

اسے جسٹن کے فارم پر آئے ہوئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ وہ جسٹن کی غیر موجودگی میں اس کے پورے گھر کی اچھی طرح تلاشی لے چکی تھی۔ سوائے اس کے بیڈروم کے۔ کیونکہ وہ جب بھی بیڈروم سے نکلتا اس کا دروازہ مقفل کر کے نکلتا تھا۔ یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی اصل مسئلہ اس کے بیڈروم کی چھت سے ایک زنجیر کے ذریعے لٹکتی چھوٹی سی بھوری چڑیا تھی جو دروازہ کھلتے ہی شور مچا کر گول دائرے میں اڑنے لگتی تھی۔

جبکہ لنڈا کو ڈر تھا کہ جسٹن اس کی آواز سن کر آ نہ جائے وہ اسے مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچن میں آ کر پلیٹ دھو کر رکھ رہی تھی جب جسٹن وہاں آیا۔ ''آج میں تمہیں اپنی پسند کا ہاٹ ڈاگ بنا کر کھلاتا ہوں۔'' لنڈا خوش ہو گئی۔

''چلو میری تو کچن سے جان چھوٹ جائے گی۔ تم کھانا بناؤ میں تب تک لانڈری کو دیکھ لوں۔''

دو گھنٹے بعد جب لنڈا ہفتے بھر کے اپنے اور اس کے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو جسٹن دوپہر کا کھانا تیار کر چکا تھا۔ ''تم ٹیبل سیٹ کرو، ہاٹ ڈاگ بس تیار ہی ہے۔''

وہ جیسے ہی کچن میں داخل ہوئی اس نے نیا حکم سنا دیا۔ لنڈا بدمزہ ہونے کے باوجود ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ ''یہ تمہارا ہاٹ ڈاگ۔'' اس نے ایک پلیٹ لنڈا کے سامنے رکھی جو کچن میں پڑی چھوٹی سی میز پر بیٹھی ہوئی تھی ''اور یہ میرا'' وہ خود بھی میز پر بیٹھ گیا۔

لنڈا نے بے صبری سے کھانا شروع کر دیا۔ کھانا ختم کر کے وہ اٹھ گئی۔ ''میں کافی بنا لوں تم پیو گے؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں اس وقت بازار جا رہا ہوں راشن وغیرہ لانے کے لیے۔ تم چاہو تو اتنی دیر آرام کر سکتی ہو اور برائے مہربانی تجربہ گاہ کی طرف جانے کی کوشش مت کرنا۔ وہ سانپ زہریلے ہیں تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

لنڈا نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔ پھر بولی۔ ''تم کب تک لوٹ آؤ گے؟ کیا میں اتنی دیر میں ایک اچھی نیند لے سکوں گی۔'' اس نے دیکھا جسٹن کی سانپ جیسی آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔ اس نے مزید اضافہ کیا۔

''دراصل کھانا کھا کر میری طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ ایک بھرپور نیند لینے سے میں بالکل فریش ہو جاؤں گی۔'' وہ مسکرایا۔

''میری طرف سے مکمل اجازت ہے تم جی بھر کر سولو۔ اگر میں پہلے بھی آ گیا تو خود لاک کھول لوں گا۔'' لنڈا نے یوں ظاہر کیا۔ جیسے وہ جسٹن کی اس بات سے بہت خوش ہوئی ہو۔ جسٹن جیپ میں بیٹھ کر شہر چلا گیا۔ لنڈا نے ایک بھرپور سانس اپنے اندر اتاری اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تو بالآخر مجھے موقع مل ہی گیا۔''

وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف گئی۔ اس کی کھڑکی سے اس نے جسٹن کی جیپ کو دور دھول اڑاتے سفر کرتے دیکھا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اس میں سے اپنا بیگ نکالا۔ اس کا خفیہ خانہ کھولا اور ایک چپٹا سا باکس نکال لیا۔

اس باکس سمیت وہ سیدھی جسٹن کے کمرے کی طرف گئی۔ اس نے باکس کھول کے اس میں سے ایک ٹیڑھی میڑھی سی تار نکالی اور دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ صرف دو منٹ میں وہ کمرے کے اندر تھی۔

چھت سے لٹکتی چڑیا اسے دیکھ کر شور مچانے لگی مگر لنڈا کو مطلق پروانہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے جسٹن کے بیڈ کی تلاشی لی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ چڑیا مسلسل شور مچا رہی تھی۔ لنڈا نے منہ اوپر کر کے اسے ڈانٹا۔

''خاموش ہو جا لعنتی چڑیا۔'' مگر چڑیا شور مچاتی رہی حالانکہ جسٹن کے اندر آتے ہی وہ چپ ہو جاتی تھی۔ اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

''کہیں یہ نگرانی کرنے والا کوئی آلہ ہی نہ ہو۔'' اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی سامنے ہی سوئچ بورڈ تھا اس نے یکے بعد دیگرے کئی بٹن دبائے بالآخر ایک بٹن اسے مل ہی گیا جسے دباتے ہی چڑیا خاموش ہو گئی تھی۔

اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے لنڈا نے سکون سے تلاشی لی۔ ہر اہم چیز کو وہ تسلی سے پرکھتی اور پھر واپس اس کی جگہ پر رکھ دیتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جسٹن کو تلاشی کا علم ہو۔

کوئی پون گھنٹے کی مشقت کے بعد بالآخر وہ ایک خفیہ الماری دریافت کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ الماری کھولنا تو اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جیسے ہی الماری کھلی لنڈا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوہ میرے خدا! کیا کچھ جمع کر رکھا ہے تم نے جسٹن......''

الماری میں نوٹوں کی گڈیوں کے علاوہ کئی چھوٹی بڑی

شیشیاں تھیں جن میں کئی رنگوں کے محلول تھے۔ لنڈا نے ایک ایک شیشی کو کھول کر سونگھا پھر سر ہلا کر واپس رکھ دیا۔ پھر وہ نچلے خانوں کی طرف متوجہ ہوئی ایک خانے میں کچھ طلائی زیورات اور کچھ قیمتی ہیرے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ سونے کی کئی ڈلیاں بھی تھیں۔

''یعنی تمہارے پاس ایک بڑا خزانہ جمع ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔''

سب سے نچلے خانے میں کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ لنڈا نے انہیں بغور پڑھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر انہیں بھی واپس اسی جگہ رکھ دیا۔ ان کاغذات کے ساتھ ایک فوٹو البم بھی پڑا تھا۔ لنڈا نے کھول کر دیکھا۔ اس میں جسٹن کی نوعمری کی تصاویر تھیں۔ اس کے خاندان کے باقی لوگوں کی تصویروں کے ساتھ۔ وہ انہماک سے تصویریں دیکھتی رہی پھر اسے بھی بند کر کے واپس رکھ دیا۔

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ جسٹن کے پاس لاکھوں کی رقم اور سونا تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

''یعنی اس رقم سے میں ایک عمدہ مکان بنا سکتی ہوں اور پوری دنیا کی سیر کو جا سکتی ہوں بلکہ بڑھاپا بھی سکون سے گزار سکتی ہوں۔''

وہ ایک پیشہ ور چور تھی۔ اس سے پہلے بھی اس نے بہت سی چوریاں کی تھیں۔ وہ کبھی پکڑی نہیں گئی تھی۔ جسٹن کو ہوٹل میں دیکھ کر وہ اس کی دولت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ پھر بازار میں اچانک اس سے ٹکرائی اور حسب خواہش اب اس کے فارم ہاؤس پر اس کے ساتھ تھی۔

وقت کم تھا۔ جسٹن کسی بھی وقت لوٹ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے مستقبل کے خواب دیکھنے بند کر کے الماری کا دوسرا پٹ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ جب الماری کا پٹ کھلا تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس میں سے تنگ سی سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ وہ محتاط قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی، نیچے مکمل تاریکی تھی۔ کمرے کی ٹیوب لائٹ کی وجہ سے ابتدائی کچھ سیڑھیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں آگے گھپ اندھیرا تھا۔ وہ رک گئی۔

چند لمحوں بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے قدرے مانوس ہو گئیں تو وہ پھر سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ جیسے جیسے وہ اترتی جا رہی تھی ایک ناگوار بو اس کی ناک سے ٹکرانے لگی تھی۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد اسے پتا چل گیا کہ وہ باسی مچھلیوں کی سڑاند نما بو تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹن نے مچھلیاں اس تہ خانے میں کیوں رکھی تھیں۔

وہ ٹھٹک کر رکی۔ کوئی دس فٹ کے فاصلے سے ایک گرم ہوا کا بھبکا اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ سامنے بڑے سے پنجرے میں ایک بہت بڑا سانپ پڑا تھا۔ اندھیرے میں وہ اس کا رنگ تو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکی تھی مگر جسامت اسے بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑی بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے واپس آ گئی۔

لنڈا کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی مگر اس وقت اس کے ماتھے پر پسینا آیا ہوا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے الماری بند کی ہر چیز واپس ٹھکانے پر رکھی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

اپنا باکس اور بیگ الماری میں بند کر کے وہ چت بستر پر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

!!!

وہ صفائی کر رہی تھی جب جسٹن نے پیچھے سے پکارا۔

''لنڈا ذرا دھیان سے۔ کوئی جار ٹوٹ نہ جائے۔'' اس وقت وہ سنہرے جار کو کپڑے سے چمکا رہی تھی جب جسٹن نے اچانک اسے پکارا تھا وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اگلے ہی پل کمرا اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

جار کا ڈھکن پہلے سے کھلا ہوا تھا اور لنڈا کا ہاتھ بے دھیانی سے لگنے کی وجہ سے جار کے منہ پر سے ہٹ گیا۔ ڈھکن ہٹتے ہی اندر بیٹھے سنہری مائل زرد رنگ کے سانپ نے لنڈا کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ جسٹن بھاگ کر اس کے پاس آیا۔ اس نے سانپ کو پکڑ کر واپس جار میں بند کیا اور لنڈا کو دلاسا دینے لگا۔

''بہادر بنو لنڈا۔ یہ بہت خطرناک سانپ نہیں ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں ابھی ایک دوا دیتا ہوں تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

فرش پر پڑی ہوئی لنڈا نے جسٹن کے چہرے سے چھلکتے اطمینان کو ایک نظر دیکھا۔ لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر سامنے دیوار میں بنے ایک ریک کے پاس چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے گلاس میں اس نے دو تین شیشیوں سے محلول انڈیلا اور لاکر زمین پر مدہوش سی پڑی لنڈا کے حلق میں ٹپکا دیا۔

''آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں تم کچھ دیر آرام کر لو۔''

یہ کہتے ہی اس نے جھک کر فرش پر ترچھی پڑی لنڈا کو اٹھایا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی لنڈا کو

میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ جسٹن کچھ دیر اس کے پاس کھڑا رہا پھر واپس پلٹ گیا۔ وہ سو گئی تھی۔

!!!

''جسٹن پلیز! صرف ایک مرتبہ مجھے سانپ سے ڈسوانے دو۔ میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔''

لنڈا نے ایک بار پھر التجا کی۔ جسٹن نے اسے ڈانٹ دیا۔

''خاموش ہو جاؤ لنڈا کہہ تو دیا ہے کہ ایک دن میں دو مرتبہ ڈسوانے سے تم مر بھی سکتی ہو۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ میں ایک قیمتی زہر ہر روز شیشی میں بھرنے کے بجائے تمہیں نشہ پورا کرنے کے لیے دے رہا ہوں، حالانکہ اس کی بازار میں مجھے بڑی اچھی قیمت مل رہی ہے۔''

لنڈا خاموش ہو گئی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں جسٹن نے اسے بتایا تھا کہ اس سے پہلے جو میڈ تھی وہ بھی اتفاق سے اس سانپ کے زہر کا شکار ہو گئی تھی اور زہر حاصل کرنے کے لیے وہ جسٹن کا ہر حکم بلاچوں چرا مانتی تھی۔ لنڈا نے فوراً پوچھا۔ ''اب وہ میڈ کہاں ہے؟'' وہ چونک گیا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' لنڈا نے بلاتوقف کہا۔

''میں اس سے اس زہر کا علاج پوچھوں گی تاکہ مجھے ڈسوانے کی حاجت ہی نہ رہے۔'' جسٹن نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''وہ بہت بیمار رہنے لگی تھی میں نے اسے شہر جانے کا مشورہ دے کر چھٹی دے دی اور علاج کے لیے رقم بھی دی۔ اس کے بعد اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ میں خود اسے شہر چھوڑ کر آیا تھا۔''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''جسٹن میں ابھی اپنے دوست کو فون کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے تم مجھے ٹال رہے ہو۔'' جسٹن کو غصہ آ گیا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس کا آف کرنے والا سسٹم خراب ہو گیا ہے۔ جب میں شہر جاؤں گا تو نیا جامر لے آؤں گا۔ اب اگر تم نے مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔''

لنڈا نے لب بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا۔ وہ باہر جا کر بھی کال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جامر کی رینج بہت وسیع تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے لنڈا نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اگلے دو سے تین روز میں یہ فارم ہاؤس چھوڑ دے گی۔

کل فش ٹرالر آنے والا تھا۔ جسٹن اپنی نگرانی میں مچھلی لوڈ کرواتا تھا۔ لنڈا کے لیے آدھے گھنٹے کی مہلت بھی کافی تھی۔ وہ اگر سامان سمیٹ کر باغ کے آخری کونے میں چھپ جاتی تو ٹرالر میں سوار ہو کر واپس شہر جا سکتی تھی۔

''جاؤ یہاں سے میں تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔''

لنڈا نے ایک نظر اسے دیکھا اور فش فارم سے باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے منصوبے پر غور شروع کیا۔ سوچتے سوچتے وہ ایک دم چونک گئی۔

''مجھے پہلے کیوں نہ خیال آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ پُرجوش سی بستر سے اٹھ گئی۔

!!!

جسٹن فش لوڈ کروا کر واپس آیا تو لنڈا فرائی فش اور ابلے چاول تیار کر چکی تھی۔ وہ دونوں میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ پہلی بدمزگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جسٹن نے مسکرا کر اس کی تعریف کی۔

''آج تم نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے اور تمہاری طبیعت بھی بہتر محسوس ہو رہی ہے۔'' لنڈا خاموشی سے ہلکا ہلکا مسکراتی رہی۔ وہ بولا۔

''آج اگر تم دو مرتبہ ڈسوانا چاہو تو میں اعتراض نہیں کروں گا۔'' لنڈا نے لقمہ چبانا موقوف کر دیا۔

''کیوں؟'' اس نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ کافی سرد ہو گیا تھا۔ جسٹن ہکا بکا رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

''او کے اگر تمہیں ضرورت نہیں ہے تو نہ سہی۔ میں نے تو تمہارے خیال سے کہا تھا۔''

لنڈا خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کھانا کھا کر جسٹن سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ لنڈا نے اطمینان سے برتن دھو کر رکھے۔ کچن کی صفائی کی پھر ہاتھ دھو کر جسٹن کے بیڈروم کی طرف آ گئی۔

دروازہ خلافِ معمول کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ جسٹن بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔ ''تو بالآخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا۔'' اس نے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا۔ جسٹن نے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

''تم سمجھتے تھے کہ تم جو مرضی کر لو تمہیں کوئی پوچھے گا نہیں۔ ایسا ہی ہے نا۔ مگر دیکھ لو۔ میں تم سے اپنا انتقام لینے پہنچ گئی۔'' جسٹن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کسمسا کر رہ گیا۔ لنڈا قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''آرام سے آرام سے۔ اب تم کبھی اپنی مرضی سے

اپنے بدن کو جنبش نہیں دے سکو گے۔ میں نے سرخ سانپ کا زہر تمہیں کھلا دیا ہے۔ تم جو زہر استعمال کر رہے تھے اس میں اس سانپ کا زہر انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ تم جانتے تو ہو۔ کیونکہ تم سانپوں پر اتنے عرصے سے تجربے جو کر رہے ہو۔“ لنڈا کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے بستر پر پڑے جسٹن کو دیکھا پھر بولی۔

”میں نے تمہیں ہوٹل میں ہی دیکھ کر پہچان لیا تھا اور تم سے اینا روزا کا بدلہ لینے کے لیے میں تمہارے ساتھ یہاں آ گئی۔ مگر یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ تم مجھے بھی اینا روزا جیسے انجام سے دوچار کرنا چاہتے ہو۔ تب مجھے تم پر شدید غصہ آیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تمہارے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔“

وہ اٹھی اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد ایک تصویر اور خط لے کر پھر اس کے کمرے میں آ گئی۔ پہلے کی طرح اس نے کرسی سنبھالی اور ہاتھ بڑھا کر جسٹن کی کھلی آنکھوں کے سامنے تصویر رکھ دی۔

”لو پہچان لو۔ یہ تم ہی ہو نا۔ تمہاری یہ تصویر مجھے اینا روزا نے بھجوائی تھی اور ساتھ یہ خط بھی۔“ لنڈا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”اس میں اینا نے بتایا تھا کہ اسے ایک سنہرے مائل زرد سانپ نے ڈس لیا ہے اب وہ روزانہ دو سے تین مرتبہ اس سے ڈسواتی ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ یہاں کا پتا لکھنا بھول گئی۔“

وہ لمحے بھر کو رکی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔

”تم سوچتے تو ہو گے کہ اس نے خط کیسے پوسٹ کر دیا جبکہ تم اس کے خط پھاڑ کر پھینک دیتے تھے۔ تو مسٹر جسٹن اینا روزا نے یہ خط فش ٹرالر والے لڑکے کو رشوت دے کر پوسٹ کرایا تھا تم سے چھپا کر ورنہ تم خط بھی پوسٹ نہ ہونے دیتے۔“

لنڈا نے خط لپیٹ کر میز پر رکھ دیا۔ جسٹن کے بدن میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ لنڈا بولی۔

”میرا ارادہ تھا کہ میں سزا کے طور پر تم سے تمہاری تمام دولت چھین لوں گی کیونکہ تم نے میری پیاری دوست کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا کر زندگی سے دور کر دیا۔ لیکن یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ تم نے اسے مار دیا ہے۔ بلکہ اسے اپنے چہیتے سانپ کی غذا بنا دیا ہے۔ وہی سانپ جسے تم نے تہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔“

وہ سانس لینے کو رکی پھر نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”سانپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم وہ دوا ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہو جس سے انسان صدیوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے سانپ کو ہر چھ ماہ کے بعد ایک ایسے انسان کا گوشت کھلایا جاتا ہے جسے کسی سانپ سے ڈسوانے کی عادت ہو اور تم نے اینا کو اسی لیے کسی بہانے سانپ سے ڈسوا دیا جس کے زہر میں نشہ ہوتا ہے۔“

اس نے سامنے گھورتے جسٹن کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ تنفر سے بولی۔

”تم اپنی دیرینہ آرزو کے پورا نہ ہونے پر رو رہے ہو اور میں سوچ رہی ہوں کہ تم اینا سے پہلے جانے کتنے قتل کر چکے ہو۔ بہرحال میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے میں تمہیں قتل نہیں کروں گی کیونکہ میں ایسا کر ہی نہیں سکتی۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد بولی۔

”تم نے پوچھا نہیں جسٹن گڈ کہ میں سانپوں کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتی ہوں اور یہ کہ اینا روزا نے مجھے تمہاری تصویر کیوں بھجوائی تھی۔“

وہ استہزائیہ ہنسی۔

”تم تو پوچھ ہی نہیں سکتے۔ میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ اینا روزا کو علم تھا کہ میں جسٹن گڈ کی تلاش میں ہوں۔ اس نے اسی لیے مجھے تمہاری تصویر بھجوائی تھی تاکہ میں دیکھ سکوں کہ تم میرے مطلوبہ آدمی ہو یا نہیں اور ہاں مجھے تمہاری تلاش اس لیے تھی کہ میں لنڈا گڈ ہوں۔ تمہاری سگی چھوٹی بہن۔ جب تمہیں ایسے ہی مجرمانہ تجربے کرنے پر ڈیڈ نے اپنی تجربہ گاہ سے نکالا تھا تو تم نے گھر بھی چھوڑ دیا مگر میں تمہیں بھلا نہ سکی اور خود مختار ہوتے ہی تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ مگر تم نے اپنی روش ترک نہیں کی اور انسانوں کی جان لینے سے بھی نہیں چوکے۔ میں اسی بات کی تصدیق کے لیے بھیس بدل کر تم سے ملی تھی۔“ وہ مسکرائی پھر بولی۔

”مگر اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگرچہ میں بھی سانپ کے ماہروں کے خاندان سے ہوں مگر مجھے سانپوں سے نفرت ہے۔ میں اب اس گھر کی قانونی وارث ہوں۔ یہاں سے سب سانپ ہٹا دوں گی اور جارڈن کے ساتھ مل کر ایک خوشگوار زندگی گزاروں گی۔ بلاشبہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔“

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

حضرت شعیب علیہ السلام

رضوانہ ساجد

شرک سے اجتناب، راست گوئی اور ناپ تول میں انصاف ہر دور میں ایمان کا جزوِ لازم تھی۔ مگر جب جب انسان دنیا کی لذتوں میں گم ہو کر اپنے مرکز سے بھٹکا تو اس قوم پر اللہ نے اپنی تمام رحمتوں کو سمیٹ لیا لیکن... اس کے باوجود منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی بھلائی کے لیے نبیوں کو مبعوث فرماتا رہا۔ اسی سلسلے میں حضرت شعیب علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جن کی قوم ناپ تول میں کمی اور زمین پر فساد پھیلانے میں ماہر تھی۔ آپ ؑ اپنی قوم کی حالت پر روتے رہے جس سے آپ ؑ کی بینائی جاتی رہی جو بارہ سال تک نہ لوٹ سکی اور اسی حالت میں آپ ؑ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ اس قوم پر آپ ؑ کی فصاحت و بلاغت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے کہا۔ ”اگر تم سچے ہو تو اپنے پروردگار سے کہو کہ ہم پر بادل کا ٹکڑا گرا دے۔“ پھر ایک روز ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی جب اچانک بادلوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔

سردارانِ قوم کی بداعمالیوں اور میزانِ حق کا ایک اور سچا واقعہ

حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر قبیلہ مدین آباد تھا۔ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحرِ احمر کنارے یمن سے شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ سامی اقوام کا یہ عام قاعدہ تھا کہ اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگانِ نسل کے نام سے موسوم کر دیا کرتی تھیں۔ یہ قبیلہ بھی اپنے بانی موسس خاندان مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ ان کی نسل کو اہل مدین کہا جاتا ہے۔ مدین، حضرت قطورہ کے بطن سے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری زوجہ تھیں۔

مدین اپنے اہل وعیال کے ہمراہ حضرت اسماعیل کے ساتھ ہی تقریباً 2000 سال قبل مسیح میں حضرت اسماعیل کے ساتھ ہی حجاز میں آباد ہوگئے۔ یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام بھی اسی قبیلۂ مدین سے تعلق رکھتے تھے اور اسی قوم کی اصلاح کے لیے آپ علیہ السلام کی طرف نبوت بھیجی گئی۔

مدین کا علاقہ نہایت سرسبز وشاداب علاقہ تھا۔ اس قوم نے قومی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارت بھی شروع کردی تھی لہٰذا خوش حالی ان کے قدم چوم رہی تھی۔

جب اس قوم پر صدیاں گزر گئیں تو وہ دینِ حنیف سے ہٹ گئے۔ انہوں نے جب اپنے اردگرد دولت وثروت کے انبار دیکھے باغوں کی زرخیزی اور شادابی کو دیکھا تو غرور میں مبتلا ہوگئے۔ اس خوش حالی کو اپنے دست وبازو کا کمال سمجھنے لگے۔ یہ بھول گئے کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی بخشش ہے۔ اسی لیے شکرگزار نہ ہوسکے اور ایک سرکش قوم بن گئے۔ اسی سرکشی نے ان میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کے عیوب پیدا کردیے۔

جب غیرتِ حق حرکت میں آئی تو سنت اللہ کے مطابق ان کو راہ حق دکھانے کے لیے انہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا۔ یہ ہستی حضرت شعیب علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی۔

قرآن کریم میں مدین کے ساتھ ساتھ ایک اور قوم ''اصحاب الایکہ'' کا بھی ذکر کیا ہے یعنی جنگل والے۔ اس قوم کا ذکر بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ آیا ہے۔

''مدین کی سمت ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔''

''جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی جبکہ ان سے شعیب نے کہا کہ تم نہیں ڈرتے۔''

مفسرین اس بارے میں مختلف آرا رکھتے ہیں کہ مدین اور صحاب ایکہ ایک ہی قبیلے کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے تھے۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور اصحاب ایکہ ایک دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا اس لیے اس کو بن والا یا جنگل والا کہا گیا۔

دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب وہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب بنادیا تھا اور اس قدر باغات تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہوکر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوب صورت اور گھنے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے اس کو ''ایکہ'' کہہ کر متعارف کرایا۔

سید سلیمان ندوی کا یہ خیال ہے۔

''مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب علیہ السلام سے سوال وجواب، طرز خطاب اور پھر بربادی اور طریقۂ بربادی بالکل مختلف ہے۔ اس بنا پر کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔''

ان کا خیال ہے حضرت قطورہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے دوان بھی تھے۔ یہ ''اصحاب ایکہ'' انہی دوان کی نسل سے تھے جو مدین کے قریب آباد ہوئے اور اصحاب ایکہ کہلائے۔ مدین اور ایکہ میں کوئی قریبی تعلق تھا اسی لیے دونوں قوموں پر ایک ہی پیغمبر (حضرت شعیب علیہ السلام) کی بعثت ہوئی۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں ''ایکہ'' نام کا ایک درخت تھا۔ اہلِ قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے ''مدین'' کو ''اصحاب ایکہ'' کہا گیا۔

مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی لکھتے ہیں۔

''مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے ''اصحاب ایکہ'' کے لقب سے مشہور ہوا۔

دونوں قوموں کو ایک ہی سمجھا جائے یا الگ الگ اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام ان قوموں پر بہ طور نبی مبعوث ہوئے۔

''اور مدین کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔''

علما میں سے چند کا کہنا یہ بھی ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے۔ اس کی بنیاد وہ قصہ ہے جو قرآن کے سورہ ''القصص'' میں بیان ہوا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

''جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا۔ امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا ''تمہیں کیا پریشانی ہے؟'' انہوں نے کہا۔ ''ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو نہ نکال لے جائیں اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں، یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے کی جگہ بیٹھا اور بولا۔ ''پروردگار، جو بھی خیر تو مجھ پر نازل کردے میں اس کا محتاج ہوں۔''

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔'' موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا۔ ''کچھ خوف نہ کرو۔ اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔''

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا۔ ''ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ اس کے باپ نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کردوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔''

موسیٰ نے جواب دیا ''یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کردوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو اور جو کچھ قول وقرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔''

توریت میں بھی یہ قصہ تقریباً اسی طرح مذکور ہے۔

''موسیٰ فرعون کے حضور سے بھاگ کر ملک مدیان میں جا بسا۔ وہاں وہ ایک کنویں کے نزدیک بیٹھا تھا اور مدیان کے کاہن کی سات بیٹیاں تھیں۔ وہ آئیں اور پانی بھر بھر کر کھرّوں میں ڈالنے لگیں تاکہ اپنے باپ کی بھیڑ بکریوں کو پلائیں اور چرواہے ان کو بھگانے لگے لیکن موسیٰ کھڑا ہوگیا اور اس نے ان کی مدد کی اور ان کی بھیڑ بکریوں کو پانی پلایا۔ جب وہ اپنے باپ رعوایل کے پاس لوٹیں تو اس نے پوچھا کہ آج تم اس قدر جلد کیسے آگئیں۔ انہوں نے کہا ایک مصری نے ہم کو گڈریوں کے ہاتھ سے بچایا اور ہمارے بدلے پانی بھر بھر کر بھیڑ بکریوں کو پلایا۔ اس نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ وہ آدمی کہاں ہے۔ تم اسے کیوں چھوڑ آئیں۔ اسے بلا لاؤ کہ روٹی کھائے اور موسیٰ اس شخص کے ساتھ رہنے کو راضی ہوگیا۔ تب اس نے اپنی بیٹی صفورہ، موسیٰ کو بیاہ دی۔''

توریت ہی میں یہ بیان ملتا ہے۔

''موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا، بھیڑ بکریاں چراتا تھا۔''

قرآن کی عبارت میں صرف یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین آئے تو انہوں نے ایک بوڑھے شخص کی بیٹی سے شادی کی۔ اس شخص کا نام نہیں لیا گیا لیکن مفسرین نے مختلف قیاسات کو سامنے رکھتے ہوئے اور غالباً توریت کو سامنے رکھتے ہوئے بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو آپ (موسیٰ علیہ السلام) کا خسر بتایا ہے۔

فرق اس سے بھی نہیں پڑتا کہ حضرت شعیب (علیہ السلام)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے یا نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پیغمبر تھے۔ قرآن اس کا گواہ ہے۔ اہل مدین سے تھے۔ ان کی قوم گمراہ تھی۔ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد عاد وثمود جیسی قوموں کی طرح بت پرستی میں مبتلا ہوچکی تھی۔

یہ قوم برائیوں کی ایسی دلدل میں اتر چکی تھی جہاں اچھائی اور برائی کی تمیز ہی جاتی رہتی ہے۔ شرک وکفر میں ایسے مبتلا ہوئے تھے کہ درختوں، پتوں اور اہلِ قبور کی ارواح پاک کی ناپاک پوجا کرنے لگے تھے۔ بدنیتی ان کے لہو کا حصہ بن گئی تھی انہوں نے دو قسم کے ترازو تیار کر رکھے تھے۔ ایک اشیا لینے کے لیے دوسرا اشیا دینے کے لیے یعنی جب تولتے تھے، کم تولتے تھے۔ اس پر بھی ان کی نیت نہیں بھرتی تھی۔ انہوں نے ڈاکا زنی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔ سنسان راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور گزرنے والوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اپنے اس فعل پر نادم ہونے کے بجائے فخر کیا کرتے تھے اور ناچتے گاتے بستی میں داخل ہوتے تھے۔ بڑھا چڑھا کے اپنے کارنامے بیان کرتے تھے۔ جو لوٹ کا مال جتنا زیادہ لاتا اتنا ہی قابلِ تعریف سمجھا جاتا تھا۔ بستی میں کوئی نہیں تھا جو ملامت کی آواز اٹھاتا یا انہیں شرمندہ کرتا۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اسی ماحول میں پلے بڑھے تھے لیکن آپ علیہ السلام نیک اور صالح تھے۔ کبھی بت پرستی کی طرف راغب

نہیں ہوئے تھے۔ اپنے اردگرد ہونے والی برائیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ دکھ اتنا بڑھ جاتا کہ آپؑ کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگتے۔ راتوں کو چھپ چھپ کر سجدے میں گر جاتے اور اپنی قوم کی بھلائی کے لیے دعا گو ہوتے۔

''اے میرے رب! میں اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنی قوم کو برائی سے روکوں۔ اے اللہ! اگر ان پر تیرا غضب نازل ہوا تو یہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ یہ کچھ بھی ہیں میرے اپنے ہیں۔ تو ان کے دل بدل دے یا ان پر کوئی نبی مبعوث کر جو ان کی اصلاح کرے۔''

آپؑ اپنی قوم کے دکھ میں برسوں روتے رہے۔ جب موقع ملتا سمجھاتے بھی رہتے لیکن قوم ان برائیوں میں اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ آپ علیہ السلام کے دوست احباب بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ آپ علیہ السلام اس برے معاشرے میں تنہا رہ گئے تھے۔ ایک زوجہ اور بیٹیاں تھیں جو آپ کی دلداری کرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار آپ علیہ السلام بازار کی طرف جا نکلتے تو کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ دیکھ آتے کہ توبہ کرتے ہوئے واپس آتے۔

ایک روز آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ کچھ لوگ سامان سے لدا ہوا اونٹ بستی میں لے آئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لوٹ کا سامان ہے۔ لوگ اتنے دلیر تھے کہ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بڑا کارنامہ تھا جو انہوں نے انجام دیا تھا۔ ان لٹیروں نے بازار میں کھڑے کھڑے سارا سامان دکانداروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

کچھ دیر گزری تھی کہ ایک شخص روتا پیٹتا بستی میں داخل ہوا۔ اور اتفاق سے حضرت شعیب علیہ السلام ہی کے سامنے آیا اور فریاد کرنے لگا۔

''تم کیسے لوگ ہو۔ مسافروں کے سامان پر قبضہ کر لیتے ہو۔''

''بھائی کیا ہوا تیرے ساتھ؟''

''میں ایک قافلے کے ساتھ تھا۔ میرا اونٹ کمزور تھا، پیچھے رہ گیا۔ تمہاری بستی کے لوگوں نے مجھے مارا پیٹا اور میرا اونٹ یہاں لے آئے۔ تم بھی ضرور ان کے ساتھی ہو گے۔''

''اے بھائی، میرا قصور یہ ضرور ہے کہ میں اس بستی میں رہتا ہوں لیکن میں ان کا ساتھی نہیں۔''

''پھر مجھے بتاؤ، میں اپنا اونٹ کہاں تلاش کروں۔ کس کے پاس جاؤں؟''

''اب تو اپنے مال سے ہاتھ اٹھا لے اور جان بچا کر چلا جا۔ یہ لوگ تجھے بھی نقصان پہنچائیں گے۔''

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے مشورہ دیا لیکن وہ نہ مانا اور شور مچانے لگا۔ اس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو گئے اور اسے پکڑ کر چند بڑے سرداروں میں سے ایک کے پاس لے گئے جو اس قسم کے فیصلے بڑی مہارت سے نمٹایا کرتا تھا۔ وہ بے چارہ یہ سمجھ کر چلا گیا کہ اسے انصاف ملے گا۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دیے۔

اس شخص کو مجرموں کی طرح سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سردار نے تمام ماجرا سن کر عجیب منطق پیش کی۔

''جو شخص اپنے مال کی حفاظت نہ کر سکے اور الزام دوسروں پر رکھے وہ ہمارے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہے۔ اس شخص کو مار پیٹ کر بستی سے باہر نکال دو۔''

حضرت شعیب علیہ السلام نے کچھ کہنا چاہا تو سردار نے انہیں بھی خاموش کر دیا۔

''تم ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔ اگر ہم تمہارے کہنے پر چلے تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں گے۔ جو ہم کر رہے ہیں ہمیں کرنے دو۔ ہم تمہارے خاندان سے ڈرتے ہیں ورنہ تمہیں بھی بستی سے نکال دیتے۔''

''کتنے نادان ہو تم لوگ کہ خدا سے نہیں ڈرتے اور میرے خاندان کی کثرت سے ڈرتے ہو۔''

آپ علیہ السلام کی ایک نہیں چلی اور لوگ اس شخص کو مارتے ہوئے عمارت سے باہر لے گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بستی سے باہر پہنچ گئے۔ آپ علیہ السلام نے دیکھا وہ شخص زخموں سے چور بے حال زمین پر پڑا ہوا ہے۔ آپ علیہ السلام نے اسے سہارا دیا اور کسی نہ کسی طرح اپنے گھر تک لے آئے۔ اس کے زخم صاف کیے، مرہم پٹی کی اور اسے آرام سے لٹا دیا۔

بستی کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت شعیب علیہ السلام اس اجنبی کو اپنے گھر لے گئے ہیں تو کچھ شرارتی لوگ وہاں جمع ہو گئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ اس اجنبی شخص کو ان کے حوالے کیا جائے۔ آپؑ باہر نکل آئے اور ان سے التجا کرنے لگے کہ وہ شخص ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں۔ جیسے ہی وہ صحت مند ہو گا وہ اسے روانہ کر دیں گے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں کے منہ بند ہوئے اور وہ واپس چلے گئے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسی رات سواری کے لیے اپنا گدھا اسے دیا اور رات کے اندھیرے میں اسے شاہراہ تک چھوڑ کر واپس آئے۔

اس رات بے چینی نے آپ علیہ السلام کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ رہ رہ کر اس اجنبی کا خیال آ رہا تھا جس کا مال بھی گیا اور بے عزت ہو کر واپس جانا پڑا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس اجنبی کا خیال ایسا آیا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ خیال پھر قوم کی برائیوں کی طرف چلا گیا۔ آپ کی ہچکی بندھ گئی۔ روتے روتے صبح ہو گئی کہ آپ علیہ السلام کی بیٹی صفورہ آپ علیہ السلام کے پاس آئیں۔

''ابا جان، آپ کیوں روتے ہیں؟''

''اس لیے کہ مجھے اپنی قوم سے محبت ہے اور وہ ایسی برائیوں میں پڑ رہی ہے جس کے بعد جہنم اس کا ٹھکانا ہو گا۔''

''ہمیں کسی سے کیا۔ ہم تو ٹھیک راہ پر ہیں۔''

''کل کو خدا مجھ سے بھی پوچھے گا کہ میں نے اپنے لوگوں کو روکا کیوں نہیں۔''

''یہ کام تو نبی کا ہوتا ہے۔ خدا ہم پر کوئی نبی کیوں نہیں اتار دیتا۔ آپ علیہ السلام برائی کو برائی سمجھتے ہیں یہی بہت ہے۔''

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ آپ علیہ السلام قوم کی حالت دیکھ دیکھ کر روتے رہے۔ آپ اتنا روئے کہ آپ کی بینائی زائل ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ابھی پیغمبر نہیں بنے تھے مدین میں داخل ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی اور بہادر جوان نکلے۔ چہرے سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان ظاہر ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے باہر آپ علیہ السلام کسی طرف جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو آپ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ٹھہر گئے اور مصری کو اس حرکت سے روکنے کی کوشش کی مگر مصری نہ مانا۔ آپ علیہ السلام نے غصے میں آ کر اس کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت مر گیا۔

اس قتل کا چرچا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے خوف سے مصر سے نکلے اور مدین آ گئے۔ یہ انتخاب آپ علیہ السلام نے اس لیے کیا تھا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا۔

آپ علیہ السلام اتنی جلدی میں مصر سے نکلے تھے کہ نہ کوئی رفیق ساتھ تھا نہ زادِ راہ۔ طبری میں لکھا ہے کہ اس تمام سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی اور برہنہ پا ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اڑا دی تھی۔

جب آپ علیہ السلام مدین کی سرزمین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کنویں کے سامنے پانی کے حوض پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ ان کے ساتھ جو جانور ہیں وہ پانی دیکھ کر آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، مگر لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان لڑکیوں پر رحم آیا۔ آپ علیہ السلام ان کے پاس گئے۔

''لڑکیو! تم کیوں پانی نہیں پلاتیں۔ پیچھے کیوں کھڑی ہو؟''

''کیسے آگے بڑھیں۔ دیکھتے نہیں سرکشوں کی بھیڑ ہے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں تو یہ ہمیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب طاقتور لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا چکیں گے تو بچا کھچا پانی ہم اپنے جانوروں کو پلا دیں گے۔''

''تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو جانوروں کو پانی پلائے؟''

''ہمارے والد نابینا ہیں۔ سب کام ہم پر آ پڑے ہیں۔''

''لاؤ میں پلاتا ہوں تمہارے جانوروں کو پانی۔ دیکھتا ہوں کون مجھے پیچھے ہٹاتا ہے۔''

''تمہیں کون ہٹائے گا تم تو یہاں جتنے ہیں، ان سب سے قوی ہو۔'' ان میں سے ایک لڑکی نے شوخی سے کہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنویں پر پہنچ گئے اور کنویں کا بڑا ڈول جسے کئی لوگ مل کر کھینچتے تھے تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا۔ لوگوں کو ان کی قوت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر اس وقت بلا کا غصہ بھی تھا لہٰذا کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ انہیں روکتا۔

ان لڑکیوں نے ان کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور مویشیوں کو لے کر گھر کی طرف چل دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ستانے لگے۔

لڑکیاں وقت سے پہلے گھر پہنچ گئیں تو والد کو سخت تعجب ہوا۔

"آج اتنی جلدی کیسے آ گئیں۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے جانوروں کو جلدی پانی پینے دیا؟"

"وہ کہاں پینے دیتے تھے۔ وہ تو ایک مصری شخص وہاں آ گیا۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ سب کو پیچھے ہٹا کر ہمارے جانوروں کو پانی پلا دیا۔"

"وہ شخص اب کہاں ہے؟"

"ہم تو اسے وہیں چھوڑ آئے تھے۔"

"جلدی جاؤ اور اس بھلے شخص کو یہاں بلا کر لاؤ۔"

ان دو میں سے ایک لڑکی تیزی سے کنویں پر پہنچی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے ایک درخت کے نیچے بیٹھے نظر آ گئے۔

وہ لڑکی آپ علیہ السلام کے پاس پہنچی۔

"آپ ہمارے گھر چلیے۔ ہمارے والد نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ آپ کو اس احسان کا بدلہ دیں گے جو آپ نے ہم پر کیا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دل ہی دل میں کہا۔ "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لڑکی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ ایک نورانی صورت بزرگ ان کے منتظر تھے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ سے مدین آنے کا سبب دریافت کیا تو آپ علیہ السلام نے تمام حالات من وعن بیان کر دیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تمہیں ظالموں کے پنجے سے نجات مل گئی۔ اب کوئی خوف کا مقام نہیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کھانے سے فراغت کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹے تو وہ لڑکی حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلانے کے لیے کنویں پر گئی تھی۔

"اگر آپ میری بات مانیں تو اس مہمان کو ملازم رکھ لیں۔ یہ شخص قوی بھی ہے اور امانت دار بھی۔"

"تجھے اس کی قوت وامانت کا حال کیسے معلوم؟"

"مہمان کی قوت کا اندازہ تو میں نے اس سے کیا کہ کنویں کا بڑا ڈول اس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا اور امانت داری کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیں اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا اور میں نے صرف اشاروں ہی میں اس کی رہنمائی کی۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے بیٹی سے یہ باتیں سنیں تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے پاس طلب کر کے مطلب بیان کیا۔

"تمہیں اپنی حفاظت کے لیے ٹھکانا چاہیے اور مجھے ایک طاقتور نوکر کی ضرورت ہے تو کیوں نہ ہم اپنی حاجتیں آپس میں بدل لیں۔"

"مجھے خوشی ہوگی کہ اگر آپ جیسے بزرگ کی خدمت کروں۔"

"اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو اپنی بیٹی صفورہ کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کر دو تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "یہ میری خوشی پر چھوڑ دیجیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کر لوں۔ آپ علیہ السلام کی جانب سے مجھ پر اس بارے میں کوئی جبر نہ ہوگا۔"

طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شادی اپنی بیٹی سے کر دی اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر عقد عمل میں آیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرانے لگے۔ اجرت کی مدت آپ علیہ السلام کے سامنے تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت شعیب علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اب تک آپ علیہ السلام قوم کے غم میں آنسو بہاتے رہے تھے۔ اب آپ علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا تھا کہ اٹھ اور اپنی قوم کے پاس جا۔

آپ علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہیں نابینائی میں نبوت سے نوازا گیا۔ گو بعد میں آپ کی بینائی لوٹا دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ کامل بارہ سال آپ دیکھنے سے محروم رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔ "اے شعیب! کیا تو جہنم کے خوف سے روتا ہے؟"

عرض کیا۔ "تیری محبت میں روتا ہوں۔ جب تجھ کو دیکھ لوں گا تو مجھے کوئی پروانہ ہوگی کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔"

اللہ نے بشارت دی کہ اے شعیب تجھ کو میری ملاقات مبارک ہو لہٰذا اسی وجہ سے میں نے موسیٰ بن عمران جو میرے ہم کلام ہیں وہ تجھ کو بطور خادم دے دیے ہیں۔"

یہ انکشاف ہوتے ہی حضرت شعیب علیہ السلام کی نظروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وقعت بڑھ گئی۔ وہ جسے محض غلام سمجھ رہے تھے اسے خدا اپنا ہم کلام کہہ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے عنقریب اسے یہ سعادت ملنے والی ہو۔

توریت کے مطابق اس گلہ بانی کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیرسون رکھا گیا۔

مدت اجارہ پوری ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر کو واپسی کی اجازت طلب کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیے تھے ان کے حوالے کر دیے اور وہ اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ اس راستے میں وہ واقعہ پیش آیا کہ طور کی جانب آپ علیہ السلام نے آگ دیکھی۔ آپ علیہ السلام اس طرف گئے اور خدا سے ہم کلام ہوئے۔ آپ علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے اور حکم ہوا۔ "ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو سمجھاؤ۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام دعوت و تبلیغ کے لیے مصر کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اہلِ مدین کو مخاطب کیا۔

"اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر۔ اس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں۔ خدا کو پوجو۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ خدا کی جانب سے گواہی آ چکی۔ خرید و فروخت میں ناپ تول کو پورا رکھو اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کرو۔ کل تک ممکن ہے کہ تمہیں ان برائیوں کا حال معلوم نہ ہو مگر آج تمہارے پاس نشانی اور برہان آ چکی۔ اب حق کو قبول کر لو اور باطل سے باز آ جاؤ۔"

یہ ایسی آواز تھی جو اہل مدین نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔ ان پر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ وہ جوان جو سب سے کمزور تھا اچانک ان کے سامنے آ گیا ہے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا ہے۔

بات تعجب کی ضرورت تھی لیکن خطرے کی نہیں تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام ایسے بااثر نہیں تھے کہ لوگ ان کی باتیں غور سے سنتے اور ان پر عمل کرتے۔

"شعیب تم کیا کہتے پھرتے ہو کہ نشانی اور برہان آ گئی ہے۔ کس دلیل کی بات کرتے ہو۔ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔"

"مجھے تم پر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ جو کچھ میں لایا ہوں وہی سچ ہے۔ تول اور ترازو کو پورا کرو اور لوگوں کو اشیا گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد نہ مچاؤ۔"

"اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں۔" لوگوں نے کہا اور ایک ایک کر کے آپ کے پاس سے ہٹ گئے۔ بھیڑ چھٹ گئی۔

مدت گزر گئی تھی لیکن کسی پر آپ علیہ السلام کی باتوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اب آپ نے ان محلوں کا رخ کیا جہاں غریب اور کم حیثیت کے لوگ رہتے تھے۔ یہ تاجر پیشہ تو نہیں تھے لیکن شرک کی بیماری میں ضرور مبتلا تھے۔ درختوں اور پتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں توحید کا درس دیا اور اخلاقی برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو مان لینے سے ان غریبوں کے مال و متاع کا نقصان نہیں ہوتا تھا، اس لیے بعض کمزور ہستیاں آپ پر ایمان لے آئیں اب حضرت شعیب علیہ السلام وعظ و تلقین کے لیے نکلتے تو یہ مٹھی بھر لوگ بھی آپ علیہ السلام کے ہمراہ ہوتے۔ آپ علیہ السلام کسی بلند ٹیلے پر کھڑے ہو جاتے اور قوم سے خطاب فرماتے۔

"خدا کی جانب سے گواہی آ چکی۔ پیمانہ اور ترازو پورا کرو اور لوگوں کو ان کا حق کم نہ کرو اور ہر راستے پر دھمکانے کو نہ بیٹھا کرو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو مت روکو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ تم تعداد میں بہت تھوڑے تھے اس نے تم کو بڑھایا۔ تمہیں خوش حالی دی۔ اس کے شکر گزار بنو ورنہ مفسدین کے انجام سے تم واقف ہو۔ لوط کا زمانہ تم سے زیادہ دور نہیں۔ دیکھو اس کی قوم کے ساتھ کیا گزری میں بھی ڈرتا ہوں تمہیں کوئی عذاب نہ گھیر لے۔

تم میں کچھ لوگ تو جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا ہوں، اس پر ایمان لا چکے ہیں اور بعض نہیں لائے تو اس وقت تک صبر کرو کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ شیریں کلامی اور حسن خطابت میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ علیہ السلام کی باتیں وقتی طور پر دلوں پر اثر انداز بھی ہوتی تھیں لیکن کچھ ہی دیر میں ان کے دلوں کی کجی ان پر غالب آ جاتی یا ایک کو دوسرا بہکا دیتا اور وہ کہہ اٹھتے تھے۔

"تم پر تو جادو کیا گیا ہے۔ تم تو ہماری طرح آدمی ہو۔ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ٹکڑا تو گرا دو۔"

یہ سراسر مذاق اڑانے والی باتیں تھیں۔ آپ علیہ السلام سب کچھ سنتے رہے اور صبر کرتے رہے۔ قوم کا یہ حال رہا کہ چند کمزور لوگوں کے سوا کسی نے پیغام حق پر کان نہیں دھرا۔ خود بھی اسی طرح بداعمال رہے دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے۔ راستوں میں بیٹھ جاتے اور جو کوئی حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر کی جانب جاتا نظر آتا تو اسے مارتے پیٹتے اور موقع لگ جاتا تو لوٹ بھی لیتے۔ اس کے باوجود نہ آپ علیہ السلام رشد و ہدایت سے رک رہے تھے، نہ لوگوں نے آپ علیہ السلام کے پاس آنا جانا چھوڑا تھا۔ یہ بہت تھوڑے لوگ تھے لیکن سرداران قوم اس فکر میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر یہ تعداد بڑھ گئی تو ان کی سرداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ لوگ ہر ہونے والے جرم پر غنڈا ٹیکس وصول کرتے تھے۔ جب جرائم ہی نہیں ہوں گے تو ٹیکس کہاں سے وصول ہو گا۔ مدین کا تمام کاروبار ان سرداروں کے ہاتھوں میں تھا اور اب انہیں اپنی گدی خطرے میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ بالآخر انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ ان کے مزاجوں کے عین مطابق تھا۔ وہ یہی سوچ سکے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کا کوئی مطالبہ ہے جسے منوانے کے لیے انہوں نے یہ فساد کھڑا کیا ہے۔ اس زوال پذیر معاشرے میں کوئی اس کے سوا سوچ بھی کیا سکتا تھا۔

ایک دن یہ سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام کو بلا بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں دولت کا لالچ دے کر منہ بند رکھنے کا مشورہ دیا جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کو پیغام پہنچا تو اس وقت آپ علیہ السلام کے پاس ایک نہایت مسکین آدمی بیٹھا تھا جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے روزی کماتا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا لیکن اسے سرداروں تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ بھلا ایسے گھٹیا لوگوں کا سرداروں سے کیا کام۔ وہ باہر بیٹھ گیا اور حضرت شعیب علیہ السلام تنہا سرداروں کے پاس گئے۔

"شعیب تمہاری تعلیمات کیا ہیں؟"

"میں کہتا ہوں ایک خدا کی پوجا کرو۔ جو اس کی مخلوقات ہیں ان کی پرستش چھوڑ دو۔"

"اور؟"

"اور یہ کہ ناپ تول میں کمی بیشی مت کرو۔ تم نے جو باٹ بنائے ہیں ان میں ہیرا پھیری کرتے ہو۔ چیزیں فروخت کرتے ہوئے دوسرے باٹ استعمال کرتے ہو خریدتے وقت دوسرے۔"

"اور بھی کچھ فرمانا ہے یا بس؟"

"آتے جاتے مسافروں کو لوٹ لیتے ہو۔ ڈاکازنی سے باز آ جاؤ۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنا کام کرتے رہو، ہمیں اپنا کام کرنے دو؟"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ میں تو وہی کہتا ہوں جو میرا خدا مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے۔"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے شعیب۔ آپ تو اچھے خاصے عقل مند آدمی تھے۔ دراصل جو نماز آپ پڑھتے ہیں وہ آپ کو سکھاتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا ہم اپنے اموال میں سے اپنی مرضی سے کچھ نہ کریں۔ کیا زبردستی ہے کہ دنیوی معاملات میں بھی ہم آپ کی مرضی کے مطابق چلیں۔"

"میں تمہاری مخالفت میں تمہیں ان باتوں سے منع نہیں کرتا بلکہ اصلاح کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جانب سے بہترین رزق عطا فرمایا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو۔ تو کیا میں تمہیں برائی میں پڑا رہنے دوں اور اپنی اصلاح کر لوں۔"

"شعیب، تم ہمارے ساتھ سودا طے کر لو۔ تمہیں اگر دولت درکار ہے تو اس کی ہمارے پاس کمی نہیں۔"

"خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت صرف پروردگار عالم پر ہے۔ ناپ اور تول پورا کرو۔ ٹھیک ترازو سے تولو۔ لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور پہلی قوموں کو پیدا کیا۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک سردار نہایت طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"جب تم کوئی بات ماننے ہی کو تیار نہیں تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔ یا ہم تم کو اور تم پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم کو مجبور کر دیں گے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔"

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا۔ "اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دے دی تو پھر ہم اسی دین کی طرف لوٹ جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں تمہیں چاہیے کہ باطل خیالات سے توبہ کرو۔ ایک رسول تم میں آ چکا۔ تم پر حجت قائم ہو گئی۔ اب تمہارا کیا بہانہ ہو گا۔"

سرداروں نے آپ علیہ السلام کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد آپ علیہ السلام کو یہ باور کرا دیا کہ آج کے بعد سے کھلی جنگ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر اپنے عزم کو دہرایا اور منصب نبوت کی رعایت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو، خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اپنے مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی صداقت اور سچائی کے لیے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں۔ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی و نافرمانی پر قائم ہو۔ میں اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلے میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک نہ کر ڈالے۔"

آپ ان سرداروں سے رخصت ہوئے تو یہ دعا آپ کے ہونٹوں پر تھی۔

"اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو ہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

قوم کے سرداروں نے قوم سے کہنا شروع کر دیا۔ "اگر تم نے شعیب کا کہنا مانا تو تم ہلاک کر دیے جاؤ گے۔"

یہ فیصلہ صرف زبانی کلامی نہیں تھا۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی ہوا۔ سب سے پہلے تو وہی غریب آدمی ہلاک کر دیا گیا جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھ سرداروں سے ملنے چلا آیا تھا۔ اس کے بعد اوباش لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے جو حضرت شعیب علیہ السلام سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھتے تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی باقاعدہ نگرانی کی جانے لگی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ ان سے ملنے نہ آیا کریں۔ خود بھی وعظ و تلقین بند کر کے گھر میں بیٹھ گئے اور خدا کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ دن تک کسی نے حضرت شعیب علیہ السلام کو نہیں دیکھا تو سرداروں کو فکر ستانے لگی کہ آخر ایسی کیا خفیہ سرگرمیاں ہیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبتلا ہیں۔ کہیں ہمارے خلاف کوئی اور کارروائی نہ کر رہے ہوں۔ وہ سب جمع ہو کر حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر پہنچے۔

"شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں۔ اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں۔ لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو ہم مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے؟"

حضرت شعیب علیہ السلام نے نہایت دل سوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا۔ "مجھے یہ خوف ہے کہ آپ علیہ السلام لوگوں کی یہ بے باکیاں اور خدا کے مقابلے میں نافرمانیاں کہیں تم لوگوں کا بھی وہی انجام نہ کر دیں جو تم سے پہلے قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح اور قوم لوط کا ہوا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ خدا کے سامنے جھک جاؤ اور اپنی بدکرداریوں کے لیے بخشش کے طلب گار بن جاؤ۔ میرا پروردگار رحم کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔ وہ تمہاری خطائیں ضرور بخش دے گا۔"

قوم کے سرداروں نے یہ سن کر جواب دیا۔ "شعیب! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے۔ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے۔ اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی۔ ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ ہم کب کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تو ہرگز ہم پر غالب نہیں آ سکتا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے۔ تم میرے خاندان سے تو ڈرتے ہو لیکن خدا سے نہیں ڈرتے۔"

سرداروں نے بھڑک کر کہا۔ "شعیب! ہم یہاں تیری باتیں سننے نہیں آئے تھے۔ تجھے سمجھانے آئے تھے کہ اپنی ہلاکت کو آواز نہ دے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں بھی تم سے کہتا ہوں۔ تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دے گا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔"

ان سرداروں نے چلتے چلتے پھر دھمکیاں دیں اور گھر سے نکل گئے۔

آپ علیہ السلام کچھ دن کے لیے دوسرے قبیلے ''ایکہ'' میں چلے گئے۔ اب حضرت شعیب علیہ السلام کی آواز وہاں کے بازاروں میں گونج رہی تھی۔ پیغام وہی تھا جو آپ علیہ السلام نے مدین والوں کو دیا تھا۔

''میں تمہارا پیغمبر امین ہوں۔ خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت صرف پروردگارِ عالم پر ہے۔ ناپ اور تول پورا کرو اور ٹوٹا دینے والوں میں سے نہ ہو اور ٹھیک ترازو سے تولو۔ لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور پہلی قوموں کو پیدا کیا۔''

یہاں کے لوگ کچھ زیادہ ہی حد سے گزرنے والے ثابت ہوئے۔ وہ کھلم کھلا عذاب لانے کی فرمائش کرنے لگے۔

''اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ٹکڑا تو گرا دو۔''

آپ علیہ السلام جدھر سے گزرتے یہی مطالبے کیے جاتے۔ آپ علیہ السلام پھر اپنے قبیلے ''مدین'' کی طرف آ گئے۔ یہاں حالات پہلے سے بھی زیادہ ابتر تھے۔ اصحاب ایکہ کی طرح وہ بھی اب عذاب کی نوید سنانے کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یا تو عذاب لا کر دکھاؤ یا ہمارے دین میں شامل ہو جاؤ یعنی اصلاح کی خدمت چھوڑ دو۔

آپ علیہ السلام کا جواب یہی ہوتا۔ ''جب اللہ نے ہم کو تمہاری جھوٹی ملت سے نجات دے دی ہے اس کے باوجود بھی تمہاری طرف لوٹیں گے تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔ تمام کاموں میں اسی کی طرف ہمارا ٹھکانا اور وہی ہماری جائے پناہ ہے۔''

حضرت شعیب علیہ السلام قوم کے غم میں آنسو بہاتے تھے۔ انہیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ کب سننے والے تھے۔ پوری قوم اپنے کفر پر ڈٹی ہوئی تھی۔

آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر ان پر حجت قائم کی۔ انہیں سمجھایا۔

''اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آ کر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آ جائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آ چکا ہے۔''

اور پھر فرمایا۔ ''قوم لوط کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں ہے۔''

حضرت لوط علیہ السلام کی مثال آپ نے اس لیے دی کہ یہ نسبتاً قریب کے زمانے کی بات تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اور اہل مدین دونوں بڑی شاہراہ پر تھے۔

''اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔''

دونوں کے افعال بھی کم و بیش یکساں تھے۔ دونوں قومیں ڈاکے اور راہ زنی میں طاق تھیں۔

اس روز حضرت شعیب علیہ السلام کے جلال کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرنے والا دوٹوک لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا ان کا انجام کس قدر عبرت ناک ہوا اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کرو تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کر دے۔''

اس خطاب نے اہل مدین کے دلوں پر خوف سے کپکپی طاری کر دی۔ ایک دوسرے سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ اس ''آخری فیصلے'' سے ان کا مطلب کیا تھا۔ وہ کس فیصلے کی بات کر رہے تھے۔

کفار آپ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے تھے کیونکہ اس میں ان کا دنیاوی نقصان تھا لیکن اندر سے ڈرے ہوئے بھی تھے۔ سمجھتے تھے کہ آپ علیہ السلام کی باتیں سچ پر مبنی ہیں لیکن عمل کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ باپ دادا کا دین غالب آ جاتا تھا۔ جب کوئی خود کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتا تو چاہتا ہے کہ دوسرے کو بدل دے۔ یہی معاملہ اس قوم کے ساتھ پیش آ رہا تھا۔

مدین اور ایکہ میں خوف کی فضا طاری تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے خطاب مسلسل کسی عذاب کی خبر سنا رہے تھے۔ سرداران قوم یہ کہہ کر قوم کو تسلیاں دے رہے تھے کہ شعیب اپنی بات منوانے کے لیے ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی دھمکیوں میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

''دیکھو اب بھی سنبھل جاؤ۔ جب اللہ کی پکڑ ہو گی تو سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔'' حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو سمجھا رہے تھے لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو گئے تو ایک رات آپ علیہ السلام کے ہاتھ فیصلہ کن دعا کے لیے اٹھ گئے۔

''اے اللہ! جلد ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

یہ دعا مقبول ہوئی۔ حکمِ الٰہی ہوا کہ شعیب اپنے ساتھیوں کو لے کر اس بستی سے نکل جاؤ۔ ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لا چکے ہیں بچا لیں گے۔''

حضرت شعیب علیہ السلام کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کی قوم کس نوع کے عذاب میں مبتلا ہونے والی ہے۔ آپ علیہ السلام نے ان چند لوگوں کو ساتھ لیا اور مدین سے نکلنے لگے۔ بستی کے لوگوں نے دیکھا تو یہی سمجھے کہ آپ تنگ آ کر بستی چھوڑ رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہی یہ تھے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کسی طرح بستی چھوڑ کر چلے جائیں۔ ان کی تو جیسے مراد پوری ہو گئی۔ جن لوگوں نے آپ علیہ السلام کو بستی سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ دوڑتے ہوئے آئے اور سرداروں تک یہ بات پہنچائی۔ انہوں نے اس فرار کو اپنی کامیابی قرار دیا۔

''شعیب علیہ السلام عقل مند تھے کہ بستی چھوڑ کر چلے گئے ورنہ ہم تو انہیں سنگسار کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہوا نے چلنا چھوڑ دیا۔ سخت گرمی مسلط ہو گئی۔ یہ ایسی آفت تھی کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی بددعا کا اثر تو نہیں۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ انہیں راضی کر کے لے آؤ لیکن سرداران قوم نے انہیں ڈانٹ دیا۔ نہیں جان سکتے تھے کہ اللہ کا عذاب سر پر آ گیا ہے۔

''اللہ نے ان پر پہلے تو سخت گرمی مسلط فرمائی اور سات دن مسلسل ان پر ہوا بند رکھی جس کی وجہ سے ان کو پانی اور سایہ بھی نفع نہیں دے سکتا تھا۔ سرداران قوم ان کی کیا مدد کرتے۔ وہ تو خود اسی مشکل میں گرفتار تھے۔

یہ لوگ اپنے محلوں سے بھاگ کر جنگل میں پہنچے تاکہ کچھ ہوا لگے۔ وہاں ان پر بادلوں نے سایہ کر لیا۔ تمام لوگ ان بادلوں کے نیچے جمع ہو گئے۔ خوش تھے کہ گرمی اور دھوپ سے نجات ملے گی۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ موت انہیں ایک جگہ جمع کر رہی ہے۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو بادلوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔ پھر زمین ہلنے لگی۔ زلزلے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر آسمان سے ایک چیخ آئی۔ اس کے شور سے ان کے کلیجے پھٹ گئے۔ سب اوندھے منہ گرے پڑے رہ گئے۔

فرمانِ الٰہی ہے۔ ''پھر وہ اپنے گھروں (یعنی علاقے) میں اوندھے منہ ہو گئے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا۔ گویا وہ ان میں تھے ہی نہیں۔ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ اٹھانے والے ہوئے۔''

ایک تفسیر میں لکھا ہے کہ ان کو ایک زلزلے نے پکڑ لیا۔ اس کی وجہ سے وہ زمین میں دھنس گئے۔ زمین زلزلے کی زد میں آ گئی اور ان کی روحیں ان کے جسموں کا ساتھ چھوڑ گئیں اور ان کے حیوانات بھی جمادات کی طرح ہو گئے۔ ان کے اجسام صرف ریت کے ڈھیر رہ گئے جن میں کوئی حرکت نہ تھی اور نہ حواس تھے اور اللہ نے ان پر کئی اقسام کے عذاب جمع فرما دیے تھے اور کئی مصیبتوں اور ہلاکتوں کی صورتیں ان پر اکٹھی کر دی تھیں اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ بھی کئی قسم کے گناہوں کے ساتھ زندہ تھے تو اللہ نے ان پر آندھی بھیجی۔ اس نے حرکتیں بند کر دیں اور چنگھاڑ بھیجی، اس نے آوازیں بند کروا دیں اور بادل بھیجے انہوں نے تمام اطراف سے آگ کے شعلے برسا دیے لہٰذا اللہ نے جہاں بھی ان کے قصے کو بیان فرمایا وہیں کی مناسبت سے ان کے مختلف عذاب کو بیان فرمایا۔

کل تین طرح کے عذاب کا ان پر ذکر آیا ہے۔ زلزلہ، چنگھاڑ، آگ کے بادل۔

سورۂ ہود میں ان کے متعلق چنگھاڑ کے عذاب کا حکم آیا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے گر گئے۔ انہوں نے اپنے نبی کا مذاق اڑایا تھا لہٰذا مناسب ہوا کہ ان کو ایسی ڈانٹ ڈپٹ کی جائے جو اس کے مطابق ہو تو اللہ نے اپنے فرشتے کے ذریعے ایک چیخ ان پر لگوائی جس سے ان کے کلیجے تک پھٹ گئے اور اس بدکلامی کا مزہ مل گیا جو وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کرتے تھے۔

سورۂ شعرا میں ہے کہ ان کو بادل کے عذاب نے آ دبوچا۔ اس کا مطالبہ خود ان کی قوم نے کیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ آپ علیہ السلام تو جادوگر ہیں۔ ہم تو آپ علیہ السلام کو بس جھوٹا گمان کرتے ہیں۔ اگر آپ علیہ السلام سچے ہیں تو بادل کا ایک ٹکڑا گرا دیجیے۔ وہ سمجھتے تھے حضرت شعیب علیہ السلام ایسا کبھی نہیں کر سکیں گے۔ لاجواب ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا ''میرا رب تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔''

اللہ نے ان کی خواہش کو پورا فرمایا۔

''پھر انہوں نے شعیب کو جھٹلایا تو ان کو سائبان کے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ بے شک وہ بڑے دن کا عذاب ہے۔ بہرحال اہلِ مدین تباہ و برباد ہو گئے۔ ان کا وہی حال ہوا جو ان سے پہلے آلِ ثمود کا ہوا تھا۔

ان سب امور کا خلاصہ قرآن کی زبانی یوں بیان ہوا ہے۔

''اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے

سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوش حال ہو (یعنی خدا نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا بچ رہے اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ اور دیکھو (میرا کام تو نصیحت کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں۔ لوگوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے، ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

شعیب علیہ السلام نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل وکرم کا یہ حال ہو کہ اچھی روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہ حق کی طرف نہ بلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں اس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے خلاف چلوں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاحِ حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بنتا ہے تو اللہ کی مدد سے بنتا ہے میں نے اسی پر بھروسا کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ایسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آچکا ہے اور قوم لوط کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں اور دیکھو اللہ سے معافی مانگو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا ہے، بڑی ہی محبت والا ہے۔

لوگوں نے کہا۔ ''اے شعیب علیہ السلام جو کچھ تم کہتے ہو اس میں اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں سے ایک کمزور آدمی ہو۔ اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں۔''

شعیب علیہ السلام نے کہا۔ ''اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا اور اللہ تمہارے لیے کچھ نہ ہوا کہ اسے پیچھے ڈال دیا۔ جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطۂ علم سے باہر نہیں۔ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی اپنی جگہ سرگرم عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں اور پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب علیہ السلام کو اور ان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور جو لوگ ظالم تھے انہیں ایک سخت آواز نے آپکڑا۔ بس جب صبح ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔''

❂ ❂ ❂

حضرت شعیب علیہ السلام عذاب آنے سے پہلے یہ کہتے ہوئے افسوس زدہ حالت میں چل دیے کہ اے قوم! بے شک میں نے تو اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیے تھے اور میں نے تمہارے لیے بہت خیر خواہی کی مگر تم نے میری ایک نہ سنی اور جو مجھ پر واجب تھا میں نے پورا کیا۔ میں نے تمہاری ہدایت میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن میری تمام کوششیں بیکار گئیں۔

پس جو ہوا سو ہوا۔ آج کے بعد میں تم پر افسوس نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ تم نے ہی نصیحت کو ٹھکرا دیا تھا اور رسوائی کے دن سے بے خوف ہو گئے تھے۔

اپنی قوم کے چھوڑنے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرموت کے قریب آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ایک قبر ہے جو زیارت گاہ خواص وعوام ہے۔ دہاں کے باشندوں میں مشہور ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے۔

حضرموت کے مشہور شہر ''شیون'' کے مغربی جانب ایک مقام ہے جس کو ''شیام'' کہتے ہیں۔ اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ قبر ہے۔ یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں۔ یہاں جو لوگ آتے ہیں وہ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

وفات کے وقت آپ کی عمر مبارک 140 سال تھی۔ بعض مؤرخین نے 400 سال بھی درج کی ہے۔

قرآن پاک میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر مبارک سورہ اعراف، ہود، شعرا اور سورہ عنکبوت میں آیا ہے۔

آپ کو خطیب الانبیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ماخذات: قصص القرآن، قصص الانبیا۔ ارض القرآن

شامتِ اعمال

مختار آزاد

شامت کبھی دعوت دے کر نہیں بلائی جاتی بلکہ یہ تو بن بلائے مہمان کی طرح بلائے جان بن کر چلی آتی ہے۔ چاہے انسان کتنا ہی دامن بچائے وہ چمٹنے کے رستے نکال ہی لیتی ہے۔ وہ بھی نہ بچ سکا، اگرچہ تدبیر کرتے کرتے اس کی عمر تمام ہو گئی مگر نتیجہ وہی صفر رہا... اسی لیے سفر کوئی بھی ہو سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سفر بہ سفر جلد بازی کے شکار، پرتجسس واقعات کا تسلسل

ساری خرابی شروع ہوئی تھی ائرپورٹ پر چیکنگ کے غیر معمولی انتظامات اور سول ایوی ایشن سیکیورٹی کے نئے قواعد کے تازہ تازہ نفاذ سے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ جہاز کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ بات یہیں تک رہتی، تب بھی ٹھیک ہوتا۔ فضائی سفر میں اس طرح ہو جاتا ہے مگر اس کے نتیجے میں جیری کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس سے تو وہ گھن چکر بن کر رہ گیا تھا۔

ائرپورٹ پر تاخیر سے پہنچنے والا کئی روز کا تھکا ماندہ جیری

پہلے ہی جھلایا ہوا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے وہ تھک گیا تھا۔ اس کا جسم تھکن سے چور تھا۔ وہ جب ہوٹل سے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تو اسے دیر ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ راستے میں ہی پرواز کے طے شدہ وقت کے مطابق اپنا اگلا پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ جس کے تحت اسے لیک کنٹری پہنچتے ہی، گھر روانگی سے پہلے کلائنٹ کے دفتر جا کر سیکیورٹی عملے کو سربہ مہر فائل حوالے کرنا تھی اور پھر سیدھے گھر جا کر بستر پر ڈھیر ہونا تھا۔

جیری تو ائرپورٹ سے سیدھے گھر جانا چاہتا تھا مگر اس کے کلائنٹ کا حکم تھا کہ جیسے ہی پہنچے، گھر جانے سے پہلے تفتیشی فائل اس کے عملے کے حوالے کر دے۔ کلائنٹ تھامس سحر خیزی کا عادی تھا اور اس کا دن صبح چار بجے شروع ہوتا تھا۔

تھامس اپنے اگلے دن کا آغاز فائل پڑھ کر کرنا چاہتا تھا۔ یہ حکم وہ اسے سرِ شام کو ہی سنا چکا تھا۔ جیری کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بھاری فیس ایڈوانس لے چکا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ آدھی رات کو جا کر سوئے گا تو صبح دس ساڑھے دس بجے تک ہی دفتر پہنچ پائے گا۔ اس لیے اس نے بھی مناسب سمجھا کہ فائل دیتا ہوا ہی جائے گا ورنہ فون کی گھنٹی سونے نہیں دے گی مگر ائرپورٹ پہنچا تو سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔

پرواز میں منٹوں کی نہیں گھنٹوں کی تاخیر تھی۔

جیری کی عادت تھی کہ وہ ہر معاملے میں بہت جلد باز اور ضرورت سے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اکثر ان عادتوں کی وجہ سے وہ مسائل کا شکار ہو جاتا تھا مگر پھر بھی اپنی عادت پر قائم و دائم تھا۔ اس دن ائرپورٹ کے لیے روانگی میں اس کی جلد بازی کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ چیک ان کے موقعے پر اسے پتا چلا کہ پرواز میں تاخیر ہے، جس کی اطلاع اسے موبائل ایس ایم ایس پر دے دی گئی مگر وہ جلدی میں موبائل فون سوٹ کیس یا بریف کیس یا پھر کہیں اور رکھ کر بھول چکا تھا۔ فون کہاں رکھا ہے، اب کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر یہ یاد کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی جو ایس ایم ایس ملا تھا، اس کو پڑھنے کا وقت گزر چکا تھا۔ پرواز میں تکنیکی خرابی کے باعث چار گھنٹوں کی تاخیر تھی۔ اس نے پرواز کی روانگی کا انتظار کرنے کے بجائے دوسری پرواز سے سفر کا فیصلہ کیا۔ وہ واپس باہر آیا اور مختلف فضائی کمپنیوں میں پروازوں کی معلومات حاصل کرتا رہا۔ آخر اسے ایک قریب ترین پرواز مل ہی گئی۔

پہلے سے طے شدہ پرواز میں تاخیر اور دوسری پرواز کے لیے ٹکٹ خریدنے کے لیے، ایک سے دوسرے لاؤنج میں سامان لیے لیے پھرنے کی وجہ سے وہ سخت ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ جیری کو شدید غصہ آ رہا تھا۔

جس وقت اس نے دوسری پرواز کا ٹکٹ خریدا، تب تک فلائٹ کی روانگی طے شدہ وقت کے مطابق تھی لیکن جب وہ چیک ان کے لیے پہنچا تو اس پرواز کی روانگی میں بھی 'کچھ تاخیر' کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ فوراً انکوائری کاؤنٹر پر پہنچا۔ جہاں اسے بتایا گیا کہ پروازوں کی آمد میں رش کی وجہ سے اگلے پچاس منٹ تک ائرپورٹ کنٹرول ٹاور اڑان بھرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ چیک ان کیا۔ بورڈنگ پاس تھاما اور اپنا بریف کیس اور ہینڈ کیری پکڑے پکڑے بڑبڑاتا اور جھلاتا ہوا لاؤنج میں چلا آیا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا مگر اتنی چہل پہل میں وہ کیا خاک آرام کر سکتا تھا۔ پرواز کے انتظار میں پاؤں پٹختا رہا اور اپنے غصے سے اپنا ہی خون جلاتا رہا۔

جیری دوسری پرواز کی تاخیر کے ستم کو کافی دیر تک طبیعت پر جبر کر کے برداشت کرتا رہا۔ جب بورڈنگ کا اعلان ہوا تو وہ سمجھا کہ اس کی آزمائش ختم ہوئی مگر یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

بورڈنگ کے لیے وہ تیزی سے اٹھا اور قطار میں لگ گیا۔ جس میں اس کا نمبر چوتھا تھا۔ اس کے آگے دو بوڑھے اور ایک جوان سال لڑکی اپنی باری کی منتظر تھی۔ جیری نے ایک ہاتھ میں بورڈنگ پاس اور بریف کیس پکڑا ہوا تھا تو دوسرے سے ہینڈ کیری کا ہینڈل تھام رکھا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ نئی آزمائش سے صرف تین جوڑی جوتوں کی دوری پر تھا۔

جیسے ہی جیری کا نمبر آیا۔ اس نے کاؤنٹر کلرک کو بورڈنگ پاس تھمایا۔ اس کے ساتھ ائرپورٹ سیکیورٹی کا اہلکار بھی کھڑا تھا جو مسافروں کے پاس موجود دستی سامان اور ان پر لگا سیکیورٹی کلیئرنس ٹیگ چیک کر رہا تھا۔ اس نے جیری کے سوٹ کیس کو غور سے دیکھا اور اسے سائڈ میں ہونے کو کہا۔ یہ سنتے ہی وہ پریشان ہو گیا مگر لاچار تھا۔ حکم پر عمل کے سوا کچھ اور اس کے بس میں نہیں تھا۔ جیری کے ہٹتے ہی اس کے پیچھے پانچویں نمبر پہ کھڑا مسافر آگے بڑھا، بورڈنگ پاس چیک کرایا اور دونوں خالی ہاتھ جھلاتا ہوا جہاز کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ہوا، کیا بات ہے؟'' جیری نے سائڈ میں ہوتے ہی اہلکار سے پوچھا۔ وہ ایک بار پھر سخت ذہنی دباؤ میں تھا۔

''یہ سوٹ کیس بڑا ہے، آپ اپنے ساتھ کیبن میں نہیں لے جا سکتے۔'' سیکیورٹی اہلکار نے مہذبانہ انداز میں اسے مطلع کیا۔ یہ سنتے ہی اس کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔

''مگر میں اسے جہاز میں ہی ساتھ لے کر...''

''سوری سر!'' جیری نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے ایک بار پھر سکون سے کہنا شروع کر دیا۔ ''آپ ضرور اسے اپنے ساتھ کیبن میں رکھ کر لائے ہوں گے مگر آج سے جو نئے سیکیورٹی رولز لاگو ہوئے ہیں، ان کے تحت اتنا بڑا سوٹ کیس مسافر اپنے ساتھ اندر نہیں لے جا سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ خوامخواہ مسکرایا۔ ''امید ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی بات سن کر جیری نے نئے رولز اور اس پر عملدرآمد کے لیے اہلکار کی چابکدستی پر سخت لعنت بھیجی مگر پھر اچانک اسے خوشامد سے کام نکالنے کی ترکیب سوجھی۔

''دیکھیں سر! بورڈنگ شروع ہو چکی ہے، اب شاید وہ میرا سامان بُک نہ کریں۔ اس طرح تو میری پرواز رہ سکتی ہے، اگر آپ مہربانی کریں تو...''

''پریشان مت ہوں۔'' اس نے یہ سنتے ہی کہا۔ ''میں کاؤنٹر پر بات کرتا ہوں۔ خاص حالات میں آپ کا سامان بُک کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی ان نئے رولز کی وجہ سے آج نہیں کل بھی ایسی گڑبڑ ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے واکی ٹاکی پر کسی سے بات کی۔ ''مسٹر! آپ جلدی سے جائیے اور سوٹ کیس بُک کروائیں۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''مگر میری پرواز...''

''بالکل مس نہیں ہو گی، اگر آپ میری بات مانیں گے۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور انگلی سے اشارہ کیا۔ ''جلدی جائیے، کاؤنٹر پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' اس نے جیری کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

جیری سمجھ گیا کہ اب اس حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ ایک بار پھر ایک ہاتھ سے سوٹ کیس کو کھینچتے اور دوسرے سے بریف کیس تھامے، لاؤنج سے باہر بنے چیک ان کاؤنٹر کی طرف دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ پرواز مس ہونے کا خوف، اوپر سے تھکن... اس کی سانس تیزی سے پھول رہی تھی۔

جیری بے ترتیب سانسوں کے ساتھ کاؤنٹر پر پہنچا۔ جلدی جلدی سوٹ کیس بُک کروایا اور جب وہ اسی طرح دوڑتا ہوا واپس لاؤنج میں پہنچا تو اس کے لیے اعلان ہو رہا تھا کہ فوراً بورڈنگ کاؤنٹر پر پہنچیں۔ جب وہ پھولی سانسوں اور ہانپتے کانپتے وجود کے ساتھ جہاز کے اندر داخل ہوا تو سارے مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ اس پرواز کا آخری مسافر تھا۔

دروازے پر کھڑی ائرہوسٹس نے اس کا بورڈنگ پاس چیک کیا۔ ''جیری ہاپکن۔'' نام پڑھتے ہی وہ مسکرا دی۔ ''تاخیر سے آمد پر شکریہ۔''

ائرہوسٹس نے اگرچہ بھرپور طنز کا وار کیا تھا مگر جیری اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے اپنا بریف کیس کیبن میں رکھنا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے کئی کیبن کھول کر دیکھ ڈالے مگر کسی میں بھی اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ اپنا بریف کیس رکھنا تو دور کی بات کم از کم ان کے بیچوں بیچوں اٹکا سکے۔ ایک دو بار اس نے یہ کوشش کی بھی مگر بے سود۔

جہاز کے دروازے تو اس کے اندر داخل ہوتے ہی بند کیے جا چکے تھے۔ اب جہاز کو رن وے کی جانب دھکیلا جا رہا تھا۔ جیری کو ایک کے بعد دوسرے کیبن کو کھول کر اس کے اندر تاکا جھانکی کرتے دیکھ کر ایک ائرہوسٹس تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ ''سر! پلیز اپنی سیٹ پر بیٹھ کر حفاظتی بیلٹ باندھ لیجیے۔''

سامنے ایک دوسری ائرہوسٹس سفر کے آغاز پر مسافروں کو روایتی حفاظتی انتظامات کا غیر دلچسپ لیکچر پلا رہی تھی مگر اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ سب اپنے آپ میں یا اپنے ہم سفر کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ وہ بے چاری بھی یہ سب کچھ جانتی تھی مگر اس کے باوجود روبوٹ کی طرح رٹے رٹائے الفاظ دہراتے ہوئے اپنی ذمے داری پوری کر رہی تھی۔

جیری نمبر چیک کرتا ہوا اپنی نشست کی طرف بڑھنے لگا۔ تین نشستوں کی قطار میں اس کی نشست درمیان کی تھی۔ وہ پھنس پھنسا کر موٹے سے مسافر کو اپنے وزن سے دھکیلتا ہوا، اپنی نشست کی طرف بڑھا، بیٹھ کر حفاظتی بیلٹ باندھی اور بریف کیس گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کی دونوں کہنیاں بریف کیس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہتھے پر تو اس کے دائیں بائیں کے پڑوسیوں کی موٹی موٹی کلائیاں براجمان تھیں۔ ابھی جہاز نے اڑان شروع ہی کی تھی کہ جیری کے خراٹوں نے اس کے پڑوسیوں کو بے چین کر دیا۔ ہتھے پر رکھی اُن پڑوسیوں کی کلائیاں اوپر اٹھیں اور خراٹوں سے پریشان پڑوسیوں نے اپنے ہاتھوں کو کانوں کی ڈھال بنا لیا۔

جیری اُس وقت جو نیند جہاز میں پوری کر رہا تھا، پروگرام کے مطابق اسے اپنے گھر کے آرام دہ ماسٹر بیڈ پر لیٹ کر چین کی وہ نیند لینا تھی مگر کیا جائے کہ رات کے گیارہ بجے روانہ ہونے والی پرواز نے پونے ایک بجے اڑان شروع کی تھی۔

گھڑی اور کیلنڈر پر تاریخ بدل چکی تھی۔ گزرے کل کی تاریخ کے ٹکٹ پر اسے نئے دن کے پہلے گھنٹے میں جہاز کی

سیٹ پر بیٹھنا نصیب ہوا تھا...... جیری واقعی وہ بہت بری طرح تھک چکا تھا۔ اب بھی اگر وہ نہ سوتا تو شاید اس کی حالت مزید خراب ہوجاتی۔

ایسے عالم بدحواسی کا شکار تھکے ہارے مسافر سے کسی بھی حماقت کی توقع کی جاسکتی ہے وہ تو پھر بھی جیری تھا، جس سے اس طرح کے کارنامے اکثر و بیشتر سرزد ہوتے رہتے تھے۔ جیری جہاز میں پہنچ کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

گھنٹا بھر کی پرواز یا یوں کہہ لیں کہ جیری کی گھنٹا بھر کی نیند کے بعد جہاز نے اوہیرے ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ جہاز کے جھٹکوں سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ بریف کیس اس کی گود سے لڑھک کر نیچے پاؤں پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں مسلیں، جھک کر بریف کیس اٹھایا اور جیسے ہی دروازہ کھلنے کا اعلان ہوا وہ دھکم پیل کرتا ہوا قطار میں داخل ہوگیا۔ آگے نکلنے کی بے ہنگم کوشش میں اس کا بریف کیس آگے کھڑی ایک عورت کی ٹانگ سے بڑے زور سے ٹکرایا۔ اس نے غصے سے پلٹ کر دیکھا۔

''جلدی ہے تو پھر ایمرجنسی گیٹ استعمال کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے جیری کو گھورتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اترنے کے منتظر قریب کھڑے کئی مسافر معنی خیز انداز میں مسکرادیے۔ جیری شرمسار ہوگیا اور اپنی خفت مٹانے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اگر جیری کے پاس صرف دستی سامان ہوتا تو باہر نکلنے میں جلدی کی وجہ سمجھ آتی تھی لیکن اس نے اپنا سوٹ کیس بک کرایا تھا۔ اب اسے کیا کہیے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مسافروں کا سامان جہاز سے اتار کر، کنویئر بیلٹ پر ڈال کر ان تک پہنچانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا مگر پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ جلد سے جلد جہاز سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے اپنے آگے کھڑے مسافروں کو کہنی مار کر ہی راستہ کیوں نہ بنانا پڑے مگر برا ہو اس عورت کا جس کے انداز تخاطب اور مفید مشورے نے، اسے باہر نکلنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے پر مجبور کردیا۔

جیری کئی روز سے کام کے سلسلے میں اوہاما میں تھا اور اب شکاگو کے علاقے لیک کنٹری میں واقع اپنے گھر واپس جارہا تھا۔ وہ اپنی قانونی مشاورتی فرم چلاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سراغرساں کے طور پر بھی اپنی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ اس کے پاس اکثر ایسے میاں یا بیوی کی جاسوسی کے کیس آتے تھے، جنہیں ایک دوسرے کی وفاداری پر شک ہوتا تھا یا پھر وہ طلاق دینے کے لیے جواز کی تلاش میں ٹھوس ثبوت کی فراہمی کے لیے اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جو کیس آتے تھے، وہ بھی زیادہ تر بے اعتباری، دھوکا بازی اور اسی طرح کے معاملات پر مشتمل ہوتے تھے۔

پچھلے تین چار دن سے وہ اوہاما میں ایک دھوکے بازی کے کیس کی سراغرسانی کررہا تھا۔ معاہدے کے مطابق یہ رات آخری تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے اپنا کام کرلیا تھا اور تھامس کو ثبوتوں اور تفتیش کی فائل دینے کے بعد یہ کیس بند ہوجاتا۔ تھامس شکاگو کے ایک بہت بڑے کاروبار کا مالک تھا۔ اس کے کئی پارٹنر تھے، ان میں سے ایک اوہاما میں مقیم تھا۔ تھامس کو شک تھا کہ وہ اس کے کاروبار کی طرز پر متوازی طور پر اپنا کاروبار شروع کرچکا ہے اور اب خفیہ طور پر اسے فروغ دے رہا ہے جس کی وجہ سے اس کے کاروبار اور آمدنی پر فرق پڑنے لگا تھا۔ تھامس کا خیال درست نکلا۔ جیری نے پتا چلالیا تھا اور اب وہ کیس کی فائل اس تک پہنچا کر گہری نیند سونا چاہتا تھا۔

''برا ہو اس پرواز کی تاخیر کا، کمبخت ساری رات غارت ہورہی ہے۔ اب تک تو مجھے اپنے بیڈ پر گہری نیند میں ہونا چاہیے تھا۔'' جیری نے گھڑی دیکھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ وہ بیگیج لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا مسافروں کے سامان آنے کا منتظر تھا مگر وہاں دور دور تک فی الحال اس کے آثار نہیں تھے۔ جیری نے اکتاہٹ بھری جماہی لی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ دو منٹ سے کم وقت میں وہ ایک بار پھر سو چکا تھا۔

لاؤنج میں دوسرے درجنوں مسافر بھی ٹرالی تھامے، سامان کی آمد کے منتظر تھے لیکن شاید ہی وہاں کوئی اور اپنے سامان کی آمد کا اتنے بے صبرے پن سے منتظر ہوتا جتنا کہ جیری خراٹے بھرنے سے پہلے تھا۔

تقریباً بیس منٹ تک وہ خراٹے بھرتا رہا۔ اچانک ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھولیں۔ کنویئر بیلٹ چل پڑا تھا۔ اسی کی زوردار گڑگڑاہٹ سے اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ ایک بار پھر نیند کے دوران اس کا بریف کیس کھسک کر نیچے جا پڑا تھا۔ اس نے جھک کر بریف کیس اٹھایا اور آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ کر بیلٹ کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ سامان آنے لگا تھا۔ ''یہ رہا میرا سوٹ کیس۔'' اس نے خود کلامی کی اور جیسے ہی سوٹ کیس قریب آیا، لپک کر تھام لیا اور کھینچ کر اس کا ہینڈل باہر نکالا۔

یہ سیاہ چمڑے سے بنا عام سا سوٹ کیس تھا جسے کھینچنے کے لیے اسٹیل کا چمکدار ہینڈل لگا ہوا تھا جس کا لاک ہٹا کر ذرا سا دباؤ تو وہ خود بخود اندر چلا جاتا تھا۔ عام طور پر مسافر اسی طرح کے سفری سوٹ کیس استعمال کرتے تھے۔ جیری نہایت احتیاط پسند تھا۔ اس نے سوٹ کیس کے ایک کونے پر چٹ بھی چسپاں کر رکھی تھی، جس پر اس کا نام اور پتا لکھا تھا۔ وہ اکثر دستی سامان لے کر سفر کرتا تھا۔ چٹ لگانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اگر کبھی وہ جہاز کے کیبن میں سوٹ کیس بھول جائے تو فضائی کمپنی کا عملہ اسے بہ آسانی مالک تک پہنچا سکے۔ اس بار یہ پہلا موقع تھا کہ جیری کو سوٹ کیس بک کروانا پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سامان کی آمد میں صرف وقت اسے ضائع ہونے کے مترادف لگا۔

کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھا تھامس کے دفتر جارہا تھا تاکہ سیکیورٹی کے حوالے فائل کرسکے۔ فائل سوٹ کیس میں تھی۔ اس نے وقت بچانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بریف کیس کھولا اور فائل نکال کر ہاتھ میں تھام لی۔ اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ تین بجے تک وہ گھر پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

اوہیرے ائرپورٹ کے بیگیج لاؤنج میں مسافروں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ سارے مسافر جاچکے تھے۔ سیکیورٹی عملہ بھی اِدھر اُدھر ہوگیا تھا۔ صرف ایک شخص وہاں کھڑا تھا۔ گرے کلر کے قیمتی سوٹ میں ملبوس یہ ایڈی تھا۔ ایڈی بھی اسی پرواز سے پہنچا تھا جس میں جیری سوار تھا۔ وہ گہری نظروں سے کنویئر بیلٹ کو دیکھ رہا تھا جو ایک منٹ پہلے زوردار جھٹکا لے کر بند ہوچکا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ جو سامان آنا تھا، وہ آچکا۔

ایڈی کے سامنے کنویئر بیلٹ پر سیاہ چمڑے کا ایک سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ یہ بیگ بھی ہو بہو ویسا ہی تھا جیسا جیری یہاں سے لے کر نکلا تھا مگر مطمئن چہرہ، گنجا اور پہلوانوں کی طرح لحیم شحیم ایڈی اپنا سوٹ کیس اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ اس کے سوٹ کیس جیسا تھا مگر اس کا نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا سوٹ کیس کہاں چلا گیا۔ لاؤنج سے سارے مسافر جاچکے تھے۔ لمحہ بھر میں وہ ساری بات سمجھ گیا۔ اِس کے سامنے جو سوٹ کیس تھا، اُس کا مالک دانستہ یا نادانستگی میں اس کا سوٹ کیس لے جاچکا تھا اور اب یہ لاوارث سوٹ کیس اس کی وراثت میں آنے کا منتظر تھا۔ اس نے سوٹ کیس تھاما اور بڑے سکون سے چلتا ہوا کافی شاپ میں آگیا۔ وہ اس وقت بری طرح پریشان ہوچکا تھا مگر اس کے باوجود وہ حسبِ مزاج بہ ظاہر بالکل مطمئن نظر آرہا تھا۔

اندر پہنچ کر اس نے بلیک کافی کا آرڈر کیا۔ سوٹ کیس میز پر رکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔ اچانک اس کی نظر سوٹ کیس کے کونے پر لگی چھوٹی سی چٹ پر پڑی۔ اس پر مالک کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ ''اوہ جیری... تم نے میری رات ہی برباد نہیں کی میری پرواز بھی مِس کروادی۔'' ایڈی کو گھنٹا بھر بعد اوہیرے ائرپورٹ سے نیویارک کی پرواز پکڑنا تھی۔

ایڈی نے اطمینان سے کافی پی۔ سوٹ کیس کے مالک کا نام اور پتا ملنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ سوٹ کیس سے زیادہ دوری پر نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ دیر پہلے وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کاؤنٹر پر جاکر اپنے سوٹ کیس کی گمشدگی کی رپورٹ اور کلیم درج کروائے مگر کلیم میں کیا لکھوائے گا۔ سچ سن کر وہ الٹا اسے بے وقوف ٹھہرائیں گے اور جھوٹ بولا تو سوٹ کیس ملے گا نیا مگر بالکل خالی۔ اسے تو اپنے سوٹ کیس میں رکھے سامان سے غرض تھی، سوٹ کیس سے نہیں۔

کافی پی کر اس نے اپنے سوٹ کیس کی چابی سے تالا کھولنے کی کوشش کی۔ لاک فوراً کھل گیا۔ اس میں نمبر اور مینوئل لاک دونوں تھے۔ سوٹ کیس کھولنے سے پہلے ایڈی حیران تھا کہ اس کے مالک نے 'نمبر لاک' کیوں نہیں لگایا مگر جیسے ہی اس نے سوٹ کیس کھولا، وہ اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ اندر چند جوڑے میلے کپڑے، اضافی شیونگ کِٹ اور ہوٹل کے غسلخانہ سے اٹھائی گئی کچھ چیزیں تھیں۔ ''لعنت ہو۔'' اس نے غصے سے کہا اور سوٹ کیس بند کردیا۔

ایڈی نے جیب سے ایک کارڈ نکالا۔ اس کی پشت پر سوٹ کیس کے مالک کا نام اور پتا نوٹ کیا اور باہر نکلنے لگا۔ وہ ٹیکسی پکڑ کر جلد سے جلد لیک کنٹری کے اس پتے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا سوٹ کیس لے جانے والا اب تک گھر پہنچ چکا ہوگا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر چور بھی اپنے گھر کا راستہ لیتا ہے۔ ایڈی سیدھا اس کے گھر پہنچ کر، اپنا سوٹ کیس واپس لے کر دوبارہ ائرپورٹ پہنچنا چاہتا تھا تاکہ نیویارک کی پرواز پکڑ سکے مگر جب اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتایا تو جواب سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ جگہ ائرپورٹ سے چالیس میل دور، شکاگو سٹی کا مضافاتی علاقہ تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ فلائٹ مِس ہوگئی۔ ایڈی کے لیے یہ اہم بات نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ سوٹ کیس واپس مل جائے۔ نیویارک کی فلائٹ تو دوسری بھی مل سکتی ہے مگر سوٹ

کیس... یہ خیال آتے ہی اس نے سر جھٹکا۔

''چلو۔'' وہ ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیتے ہوئے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''کوئی اور شارٹ کٹ نہیں ہے؟'' جیری نے بے تابی سے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ سامنے سڑک پر کوئی ٹریفک حادثہ ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے سڑک بند تھی۔ ''کوئی اور راستہ نکالو۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ پونے تین بج رہے تھے۔

''ایک راستہ ہے مگر آٹھ کلومیٹر لمبا۔''

''وہی راستہ لے لو۔'' جیری نے پوری بات سنے بغیر کہا۔

''سوچ لو۔'' ڈرائیور نے ٹیکسی کو ریورس گیئر لگاتے ہوئے کہا۔ ''کل پبلک ٹرانسپورٹ مینجمنٹ آفس میں شکایت درج نہ کروا دینا کہ ڈرائیور نے دھوکے سے لمبا راستہ لیا تاکہ کرایہ زیادہ وصول کرسکے۔''

''تم چلو، مجھے نہیں کرنی تمہاری شکایت۔ ویسے میں خود تم سے ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔'' جیری نے منہ بنا کر کہا۔ بے تابی سے پہلو بدلا۔ ''اور ہاں، ذرا اسپیڈ پکڑو، مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''او کے سر!'' سیاہ فام ڈرائیور نے ہنستے ہوئے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

جیری نے تھامس کے دفتر پہنچ کر سیکیورٹی عملے کے حوالے فائل کی اور واپس پلٹا، اس وقت رات کے سوا تین بج رہے تھے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہی اپنا ارادہ بدل دیا۔ پہلے تو وہ سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر سکون سے سوئے گا مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگلے چالیس پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے گھر پہنچا تو چار سوا چار بج جائیں گے۔ اس نے غصے سے پاؤں زمین پر مارا۔ ''سارا دن میرے پلان فیل ہوتے رہے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔

چند کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی کلاس فیلو اور بہت اچھی دوست کا فلیٹ تھا۔ ''رات اس کے ہاں رہتا ہوں اور صبح وہیں سے دفتر پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''ورنہ گھر جاتے جاتے تو صبح ہو جائے گی۔''

کرسٹین اور جیری لاء کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے اس نے لاء کی پریکٹس چھوڑ کر ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام پیش کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ کالج کے زمانے سے اب تک بہت اچھے دوست تھے۔ جیری کو معلوم تھا کہ آج کل وہ ہر رات مقامی ایف ایم ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام پیش کرتی تھی اور ڈھائی بجے تک گھر لوٹ آتی تھی۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ وہ پیلٹن ایونیو کے ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اب تک تو وہ گھر پہنچ گئی ہوگی۔'' جیری بڑبڑایا۔

دس منٹ بعد وہ کرسٹین کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل پر انگلی رکھ رہا تھا۔ کرسٹین نے دروازہ کھولا اور جیری کو ساز و سامان، تھکن زدہ چہرے اور شکن آلود سوٹ میں دیکھ کر پریشان ہو گئی مگر جب کافی پیتے ہوئے اس نے اسے مختصراً اپنی بپتا سنائی تو وہ بھی اس سے ہمدردی جتانے لگی۔ ''تم بہت تھکے ہوئے ہو، میرے بیڈروم میں سو جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ کام کرنا ہے۔ میں یہیں لاؤنج میں سو جاؤں گی۔''

کرسٹین کی بات سنتے ہی جیری صوفے سے اٹھا۔ ''ایک منٹ ٹھہرو۔'' کرسٹین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بیڈروم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی۔ ''میں نے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ بیڈ پر رکھ دیا ہے، وہ پہن لو اور یہ کپڑے اتار کر مجھے دے دو۔ استری کر کے یہیں رکھ دوں گی۔ صبح بدل لینا۔''

''بہت شکریہ کرسٹین۔'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور سونے کے لیے چل دیا۔ بیگ اس نے لاؤنج میں چھوڑ دیا اور بریف کیس ساتھ لے گیا۔ اس میں اس کی شیونگ کریم، ریزر، ٹوتھ برش اور پیسٹ تھا۔ صبح تیار ہونے کے لیے اسے ان چیزوں کی ضرورت پڑتی۔

☆☆☆

پہنچنے سے پہلے ایڈی کو یقین تھا کہ شاید سوٹ کیس کا مالک لیک کنٹری کے کسی مہنگے علاقے میں واقع بڑے سے گھر میں رہتا ہوگا مگر اسے یہاں پہنچ کر مایوسی ہوئی۔ جیری کا ڈیننگ پیلس اپنے نام کے مطابق کوئی محل نما بنگلا نہیں بلکہ سڑک کنارے ایک بڑے سے شاپنگ سینٹر کے سامنے قطار میں بنے درجن بھر سے زائد چھوٹے گھروں میں سے ایک تھا۔ رات کے آخری پہر وہاں مکمل سناٹا طاری تھا۔

اس نے ٹیکسی چھوڑی اور سوٹ کیس تھامے ہوئے گھر کی طرف بڑھا۔ اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ عام لوگوں کے اس وقت وہاں ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، دور دور تک چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دروازے پر پہنچا مگر وہ لاک تھا۔ بند تالے کھولنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ چند لمحوں میں وہ جیری کے ڈیننگ پیلس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر کی حالت بتا رہی تھی کہ اب تک

وہ گھر نہیں لوٹا تھا۔

ایڈی نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹس نہیں جلائی تھیں البتہ باہر کھمبے پر لگے بلب کی روشنی سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک کے پیچھے ایک بنے دو کمروں کا گھر تھا۔ پہلے کمرے کو اس نے دفتر کی شکل دے رکھی تھی۔ وہ بیگ لیے لیے دوسرا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ماسٹر بیڈروم خالی تھا۔ وہ واپس پہلے کمرے میں آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تو کمرے کی لائٹس روشن کرسکتا تھا مگر اس نے باہر سے آنے والی روشنی پر ہی اکتفا کیا۔ وہ یہ سب کچھ پہلی بار نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح کے کاموں میں عمر بسر کی تھی۔ اس لیے وہ روایتی احتیاط پسندی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

کافی دیر بعد ایڈی نے گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج کر پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ ''شاید گھر لوٹتے ہوئے کسی ضروری کام سے کہیں رک گیا ہوگا۔'' اس نے دل میں سوچا مگر جب گھڑی چار کے ہندسے کو عبور کر گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا مگر پھر بھی اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے جیری کا منتظر تھا لیکن جب گھڑی نے صبح کے پانچ بجائے تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ ''مجھے اب کہیں اور اپنا سوٹ کیس تلاش کرنا ہوگا۔'' اس نے خود کلامی کی اور بے چینی سے اس کے دفتر کا پتا تلاش کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا ممکن ہے کہ وہ گھر آنے کے بجائے سیدھا اپنے دفتر پہنچا ہو اور رات ہونے کی وجہ سے وہیں رک گیا ہو۔ چند منٹ کی تلاش کے بعد اسے دفتر کا پتا مل ہی گیا۔

جیری ہاپکن

پروپرائٹر... بریکمن ایسوسی ایٹس

15 ایڈورڈ پلازا، گراؤنڈ فلور، پارک ایونیو...

ایڈی نے جلدی جلدی ایڈریس پڑھا اور پھر سر تھام لیا۔ ''اوہ میرے خدا۔'' یہ پتا تو ہیرے ایئرپورٹ سے صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ خوش قسمتی سے وہ شہر کے اس مہنگے ترین علاقے میں پہلے ایک دو بار جا چکا تھا۔ اس لیے اس جگہ سے کچھ شد بد تھی۔ اب اسے واپس پلٹنا تھا۔

ایڈی نے سوٹ کیس تھاما اور نہایت سکون سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔ ٹیکسی روکی، ڈرائیور کو پتا بتایا اور سفر شروع ہو گیا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ بہ ظاہر بالکل مطمئن تھا۔ ویسے بھی وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ جو اس نے کھویا، وہ کسی اور نے کھو دیا ہوتا تو شاید دل کے دورے کے سبب اسپتال میں ہوتا مگر وہ اب بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

جس عمارت کے گراؤنڈ فلور پر جیری کی فرم کا دفتر تھا، وہ کئی منزلہ پلازا تھا۔ ایڈی نے کچھ فاصلے پر ٹیکسی چھوڑی اور پیدل عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ چھپ چھپا کر اندر داخل ہوتے وقت سیکیورٹی کے روکے جانے کا تو امکان نہیں۔ عمارت کے گرد چھوٹی سی چار دیواری

حساب کتاب

تاریخ کی اہم اور نامور شخصیات کی طویل ترین عمریں

1۔ لقمان کی عمر......3500 سال
2۔ عوج بن عنق کی عمر......3300 سال یا بعض روایات کے مطابق 3600 سال
3۔ ذوالقرنین کی عمر......3000 سال
4۔ حضرت نوحؑ، طہمورث اور اضحاک کی عمریں......1000 سال
5۔ قینان کی عمر......900 سال
6۔ مہلائیل کی عمر......800 سال
7۔ تفصیل بن عبداللہ کی عمر......700 سال
8۔ ربیعہ بن عمر عرف سطیح کاہن کی عمر......600 سال
9۔ حاکم عرب عامر بن ضرب، اور سام بن نوح کی عمر......500 سال
10۔ حرث بن مضاض جرہمی اور ارفکشد کی عمریں......400 سال
11۔ درید بن زید کی عمر......456 سال
12۔ حضرت سلمان فارسیؓ اور عمر بن دوسی اور حرث بن خیاص کی عمریں......400 سال
13۔ زہیر بن جناب بن عبداللہ کی عمر......430 سال
14۔ کعب بن حجمہ کی عمر......390 سال
15۔ نصر بن دھمان بن سلیمان کی عمر......390 سال
16۔ قیس بن ساعدہ کی عمر......380 سال
17۔ عمر بن ربیعہ کی عمر......333 سال
18۔ اکثم بن صیفی کی عمر......336 سال
19۔ عمر بن طفیل عدوانی......200 سال

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

تھی جس کے بعد پارکنگ تھی۔ اندر جانے اور باہر نکلنے کے لیے دو علیحدہ گیٹ تھے۔ ایک گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے میں روشنی تھی جبکہ باہر نکلنے والا گیٹ بالکل سنسان تھا۔ صبح ہونے والی تھی مگر ماحول اب تک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے سوٹ کیس اندر پھینکا اور پھر جمپ مار کر خود بھی چار دیواری پار کر گیا۔ وہ چند لمحے تک اندھیرے میں دُبکا حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر وہ سوٹ کیس تھامے آگے بڑھا۔ خوش قسمتی سے اسے سامنے ایک اور دروازہ نظر آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور کونے میں ہو کر اندر کسی کی موجودگی کا اندازہ لگاتا رہا۔ اسے ویکیوم کلینر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ذرا سی گردن باہر نکال کر جھانکا۔ ایک عورت فرش کی صفائی کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ دروازہ اسی نے کھولا ہوگا۔ وہ دائیں بائیں دروازوں پر نظریں ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ اتنی صبح صفائی کرنے والی عورت کو کیا پتا کہ کون کس دفتر کا مالک ہے یا وہاں کام کرتا ہے۔ ویسے بھی وہ شاندار مہنگے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ اگر وہ دیکھ بھی لیتی تو یہی سمجھتی کہ شاید دفتر کا مالک کہیں باہر سے لوٹا ہے اور گھر جانے کے بجائے سیدھا دفتر چلا آیا ہے۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے سامنے سے گزرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد دائیں ہاتھ پر مطلوبہ دفتر نظر آ گیا۔ ''بریکمن ایسوسی ایٹس۔''

ایڈی نے سامنے دیکھا، صفائی کرنے والی عورت خاصی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس نے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے یہ سمجھنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا کہ دروازہ باہر سے لاک ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور پھر کوئی چیز دیکھنے لگا۔ دو منٹ میں وہ اندر تھا۔ اس نے دروازہ لاک کیا۔ بلب روشن کیے۔ دفتر خالی تھا۔

''تو وہ یہاں بھی نہیں پہنچا۔'' ایڈی نے خود کلامی کی۔ دروازے کے ساتھ رکھے صوفے سے ٹیک لگا کر سوٹ کیس کھڑا کیا۔ روشنیاں بند کیں اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ نہایت مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر پچھلے چالیس گھنٹوں سے جاگ رہا تھا۔ اب وہ ایک لمحے کے لیے بھی مزید آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتا تھا۔ صوفے پر بیٹھنے کے دو منٹ کے اندر اندر وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو فرش پر چت لیٹا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے کانوں میں لوگوں کے چلنے پھرنے، باتیں کرنے، فوٹو کاپی مشینوں اور ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ''میں کہاں ہوں؟'' اس نے لیٹے لیٹے دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔ چند منٹ تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے اور کس طرح وہاں پہنچا ہے مگر پھر اسے گزری رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے دس بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔

روشندان سے آنے والی روشنی کے باعث کمرے کا منظر واضح تھا۔ یہ شاندار دفتر تھا جس کے ایک کونے پر چھوٹا سا دروازہ تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ یہ باتھ روم تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ بال درست کیے۔ اپنے کپڑے ٹھیک کیے اور پھر واپس آ گیا۔ سوٹ کیس صوفے کے ساتھ ٹکا تھا۔ اس نے سوٹ کیس گھسیٹا اور میز کے قریب دیوار سے لگا دیا اور بڑی سی میز کی دوسری طرف رکھی چمڑے کی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پشت سے اونچی اور چوڑائی میں غیر معمولی کرسی آرام دہ تو تھی ہی مگر اتنی بڑی تھی کہ اگر عقب سے کوئی اندر آتا تو فوراً یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس پر کوئی بیٹھا ہے۔ ایڈی کا منہ دیوار اور پشت داخلی دروازے کی طرف تھی۔ کمرے کی لائٹس بہ دستور بند تھیں۔ چار پانچ گھنٹوں تک گہری نیند سونے کے بعد وہ اب اور بھی زیادہ مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت وہ شدت سے بلیک کافی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اچانک کھٹکے کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ اس نے نظریں گھما کر پیچھے دیکھنے کے بجائے سامنے لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر اٹھائیس منٹ اور پچیس سیکنڈ ہو رہے تھے۔

کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے لائٹ جلائی اور جب وہ میز کے قریب پہنچا تو اس کی نظر ایڈی پر پڑی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا۔ اس شخص کا منہ ایڈی کی طرف تھا۔ وہ اجنبی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی لیکن اس نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی اور دیکھے بنا سوٹ کیس دیوار کے ساتھ ٹکا دیا۔ اس کے برابر وہ سوٹ کیس تھا جو ایڈی لے کر یہاں پہنچا تھا۔ یہ جیری تھا' بریکمن ایسوسی ایٹس کا مالک اور ایڈی کا مطلوبہ شخص۔

''آپ کی تعریف؟'' جیری اپنی سیٹ کی طرف بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''صبح ساڑھے دس بجے کا تمہارا ملاقاتی۔'' ایڈی نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

''مگر میری تو صبح ساڑھے دس بجے کی کوئی ملاقات طے شدہ نہیں تھی اور... معاف کیجیے، آپ سے تو میرا تعارف بھی نہیں ہے۔''

''یہ ضروری نہیں۔'' ایڈی نے اپنے مخصوص انداز میں بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''کچھ ملاقات تقدیر طے کرتی ہے، اگر آپ کو اس پر یقین ہو تو۔''

''تم کون ہو سکتے ہو؟'' جیری نے کنپٹی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ بہ ظاہر وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اجنبی در انداز کون ہو سکتا ہے جو دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوا اور اتنے سکون سے اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی جسامت سے لگ رہا تھا کہ وہ ورلڈ ریسلنگ فیڈریشن کا کوئی اعلیٰ عہدیدار ہے۔ اس کا قیمتی سوٹ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی کنگلا نہیں مگر جس طرح وہ اندر داخل ہوا تھا، وہ حرکت اسے مشتبہ بنا رہی تھی مگر وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس سے خوفزدہ ہے۔ ''مجھے یاد نہیں آ رہا کہ تم کون ہو سکتے ہو۔'' تقریباً پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد اس نے ایڈی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی بھی ہو سکتا ہوں۔'' ایڈی نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''کوئی بھی... پوپ... صدرِ امریکا... کوئی بہروپیا... کوئی بھی... مگر ایک بات یقین سے کہتا ہوں کہ میں وہ ہرگز نہیں جس کا نام سوٹ کیس کی چٹ پر لکھا ہوا ہے۔'' اس نے دیوار کے ساتھ لگے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پُراسرار انداز میں جواب دیا۔

یہ سن کر جیری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''ایک منٹ... مجھے سوال ذرا بدل کر کرنے دو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم کون ہو اور اس وقت میرے دفتر میں کیا کر رہے ہو؟'' جیری نے سنبھل سنبھل کر بات مکمل کی۔

''میں یہاں اپنا سوٹ کیس لینے آیا ہوں۔'' اس بار ایڈی نے بھی سادہ سے سوال کا سادگی سے جواب دیا۔

''تمہارا سوٹ کیس؟''

''جی ہاں... میرا سوٹ کیس۔'' جیری اب تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ اجنبی کس سوٹ کیس کی بات کر رہا ہے۔ ''ہم پہلے کبھی نہیں ملے، ایک دوسرے کو نہیں جانتے تو تمہارا سوٹ کیس میرے پاس کیسے... تم میرے دفتر کس طرح پہنچے؟'' اب وہ واقعی سخت حیران تھا۔

''تو کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں جو یہ کہہ رہا ہوں۔'' ایڈی نے تڑپ کر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''بالکل نہیں۔'' جیری نے جلدی سے کہا۔ وہ اس کے پہلوانی جثے اور ممکنہ غصے سے گھبرا گیا تھا۔

''تم نے کل رات جلد بازی میں ائرپورٹ سے اپنے بجائے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا ہے۔'' اس بار اس کی آواز بھی قدرے اونچی تھی۔ ''تمہاری اس جلد بازی کی وجہ سے میں یہاں خوار ہو رہا ہوں۔''

''ایک منٹ...'' یہ سنتے ہی جیری نے کہا اور برابر میں نظر ڈالی جہاں کچھ دیر پہلے اس نے سوٹ کیس دیوار سے لگا کر کھڑا کیا تھا۔ ''حیرت انگیز۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔ وہاں بالکل ایک جیسے دو سوٹ کیس کھڑے تھے۔ ''اوہ...'' یہ دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو تمہارا مطلب ہے کہ ان میں سے...''

''ایک میرا ہے جو تم اٹھا لائے تھے۔'' ایڈی نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''اور تم نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔'' جیری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تم نے میرا سوٹ کیس اپنا سمجھ کر جلد بازی میں اٹھایا تھا مگر میری مجبوری تھی۔'' ایڈی نے وضاحت کی۔

''تو وہ تم ہو سکتے ہو، جس نے میرا سوٹ کیس اٹھایا تھا۔'' ایڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں بیگیج لاؤنج میں آخری مسافر تھا جو اس پرواز سے پہنچا، جس سے تم بھی آئے تھے مگر کوئی بھی اس سوٹ کیس کو ساتھ نہیں لے کر گیا۔ اس لیے میں نے اسے اٹھایا اور پھر مجھے سارا قصہ سمجھ میں آ گیا کہ میرے سوٹ کیس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔''

''حیرت انگیز۔'' جیری نے کہا۔ ''پھر تم نے کیا کیا؟''

''سوٹ کیس پر تمہارے نام اور گھر کے پتے کی چٹ لگی تھی اور پھر میں تمہارے گھر پہنچا مگر...''

''تو تم میرے گھر بھی ہو کر آ چکے ہو؟'' جیری کے لیے یہ بات انکشاف سے کم نہ تھی۔ اس نے کرسی پیچھے کھسکائی۔ میز کے نیچے ٹانگیں پھیلائیں اور پھر غیر محسوس... انداز میں درمیانی دراز کھول کر اس میں موجود اعشاریہ اڑتیس کا لوڈڈ پستول نکال

کر گود میں رکھ لیا۔ اب وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ اجنبی اس کے لیے خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔ ''ایک بات بتاؤ... تم یہاں کیسے پہنچے، سوٹ کیس پر تو صرف میرے گھر کا پتا درج تھا مگر...''

''یہ میرے لیے مشکل نہیں تھا۔'' ایڈی پہلی بار مسکرایا۔ ''جب صبح پانچ بجے تک تم نہ لوٹے تو میں نے تلاش شروع کی اور ڈرومنٹ میں ہی مجھے تمہاری فرم کا لیٹر پیڈ مل گیا، جس پر یہاں کا پتا درج تھا۔''

''تم میرے گھر کا تالا توڑ کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گھسے کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔'' جیری نے خفگی سے کہا۔

''نہیں نہیں...'' ایڈی نے مداخلت کی۔ ''دراصل میں تمہارے گھر کا تالا کھول کر، اندر بیٹھ کر تمہارا انتظار کررہا تھا مگر جب پانچ بج گئے تو مجھے یقین ہوگیا کہ شاید تم اپنے دفتر میں رک گئے ہو، اس لیے میں نے گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا مگر خوش قسمتی سے مجھے ڈرومنٹ میں ہی تمہاری میز پر سے لیٹر پیڈ مل گیا تھا۔'' ایڈی نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔

''تو تم نے اور کیا کچھ دیکھا وہاں؟''

''کچھ خاص نہیں۔ بس تمہاری بینک اسٹیٹمنٹ اور دو چار کاغذات ہی دیکھ پایا تھا۔'' ایڈی نے مطمئن انداز میں ایسے جواب دیا جیسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔

''تو تم نے میری بینک اسٹیٹمنٹ بھی پڑھی ہوگی؟''

''ہاں۔'' ایڈی نے سادگی سے کہا۔

یہ سن کر جیری کا ماتھا ٹھنکا۔ پستول پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ ''تو یہ اجنبی شخص جان چکا ہے کہ میرے پاس بینک میں کتنا پیسا ہے۔ کہیں یہ مجھے لوٹنے تو نہیں آیا۔'' اس نے دل میں سوچا۔ اس نے سامنے نظر ڈالی۔ ایڈی بے فکروں کی طرح بڑے مزے سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا اطمینان دیکھ کر جیری کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اسے اجنبی سے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت نظر آئی۔

''سنو...'' جیری نے گمبھیر لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''بہتر ہے کہ ہم اپنا اپنا سوٹ کیس لیں۔ پھر تم اپنے راستے اور میں اپنے دفتر میں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' ایڈی نے چہک کر کہا۔ ''مگر ایک بات ہے؟''

''وہ کیا؟''

''میں اپنا سوٹ کیس لے جانے سے پہلے کھول کر چیک کرنا چاہوں گا اور چاہو تو تم بھی ایسا کرلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر...''

''اب مگر کیا؟'' جیری نے زچ ہوکر اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''میں پہلے اپنا سوٹ کیس کھول کر چیک کروں گا۔''

''تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے اس کی تلاشی لی ہے۔'' یہ سن کر جیری کا منہ بن گیا تھا۔ اسے ایڈی کی بات سے اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی۔

''مائنڈ کرنے کی ضرورت نہیں، ایسا ہوجاتا ہے۔'' ایڈی نے بھی اس کے لہجے سے ناراضی کو محسوس کرلیا تھا۔

''کیا ہوجاتا ہے؟'' جیری بہ دستور ناراض نظر آرہا تھا۔

''جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس موجود سوٹ کیس اس کا نہیں تو وہ اسے کھول کر دیکھ سکتا ہے۔ یہ تو معمولی سی بات ہے۔'' ایڈی نے اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے بے فکری سے وضاحت کی۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم ایسا کرچکے ہو؟'' جیری نے چونک کر کہا۔

''یقیناً، میں نے ابھی تو تم سے کہا تھا نا کہ یہ تو معمولی سی بات ہے۔''

''تو تم نے میرے سوٹ کیس کو کھولا، سامان کی تلاشی لی؟''

''کھولنے کی حد تک درست ہے، البتہ تلاشی نہیں لی تھی۔ بس... یونہی دیکھا تھا چیزوں کو ذرا سا اُلٹ پلٹ کر۔''

''بہت گھٹیا حرکت...''

''ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم نے یہ گھٹیا حرکت نہیں کی ہوگی۔''

''نہیں کی...'' جیری نے تڑپ کر کہا۔

''تو تم نے میرا سوٹ کیس کر کھول کر نہیں دیکھا؟''

''نہیں دیکھا۔'' جیری نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور میں دیکھتا بھی کیوں... میں اب سے کچھ دیر پہلے تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ میرا سوٹ کیس ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ایڈی کے چہرے پر اپنی نظریں گڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کل رات پرواز پر بک کروانے کے بعد سے اب تک مجھے سوٹ کیس کھولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ویسے بھی یہ تو مجھے ابھی پتا چلا ہے کہ جسے میں اپنا سمجھ رہا تھا وہ دراصل تمہارا سوٹ کیس ہے... سمجھے۔''

ایڈی اس کے چہرے کے تاثرات کو بہ غور دیکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ آیا وہ سچ بول رہا ہے یا صرف خود کو پارسا ثابت کرنے کے لیے بکواس کررہا ہے۔

''ویسے ایک بات اور...'' جیری بہ دستور غصے میں نظر آرہا تھا۔ ''مجھے آپ کی حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔ سوٹ کیس کے اندر کیا ہے، یہ میرا انتہائی ذاتی اور خفیہ معاملہ ہے جسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے۔ تم نے میری پرائیویسی میں دخل اندازی کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا دل کررہا تھا اجنبی درانداز کو اس کے سوٹ کیس سمیت دھکے مارتے ہوئے دفتر سے باہر نکال دے مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔

''سوری...'' جیری دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہوا تو ایڈی نے اطمینان سے کہا۔ ''جو کچھ ہوا غلط فہمی میں ہوا۔ ویسے یہ میرا وعدہ ہے کہ کبھی کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گا کہ تمہارے سوٹ کیس میں کیا کچھ تھا۔''

''اس میں میری قانونی دستاویزات تھیں۔'' جیری نے اپنی بھڑاس نکالنے کا ایک اور نکتہ تلاش کرلیا۔ ''یہ ایک قانونی مشاورت کی فرم ہے۔ وہ قانونی دستاویزات نہایت خفیہ تھیں مگر تم نے...'' جیری نے بات ادھوری چھوڑ کر دوسری طرف منہ کرلیا۔ ''تم نے مجھ سمیت کئی لوگوں کے پرائیویسی کے حق کو پامال کیا ہے۔ وہ دستاویزات میرے پاس اُن کی امانت ہیں۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے لہجے کو مزید گمبھیر اور سرد بناتے ہوئے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اجنبی سمجھ لے کہ میں اس سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ مگر وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اس کے مقابل بھی گھاگ شکاری بیٹھا تھا۔

''جو کچھ تم نے مجھ سے کہا، اُن سب باتوں کا سو فیصدی اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔'' ایڈی نے سکون سے جواب دیا۔ ''میرا سوٹ کیس تمہاری تحویل میں تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے بھی اسے کھول کر، اُس میں موجود سامان کو تلپٹ کیا ہوگا۔''

''پھر وہی سوٹ کیس...'' جیری نے تلملا کر کہا۔ ''میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔''

''تو پھر کیوں تلملا رہے ہو؟'' ایڈی نے فوراً لقمہ دیا اور تجویز پیش کی۔ ''ہم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس کھول کر دیکھتے ہیں۔ اپنی تسلی کرتے ہیں کہ سب کچھ موجود ہے۔ پھر اپنا اپنا سوٹ کیس تھامتے ہیں اور ہاتھ ملا کر میں اپنے راستے...''

''تو جاؤ اپنے راستے۔'' جیری نے قطع کلامی کرتے ہوئے اُس کا جملہ از خود مکمل کردیا۔

''مگر میرا سوٹ کیس...''

اب تک تو جیری اس کی باتوں سے پریشان تھا لیکن اچانک اس کے دماغ نے پلٹا کھایا۔ ایڈی سوٹ کیس کھو یا تھا مگر اب تک وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رات بھر سوٹ کیس کے چکر میں خوار ہونے والا موٹا ایڈی اتنا پُرسکون کیوں نظر آرہا ہے۔ ''میں نے کل رات ہی تمہارا سوٹ کیس کھول کر دیکھ لیا تھا۔'' اس کا اطمینان دیکھ کر جیری نے ایک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔

''کیا مطلب۔'' ایڈی نے اطمینان بھرے لہجے لیکن ناراض انداز میں کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تو تم کہہ رہے کہ میرا سوٹ کیس...''

''کھول کر نہیں دیکھا تھا۔'' جیری نے قطع کلامی کی۔ ''سوری! میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' اس نے اپنے لہجے سے ندامت کا تاثر دینے کی کوشش کی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔'' اس نے سر کو نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ ایڈی کو تاثر دینا چاہتا تھا کہ بہت شرمندہ ہے مگر حقیقت میں وہ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ پستول کا سیفٹی لاک ہٹا ہوا ہے یا نہیں۔

''تو تم نے میرے سوٹ کیس کے ساتھ کیا کرنے کا سوچا تھا؟'' ایڈی کی آواز میں ترشی آگئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' جیری نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔ ''بس میں چاہتا تھا کہ تمہیں فون کروں گا اور یہ سوٹ کیس تمہارے حوالے کرکے اپنا سوٹ کیس لے لوں گا۔''

''مگر میرے سوٹ کیس پر میرا فون نمبر نہیں۔''

''مگر نام تو ہے۔'' اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ لگیج ٹیگ پر 'ای ڈی' لکھا ہوا تھا۔

''وہ میرا پورا نام نہیں۔'' ایڈی نے نکتہ اٹھایا۔

''یہ قانونی فرم ہے اور میں اسے چلاتا ہوں۔'' جیری نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ کسی شخص کا فون نمبر کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔'' جیری نے صاف صاف کہنے کے بجائے گول مول جواب دیا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پاس اس طرح کے وسائل ہیں۔'' ایڈی نے یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہونا چاہئیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں پرائیویٹ سراغ رساں بھی ہوں۔ سراغ ڈھونڈنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''یقیناً، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ایڈی نے پھر اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔

''میں تمہیں فون ضرور کرتا۔'' آخر جیری نے سکوت توڑا۔

''میں بھی تمہیں فون ضرور کرتا۔'' ایڈی نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پتا درج ہے۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد جیری نے کہنا شروع کیا۔ ''اب تم یہاں بیٹھے میرا منہ کیا تک رہے ہو، جاؤ جا کر اپنا سوٹ کیس اٹھاؤ اور چلتے بنو۔''

''لے جانے سے پہلے سوٹ کیس چیک کرنا ضروری ہے۔'' ایڈی نے کہا۔ ''تم تیار ہو؟'' یہ کہہ کر اس نے جیری کی طرف دیکھا مگر وہ خاموش تھا۔ ''تمہارے بقول تم نے سوٹ کیس کھولا تھا۔ تمہیں کچھ یاد ہے، اس میں کیا کچھ تھا؟'' ایڈی نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب ضروری نہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں بات کی جائے۔'' جیری نے گول مول جواب دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے سوٹ کیس کھولا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اندھیرے میں تیر چلا کر یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کیا ہوسکتا تھا مگر ایڈی گھاگ شخص تھا۔ اس نے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا، جس سے اسے کوئی سراغ مل سکتا۔ ویسے بھی اب جیری موٹے سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

''خیر! تم نہ بتانا چاہو مگر میں بتائے دیتا ہوں۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد ایڈی نے کہنا شروع کیا۔ ''جو کوئی بھی اس سوٹ کیس کو کھولتا، پہلی ہی نظر میں بھانپ جاتا کہ اس میں بھاری مالیت کے بیئرر بانڈز موجود ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔''

''بیئرر بانڈز۔'' جیری چونکا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ اجنبی کے سوٹ کیس میں کیا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے ان کی مالیت کیا ہے؟'' ایڈی نے مسکرا کر سوٹ کیس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً نہیں۔'' جیری نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ بہت زیادہ مالیت کے ہیں۔'' اس نے پھر بات بنائی۔ اس بار جیری میں ہمت نہیں تھی کہ سچ کہہ سکے کہ اس نے سرے سے سوٹ کیس کھولا ہی نہیں تھا۔

''لاکھوں ڈالرز کے ہیں۔'' ایڈی نے بھی گول مول جواب دیا۔

یہ سن کر جیری کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر ایڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرا دفتر نہایت محفوظ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ''میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔ ان کے آنے تک تم اور یہ رقم... دونوں یہاں مکمل طور پر محفوظ رہیں گے۔''

''پولیس...'' یہ سن کر ایڈی نے آہستہ سے کہا۔ ''مگر پولیس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے بیچ ان کا کیا کام۔ وہ میرا سوٹ کیس ہے۔ تم بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہو۔ جب ہمارے درمیان کوئی تنازعہ نہیں تو پھر پولیس... کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟'' پہلی بار ایڈی پریشان نظر آیا تھا۔

''تم نے کتنے لاکھ ڈالرز بتائے تھے۔'' جیری نے پینترا بدلا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات اس نے نہیں کہی تھی۔

''پانچ لاکھ ڈالرز۔'' وہ اب بدحواس ہو رہا تھا۔

''یہ بہت بھاری رقم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کے علم میں بھی یہ بات آجائے کہ میں نے تمہاری وہ رقم لوٹا دی جو کل رات اتفاقی غلطی سے میرے پاس پہنچ گئی تھی۔'' جیری سمجھ گیا تھا کہ ایڈی پولیس کے نام پر پریشان ہو کر کنی کترا رہا ہے۔ اس نے اجنبی کے کمزور پہلو کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہا۔

''تم جانتے ہو کہ یہ رقم میری ہے پھر بھی پولیس کو بلانے پر اصرار کیوں؟''

''یقیناً یہ تمہاری ہوگی۔'' جیری نے اسے اطمینان دلایا۔ ''مگر میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سوٹ کیس تمہارا ہے بھی یا نہیں۔ یہ اور بات کہ تم اس کے دعویدار ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پولیس آئے گی، تصدیق کرے گی اور تمہارا ہے تو تمہیں مل جائے گا۔ بس! اتنی سی بات ہے۔ آخر میں ایک ذمے دار شہری ہوں۔''

ایڈی نے کرسی موڑی، اپنے سوٹ کیس کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ اب اٹھ کر جیری کو گڈبائے کہہ کر جانے والا ہے۔

''میرا خیال ہے اب پولیس کو فون کر دیا جائے۔'' جیری نے میز پر رکھے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھہرو...'' ایڈی نے کہا۔ ''پولیس کو بلانا اچھا آئیڈیا نہیں۔''

''اچھا آئیڈیا نہیں۔'' جیری نے اس کے الفاظ دہرائے۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ بیئرر بانڈز کس کی ملکیت ہو سکتے ہیں۔''

''تم نے ہی تو بتایا تھا کہ یہ تمہارے ہیں۔'' جیری نے جواب دیا۔

''اس وقت میرے ہیں پر میری ملکیت نہیں۔'' ایڈی نے جواب دیا۔ وہ ایک بار پھر مطمئن نظر آرہا تھا۔ ''میں تو اس رقم کے لیے صرف ایک کوریئر کی حیثیت رکھتا ہوں وہ بھی اپنے ادارے کی طرف سے... سمجھ گئے۔''

''یہ کون سا ادارہ ہوسکتا ہے؟'' جیری نے استفساریہ

نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی نجی ادارہ ہوسکتا ہے، مالیاتی کمپنی ہوسکتی ہے، سرکاری ادارہ بھی ہوسکتا ہے... تم اس بات کو چھوڑو۔'' ایڈی نے کندھے اچکا کر کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ ادارہ یا کمپنی چاہے کوئی سی کیوں نہ ہو، مالیاتی معاملات کے بیچ پولیس کی دخل اندازی کسی کو بھی پسند نہیں۔ کوئی یہ نہیں چاہے گا کہ مالی معاملات کے بیچ پولیس آئے اور ان کے اثاثوں تک اس کی رسائی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ رقم کس ادارے کی ہوسکتی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے اس بات کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔'' جیری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تو پھر تم یہ بھی سمجھ رہے ہوگے کہ جب پولیس کو بیچ میں ڈالو گے تو کیسی مشکلات کھڑی ہوسکتی ہیں۔'' ایڈی نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

جیری نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب معاملہ ختم۔ کسی بھی وقت وہ آگے بڑھے گا۔ اپنا سوٹ کیس اٹھائے گا، کھول کر رقم چیک کرے گا اور پھر چلتا بنے گا۔ وہ اسے اب نہیں روک پائے گا۔ اس کی گود میں رکھا اعشاریہ اڑتیس بور کا پستول بھی یونہی دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ اچانک اسے ایک نیا آئیڈیا سوجھا۔ ''میں تمہیں ایک مفید کاروباری مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر ایڈی کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کی خاموشی کو جیری رضامندی سمجھا اور کہنے لگا۔ ''تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم اپنی ملازمت سے بہت خوش ہو۔ وہ جو کچھ تمہیں دے رہے ہیں۔ اس سے تم آسودہ زندگی گزار رہے ہو۔''

''ہاں... وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' ایڈی نے لقمہ دیا۔

''تم نے کبھی سوچا کہ اگر کسی دن وہ تمہیں ملازمت سے نکال دیں تو پھر کیا ہوگا؟'' یہ کہہ کر اس نے ایڈی کے چہرے پر نظریں گڑائیں۔ ''یہ تمہارا قیمتی سوٹ، ٹھاٹھ باٹ، پُرآسائش گھر، گاڑی... کبھی زندگی کے اس پہلو پر سوچا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔

''یہ میرا نہایت نجی معاملہ ہے۔'' ایڈی نے خفگی سے کہا۔

''میں تمہاری بے عزتی نہیں کر رہا۔'' جیری نے جلدی سے کہا۔ ''مگر تم جیسے ادھیڑ عمر مرد اس پہلو پر اس عمر میں بھی نہ سوچیں گے تو کب سوچیں گے، اُس وقت جب ہاتھ پاؤں جواب دے چکے ہوں گے یا تب جب مالکان نکال باہر کر چکے ہوں گے... بولو؟'' یہ کہہ کر وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

ایڈی بہ دستور خاموش تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا مگر وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جیری کے لیے یہی بات حوصلہ افزا تھی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد آخر اس نے منہ کھولا۔

''میں ابھی آدھے میل کے فاصلے سے یہ سوٹ کیس گھسیٹتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔'' جیری نے مطلب کی بات شروع کی۔ ''کسی کو پتا نہیں کہ اس کے اندر کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''اگر ہم دونوں، میرا مطلب ہے کہ تم اور میں اسے آپس میں...'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا اور بات نامکمل چھوڑ دی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایڈی نامکمل فقرے سے پوری بات سمجھ گیا ہوگا۔

وہ بہ دستور جیری کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اگرچہ اس نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی تھی مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ نہ ہی اس کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

جب سے ایڈی نے سوٹ کیس میں رکھے بانڈز کی مالیت بیان کی تھی، تب سے جیری کی نیت پھسل گئی تھی۔ وہ رات بھر اپنے پاس سوٹ کیس رکھنے کی فیس ہر حال

قحط اور وجہ

مشہور انگریز ادیب،
جی کے چیسٹرٹن اور جارج برنارڈ شا چونکہ
ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ کس محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی فقرے بازیاں آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ جارج برنارڈ شا دبلے پتلے تھے اور چیسٹرٹن موٹے تھے۔ ایک دن چیسٹرٹن نے برنارڈ شا سے کہا: ''شا! اگر کوئی غیرملکی تمہیں دیکھے تو کہے گا کہ انگلستان میں قحط ہے۔''
برنارڈ شا سے یہ جملہ برداشت نہ ہوسکا فوراً بولے: ''اور اگر کوئی غیرملکی تمہیں دیکھے تو فوراً سمجھ جائے گا کہ اس قحط کا باعث کون ہے۔''

مرسلہ: [illegible]

میں وصول کرنا چاہتا تھا یعنی ڈھائی لاکھ ڈالر؟ ''تم نے ائرپورٹ پر اپنے سوٹ کیس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی؟'' جیری نے ایک اور نکتہ بیان کیا۔

ایڈی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اٹھو... فوراً ائرپورٹ جاؤ اور گمشدگی کی رپورٹ درج کرواؤ۔'' جیری نے مفت قانونی مشورہ دیا۔

''میں اور یہ کروں... مگر کیوں؟'' ایڈی نے کافی دیر بعد سوال کیا تھا۔

''اس سے یہ ثابت کرنا آسان ہوگا کہ رقم والا سوٹ کیس واقعی غائب ہوا تھا۔'' جیری نے پٹی پڑھائی۔

''تم مجھے واقعی مشکل میں ڈال رہے ہو۔'' ایڈی نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں... میں رقم اور تمہیں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' جیری نے فوراً کہا۔ ''ممکن ہے کہ جب تم اپنے ادارے سے کہو کہ ائرپورٹ سے سوٹ کیس غائب ہوگیا ہے تو وہ تمہاری بات پر یقین کرلیں اور انکوائری نہ کروائیں۔ بڑی کمپنیوں کے لیے تو یہ معمولی رقم ہے اور ابھی تم نے ہی تو کہا تھا کہ بڑی بڑی کمپنیاں اور ادارے مالی معاملات کے حوالے سے پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔'' جیری اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''اگر میں ایسا نہیں کرتا تو پھر...'' ایڈی نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر مجبوراً مجھے پولیس کو فون کرنا پڑے گا۔'' جیری نے ایسا تاثر دیا کہ جیسے وہ بھی فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکا ہے۔ ''میرا خیال ہے فون کر ہی لینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایڈی کی طرف دیکھا۔ ''آگے کی کہانی تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

ایڈی ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے باس ہیری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے باس کے بڑے بڑے کام کیے تھے۔ وہ اس کا بہت شکرگزار تھا مگر پھر بھی یہ رقم کا معاملہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رقم جیری کے منصوبے کے مطابق ہڑپ کرلی گئی تو ہیری اس کی بات پر بالکل یقین نہیں کرے گا۔ وہ بھی بلا کا کائیاں شخص تھا۔

دوسری طرف اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر جیری کو پھر حوصلہ ملا۔ ''تم اس رقم کو لے کر کہیں بھی فرار ہوسکتے ہو۔ سوئٹزرلینڈ، یورپ کے کسی بھی ملک، برطانیہ... کون تمہیں ڈھونڈ پائے گا۔ اس رقم سے، کسی بھی ملک میں جاکر بڑے آرام سے اپنا کاروبار شروع کرسکتے ہو۔'' جیری اسے تجویز پہ تجویز دیے جا رہا تھا۔ مگر وہ خاموش تھا۔ ایڈی کی خاموشی اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر وہ بھی خاموش ہوگیا۔ کمرے میں تقریباً پانچ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ ایڈی سوچ کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا اور جیری غور سے اس کے تاثرات سے معاملہ فہمی کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے فیصلہ کرلیا۔'' کافی دیر بعد ایڈی نے سر اوپر اٹھایا اور جیری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا مگر اس نے اپنے چہرے پر بہ دستور متانت طاری کیے رکھی۔

''سب سے پہلے تو میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ اتنی اچھی تجویز مجھے دی۔'' ایڈی کی بات سن کر جیری مسکرا دیا۔ ''تو اب ہم تمہارے منصوبے پر عمل کریں گے۔'' ایڈی نے بھی مسکرا کر بات آگے بڑھائی۔ اس کا ہاتھ نہایت آہستگی سے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''مگر تمہارے منصوبے کے عین مطابق نہیں۔ اس میں، میں نے چھوٹی سی تبدیلی کردی ہے۔'' جیری کی نگاہ اس کے چہرے پر مرکوز تھی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ کب اس کا ہاتھ کوٹ کے اندر گیا اور باہر آیا۔ جب تک وہ دیکھ پاتا سائلنسر لگے پستول سے ایک گولی نکلی اور سیدھی جیری کی پیشانی میں جا گھسی۔

ایڈی نے آگے بڑھ کر اس کی لاش کو کھینچ کھانچ کر میز کے نیچے دھکیلا۔ جلدی سے سیاہ چمڑے کے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا اور مسکراتا ہوا بڑے سکون سے باہر نکل گیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دو دن میں کوئی نہ کوئی اس کی لاش دریافت کر ہی لے گا۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے کے بعد ایڈی او ہیرے ائرپورٹ پر تھا۔ وہ اپنا پاسپورٹ ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے تین گھنٹے بعد لندن جانے والی پرواز کے ٹکٹ خریدے۔ چیک اِن کیا اور لندن پہنچ گیا۔

مسلسل سفر کے باعث وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ ہوٹل پہنچتے ہی وہ سو گیا۔ دوسرے دن اٹھا۔ تیار ہوکر اس نے سوٹ کیس اٹھایا تاکہ بیئرر بانڈز فروخت کرسکے۔ ''یہ کیا!'' اچانک حیرت کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ پُرسکون نظر آنے والا ایڈی اچانک بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ سوٹ کیس کے کونے پر چٹ لگی ہوئی تھی:

جیری ہاپکن

ڈیننگ پیلس، لیک کنٹری۔

خود گواہی

سلیم انور

کبھی دام اور کبھی صیاد... بازی کبھی بھی کسی کے حق میں پلٹ سکتی ہے۔ ارتکابِ جرم سے قبل مجرم خود کو چھپائے رکھنے کے تمام نکات پر غور کرتا ہے مگر... ارتکابِ جرم کے بعد وہ لاشعوری طور پر دور رہنے کی خوش فہمی میں مبتلا دھیرے دھیرے شکنجے سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے کہ یہی قدرت کا نظام ہے۔ غیر دانستہ سہی مگر یہی غلطی وہ بھی کر رہا تھا۔

ایک مجرمانہ ذہن کی الجھی نفسیات...... اور حالات کا پیچ وخم

ڈین اولیری نے انجیلا کی خواب گاہ کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگائی اور قریب کی گلی کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ اب اس کا اعتماد پختہ ہو چکا تھا۔ اسے اس بے حس وحرکت جسم کی قطعی پروا نہیں تھی جسے وہ خواب گاہ کے فرش پر پڑا چھوڑ آیا تھا۔

''احمق عورت'' ڈین نے سوچا۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح اس سے الجھ گئی تھی اور اس کے چہرے پر سے عینک اور اس کی وگ اتار پھینکنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اسے اب بھی اس عورت کے چہرے کے تاثرات بہ خوبی یاد تھے جن سے خوف جھلک رہا تھا۔ اس کیفیت نے اسے مزید برانگیختہ کر

دیا تھا۔ اسے اچانک یوں لگا تھا جیسے وہ اسے پہچان گئی ہو اور تب ہی اسے غصہ آگیا تھا۔

ڈین اندھیری گلی سے نکل کر باہر سڑک پر آگیا۔ اس نے سڑک پار کی اور آل نائٹ گروسری پارکنگ لاٹ کی جانب چل دیا جہاں اس نے اپنی پک اپ چھوڑی تھی۔

اس کا مؤقف تھا کہ کبھی اپنی گاڑی جائے واردات پر پارک نہ کرو۔ اس لیے کہ اندھیرے میں بھیس بدلے ہوئے چہرے کے مقابلے میں کار کو بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے اور اس کا کھوج لگایا جاسکتا ہے۔

اس نے وہ پلاسٹک بیگ اپنی پک اپ کی سیٹ پر اچھال دیا جس میں اس کے "کام کا لباس" موجود تھا۔ یہ لباس ایک سستی سی جینز، ایک پل اوور شرٹ اور نائلون کے دستانوں پر مشتمل تھا۔ اس نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کیا اور سوچنے لگا کہ اس بار اسے اس کام کے لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا کیونکہ اس عورت سے ہاتھا پائی میں لباس کا ستیاناس ہوگیا تھا۔

یہ اسی روز دن کے وقت کی بات ہے کہ وہ اپنی پک اپ کے نیچے لیٹا اس کا آئل چینج کر رہا تھا جب اینجلا ڈپلیکس میں وارد ہوئی۔ ڈین نے لیٹے ہوئے ہی اس کی ٹانگوں کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر پک اپ کے نیچے سے کھسک کر باہر نکل آیا تاکہ ان بھرپور ٹانگوں کی مالکہ کا بھی دل کھول کر نظارہ کرسکے۔ سنہری زلفوں اور متناسب جسم کی اینجلا اسے ایک نظر میں بھا گئی تھی۔ اسے اسی قسم کی عورتیں پسند تھیں۔

اس نے اینجلا کے ساتھ فلرٹ کرنے کی کوشش کی۔ عورتیں عام طور پر اس کے کرخت نقوش کو پسند کرتی تھیں اور اس کے فلرٹ کا مثبت جواب دیتی تھیں۔ لیکن اینجلا نے بڑی ادا کے ساتھ اپنی بڑے سے ہیرے والی منگنی کی انگوٹھی اس کے سامنے لہرا دی۔ ڈین کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ اس کے گاؤدی مالک مکان لیو بیلے کی منگیتر ہوسکتی ہے۔

بعد میں اس نے اینجلا کا چھپ کر پیچھا کیا تاکہ اس کی رہائش گاہ کا پتا لگا سکے۔ اینجلا کی رہائش شہر کے مشرقی حصے میں واقع ایک اپارٹمنٹ میں تھی۔ اس سے پہلے وہ اینجلا کو لیو بیلے سے یہ کہتے ہوئے سن چکا تھا کہ وہ اس رات اس کے ہمراہ باہر گھومنے نہیں جاسکے گی کیونکہ اسے رات دس بجے تک دفتر میں مصروف رہنا پڑے گا۔

ڈین نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے پاس اینجلا کی خواب گاہ کی کھڑکی کے راستے اندر جانے اور وہاں چھپ جانے کے لیے خاصا وقت ہوگا۔

ڈین نے اپنے لباس کا بیگ ایک بند ریسٹورنٹ کے عقب میں واقع کوڑے دان میں پھینک دیا اور پھر اپنے پسندیدہ بار کی جانب روانہ ہوگیا۔ بیئر کے چند گلاس اور تھوڑا سا بلیرڈز کا کھیل...... اسے اس وقت بس ان ہی چیزوں کی طلب ہورہی تھی۔

اس نے اپنی جیب میں سے ہیرے کی انگوٹھی نکال کر ایک بار پھر پرشوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ پھر وہ انگوٹھی دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ وہ دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا، گنگناتا ہوا بار کی جانب چل دیا۔ اس کی اس شب کی محنت رائگاں نہیں گئی تھی۔

قطعی نہیں!

⁂⁂⁂

یہ چند گھنٹوں بعد کی بات ہے کہ جب ڈین نے اپنی پک اپ بڑا سا موڑ کاٹنے کے بعد اپنی سڑک پر گھمائی تو اس کا سانس رک سا گیا۔

اسے ڈرائیو وے میں دو افراد کھڑے دکھائی دیے۔ ان کے برابر میں ایک سرکاری ٹائپ کی کار بھی کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک کو ڈین نے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ اس کا مالک مکان لیو بیلے تھا۔ دوسرے فرد کا چہرہ مخالف سمت میں تھا۔

"کیا وہ کوئی پولیس والا ہے؟" ڈین نے سوچا۔

ڈین نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا۔ "یہ ناممکن ہے" اس نے سوچا۔ وہ اتنی جلدی اس کا سراغ نہیں لگا سکتے اور وہ بھی کس بنیاد پر؟

اس نے اپنی پک اپ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے ساتھ روک دی اور اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ البتہ انجن بند نہیں کیا۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف نہیں بڑھا تو ڈین کا اعتماد لوٹ آیا۔

اب اسے یقین آگیا کہ انہیں حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے اور وہ خواہ مخواہ گھبرا گیا تھا۔

پھر جب ڈین پک اپ سے اتر کر ان کی جانب بڑھا تو لیو بیلے سسکیاں لے رہا تھا۔ ڈین پر نگاہ پڑتے ہی وہ روتے ہوئے بولا۔ "وہ...... وہ اینجلا...... کسی نے اس پر حملہ کردیا تھا۔ وہ اس وقت ویلے اسپتال میں ہے اور ابھی ابھی اس کی سرجری ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک ایک جھٹکے سے چہرے سے ہٹائی اور آنسو پونچھنے لگا۔ پھر ڈپلیکس کے اپنے نصف حصے کی جانب چل دیا۔

ڈین اس وقت اچھل پڑا جب دوسرے فرد نے زبان کھولی۔ اس کا تعلق واقعی پولیس ہی سے تھا لیکن وہ ایک پولیس وومن تھی۔

"سارجنٹ مارٹینیز!" اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تم ڈین اولیری ہو۔ مسٹر لیو بیلے کے نئے کرائے دار!"

ڈین اس کی صورت تکنے لگا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ اس پولیس سارجنٹ خاتون کو اس کے نام کا پہلے سے علم تھا اور اسے یہ بات بھی پسند نہیں آئی تھی کہ اینجلا مری نہیں بلکہ زندہ تھی۔

"مس اینجلا...... اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" ڈین نے معصوم سے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں، چوٹ تو اچھی خاصی آئی تھی لیکن اس نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور اپنے حملہ آور سے بھڑ گئی۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ زندہ بچ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کل دوپہر سے پہلے یا سہ پہر تک بات چیت کرنے کے قابل ہوجائے۔" سارجنٹ مارٹینیز نے بتایا۔

لعنت ہو، ڈین نے دل ہی دل میں کہا۔ "تو تمہیں کوئی سراغ نہیں ملا؟ کسی کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا؟"

اس بات پر سارجنٹ مارٹینیز نے ایک لمحے کے لیے ڈین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے توقف کیا، پھر ایک آہ بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مس اینجلا کسی نہ کسی طرح گھسٹتے ہوئے فون تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے 911 ڈائل کردیا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے ہانپتے ہوئے آپریٹر سے جو کچھ کہا تھا، بس وہی ہمارے لیے ایک کلیو ہے جس پر ہمیں کام کرنا پڑے گا۔"

ڈین اس کے بات جاری رکھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن سارجنٹ اب خاموش ہوگئی تھی۔

ڈین نے مزید چند لمحے انتظار کیا۔ پھر بالآخر خود ہی پھٹ پڑا۔ "اس نے آپریٹر سے کیا کہا تھا؟"

"مجھے یقین ہے کہ اخبارات میں یہ سب تفصیل سے آجائے گا۔ ویسے میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ اس نے ہانپتے ہوئے پہلے مدد کی درخواست کی تھی۔ پھر کہا تھا۔ لیوٹینینٹ (Lieutenant)...... اس نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔"

"لیوٹینینٹ؟" ڈین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دہرایا۔

سارجنٹ مارٹینیز نے شانے اچکا دیے۔ "شاید اس کے حملہ آور نے ملٹری یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ اسی حوالے سے اس نے اسے لیفٹیننٹ کہا ہو، لیکن بدقسمتی سے مسٹر لیو بیلے کے ذہن میں ایسا کوئی شناسا نہیں جو اس حلیے پر پورا اترتا ہو۔"

ڈین کا دل چاہا کہ خوب قہقہے لگائے۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کو حملہ آور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اور اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتا جب تک وہ دوبارہ بولنے کے قابل نہیں ہوجاتی۔

سارجنٹ مارٹینیز اپنی پولیس کار میں وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ڈین لان عبور کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے لیو بیلے کے کچن کی کھڑکی کے پاس رک گیا۔ کچن میں روشنی ہورہی تھی اور وہ احمق ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا کسی بچے کے مانند رو رہا تھا۔

ڈین نے حقارت سے گھاس پر تھوک دیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی سمت چل دیا۔

اسے ایک کام سرانجام دینا تھا۔ اس سے پہلے کہ اینجلا مزید کوئی لفظ زبان سے ادا کرے، اسے ہمیشہ کے لیے گہری نیند سلا دینا ہوگا۔

ڈین نے اپنے بہروپ بدلنے والی بھانت بھانت کی اشیا کو الٹ پلٹ کر جانچنا شروع کیا۔ منصوبہ بھی بدستور اس کے ذہن میں ترتیب پا رہا تھا۔

اسے ڈاکٹروں والا وہ سفید کوٹ دکھائی دے گیا جو اس نے ایک دلکش نوجوان لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے خریدا تھا اور پہنا کرتا تھا۔ وہ یہ سفید کوٹ پہن کر اور عینک لگا کر اس کے اسپتال پہنچ جائے گا اور اس کمرے میں داخل ہوجائے گا جہاں اینجلا کو رکھا گیا ہے۔ پھر اس کے جسم میں انجکشن کے ذریعے دوا داخل کردے گا۔ اس کے پاس تالے میں بند چوری شدہ ہر قسم کی دوائیں موجود تھیں۔ وہ ان دواؤں میں سے کوئی ایک دوا استعمال کرسکتا ہے جو اس نے جانوروں کے ڈاکٹر کے کلینک سے چوری کی تھیں۔ وہ ایسی دوائیں تھیں جو جانوروں کو ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔

ہاں، اسے یہ کام سرانجام دینے کے لیے اینجلا کے کمرے میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے میں صرف چند سیکنڈ لگیں گے۔

اپنے اس شاندار منصوبے پر ڈین کے ہونٹوں پر ایک

اطمینان بخش مسکراہٹ ابھر آئی۔

❦ ❦ ❦

ڈین سورج نکلنے سے کچھ دیر قبل ویلے اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے اپنی پک اپ اسپتال کے وسیع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ اس نے اینجلا کے کمرے کا نمبر پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔

کسی بھی مریض کے کمرے کا نمبر دریافت کرنا مشکل نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آپ اگر یہ کہتے ہیں کہ میں مریض کے لیے گلدستہ بھجوانا چاہتا ہوں تو اسپتال والے بلا جھجک مریض کے کمرے کا نمبر بتا دیتے ہیں۔

اینجلا کے کمرے کا نمبر 327 تھا۔

ڈین نے اپنی عینک اپنی ناک پر جماتے ہوئے بے باکی کے ساتھ اسپتال کے مرکزی دروازے کی سمت قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ اس کا داہنا ہاتھ اس کے سفید کوٹ کی داہنی جیب میں تھا جس میں دوا سے بھری ہوئی سرنج موجود تھی۔

وہ معمول کے انداز میں چلتا ہوا اسپتال میں داخل ہو گیا۔

پھر لفٹ میں سوار ہو کر تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ جب وہ لفٹ سے باہر نکل رہا تھا تو ایک نرس سے اس کا سامنا ہو گیا۔ وہ نرس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ نرس بھی جواباً مسکرا دی۔

وہ بااعتماد انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے صبح سویرے کے معمول کے راؤنڈ پر ہو۔ وہ اب اپنے مطلوبہ کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کمرا نمبر 321 ...... 323 ...... 325 ...... ڈین نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ سامنے سے ایک اور نرس آ رہی تھی۔ جب نرس آگے نکل گئی تو ڈین نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر دبے پاؤں کمرا نمبر 327 میں داخل ہو گیا۔

صبح کی ہلکی روشنی چھن کر کمرے میں آ رہی تھی۔ ڈین بیڈ کے نزدیک پہنچا اور اپنی جیب میں سے سرنج باہر نکال لی لیکن جب اس نے نگاہ اٹھا کر بیڈ کی طرف دیکھا تو ششدر رہ گیا۔

بیڈ خالی تھا!

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اس کے کانوں میں ایک تحکمانہ آواز سنائی دی۔ ”ہینڈز اپ!“

ڈین نے آواز کی سمت پلٹنے سے قبل ہی اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ وہ سارجنٹ مارٹینیز کی آواز تھی۔

ڈین کی نگاہ کمرے کی کھڑکی کی جانب اٹھ گئی۔

”تین منزل سے چھلانگ لگانا خاصا رسکی ہو گا، اولیری لیکن اگر تم کوشش کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔ مگر میں پہلے بتا دوں کہ نیچے ایک پولیس مین موجود ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ چھلانگ لگانے کے باوجود تم بچ کر نہیں جا سکو گے۔“ سارجنٹ مارٹینیز نے کہا۔

”تم ...... تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آؤں گا؟“ ڈین نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے جھرجھری سی آ گئی جب ایک باوردی پولیس مین نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

”میں تمہارے بارے میں پر یقین تو نہیں تھی۔ لیکن تم گزشتہ شب خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے اور بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور پھر جب تم نے یہ پوچھا کہ کیا کسی کو اینجلا کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا تو اس بات نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیو بیلے نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا کہ اینجلا پر حملہ کس جگہ ہوا ہے۔ سو تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ اس پر حملہ اس کے اپارٹمنٹ میں ہوا تھا؟ پھر ہمارے پاس ایک گواہ بھی تھا۔“

”گواہ؟“ ڈین چونک پڑا۔

”ہاں، اینجلا۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے پاس اس بارے میں کوئی جواز نہیں تھا کہ اینجلا کی گمشدہ ہیرے کی انگوٹھی کے لیے تمہاری یا تمہاری رہائش گاہ کی تلاشی لے سکوں۔ لیکن اس بارے میں مجھے کامل یقین تھا کہ اگر میرا شبہ درست ہے تو تم اینجلا کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے لیے قدم ضرور اٹھاؤ گے۔ سو میں نے تمہاری نگرانی شروع کر دی۔ پھر کچھ دیر پہلے جب تم اسپتال کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئے تو ہم نے اسی لمحے اینجلا کو اس کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔“

”تم واقعی بہت چالاک ہو۔“ ڈین نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ اینجلا نے 911 کے آپریٹر کو فون پر کوئی کارآمد بات بتائی تھی۔ تم دن میں خواب دیکھ رہی ہو۔ میں کوئی لیفٹیننٹ نہیں ہوں ...... کبھی ملٹری میں نہیں رہا۔“

اس بات پر سارجنٹ مارٹینیز نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بولی۔ ”اینجلا نے اپنے حملہ آور کو لیفٹیننٹ نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا لیو ٹینیٹ (Leo Tenent) یعنی لیو کا کرایہ دار!“

میں نے کبھی نیٹ چیٹنگ نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت ہی نہیں لیکن لوئیس بروکس میں نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ میں پہلی ملاقات میں ہی اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس سے میرا رابطہ کس طرح ہوا؟ یہ آگے چل کر بتاؤں گا۔ فی الحال تو یہ سن لیجیے کہ ہماری گفتگو کس طرح شروع ہوئی اور یہ سلسلہ کس انداز میں آگے بڑھا۔ میں نے اپنے آپ کو رومانٹک کے فرضی نام سے متعارف کراتے ہوئے لکھا۔

”میری عمر چالیس سال ہے اور میں ایک حساس آدمی ہوں۔ مجھے موسیقی، شاعری اور فلموں سے دلچسپی ہے۔ وکیل

نیٹ چیٹنگ سے پبلک چیٹنگ تک ایک دلچسپ ماجرا

تنویر ریاض

بھیس بدل کر بھید پالینا کبھی آسان تھا مگر آج کل لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ کبھی کسی کی مشابہت شبہات کے دروازوں پر دستک دیتی ہے تو کبھی کسی کی حماقت ہی قابلیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس رنگ بدلتی دنیا پر بھلا کوئی کیسے اعتبار کر سکتا ہے، جبکہ اعتبار بھی بار بار ڈسنے والا ہو تو محتاط رہنا ہی بھلا ہوتا ہے۔

ہوں اور تنہا رہتا ہوں۔ اب میں شدت سے کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جو مجھے سچی محبت اور عزت دے سکے۔ رومانٹک۔''

میں ایک ہفتے تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا' جب میری مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو اس کا جواب آ گیا۔

''ڈیئر رومانٹک! تمہاری طرح میں بھی کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جو خود مختار ہو اور مجھے بھرپور محبت دے سکے۔ مجھے بھی موسیقی، شاعری اور خاص طور پر فلمیں بہت پسند ہیں۔ اپنے بارے میں کچھ اور بتانا چاہو گے۔ لوئیس بروکس''۔

''ڈیئر لوئیس بروکس، میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے کوئی مالی پریشانی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اپنی آئیڈیل لڑکی نہیں ملی۔ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں آئیڈیل ملنا مشکل ہے۔ یہ سب رومانوی باتیں ہیں لیکن میں اس فلسفے کو نہیں مانتا اور مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل مجھے میرا آئیڈیل ضرور مل جائے گا۔ اسی لیے میں اپنے آپ کو رومانٹک کہتا ہوں۔ کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم نے اپنے لیے لوئیس بروکس کے نام کا انتخاب کیوں کیا؟''

''ڈیئر رومانٹک! اگر تم فلمیں دیکھتے ہو تو جانتے ہو گے کہ لوئیس بروکس خاموش فلموں کے دور کی ایک خوب صورت اداکارہ تھی۔ ایک دن میرے ایک بوائے فرینڈ نے مجھے اس کی تصویر دکھائی۔ اس کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ وہ تصویر آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ مجھے اس کے چہرے پر کچھ پراسراریت سی محسوس ہوئی، جبکہ اس کے برعکس میں ایک کھلی کتاب کے مانند ہوں، میں نے بھی اب تک شادی نہیں کی اور تمہاری طرح اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھے مل ہی جائے گا۔ کیا پتا وہ تم ہی ہو۔ ایک بات پوچھوں، کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے؟ لوئیس بروکس۔''

''ڈیئر لوئیس! میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم سوچو گی کہ میں تمہیں جانتا تک نہیں پھر ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کر رہا ہوں؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں بہت دور تک ساتھ چل سکتے ہیں۔ کیا تم اس بارے میں سوچنا پسند کرو گی؟ رومانٹک!''

''ڈیئر رومانٹک! تم نے مجھے کس الجھن میں ڈال دیا۔ میں بہت شرمیلی لڑکی ہوں اور پہلی بار کسی مرد سے نیٹ چیٹنگ کر رہی ہوں، میں نہیں جانتی کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ماں کو پتا نہ چل جائے۔ وہ تو میرا جینا عذاب کر دے گی۔''

''ڈیئر لوئیس! میں بھی تمہاری طرح شرمیلا ہوں اور میری زندگی میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس طرح نیٹ کے ذریعے چیٹنگ کر رہا ہوں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے اور میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں کا ساتھ خوب رہے گا۔ کیا میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟ مجھے امید ہے کہ تمہاری ماں مجھے پسند کرے گی۔ رومانٹک۔''

''ڈیئر رومانٹک! میرے گھر پر تو یہ ملاقات ممکن نہیں۔ اگر کہو تو میں تمہارے گھر آ جاؤں۔ تم مجھے اپنا پتا بتا دو۔ میں کل شام تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تمہاری لوئیس۔''

''ڈیئر لوئیس! مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ میرا پتا بہت آسان ہے۔ میں گوس مونیٹرو میں واقع ایک چار منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر رہتا ہوں۔ اس عمارت کی ہر منزل پر صرف ایک ہی اپارٹمنٹ ہے۔ تم انٹر کام کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دے دینا۔ میں بٹن دبا دوں گا۔ مجھے تمہارا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گی۔ رومانٹک۔''

میں سارا دن بے چین رہا اور جیسے جیسے ملاقات کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے استقبال کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔ پورے اپارٹمنٹ کی صفائی کی۔ گل دانوں میں تازہ پھول سجائے۔ سارے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کی اور کچن میں جا کر تمام برتن دوبارہ دھوئے۔ پھر فریج کھول کر دیکھا کہ اس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان لے آیا تھا جبکہ کیبنٹ میں عمدہ شراب کا ذخیرہ پہلے سے موجود تھا۔ خدا خدا کر کے اس کے آنے کا وقت قریب آیا تو میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی پھر انٹر کام پر اس کی دلکش آواز سنائی دی۔

''لوئیس۔''

میں نے انٹر کام کا بٹن دبا دیا۔ کچھ دیر بعد میرے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

وہ گوری چٹی، قبول صورت عورت تھی جس کے بالوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر لگتا تھا کہ انہیں خضاب سے رنگا گیا ہے۔ اس نے ایک چست سامنی اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی خوب صورت گوری ٹانگیں نمایاں ہو گئی تھیں۔ میں قدامت پسند شخص ہوں۔ اس لیے مجھے اس کا یہ لباس پسند نہیں آیا۔ میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ اس نے ایسے لباس کا انتخاب کیوں کیا' شاید اس طرح وہ مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ آ ہی گئی تھی تو میں اسے دھکے دے کر باہر نہیں نکال سکتا تھا لہٰذا دل پر جبر کر کے کہنا پڑا۔

''براہ مہربانی۔ اندر آ جاؤ۔''

میرے سامنے وہ عورت کھڑی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ اتنی جلدی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کس قماش کی عورت ہے۔ وہ لہراتی ہوئی اندر آئی تو میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''تمہارا اپارٹمنٹ بہت خوب صورت ہے۔'' وہ چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے بولی۔ ''کیا یہ تمہارا اپنا ہے؟''

''نہیں۔ یہاں میں کرایہ پر رہتا ہوں۔ میرا اپنا اپارٹمنٹ بارہ میں ہے۔''

''میرا اصلی نام ڈیانا ہے۔''

''اور مجھے کارلوس کہتے ہیں۔'' میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ویسے تم بھی شہزادی ڈیانا سے کم نہیں ہو۔''

''یہ مردوں کی پرانی عادت ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''عورت کی چھوٹی سی تعریف کر کے اسے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمہیں پہلی نظر میں ہی پسند کر چکی ہوں۔''

''میرا بھی یہی حال ہے۔'' میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا۔ تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔''

''اگر کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو کبھی یقین نہیں کرتی لیکن تم کہہ رہے ہو تو مان لیتی ہوں۔'' اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ لوئیس بروکس کی وہی تصویر ہے جس کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا۔ میں تمہیں ہی دکھانے کے لیے لائی ہوں۔''

وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس کا رنگ گورا اور بال غیر معمولی طور پر سیاہ تھے۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔

''کچھ پینا پسند کرو گی؟''

''بس تھوڑی سی وہسکی۔''

میں کیبنٹ سے وہسکی اور منرل واٹر کی ایک ایک بوتل اور ٹرے میں تھوڑی سی برف لے کر آ گیا۔

''میں برف کے بغیر ہی وہسکی میں پانی ملا کر پیتا

دلچسپ معلومات

☆ دنیا کے سارے دریا روزانہ کروڑوں ٹن نمک زمین سے چوس کر سمندر میں پھینکتے ہیں۔

☆ اگر سمندر کے پانی میں نمک نہ ہوتا تو ہم بارش جیسی نعمت سے محروم ہوتے۔

☆ ایک سیکنڈ میں مجموعی طور پر 15 ارب ٹن پانی بخارات بن کر ہوا میں اڑتا ہے۔

☆ ایک چمچ شہد میں 2 لاکھ پھولوں کا رس ہوتا ہے۔

☆ ایک پاؤنڈ شہد بنانے کے لیے شہد کی مکھی 35 لاکھ دفعہ اڑتی ہے اور 50 ہزار کلومیٹر کا سفر کرتی ہے۔

☆ دس کروڑ چیونٹیوں کا اگر نروس سسٹم نکال کے تول لیا جائے تو اس کا مجموعی وزن 20 گرام بنتا ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی کتاب تین ہزار قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب ''رگ وید'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ میں لکھی گئی تھی۔

مرسلہ: سلمان خان، ضلع بونیر

****

گر کی باتیں

ایک آرٹسٹ سے دل کے دروازے کی تصویر بنانے کو کہا گیا اور اس نے بہت حسین گھر بنایا اور اس میں چھوٹا سا خوب صورت دروازہ لگایا، لیکن اس کا ہینڈل نہیں تھا۔

کسی نے پوچھا کہ ہینڈل کیوں نہیں لگایا۔

تو اس نے بڑی خوب صورت بات کہی۔

''کہ دل کا دروازہ اندر سے کھولا جاتا ہے باہر سے نہیں۔''

☆☆☆☆

کسی کی مدد کرتے وقت اس کی آنکھوں میں نہ دیکھو ورنہ ہو سکتا ہے اس کی آنکھوں میں موجود شرمندگی تمہارے دل میں غرور پیدا کر دے۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

ہوں جس میں وہسکی کی مقدار زیادہ اور پانی کی کم ہوتی ہے۔'' میں نے گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

''میرے گلاس میں برف ضرور ڈالنا اور بہت سا پانی بھی۔''

میں نے دو گلاس تیار کیے اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ وہ بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی پھر اچانک ہی بے تکلف ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے حصے میں جا کر مختلف کیبنٹ دیکھنے لگا۔ وہاں مجھے بسکٹ کے کچھ پیکٹ نظر آئے۔ میں نے ان میں سے ایک اٹھایا اور دوبارہ اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری دوستی کے نام۔ امید ہے کہ یہ تعلق دیرپا ثابت ہوگا جیسا کہ تم نے اپنی ای میل میں کہا تھا۔''

میں نے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور بولا۔ ''اسے پینے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کچن میں سے کچھ نمکین چیزیں بھی لے آؤں۔ اس وقت میں جلدی میں صرف بسکٹ ہی اٹھا لایا تھا۔''

یہ کہہ کر میں کچن میں چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے ہاتھ میں اسنیکس کی پلیٹ تھی پھر میں نے اپنا گلاس اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''دیرپا تعلق کے نام۔''

لوئیس نے مسکراتے ہوئے اپنا گلاس میرے گلاس سے ٹکرایا اور بولی۔ ''چیئرز۔''

ہم دونوں مشروب پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا باپ مر چکا ہے اور وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رشتے دار نہیں۔ اس کی ماں ایک سخت مزاج عورت ہے اور اس پر بہت سختی کرتی ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کسی سے مل سکتی ہے اور نہ ہی کہیں جا سکتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے یہاں آئی تھی۔

میں نے بھی اسے اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ کہ میری چار بڑی بہنیں ہیں۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اپنی زندگی گزار رہی ہیں۔ صرف میں ہی تنہا رہ گیا ہوں اور جلد از جلد اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر پیرس یا نیویارک جانا چاہتا ہوں۔ اس سفر کے لیے میں نے خاصی رقم بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ کھٹمنڈو جانا چاہتی ہے۔ اسے ایشیائی شہر بہت پسند ہیں۔

باتیں کرتے کرتے مجھے کچھ خیال آیا اور میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''پانی ختم ہو گیا ہے، میں کچن سے دوسری بوتل لے کر آتا ہوں۔''

کھڑے ہوتے ہی میں بری طرح لڑکھڑایا اور میں نے جلدی سے کرسی کی پشت کا سہارا لے لیا۔

''لگتا ہے کہ مجھے چکر آ رہے ہیں۔''

وہ مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''واقعی تمہیں چکر آ رہے ہیں یا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں سہارا دوں؟''

پھر وہ مجھ پر جھکتے ہوئے بولی۔ ''فکر نہ کرو۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

اس نے سہارا دے کر مجھے صوفے پر بٹھایا لیکن فوراً ہی میرا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

''کارلوس، کارلوس! تم ٹھیک تو ہو۔'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر اس نے میرا بازو ہلایا اور بولی۔ ''کارلوس! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

میں پھر بھی خاموش رہا۔ پھر مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بیڈروم کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ لاک تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری جیبوں کی تلاشی لے رہی ہو پھر مجھے اس کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ سیل فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

''ایگور! وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی تمام قیمتی اشیا دوسرے کمرے میں بند ہیں۔ تم فوراً آ جاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ یہاں کا پتا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہاں پہنچ کر انٹرکام بٹن دبا دینا میں دروازہ کھول دوں گی۔''

میں صوفے پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا لیکن سب آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انٹرکام پر ایگور کی آواز سنائی دی۔

''اوپر چلے آؤ۔'' ڈائنا نے انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایگور اندر چلا آیا۔

''کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ اب تک تو سب ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمام نقدی اور قیمتی اشیا اس کے بیڈروم میں ہیں۔ میں نے اس کی چابی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ملی۔''

''تم نے اس کی جیبیں دیکھیں؟''

''ہاں۔ اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔ کسی جیب میں بھی چابی نہیں ہے۔''

''پھر تو کمرے کا دروازہ ہی توڑنا پڑے گا۔'' ایگور بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچتا۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے جو میرے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو نشانے پر لیتے ہوئے فرش پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ اپنے ہاتھ پشت پر کر لیں۔ جیسے ہی ان دونوں کو ہتھکڑی لگی میں صوفے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مارٹا کاسترو اور ایگور ڈی سلوا۔ تم دونوں کو ایڈورڈ گوریا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔''

وہ ایک دوسرے پر الزام لگانے لگے۔ ایگور کا کہنا تھا کہ مارٹا نے ہی اسے ایڈورڈ کو قتل کرنے پر مجبور کیا تھا جبکہ مارٹا اپنی صفائی میں کہہ رہی تھی کہ اس نے ایگور کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر قیمت پر ایڈورڈ کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''تم نے ایڈورڈ کو قتل کیا ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔'' مارٹا ہذیانی انداز میں بولی۔

''بدمعاش عورت اتم نے ہی مجھے اسے قتل کرنے پر اکسایا تھا۔'' ایگور نے جواب دیا۔

ان دونوں کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ وہاں بھی ان کے درمیان یہی تکرار جاری رہی۔ قتل کا معاملہ تھا۔ اس لیے ان کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انہیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں عمر قید کی سزا ہو جائے گی۔ جب مارٹا کو حوالات میں بند کیا جا رہا تھا تو وہ مجھ سے بولی۔

''میں نے تمہارے گلاس میں بے ہوش کر دینے والی دوا کی اچھی خاصی مقدار ڈالی تھی۔ اس کے باوجود تم بے ہوش نہیں ہوئے۔''

''مجھے شبہ تھا کہ تم ضرور کوئی نہ کوئی حرکت کرو گی۔ اس لیے میں اسنیکس لینے کے بہانے اپنا گلاس ہاتھ میں پکڑے پکڑے کچن میں چلا گیا اور وہاں سے دوسرے گلاس میں وہسکی ڈال کر لے آیا۔''

''لیکن تم نے میرا پتا کیسے چلایا؟''

''ایک سراغ رساں کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ جب میں نے ایڈورڈ گوریا کا کمپیوٹر ریکارڈ چیک کیا تو اس کے ای میل باکس سے مجھے تمہارا نام اور ای میل ایڈریس مل گیا۔ تم اس سے بھی لوئیس بروکس کے نام سے چیٹنگ کرتی تھیں۔ تمہیں کم از کم اپنا نام تو بدل لینا چاہیے تھا۔''

وکٹ کیپر اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار تھا اور کیپٹن کی بات نہیں مانتا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے؟'' اس نے کہا۔ ''دو کھلاڑیوں کو فوراً ٹیم سے نکال باہر کرنا چاہیے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' کیپٹن سرد لہجے بولا۔ ''تم دوسرے کا نام بتاؤ۔''

کرکٹ کے دو عمر رسیدہ کھلاڑی ایک کلب میں محو گفتگو تھے۔

''تمہارا سب سے زیادہ اسکور کیا ہے؟''

''ایک سو دس رن ناٹ آؤٹ۔''

''میرا سب سے زیادہ اسکور ایک سو بیس رن ناٹ آؤٹ اور ایک اننگ میں زیادہ سے زیادہ وکٹوں کی تعداد؟''

''اوہ نہیں، اس بار پہلے تم بتاؤ۔''

''لیکن یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اسے ہم دونوں نے قتل کیا ہے؟''

''قاتل خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو۔ اپنے پیچھے کئی ثبوت چھوڑ جاتا ہے۔ تم ایڈورڈ سے نیٹ چیٹنگ کرتی رہیں۔ پھر جب اس نے تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کے گھر پہنچ گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے پاس آئی تھیں۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے میرے ساتھ ہوا پھر تم نے اس کے بیڈروم سے نقدی اور زیورات سمیٹے اور وہاں سے فرار ہونے ہی والی تھیں کہ اسے ہوش آ گیا۔ اس نے تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو ایگور نے تمہارے کہنے پر بے آواز پستول سے اس پر فائر کر دیا۔ اس کے گھر سے ہم نے تم دونوں کے قدموں اور انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے ہیں اور تمہیں مجرم ثابت کرنے کے لیے یہی ثبوت کافی ہیں۔ ہاں اگر تم اپنا نام بدل لیتیں تو شاید میں تم تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔''

''مجھے اس نام سے جذباتی لگاؤ ہے۔ میں اس جیسی ہی بننا چاہتی ہوں۔ سچ سچ بتاؤ، کیا میری شکل اس سے نہیں ملتی؟''

''ہاں۔ بہت زیادہ۔'' میں نے اعتراف کیا۔

واقعی مارٹا فلم ایکٹریس بن سکتی تھی لیکن اب شاید اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے۔ اگر اسے پیرول پر رہائی مل گئی تب بھی بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

عائشہ فاطمہ

قرض مسافت

سیانے کہتے ہیں... طوائف جب کسی مرد کی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اس کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی... جہاں کی راتیں انگڑائی لے کر جاگتی ہوں، ساز کی آواز پر گھنگرو کھنکتے ہوں اور نظروں کی کاٹ دلوں میں تلاطم برپا کرتی ہو وہاں جذبات کی ہلچل چین لینے دیتی ہے نہ ہی مزاج کی آوارگی درست سمت میں چلنے دیتی ہے۔ یونہی تو وہ بھی دربہ درمحو سفر نہیں تھا... جانے کس مسافت کا قرض ادا کر رہا تھا... وہ جو شبنم کی بوندوں کے مانند نرم تھی، آج سراپا انتقام بن کر بستی بستی اس کے تعاقب میں بھٹکتی پھر رہی تھی... وہ جو ایک خوشگوار جھونکے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک تیز آندھی بن کر زندگی کی ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ چھوڑا۔ ان بگولوں کی زد پر جانے کتنے چراغ بھڑک رہے تھے مگر... ان کی تھرکتی روشنی میں اسے صرف اپنے خوابوں کی کرچیاں دکھائی دے رہی تھیں، جن پر ناچتے ناچتے اس کے پیر لہولہان تھے لیکن جوش انتقام نے اس کے خوابوں کی طرح گھنگروؤں کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ حتیٰ کہ نفرت کا الاؤ سرد ہونے سے پہلے ہی اس کی بے ترتیب کہانی کو انجام مل گیا... جس کے ہراساں کردار بالآخر اخبار کی ایک بڑی سرخی میں ڈھل گئے... سیانے سچ ہی کہتے ہیں... طوائف موت سے قبل پیچھا نہیں چھوڑتی... خواہ اپنی موت ہو یا اپنے چاہنے والے کی... انتقام کے اندھیرے میں لہو کے دیے روشن کرنا پڑتے ہیں۔

رنگین لمحات میں حسین چہروں کے بدلتے رنگ اور...... سنگین واردات قلبی کا شاخسانہ

احمد علی کا شمار ان خوش نصیبوں میں ہوتا تھا جو دین اور دولت دونوں ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہزار گز کی کوٹھی میں مقیم تھے لیکن قبر کی دو گز زمین کو نہیں بھولے تھے۔ کاروباری آدمی تھے لیکن اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح کاروباری سیاست اور بے ایمانی سے کوسوں دور تھے۔ خدا نے برکت بھی شاید اسی لیے دی تھی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے مٹی کو سونا بنا کر اٹھتے۔ تجارتی حلقوں میں ان کی عزت بھی تھی اور شہرت بھی۔

اس اعتبار سے بھی خوش قسمت تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیک اولاد سے نوازا تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جو نئے زمانے کے ساتھ چل ضرور رہی تھیں لیکن اس مادر پدر آزادی سے دور تھیں جس کے نمونے دولت مند گھرانوں میں دیکھے جا سکتے تھے۔ ایک بیٹا تھا جسے انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور اب وہ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بیٹیاں تو خیر پرایا دھن ہوتی ہیں لیکن انہیں اپنے اکلوتے بیٹے سرفراز علی سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ضرورت سے زیادہ پھیلا ہوا کاروبار اسی کا تو تھا اور اسی کو اس کاروبار کی حفاظت کرنی تھی۔ سرفراز علی کی سعادت مندی اور قابلیت صاف بتا رہی تھی کہ وہ ان کی امیدوں پر پورا اترے گا۔

احمد علی اس جنت میں آباد بھی تھے اور خوش بھی کہ ایک روز ایک چنگاری نے ان کے اعتماد کی فصل کو جلا ڈالا۔ انہیں خبر ملی کہ سرفراز علی کا ایک طوائف ستارہ بائی کے گھر آنا جانا

ہے۔ یہ ایسی اطلاع نہیں تھی جسے وہ آسانی سے برداشت کر لیتے۔ سنتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''یاالٰہی! میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی جو یہ خبر سننے کو ملی ہے۔'' وہ اسی وقت دفتر سے اٹھے اور اپنی بہن مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گئے۔ مخدومہ جہاں خاندان میں سب سے بڑی بھی تھیں اور نہایت سمجھ دار بھی۔ واجبی سی پڑھی لکھی تھیں لیکن مسائل کی نبض پر ایسا ہاتھ تھا کہ ان کے مشورے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ احمد علی تو ان کے ایسے معتقد تھے کہ کاروباری معاملات میں بھی ان سے مشورہ لے کر قدم اٹھاتے تھے۔

مخدومہ جہاں ابھی نماز ظہر پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں کہ ملازمہ نے احمد علی کے آنے کی خبر پہنچادی۔ یہ کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی کہ وہ پریشان ہوجاتیں۔ احمد علی خلاف معمول اس وقت آئے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ان کے لیے وقت کی کوئی پابندی تھی۔ بھائی تھے، کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ مخدومہ جہاں جیسی بیٹھی تھیں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

''احمد علی خیریت تو ہے۔ اس وقت تو تمہیں اپنے آفس میں ہونا چاہیے تھا۔''

''بات ہی ایسی تھی کہ مجھے اس وقت آنا پڑا حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت آپ آرام کرتی ہیں۔''

''میرے آرام کو چھوڑو۔ تم بتاؤ بات کیا ہے۔ یہ صورت سے بھی کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''آپ سنیں گی تو آپ بھی پریشان ہوجائیں گی۔ سرفراز علی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

''ایسا کیا کردیا اس نے۔ مجھے تو اس سے ایسی ویسی امید نہیں۔''

''امید تو مجھے بھی نہیں تھی لیکن اس نے وہ کیا ہے جو ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کیا۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی طوائف کے پاس جانے لگا ہے۔ اب میں آپ کے پاس مشورے کے لیے آیا ہوں کہ اس مردود کے ساتھ میں کیا سلوک کروں۔''

''احمد علی، تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ جوان بچہ ہے ایسی غلطی اس عمر میں ہو ہی جاتی ہے۔ اب تمہیں عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔''

''آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ کیسے پیچھا چھڑاؤں اس نامعقول طوائف سے سرفراز علی کا۔''

''اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ سرفراز سے بھی نہیں۔ یوں بنے رہو جیسے تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔''

''اس سے کیا ہوگا۔ وہ اس طوائف کے پاس جانا چھوڑ دے گا؟''

''اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ اس وقت تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔''

''باجی، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ سرفراز کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ یہ کیسے ہوگا؟''

''بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ ابھی میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو۔'' احمد علی چپ ہوگئے۔ اس کے بعد کچھ نہیں بولے۔ تھوڑی دیر بیٹھے پھر اٹھ کر چلے آئے۔

☆☆☆

احمد علی کی بیوہ بہن لندن سے کراچی مستقل قیام کے لیے آرہی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ کچھ دن وہ احمد علی کے پاس رہیں گی پھر اپنی رہائش کا الگ بندوبست کرلیں گی۔ اس عرصے میں ان کا بیٹا بھی اپنی تعلیم مکمل کرکے امریکا سے واپس آچکا ہوگا۔

سلطانہ جہاں پورے پندرہ سال بعد واپس آرہی تھیں۔ ان کا بیٹا علی بارہ سال کا اور بیٹی فرزانہ پانچ سال کی تھی۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان چھوڑ دیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے شوہر کا کاروبار وائنڈ اپ کیا اور اب پاکستان آرہی تھیں۔

احمد علی اپنی بہنوں سے بہت محبت کرتے تھے اور سلطانہ جہاں تو بیوہ ہوگئی تھیں۔ محبت کے ساتھ ہمدردی بھی شامل ہوگئی تھی۔ انہی کے مشورے سے وہ پاکستان آبھی رہی تھیں۔

سلطانہ جہاں کا خط ملتے ہی احمد علی نے تیاریاں شروع کردی تھیں۔ کوٹھی کا اوپری حصہ نوکروں کے سپرد کردیا تھا کہ جلد سے جلد صفائی ستھرائی مکمل کرلیں۔ جس روز فلائٹ تھی اس روز احمد علی کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سرفراز علی سے ایک دن پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ائرپورٹ چلے گا حتیٰ کہ ان کی بیگم جو بیمار چلی آرہی تھیں انہیں بھی حکم ہوا کہ وہ بھی ائرپورٹ چلیں گی۔ وہ کہتی ہی رہ گئیں کہ سلطانہ کو آنا تو یہیں ہے میں یہاں مل لوں گی لیکن احمد علی نے انہیں گاڑی میں بٹھا ہی دیا۔ یہ قافلہ ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

ائرپورٹ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سرفراز کی اکتاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے اس وقت ستارہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ ستارہ کو اس نے ایک جگہ شام کی چائے پر بلایا تھا۔ باپ سے کچھ کہہ نہیں سکا تھا اور اب پرواز میں تاخیر

ہو رہی تھی۔ لگتا تھا شام یہیں ہوجائے گی۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر باپ سے کوئی بہانہ کرنا چاہا تاکہ واپسی کا موقع مل سکے لیکن اسی وقت اعلان ہوگیا کہ پرواز کی آمد ہوچکی ہے۔ اب ہر بہانہ بے کار تھا۔ اسے بھی دوسروں کی طرح انتظار کرنا تھا کہ سامان کی کلیرنس وغیرہ کے بعد ان کی ملاقات ہونے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان کی بیٹی فرزانہ کا خیال بھی آیا۔ اس کا ہلکا سا عکس اب بھی اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہ پانچ چھ سال کی ہوگی جب لندن گئی تھی۔

وہ ابھی ان خیالوں میں گم تھا کہ احمد علی نے سب کی توجہ سلطانہ جہاں کی طرف مبذول کرائی۔ نگاہیں اٹھی تھیں کہ سلطانہ جہاں اور فرزانہ دوسرے مسافروں کے ساتھ دروازے سے باہر آئیں۔ ان کی نظروں نے بھی بھائی کو تلاش کرلیا۔ گلے مل کر دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان آئی تھیں۔ یہ آنسو فطری تھے۔ بیوگی کا سارا دکھ ان آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلا تھا۔ بھائی سے جدا ہوئیں تو باری باری سب کو گلے سے لگایا۔ فرزانہ احمد علی کی دونوں بیٹیوں سے گپ شپ میں مشغول ہوگئی تھیں۔

سرفراز کو ان مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ فرزانہ کی مسحور کن شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے براؤنش بال اس کی کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ جینز اور شرٹ میں بے حد متاثر کن لگ رہی تھی اور جب سلطانہ جہاں نے اس کا تعارف سرفراز سے کرایا تو وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

''یہ فرزانہ ہے، تمہیں یاد تو ہوگا؟''

''پھوپی جان، مجھے کچھ کچھ یاد تو آرہا ہے لیکن اگر آپ نہ بتاتیں تو میں پہچان نہیں سکتا تھا۔''

''تم بھی تو بدل گئے ہو۔ پندرہ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔'' فرزانہ کو تو وہ بالکل بھی یاد نہیں تھا۔ ایک آدھ تصویر دیکھ لی ہو تو الگ بات ہے ورنہ پانچ سال کی بچی کو کیا یاد رہتا ہے۔

''اب کیا ساری باتیں یہیں کرلوگی۔ کچھ باتیں گھر کے لیے بھی بچا کر رکھو۔'' احمد علی نے یاد دلایا کہ دیر ہورہی ہے۔ سرفراز علی ابھی تک اکتایا ہوا تھا۔ اسے ستارہ سے ملنے کی جلدی ہورہی تھی۔ جب سے وہ اس سے ملا تھا یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس کے گھر سے باہر اس سے مل رہا تھا اور آج ہی یہ رکاوٹیں درمیان میں آگئی تھیں۔ جلدی جلدی سامان گاڑیوں میں رکھا گیا اور یہ قافلہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔

مخدومہ جہاں بھی احمد علی کے گھر ہی پہنچ گئی تھیں۔ کب کب کی باتیں کس انداز سے ایسی چھیڑیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ باتوں کے درمیان سرفراز کا ذکر آیا تو اسے بلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پوری کوٹھی چھان ماری۔ اس کی خوشبو بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گیا تھا۔ احمد علی نے پھر خود ہی بہانہ کردیا کہ ایک بزنس میٹنگ تھی وہ وہاں چلا گیا ہوگیا۔ انہوں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا تھا لیکن انہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہوگا۔ وہ اپنی بہن مخدومہ جہاں کو ایک طرف لے گئے اور اپنی تشویش سے انہیں آگاہ کیا۔

''باجی، آپ دیکھ رہی ہیں سرفراز علی کس طرح میری ناک کٹانے پر تلا ہوا ہے۔''

''اب کیا ہوگیا؟''

''گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں اور وہ غائب ہے۔''

''تم نے خود ہی تو بتایا ہے کہ وہ کسی بزنس میٹنگ میں ہے۔''

''اور کیا کہتا، سب کو بتاتا کہ وہ کسی طوائف سے ملنے جاتا ہے، وہیں گیا ہوگا۔ کوئی میٹنگ نہیں تھی۔ وہ اسی طوائف کے گھر گیا ہوگا۔ آپ نے مجھے روک دیا ہے ورنہ میں اس طوائف کے پر بھی کاٹ دیتا اور سرفراز کے پیروں میں زنجیریں بھی ڈال دیتا۔''

''احمد علی! سرفراز جس کا قیدی ہے وہ عورت نہیں طوائف ہے۔ طوائف کا نشہ والدین کی سختی سے نہیں اترتا۔ مصلحت سے اترتا ہے۔ سختی کروگے تو بیٹا ہاتھ سے چلا جائے گا۔''

''وہ میری نرمی کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے۔''

''سختی کا فائدہ تمہیں نہیں پہنچے گا۔''

''تو کیا خاموش بیٹھا رہوں۔ گھر میں سلطانہ اور اس کی بیٹی آگئی ہیں۔ انہیں کب تک معلوم نہیں ہوگا کہ صاحبزادے کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔''

''کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ آگے آگے دیکھتے جاؤ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی تو میں نے پہلا قدم اٹھایا ہے کہ سلطانہ یہاں آگئی ہے۔ آگے کیا کرنا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔'' احمد علی کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آیا لیکن بہن کے ادب میں کچھ نہ کہہ سکے۔

☆☆☆

شہر کے ایک پر رونق اور مشہور ریسٹورنٹ میں ستارہ اور سرفراز آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ستارہ کو اس وقت طوائف کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا عبایا پہنا ہوا تھا۔ شاید یہ اہتمام اس لیے تھا کہ پہچانی نہ جائے۔

''تم جانتی ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''میں خود حیران ہوں۔ میرے گھر میں تنہائی کا ایسا کون سا موقع ہے جو آپ کو نہیں ملتا ہے پھر یہاں اس بھرے ریسٹورنٹ میں آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟''

''میں جو بات پہلی مرتبہ تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ تمہارے گھر پر نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ گھروں کی باتیں کوٹھوں پر نہیں کی جاتیں۔''

''اس کوٹھے پر آپ بڑے شوق سے آتے رہے ہیں۔''

''میں تماش بین کی حیثیت سے آیا کرتا تھا جہاں ستارہ نام کی ایک طوائف کو میں پسند کرنے لگا تھا۔ اب میں صرف ستارہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تمہیں اس ریسٹورنٹ میں بلایا ہے۔''

''میں پوچھ سکتی ہوں، ستارہ سے آپ کو کیا کام آن پڑا ہے؟''

''میں تمہیں طوائف سے لڑکی بنانے کا خواہاں ہوں۔ یہ احساس دلانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ تمہارے کوٹھے سے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ سننے کے لیے میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔ میں خود بھی اپنی موجودہ زندگی سے بے زار ہو چکی ہوں لیکن آپ اس کام کو جتنا آسان سمجھ رہے ہیں یہ کام اتنا آسان ہے نہیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ میں جس معاشرے میں ہوں وہاں شادی کا مطلب بربادی ہوتا ہے۔ ان سب کی بربادی جنہیں میرے پیروں میں بندھے گھنگرو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے جسم کی گرمی سے میرے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ میری ماں جسے عرفِ عام میں نائکہ کہا جاتا ہے میری کمائی پر عیش کرتی ہے۔ سازندوں کی ٹولی، نوکر چاکر سب کے سب اجڑ جائیں گے میری شادی سے۔''

''تو کیا ان سب کی خاطر تم میری محبت ٹھکرا دو گی؟''

''نہیں سرفراز نہیں۔ میں تو محبت سے آگے بڑھ کر تمہیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی ہوں۔ میں تو صرف یہ بتا رہی تھی کہ میری جان سے لپٹے ہوئے یہ لوگ اتنی آسانی سے مجھے آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔''

''میں تمہارے لیے ہر طاقت سے ٹکرا جاؤں گا۔ تمہاری ماں کا منہ بند کرنے کے لیے میرے پاس بہت دولت ہے تم کیوں فکر کرتی ہو۔''

''شریف گھروں میں رہنے والی لڑکیوں کے مقابلے میں ہماری آزادی کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور نائکہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے آپ کو اماں سے بات کرنی ہوگی اور مجھے پکا یقین ہے کہ وہ آپ کو مایوس کر دیں گی۔''

''تم بے زبان نہیں ہو ستارہ۔ کیا تم میری حمایت نہیں کرو گی؟''

''میں صرف اتنا کہہ سکوں گی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔''

''میرے لیے یہی گواہی بہت ہوگی۔ میں عنقریب تمہاری ماں سے بات کروں گا۔''

''نہیں اب چلتی ہوں۔ مجرے کا وقت ہونے کو ہے۔ میں نہیں پہنچی تو قیامت پہنچ جائے گی۔ اماں مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔''

''میں کتنا بدنصیب ہوں مجرے کے لیے خود تمہیں یہاں سے جانے کے لیے کہوں گا۔''

''میرے پاؤں بھی اب اس راہ پر چلنے کو تیار نہیں لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔''

☆☆☆

محفل ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ ستارہ تھکن سے چور اپنے بستر پر اوندھی لیٹی تھی۔ وہ اتنی تھک گئی تھی کہ لباس تو کیا بدلتی گھنگرو اتارنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئی۔ ستارہ کو جیسے ہی احساس ہوا کوئی اس کے بستر پر بیٹھا ہے، وہ سیدھی ہو گئی۔

''اماں، تم کیوں آ گئیں۔ کوئی بات تھی تو نازلی سے کہلوا دیا ہوتا میں آ جاتی۔''

''مجرے کے بعد تم ہمیشہ میرے کمرے میں آتی تھیں۔''

''میں آج بہت تھک گئی تھی۔ میرے پاؤں میرے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔''

''تھکن جسم میں نہیں، روح میں ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ مجرے کے دوران بھی تمہارے پاؤں تمہارا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تماشائی مایوس ہو کر گئے ہیں۔ یہی حال رہا تو فاقوں کی نوبت دور نہیں ہوگی۔''

''اماں میں انسان ہوں کبھی کبھی تھک بھی جاتی ہوں۔''

''طوائف بس طوائف ہوتی ہے۔ نہ انسان ہوتی ہے نہ عورت۔ وہ تھکتی اس وقت ہے جب کچھ اور بننے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ تو کچھ اور بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ سچ سچ بتا تو مجرے سے پہلے کہاں گئی تھی۔ جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ جھوٹ صرف شریفوں میں بولا جاتا ہے اور تو شریف نہیں ہے۔''

''میں سرفراز علی سے ملنے گئی تھی۔''

''یہاں کون سی پابندی تھی جو تجھے باہر جانا پڑا۔ وہ یہاں دن کے وقت بھی آتا ہے۔ میں نے کبھی پابندی نہیں لگائی۔ ان رئیس زادوں کے دم سے ہی ہماری دنیا آباد ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے حکم پر چلا جائے۔ انہیں ان کی اوقات پر رکھا جائے تو یہ ٹھیک رہتے ہیں۔''

''وہ ایک ایسی بات مجھ سے کہنا چاہتا تھا جو اس گھر میں نہیں کہی جا سکتی تھی۔''

''ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے؟''

''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی کہ ستارہ کی ماں سناٹے میں آ گئی۔ خود ستارہ شدید ردعمل کے انتظار میں تھی۔

''ذرا پھر سے کہہ اس نے کیا بات کرنے کو تجھے بلایا تھا؟''

''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''طوائف کے لیے شادی کا لفظ گالی سے کم نہیں ہوتا۔ تو نے یہ گالی سنی کیسے؟''

''اب تو اس گالی ہی میں میری نجات ہے۔''

''کوٹھوں پر آنے والی براتوں کا انجام تو جانتی ہے؟ دور کیوں جاتی ہے اسی بازار کی ایک لڑکی گلنار تھی۔ وہ بھی اس طرح اپنے نجات دہندہ کے ساتھ بھاگی تھی۔ اسی نجات دہندہ نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا۔ مجھے تیرے انجام سے ڈر لگتا ہے۔''

''ضروری نہیں تیزاب کی کوئی بوتل میرے لیے بھی تیار رکھی ہو۔''

''اگر تجھے اتنا ہی یقین ہے تو سرفراز سے کہنا مجھ سے بات کرے۔'' ستارہ نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کا ردعمل شدید ہوگا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ شادی کا نام سن کر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے اور وہ اس سے کہہ رہی ہیں کہ سرفراز کو ان کے پاس بھیجے۔

''وہ کہہ رہا تھا اس کے گھر کچھ مہمان آ کر ٹھہرے ہیں اس لیے وہ کچھ دن نہیں آ سکے گا۔ مجھے یہ موقع بھی دیا ہے کہ میں اچھی طرح سوچ لوں۔''

''ٹھیک ہے تم اچھی طرح سوچ لو لیکن یہ یاد رکھنا کہ طوائف کو شادی راس نہیں آتی۔ تم سے محبت سرفراز کرتا ہوگا اس کے گھر والوں کو تم سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ آئندہ چل کر جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ سرفراز کو یہ وہم ہمیشہ ستاتا رہے گا کہ تم طوائف کی زندگی گزار چکی ہو۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد ہی شادی کا دم بھرنا۔'' ماں کی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی جسے ستارہ جھٹلا سکتی۔ اس نصیحت میں ان کا تجربہ بول رہا تھا جسے آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

ستارہ کی ماں کا نام افشاں بیگم تھا۔ وہ ہمیشہ سے طوائف نہیں تھیں۔ ان کے شوہر نے ان پر بدچلنی کا الزام لگایا اور چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح انتقام لینے پر تل گئیں۔ انتقام لینے کے کئی طریقے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ اپنے گھر کے دروازے پرائے مردوں کے لیے کھول دیے۔ شوہر کے نام پر اپنی عزت کی دھجیاں بکھیرتی رہیں۔ یہ سوچ کر خوش ہوتی رہیں کہ جس کی بیوی ہیں عزت اس کی خراب ہو رہی ہے۔ ان کا شوہر بھی کوئی ایسا بے حس تھا کہ پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کی دو بیٹیاں بھی ہیں جو ماں کے ساتھ ہیں ان کا انجام اور مستقبل کیا ہوگا۔

افشاں بیگم خوب صورت بھی تھیں اور جوان بھی۔ خریداروں نے گھر دیکھ لیا۔ ان خریداروں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ اس نے افشاں بیگم کو مشورہ دیا کہ شریفوں کے محلے سے طوائفوں کے محلے میں آباد ہو جائیں۔ افشاں بیگم کوئی پیشہ ور خاندانی طوائف نہیں تھیں۔ وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہو رہی تھیں جبکہ اس شخص کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ انہیں ریڈ لائٹ ایریا میں لے جائے۔ اس شخص کا نام لاڈلا تھا اور یہ بازار میں بیٹھنے والی طوائفوں کے لیے کام کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کے پولیس میں بھی بہت تعلقات ہوتے ہیں۔ اس نے پولیس سے مل کر افشاں بیگم کے گھر پر چھاپا ڈلوایا۔ افشاں بیگم اور ان کی دونوں کم سن بیٹیاں تھانے پہنچا دی گئیں پھر یہی شخص ان کا ہمدرد بن کر

تھانے آ گیا اور اپنی ضمانت پر انہیں رہا کرا کے لے آیا۔ اس نے افشاں بیگم کو ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ اگر وہ ان محلوں میں رہی تو اسی طرح پولیس پریشان کرتی رہے گی۔ افشاں بیگم کو ابھی پوری طرح نصیحت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے خوفزدہ ہو کر صرف اتنا کیا کہ شوہر کا گھر فروخت کر کے ایک اور گھر کرائے پر لے لیا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ گھر بدل لینے سے پولیس کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ ایسا ہو بھی جاتا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ لاڈلا برابر ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ لاڈلا نے ایک مرتبہ پھر اپنے تعلقات استعمال کیے اور چھاپا ڈلوا دیا۔ اس مرتبہ پولیس نے کچھ زیادہ ہی چالاکی دکھائی۔ افشاں بیگم کو نہ صرف گرفتار کر کے تھانے لے گئی بلکہ گھر میں رکھے ہوئے زیورات اور نقدی پر بھی ہاتھ صاف کر لیا۔

افشاں بیگم نے چند گھنٹے تھانے میں گزارے تھے اور پولیس والوں کی غلیظ گالیاں سنی تھیں کہ لاڈلا پھر سامنے آ گیا۔ افشاں بیگم کو چھڑا کر لے آیا۔ افشاں بیگم اس کے احسان تلے دب گئی تھیں لیکن وہ اب بھی طوائفوں کے محلے میں جا کر آباد ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

علاقے کا ایس ایچ او ان کے دروازے پر آیا۔ وہ سمجھیں پھر کوئی چھاپا پڑ گیا ہے۔ چھاپا پڑا ضرور تھا لیکن اس مرتبہ افشاں بیگم تھانے نہیں گئیں بلکہ تھانہ ان کے گھر آ گیا۔ ایس ایچ او نے ایسا گھر دیکھا کہ وقت بے وقت چلا آتا تھا۔ افشاں بیگم کو مفت میں اس کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ افشاں بیگم نے لاڈلے سے مشورہ کیا۔ اس نے پھر یہی مشورہ دیا کہ وہ بازار حسن میں کوئی جگہ لے کر رہنے لگیں۔ اس نے وہاں کی آزادی اور بے فکری کا ایسا نقشہ کھینچا کہ افشاں بیگم تیار ہو گئیں۔ لاڈلا کی کوششوں سے ایک مکان مل گیا۔ افشاں بیگم وہاں منتقل ہو گئیں۔ لاڈلا بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

جسم فروش عورتوں کی عزت بازار حسن میں ہی ہوتی ہے اور پھر افشاں بیگم کی عمر بھی اب ڈھلتی جا رہی تھی لہٰذا لاڈلے نے مشورہ دیا کہ افشاں بیگم اپنی دونوں بیٹیوں ستارہ اور نیلما کو موسیقی کی تعلیم دلائے تاکہ جب وہ اپنی عمر کو پہنچیں تو ان کا شمار گانے والی طوائفوں میں ہو۔ افشاں بیگم کو بھی یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ خود جس جہنم سے گزری تھیں، نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں بھی اس دہکتے الاؤ میں جلتی رہیں۔ وہ اس بازار سے واپس تو نہیں جا سکتی تھیں لیکن اتنا تو کر سکتی تھیں کہ پیشے کی نوعیت بدل لیں۔ لاڈلا کی معرفت ایک استاد گھر پر آنے لگا۔ موسیقی کے ساتھ رقص بھی ضروری ہوتا ہے لہٰذا ستارہ اور نیلما رقص بھی سیکھنے لگیں۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ افشاں بیگم کی دونوں بیٹیاں بڑی محنت سے تعلیم حاصل کر رہی تھیں خصوصاً ستارہ بیگم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اسے آواز بھی اچھی ملی تھی اور صورت بھی اللہ نے خوب بنائی تھی۔ سمجھ بوجھ بھی اتنی تھی کہ مشکل سے مشکل دھنیں بڑی آسانی سے ازبر کر لیتی تھی۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ افشاں بیگم نے اپنی پوری جوانی جسم فروشی میں گزاری تھی لیکن نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہاتھ اس کی بیٹیوں کی طرف بڑھے۔ اسے لاڈلے کی طرف سے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا جو بھنورے کی طرح ستارہ کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ وہ اپنے گاہکوں کی موجودگی میں بھی لاڈلے کی طرف سے غافل نہیں رہتی تھی۔ جتنی دیر وہ اپنے کسی گاہک کے ساتھ کمرے میں بند رہتی اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے رہتے کہ لاڈلا کہیں زور زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔

اب وقت اس موڑ پر آ گیا تھا جب ستارہ پہلے مجرے کے لیے تیار تھی۔ رسم کے مطابق پہلا مجرا خاندان والوں کے سامنے ہونا تھا۔ خاندان سے مراد بازار حسن کے وہ تمام لوگ تھے جو اس پیشے سے وابستہ تھے۔ سب کو دعوت نامے بھیج دیے گئے۔ نامی گرامی طوائفیں اس نئے پھول کی مہک کو محسوس کرنے کے لیے افشاں بیگم کے مکان پر جمع ہو گئیں۔ مختلف کوٹھوں کے سازندے بھی بلائے گئے تھے کہ وہ ستارہ بیگم کی قدر و قیمت کی گواہی پیش کریں۔ اس محفل میں کسی تماشائی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے۔ پردوں کو جنبش ہوئی چھم چھم کی آواز نے احساس دلایا کہ قیامت قریب ہے پھر ایک شانِ بے نیازی سے ستارہ محفل میں نمودار ہوئی۔ ایک ایک کی خدمت میں پیش ہو کر فرشی سلام پیش کیا۔ جواب میں دعائیں لیں۔ طبلے پر تھاپ پڑی، سارنگی نے سہارا دیا۔ ستارہ نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر سارنگی کا ساتھ دینا شروع کیا۔ ساتھ میں گھنگروؤں کی آواز شامل ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ستارہ دائرہ سا بنا کر گھومنے لگی۔ یہ دائرہ ٹوٹا تو ستارہ فرش پر تھی۔ گردن اٹھائی تو کسی غزل کے بول اس کے لبوں پر تھے۔ رقص کا انداز سب نے دیکھ لیا تھا۔ اب اس کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ محفل ختم ہوئی تو تجربہ کار طوائفوں کی زبان پر پیش گوئی تھی کہ وہ افشاں بیگم کو سونے کی ترازو میں تول دے گی۔

ان کے یہ تبصرے دل خوش کرنے کے لیے نہیں تھے۔ برسوں کا تجربہ تھا جو بول رہا تھا۔ ستارہ نے جب عام مجروں کا

آغاز کیا تو بازار میں سب کے چراغ گل کر دیے۔ پہلے مجرے کا شور مچا تو تماش بینوں کا ہجوم لگ گیا۔

یہی دن تھے جب سرفراز کسی دوست کے ہمراہ وہاں پہنچا اور ستارہ کا اسیر ہو گیا۔ چشم فلک نے ان کوٹھوں پر بہتوں کو اسیر ہوتے اور برباد ہوتے دیکھا ہے لیکن سرفراز کی قسمت اچھی تھی۔ صرف وہ ستارہ کا اسیر نہیں بنا تھا بلکہ ستارہ کا دل بھی اس کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ طوائف جب کسی سے محبت کر بیٹھتی ہے تو وہ اسے نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ ایسا نجات دہندہ جو اسے گناہ کی زندگی سے نجات دلائے گا۔ اسے طوائف سے عورت بنا دے گا۔ ستارہ کی رگوں میں کسی شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا اس لیے یہ احساس اس کے دل میں نہایت شدت سے بیدار ہوا۔ وہ دیوانہ وار سرفراز کی طرف بڑھتی گئی۔ اب ان کی ملاقاتیں محفل کے ہجوم سے نکل کر دن کی تنہائیوں تک آ گئیں۔ طوائفوں کے کوٹھے دن کے وقت قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ افشاں بیگم کا بڑھاپا بھی رات کی نیند دن کے وقت پوری کر رہا ہوتا تھا۔ اس سناٹے میں دونوں کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ ستارہ کا وجود اس گھر میں سونے کی چڑیا کی طرح تھا۔ افشاں بیگم کو یہ کبھی گوارا نہ ہوتا کہ اس کے ناچتے ہوئے قدم رک جائیں اور سکوں کی برسات بند ہو جائے لیکن سرفراز کی دولت ان کا منہ بند کیے ہوئے تھی اور جب انہوں نے یہ سنا کہ وہ ستارہ سے شادی کا خواہش مند ہے تو ان کے اندر کی ماں جاگ گئی۔ انہوں نے عام طوائفوں کی طرح ہنگامہ کھڑا نہیں کیا بلکہ خاموشی سے کہہ دیا کہ سرفراز سے کہو مجھ سے بات کرے۔

☆☆☆

سلطانہ بیگم کو آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس ایک ہفتے میں وہ صرف دو مرتبہ ان سے ملا تھا۔ کاروبار کی مصروفیات کا بہانہ کر کے جان چھڑا لی تھی۔ گھر میں مہمانوں کا وجود اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ ان کی موجودگی میں ستارہ سے اپنی شادی کا تذکرہ چھیڑنا مشکل تھا۔

ستارہ سے اس کی ملاقاتیں برابر ہو رہی تھیں۔ اس نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی شادی کی بات اپنے والد سے کرے گا۔

انہی دنوں احمد علی کو بزنس ٹور پر ملک سے باہر جانا پڑا۔ انہوں نے جاتے وقت سرفراز کو پابند کر دیا کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں سلطانہ بیگم اور فرزانہ کا خیال رکھے گا خصوصاً فرزانہ کو کہیں جانا ہو تو وہ اس کے ساتھ جائے گا۔

وہ اس روز جلدی گھر آ گیا تھا۔ ستارہ سے ملے کئی دن

ہو گئے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ستارہ کی طرف جائے گا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی کمرے میں ہی تھا کہ فرزانہ آ گئی۔

''اس وقت میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔''

''کیا مانگا تھا تم نے؟''

''یہی کہ آپ کے ساتھ بازار جاؤں گی اور آپ تیار کھڑے ہیں جیسے آپ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے ساتھ بازار جانا ہے۔''

''میں بازار جانے کے لیے نہیں اپنے کسی کام سے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔''

''اب آپ میرے ساتھ بازار جائیں گے۔''

''آج تم اکیلی چلی جاؤ یا راستے سے سعدیہ کو ساتھ لے لینا۔ میں پھر کسی دن تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔''

''آپ مجھ سے اتنا پرہیز کیوں کرتے ہیں؟''

''اس لیے کہ میرے پاس شاپنگ وغیرہ کے لیے فالتو ٹائم نہیں ہوتا۔''

''بچپن میں تو آپ مچلتے تھے کہ فرزانہ ساتھ جائے گی تو بازار جاؤں گا ورنہ نہیں۔''

''مجھے تو ایسی کوئی ضد یاد نہیں۔''

''آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ آپ گھوڑا بنتے تھے اور میں گھوڑے پر بیٹھا کرتی تھی۔''

''بچپن کی باتیں بے کار لوگ یاد کرتے ہیں اور میں بے کار نہیں ہوں۔''

''اچھا یہ بتائیے، آپ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چل رہے ہیں یا نہیں۔''

''پھوپی جان کو بھی ساتھ لے لو تو چل سکتا ہوں۔''

''وہ ساتھ جا رہی ہوتیں تو آپ سے کیوں کہتی۔ انہیں کل سے بخار ہے۔ آپ کے پاس تو کسی بیمار کو دیکھنے تک کا وقت نہیں۔''

''کمال ہے! مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کر دیتا۔''

''یہ زحمت آپ کیوں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو بلا لیا گیا تھا۔ وہ آ کر دیکھ بھی گیا ہے۔''

اس کے باوجود سرفراز نے ضروری سمجھا کہ میں پھوپی کے پاس جائے اور ان کی طبیعت وغیرہ پوچھے۔ وہ ان کے کمرے میں گیا اور اپنی مصروفیات کا بہانہ کر کے ان کی عیادت کی۔ انہیں خوش کرنے کے لیے یہ بھی کہنا پڑا کہ وہ فرزانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہا ہے۔ بے دلی سے سہی لیکن اسے فرزانہ کے ساتھ جانا پڑا۔

شاپنگ سے نمٹنے کے بعد فرزانہ زبردستی اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ یہاں بیٹھ کر بھی وہ مسلسل اپنے اور اس کے بچپن کی باتیں کرتی رہی۔ سرفراز کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''تم اس وقت صرف پانچ سال کی تھیں اور ایک ایک بات اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو تمہیں وہ باتیں بھی یاد ہیں جو مجھے یاد نہیں جبکہ میں تم سے بڑا تھا۔ مجھے تو یہ لگ رہا ہے جیسے دل سے گھڑ کر سنا رہی ہو۔''

''مجھے اس لیے یاد ہیں کہ میں یہاں سے جانے کے بعد آپ کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ آپ سے وابستہ یادوں کو یاد کرتی رہتی ہوں۔''

''کیوں محترمہ، آپ کو اور کوئی کام نہیں تھا لندن میں۔''

''میں لندن میں خوش نہیں تھی۔ پاکستان کو یاد کرتی رہتی تھی اور پاکستان میں آپ تھے۔''

''اب تم پاکستان آ گئی ہو۔ یہاں میرے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ میرے بچپن کا پیچھا چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔''

''آپ کو بچپن سے چڑ ہے تو جوانی کی بات کیے لیتی ہوں۔ یہ بتائیے آپ کا شادی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی کوئی ارادہ نہیں۔''

''کوئی لڑکی دیکھی؟''

''یہ میرا نہیں میرے والدین کا کام ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کام بن گیا۔''

''کیا مطلب۔''

''وہ میں پھر کسی وقت سمجھا دوں گی۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ چلیے چلتے ہیں۔'' فرزانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ سرفراز بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

ابھی وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے ہی تھے کہ سرفراز کو لاڈلا نظر آ گیا۔ سرفراز نے بچ کر نکلنا چاہا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر سامنے آ گیا۔

''سرفراز صاحب، آفس کی سیکریٹری ہے یا گھر کی۔'' لاڈلا نے نہایت بدتمیزی سے سوال کیا۔

''میری کزن ہے۔ ہم شاپنگ کے لیے آئے تھے۔''

''یہ لفظ شاپنگ بھی خوب ایجاد ہوا ہے۔''

''کل آفس آنا تو ملاقات ہو گی۔'' سرفراز نے کہا اور فرزانہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

فرزانہ گاڑی تک تو خاموشی سے آ گئی لیکن پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے لاڈلا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔

''کون تھا یہ بے ہودہ آدمی۔''

''کاروباری دنیا میں ہر قسم کے آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے۔''

''کیسا کاروبار ہے آپ کا جو ایسے لفنگے آپ سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔''

''یہ اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ اس سے ایک بلڈنگ کا سودا چل رہا ہے۔''

''اس قدر بے تکلف۔ توبہ!''

''یہ لوگ بے تکلفی پیدا کر کے دوستی ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ خیر تم چھوڑو اسے۔ یہ بتاؤ شاپنگ کے لیے پھر کب آنا ہے۔'' سرفراز نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

''اس مرتبہ شاپنگ نہیں۔ کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے۔''

سرفراز کو اس کے اس آئیڈیے سے اختلاف ہو سکتا تھا لیکن وہ اس وقت انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ لاڈلا کی ملاقات سے ستارہ کا راز ظاہر ہو گیا ہو۔

اس نے گھر پہنچ کر سوچا کہ ستارہ سے ملا جائے۔ ممکن ہے لاڈلا نے اسے کچھ بتایا ہو۔ وہ اپنی صفائی پیش کرے لیکن اس وقت تماش بینوں کی موجودگی میں ستارہ سے ملنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ بہت دن سے دن کے وقت ملاقات کے لیے جانے لگا تھا۔

مجرے کا خیال آتے ہی اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ حسد کی آگ اس کے تن بدن میں پھیل گئی۔ لوگ اس پر نوٹ نچھاور کر رہے ہوں گے۔ گندی نظریں اس کا استقبال کر رہی ہوں گی۔ مجھے جلد از جلد ستارہ کو وہاں سے نکال لانا چاہیے۔ پھر اسے پھوپی اور فرزانہ کا خیال آیا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں شادی کا ذکر کیسے چھیڑ سکتا ہوں۔ شادی کا ذکر گھر میں نہ چھیڑوں، ستارہ کو تسلی تو دے سکتا ہوں۔ وہاں جا تو سکتا ہوں۔

دوسرے دن وہ کچھ دیر دفتر میں گزارنے کے بعد ستارہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ لاڈلا اسے بتا چکا تھا کہ اس نے فراز کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے چنانچہ اسے دیکھتے ہی ستارہ بھڑک اٹھی۔

''ہم طوائفیں تو بدنام ہیں کہ ہرجائی ہوتی ہیں۔ آپ تو شریف زادے ہیں آپ بھی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں۔''

''لاڈلا نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک لڑکی کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلتے دیکھا ہے۔''

''یہ بھی تو پوچھو وہ لڑکی تھی کون۔''

''کوئی بھی تھی۔ کیا وہ لڑکی نہیں تھی؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری پھوپی لندن سے آئی ہوئی ہیں۔ وہ لڑکی انہی کی بیٹی تھی۔ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔''

''آپ کے ساتھ اکیلی آنے کا مطلب کیا تھا۔''

''مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں میرا اس لڑکی کے ساتھ آنا برا لگا۔ یہ تمہاری محبت کی دلیل ہے لیکن جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں ہے۔''

''پھر تم شادی کے لیے اماں سے بات کیوں نہیں کرتے؟''

''میری کچھ گھریلو مجبوریاں ہیں بس ان سے نجات مل جائے۔ تم مجھ پر بھروسا کرو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔''

''کل کو یہ مت کہہ دینا کہ میں اس ''لڑکی'' سے شادی کر رہا ہوں۔''

''تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم میری محبت ہو۔ میں تمہارے لیے اپنے والدین کو چھوڑ سکتا ہوں فرزانہ کیا چیز ہے۔''

ستارہ خوش ہو گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ستار اٹھا لائی۔ یہ اس کا انداز میزبانی تھا جو وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی لیکن آج اس کا اندیشہ تھا جو اس کی آواز میں لرز رہا تھا۔ اس کی انگلیوں نے ستار کے تاروں کو چھیڑا اور اس کے ہونٹوں پر یہ غزل آ گئی۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سرفراز، فرزانہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مووی دیکھنے جائے گا۔ اسے وعدہ پورا کرنا پڑا۔ اسے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا جیسے وہ ستارہ سے وعدہ خلافی کر رہا ہے لیکن یہ کہہ کر ذہن کو جھٹک دیا کہ وہ محض وعدہ پورا کر رہا ہے ورنہ فرزانہ سے اسے کیا دلچسپی۔

وہ سینما ہال سے باہر نکلے تو فرزانہ کی ضد اسے شیرٹن ہوٹل کی طرف لے گئی۔ دونوں نے ایک ساتھ ڈنر کیا اور بہت ساری باتیں کیں۔ زیادہ باتیں فرزانہ ہی کر رہی تھی لیکن اسے بعض باتوں کا جواب دینا پڑ رہا تھا۔ اس لیے یہ نہیں کہا

جاسکتا تھا کہ وہ شریک گفتگو نہیں تھا۔

احمد علی واپس آچکے تھے۔ اب موقع تھا کہ سرفراز موقع دیکھ کر باپ کو اعتماد میں لے اور ستارہ کا ذکر چھیڑ دے لیکن ایک نادیدہ خوف اس پر غالب آ گیا۔ یہ اس کی تربیت کا حصہ تھا کہ وہ اتنی بڑی بات باپ کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ ستارہ اگر محض عام لڑکی ہوتی تو یہ بات کہنا مشکل نہ ہوتا مصیبت یہ تھی کہ ستارہ طوائف تھی۔ یہ بات چھپائی بھی نہیں جاسکتی تھی۔

اس نے ہمت جمع کی اور سوچا ماں سے ذکر کیا جائے۔ وہ ان کے پاس جاکر بیٹھا بھی لیکن ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ آیا۔

اس دن کے بعد سے اسے ایک راہ سوجھی۔ اسے فرزانہ کا خیال آیا۔ اگر فرزانہ سے وہ دل کی بات کہہ دے اور اس کے ذریعے پھوپی جان تک بات پہنچ جائے تو وہ ڈیڈی کو آمادہ کرسکتی ہیں لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے فرزانہ سے دوستی کی راہ ہموار کی جائے۔ اب تک وہ فرزانہ سے اکھڑا اکھڑا رہتا تھا مگر اب اس نے سوچ لیا کہ اس سے دوستی پیدا کرے گا تاکہ وقت پڑنے پر اس سے بھرپور سفارش کی امید کرسکے۔ اس نے خود پیشکش کی کہ وہ اسے شاپنگ پر لے جانا چاہتا ہے۔ فرزانہ کے لیے یہ خبر کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ وہ فوراً تیار ہوئی اور اس کے ساتھ بازار چلی گئی۔ سرفراز نے اپنی جیب سے اسے شاپنگ کرائی۔ وہ تحائف سے لدی پھندی گھر پہنچی تو اپنے آپ پر فخر کررہی تھی۔ چوری چھپے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ تحائف سب گھر والوں کو دکھائے۔ سب سے زیادہ خوشی احمد علی کو ہوئی تھی۔ سرفراز علی، فرزانہ میں دلچسپی لے رہا ہے یہ احساس ان کے لیے خوش کن تھا۔ کچھ دیر بعد فرزانہ، سرفراز کے کمرے میں آئی تھی۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔''

''کئی گھنٹے بعد تمہیں خیال آیا۔''

''بازار میں شکریہ ادا کرنا اچھا نہیں لگتا اس لیے......''

''شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ میں تو تمہارا اپنا ہوں۔ دوستوں کے درمیان کیا غیریت۔''

''سرفراز بھائی، میں تو سمجھ رہی تھی آپ بچپن کے مقابلے میں بدل گئے ہیں۔ آپ تو بالکل نہیں بدلے۔''

''تم نے یہ سمجھ بھی کیسے لیا تھا کہ میں بدل گیا ہوں۔''

''آپ رعب ہی ایسا جھاڑ رہے تھے جیسے بہت بڑے ہوگئے ہیں۔''

''بڑا تو میں ہوں۔''

''اب اتنے بڑے بھی نہیں ہوگئے۔ اپنی بہنوں تک سے تو چھوٹے ہیں۔''

''یہ کیا بڑے چھوٹوں کا چکر لے کر بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں برابر ہیں۔ اسی لیے تو دوست ہیں۔''

''آپ کہیں تو میں آپ کے کمرے میں کبھی کبھی آجایا کروں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''آپ کبھی اوپر کی منزل پر بھی نہیں آئے۔ امی جان کہہ رہی تھیں کہ شاید سرفراز کو ہمارا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔''

''ارے، وہ یہ سوچ رہی ہیں۔ پھر تو میں اپنا بستر بھی وہیں لگالوں گا۔''

''اب اتنا بھی فری ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''چلو پھر یونہی وقت گزارنے کو آجایا کروں گا بلکہ ایسا کرتے ہیں ابھی چلتے ہیں۔''

وہ فرزانہ کے ساتھ اپنی پھوپی کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے سرفراز کو اپنے کمرے میں دیکھا اور وہ بھی نہایت خوش گوار موڈ میں تو انہیں خوشی ہوئی، حیرت بھی۔ انہیں اتنے دن آئے ہوئے ہوگئے تھے وہ ان سے اس طرح نہیں ملا تھا جیسے اب مل رہا تھا۔

وہ بڑی دیر تک یہاں بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ یہ خبر احمد علی تک بھی پہنچی۔ اس کا سبب اس طرح بن گیا کہ وہ اپنے وکیل سے کسی کاروباری مسئلے پر گفتگو کررہے تھے۔ گفتگو کے دوران سرفراز علی کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا وہ سلطانہ بیگم کے پاس ہے۔

اس دن کے بعد سے سرفراز علی نے تواتر سے سلطانہ بیگم کے پاس جانا شروع کردیا تھا۔ دراصل وہ فرزانہ کو کم سے کم یہ موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے کمرے میں اکیلی آئے لیکن پھر بھی وہ اس کے کمرے میں آہی جاتی تھی۔ اس کی شوخ باتیں اس کے کمرے میں گونجنے لگتی تھیں۔

فرزانہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنے لگی تو وہ ستارہ اور فرزانہ میں موازنہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔ خوب صورتی میں دونوں کا جواب نہیں تھا۔ فرزانہ، ستارہ سے زیادہ شوخ اور چنچل تھی مگر پھر بھی یہ فرق ضرور تھا کہ فرزانہ محض دوست تھی اور ستارہ اس کی محبت تھی۔

وہ ستارہ کی طرف اب بھی پابندی سے جارہا تھا۔ اسے ستارہ کی زبانی یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی ماں اس شادی کی مخالفت نہیں کرے گی۔ مخالفت کا خدشہ تھا تو سرفراز کو اپنے گھر والوں سے تھا۔ اسی لیے وہ فرزانہ کو شیشے میں اتار رہا تھا لیکن اس کے ارادوں سے بے خبر فرزانہ کے دل میں اس کی

محبت گھر کرنے لگی تھی۔ سرفراز کی مصلحت آمیز بے تکلفی نے اس کے دل میں یہ غلط فہمی بھی پیدا کردی تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ فرزانہ نے اپنی پسند کا اظہار اپنی ماں کے سامنے کردیا اور یہ بھی بتادیا کہ سرفراز بھی اسے چاہتا ہے۔

سرفراز علی کے بڑے پہلے ہی ان دونوں کی بڑھتی ہوئی دوستی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سلطانہ جہاں نے اپنے بھائی احمد علی سے تذکرہ کیا۔

''بھائی صاحب، میں بیٹی کی ماں ہوکر کہہ رہی ہوں۔ اس لیے کہ سرفراز بھی میرا ہی بیٹا ہے۔ اگر سرفراز اور فرزانہ کی شادی ہوجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

احمد علی کو اپنی دوسری بہن مخدومہ جہاں کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا، ابھی سرفراز کو کچھ مت کہو۔ آگے کیا کرنا ہے یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ انہوں نے ضروری سمجھا کہ مخدومہ جہاں سے مشورہ کیا جائے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گئے۔

''باجی، میں ایک ضروری مشورے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ سلطانہ جہاں چاہتی ہیں کہ سرفراز کی شادی فرزانہ سے کردی جائے۔''

''ہاں تو دیر کس بات کی ہے۔''

''آپ سے مشورہ بھی تو ضروری تھا۔ آپ نے کہا تھا اس کے بعد کیا کرنا ہے آپ بتائیں گی۔''

''سلطانہ میرے کہنے پر ہی پاکستان آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ فرزانہ جب آپ کے گھر میں رہے گی اور سرفراز سے آمنا سامنا ہوگا تو ضرور دونوں کے دلوں میں جگہ پیدا ہوگی اور وہی ہوا۔ زہر کو زہر مارتا ہے۔ شادی ہوجائے گی تو سرفراز کے سر سے طوائف کی محبت کا بھوت بھی اتر جائے گا۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں سرفراز شادی کے لیے تیار ہوجائے گا جبکہ میری اطلاع کے مطابق وہ اب بھی اس طوائف کے گھر جاتا ہے۔''

''آپ سرفراز سے کہہ کر تو دیکھیں۔ اگر وہ نہ مانا تو اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ طوائفیں دولت کی پجاری ہوتی ہیں۔ اسے سرفراز کی دولت سے پیار ہے سرفراز سے نہیں۔ آپ دولت خرچ کریں گے تو طوائف کی محبت نفرت میں بدل جائے گی۔''

''میں پیسے خرچ کروں گا؟''

''اگر ایسا وقت آیا تو آپ اس طوائف کا منہ اپنی دولت سے بھر دیجیے گا۔ وہ خود ایسے اسباب پیدا کردے گی کہ سرفراز کو اس سے نفرت ہوجائے گی۔''

☆☆☆

سرفراز کو اب محسوس ہونے لگا تھا کہ فرزانہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اس کی یہ غلط فہمی دور ہونا چاہیے۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ ستارہ کا ذکر اس کے سامنے کردے گا اور یہ درخواست بھی کرے گا کہ وہ اپنی ماں کے ذریعے احمد علی تک یہ بات پہنچادے۔ اس نے فون کر کے فرزانہ کو بتا بھی دیا تھا کہ وہ گھر آرہا ہے۔ فرزانہ تیار رہے۔ کہیں گھومنے چلیں گے۔

وہ گھر پہنچا تو تمام گھر والے اس کے والد کے کمرے میں جمع تھے۔ دونوں شادی شدہ بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ مخدومہ جہاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی موجودگی بتارہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔ وہ اسی وقت کسی جگہ آتی جاتی تھیں جب کوئی خاص مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔ سرفراز بھی یہ جاننے کے لیے کہ بات کیا ہے وہیں پہنچ گیا۔

''آج تو ہمارے گھر میں بڑی رونق ہے۔'' سرفراز نے کمرے میں داخل ہوتے وقت کہا۔

''بات ایسی ہے کہ آئندہ اس رونق میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔'' احمد علی نے کہا۔

''پھوپی جان، کیا فرزانہ کی شادی کا سلسلہ ہے۔'' سرفراز نے سلطانہ جہاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہیں تمہاری بڑی پھوپی بتائیں گی۔''

''تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ ہم فرزانہ کی شادی کر رہے ہیں۔ یہ پوچھو اس کی شادی کس سے ہورہی ہے۔''

''جس سے بھی ہوگی خوش قسمت ہوگا۔''

''دل چھوٹا مت کرو، وہ خوش قسمت تم ہی ہو۔'' مخدومہ جہاں نے کہا۔

''کیوں مذاق کرتی ہیں پھوپی بیگم۔''

''یہ مذاق نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کی اب تک کی روایت بھی یہ رہی ہے کہ خاندان میں شادی کی جاتی ہے۔ فرزانہ جیسی لڑکی گھر میں ہے تو ہم باہر کیوں جائیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تمہاری پسند ہیں۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟''

''یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم بڑوں کے سامنے شرما رہے ہو ورنہ ہمیں سب معلوم ہے۔''

''آپ فرزانہ کو بلا کر پوچھ لیں۔ میں نے آج تک اس سے یہ نہیں کہا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔''

''وہ لڑکی ہے اور ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔ لندن

میں رہنے کے باوجود اتنی بے حجاب نہیں ہوئی کہ اپنی پسند کا اقرار سب کے سامنے کرے گی۔''

''پھوپی بیگم، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔''

''کیوں؟ کیا فرزانہ میں کوئی عیب ہے یا تم ابھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچے ہو۔''

''آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے۔ کھل کر بتاؤ۔ سب کے سامنے نہیں بتا سکتے تو میں سب کو باہر بھیجے دیتی ہوں۔ مجھے اکیلے میں بتا دو۔''

احمد علی جانتے تھے کہ وہ کیوں انکار کر رہا ہے۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا کہ ابھی وہ شادی سے انکار کی وجہ بتائے گا اور ابھی وہ راز کھل جائے گا جسے وہ چھپاتے چلے آرہے تھے۔ مخدومہ جہاں اصرار کر رہی تھیں کہ وہ انکار کی وجہ بتائے۔ وہ کیوں شادی کرنا نہیں چاہتا۔

ایک مرتبہ پھر اس کی تربیت اس کے راستے میں حائل ہوئی۔ وہ کھل کر کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔ بس یہ کہہ کر شادی کو ٹالنا چاہا کہ ابھی وہ اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ بہانہ ایسا نہیں تھا جس پر کوئی قائل ہوتا۔ مخدومہ جہاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ضروری تیاری کرلی جائے۔ صرف ایک ہفتہ بعد آج ہی کے دن سرفراز اور فرزانہ کی شادی کردی جائے گی۔''

سرفراز علی اس وقت خاموش ہوگیا لیکن جب اپنے کمرے میں پہنچا اور بڑوں کی نظروں سے دور ہوا تو اسے اپنی حالت پر غصہ آنے لگا۔ اسے سب کے سامنے کہہ دینا چاہیے تھا کہ وہ ستارہ نامی ایک طوائف سے محبت کرتا ہے۔ اگر سب سے نہ کہہ سکا تو فرزانہ سے کہہ دے۔ وہ جب سنے گی تو اس کے دل میں میرے لیے خود نفرت پیدا ہوجائے گی۔ کسی کو علم بھی نہیں ہو سکے گا اور وہ خود انکار کردے گی۔

مخدومہ جہاں بالکل صحیح اندازہ لگا رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ سرفراز جو ہم سے نہ کہہ سکا فرزانہ سے کہے گا تا کہ وہ اس اہم انکشاف کو سن کر خود انکار کردے۔ انہوں نے اسی وقت سلطانہ جہاں سے کہا کہ وہ فرزانہ کو لے کر ان کے گھر آجائے اور سرفراز سے فرزانہ کو نہ ملنے دے۔ سلطانہ جہاں کو تعجب ضرور ہوا لیکن مخدومہ جہاں کا کہا ٹال بھی نہیں سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کے گھر چلی گئیں البتہ گھر جا کر پوچھا ضرور۔ ''سرفراز سے ایسی کیا غیریت ہوگئی کہ فرزانہ کو سرفراز سے نہ ملنے دوں؟''

''وہ کسی وجہ سے نہیں چاہتا کہ ابھی شادی کرے لہٰذا وہ فرزانہ کو بھڑکانے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے اپنی بے راہ روی کے من گھڑت قصے سنائے۔ فرزانہ بچی ہی تو ہے۔ اگر اس کے دل میں نفرت بیٹھ گئی تو وہ شادی سے انکار کردے گی۔''

''آپ نے تو مجھ پر بھی پابندی لگا دی ہے۔''

''آپ سے بھی وہ وہی باتیں کرسکتا ہے جو فرزانہ سے کرے گا۔ آپ کے دل میں بھی کوئی خیال آسکتا ہے۔''

''باجی، آخر بات کیا ہے۔ اتنی رازداریاں کیوں ہوتی جارہی ہیں۔ مجھے کچھ معلوم تو ہو؟''

''ابھی کسی کو کچھ معلوم نہ ہو یہی سب کے حق میں بہتر ہے۔ ایک مرتبہ شادی ہوجائے سب کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا میں جو کچھ کر رہی ہوں سب کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔''

سرفراز علی سخت مشکل میں تھا۔ وہ کئی مرتبہ فون پر کوشش کرچکا تھا کہ کسی طرح فرزانہ سے بات ہوجائے لیکن اس سے کہا جارہا تھا کہ اب چونکہ شادی ہونے والی ہے اس لیے فرزانہ اس سے بات نہیں کرسکتی۔ وہ ایک دن ہمت کرکے مخدومہ جہاں کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی اسے مایوسی ہوئی۔ مخدومہ جہاں نے اسے فرزانہ سے ملنے نہیں دیا۔ جواز بھی پیش کیا کہ ہمارے خاندان میں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ پردہ ہوجاتا ہے۔ سرفراز علی نے چاہا کہ مخدومہ جہاں کو تمام حالات سے آگاہ کردے لیکن کیا کہتا۔ یہ کہ وہ ایک طوائف سے شادی کرنا چاہتا ہے ہمت کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا اور اٹھ کر چلا آیا۔

وہ اکیلے کمرے میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ اگر وہ بغاوت کرتا ہے تو اسے کاروبار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ بات نکلی تو خاندان کی بدنامی بھی ہوگی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کے والد ممکن ہے اس کی بات مان لیتے اور ستارہ سے شادی پر تیار ہوجاتے لیکن فرزانہ کے آجانے کے بعد یہ ممکن نہیں۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے فرزانہ کی جگہ کوئی اور لڑکی اس گھر میں آئے اور وہ بھی طوائف۔ اس نے انکار کردیا تو ستارہ پر کیا بیتے گی؟ وہ سوچ رہا تھا' ستارہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے جو اس کے فراق میں گھل گھل کر مر جائے گی۔ کچھ دن واویلا کرے گی پھر اپنی چمکیلی دنیا میں گم ہوجائے گی۔ اس نیکی کا کیا ہوگا جو میں ستارہ کو طوائف سے عورت بنا کر کمانے والا تھا؟ اللہ کی مرضی۔ خاندان کی عزت بچانا بھی تو نیکی ہے۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ لوگ دوسری شادی بھی تو کرتے ہیں۔ فرزانہ سے شادی کے بعد فرزانہ کو اعتماد میں

لے کر ستارہ سے دوسری شادی بھی تو کرسکتا ہوں۔ اس وقت کوئی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔ کوئی میری مخالفت نہیں کرے گا۔ یہ بات اس کے دل کو لگی اور وہ مطمئن سا ہوگیا۔ اس نے کسی احتجاج کے بغیر فرزانہ سے شادی کی ہامی بھر لی۔

☆☆☆

ستارہ بیگم نے سرفراز کو آدمی نہیں نجات دہندہ سمجھا تھا۔ ایک ایسا نجات دہندہ جو اسے ایک ایسی دنیا میں لے جانے آیا تھا جہاں عورت کے کئی پاکیزہ رشتے ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ گھنگرو اتار دے گی۔ اسے وہ مقام ملے گا جو عورت کا اصل مقام ہے۔ وہ بہو بنے گی، ماں بنے گی۔ گھر کے بزرگوں کی خدمت کا موقع ملے گا۔ اسے خیالوں ہی خیالوں میں خود پر فخر ہونے لگا تھا۔ اسے سرفراز علی کی شرافت پر بھی ناز ہوا تھا جس نے اسے گھر کی مالکن بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے اندھیروں سے روشنی میں لے جانے کا عہد کیا تھا مگر ایک خبر نے اس کے تمام خواب چکنا چور کردیے۔ وہ ماں سے جھگڑ رہی تھی کہ اب وہ مجرا نہیں کرے گی کہ لاڈلا آگیا۔ اس کے چہرے پر ایک خبیث مسکراہٹ تھی۔

''کس بات پر لڑائی ہورہی ہے بائی جی؟''

''کہتی ہے مجرا نہیں کروں گی۔ گھوڑا کہہ رہا ہے گھاس نہیں کھاؤں گا۔ اسے سرفراز علی پر ناز ہے۔ اس نے اسے شریف زادی بننے کے خواب دکھائے ہیں۔ ارے میں ان شریف زادوں کو خوب جانتی ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جب یہ شادی کرلے اس وقت مجرے سے ہاتھ اٹھائے۔ ابھی دلی دور ہے۔ وعدہ کرنا آسان ہے وعدہ نبھانا مشکل۔''

''بائی جی، داد دیتا ہوں آپ کے تجربے کی۔ آپ نے جو سوچا تھا بالکل ویسا ہی ہوا ہے۔ سرفراز علی نے شادی کرلی ہے۔''

ستارہ بیگم کے ہاتھ میں آئینہ تھا، ہاتھ سے گرا اور چھن سے ٹوٹ گیا۔ خبر تھی کہ آسمانی بجلی۔ وہ سر سے پاؤں تک جل کر رہ گئی۔ ابھی کچھ جان باقی تھی کہ لاڈلا پر برس پڑی۔

''تم بھی اماں سے مل گئے ہو کہ مجھے سرفراز علی کی طرف سے بدگمانی کرنے کے لیے ایسی بے پر کی اڑا رہے ہو۔''

''تمہاری جان کی قسم ستارہ بیگم۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ خبر سولہ آنے درست ہے۔ سرفراز میاں نے شادی کرلی ہے۔ وہ ایک دن یہاں آئے بغیر نہیں رہتے تھے اب ہفتہ گزر گیا۔''

وکٹ کیپر اس بیٹسمین سے سخت نالاں تھا، جو نہ کھیل رہا تھا اور نہ ہی آؤٹ ہو رہا تھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہیں کرکٹ سے عشق ہے۔'' بیٹسمین نے پلٹ کر وکٹ کیپر سے کہا۔

''ٹھیک سنا ہے۔'' وکٹ کیپر نے آہ بھر کر کہا۔ ''لیکن تم اس بات کی پروا مت کرو۔ یہیں کھیلتے رہو، میں تمہیں قتل نہیں کروں گا۔''

ہیری کی بیوی اس کے لیے باعث شرم ثابت ہوئی ہے۔ جارج پُرطلعت لہجے میں اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ''ہم لوگ کرکٹ کو چ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، وہ بے چاری سمجھی کہ کرکٹ کوچ کے چار پہیے ہوتے ہیں۔'' جارج کی بیوی الجھن میں پڑ گئی۔ وہ بولی۔ ''اچھا جارج۔ تو پھر کرکٹ کوچ کے کتنے پہیے ہوتے ہیں؟''

''اگر یہ خبر غلط ہوئی تو میں عورت سے ڈائن بن جاؤں گی۔ ایک ایک کا خون پی لوں گی۔''

''آپ تو آپ یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا۔''

ستارہ ایسے صدمے سے دوچار ہوئی کہ نہ ثبوت طلب کیا نہ گواہی مانگی۔ بھاگتی ہوئی گئی اور کمرا بند کرلیا۔ سب کے سب دروازہ پیٹتے رہ گئے کہ ممکن ہے خبر غلط ہو ابھی ایسا ویسا قدم مت اٹھائیو۔ لاڈلا وہاں سے کھسکنے کو تھا کہ افشاں بیگم کی گالیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ افشاں بیگم اس کی جان کو کوس رہی تھیں کہ اس نے ایسی بری خبر ستارہ کے کانوں تک کیوں پہنچائی۔ جب تک چھپ سکتی تھی چھپالیتا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''اب میرا منہ کیا تک رہے ہو۔'' افشاں بیگم نے لاڈلا سے کہا۔ ''کسی کو بلوا کر دروازہ توڑو۔ اگر میری بچی نے ایسا ویسا کوئی قدم اٹھالیا تو میں کھڑے کھڑے تمہیں آگ لگا دوں گی۔''

اس کی نوبت نہیں آئی۔ ستارہ خود باہر آگئی لیکن اس اطلاع کے ساتھ کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ مجرا نہیں کرے گی۔ اس کے بجائے آج نیلما کو مہمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

''ستارہ، میں تجھ پر قربان۔ تیری طبیعت ماندہ ہے تو

آج رات آرام کر۔ نیلما جو نکڑے توڑ رہی ہے وہ بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں چلائے۔''

اس رات مجرا ہوا لیکن ناچنے والی ستارہ نہیں نیلما تھی۔

دوسرے دن ستارہ سو کر اٹھی تو اس نے لاڈلا کو بلا بھیجا۔ وہ اس خبر کی مزید تصدیق چاہتی تھی جو وہ لے کر آیا تھا۔

رات بھر سوچنے کے بعد ستارہ مجسم انتقام بن گئی تھی۔ وہ طے کر چکی تھی کہ سرفراز کو زندگی بھر چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ سرفراز کی بے وفائی نے اسے پھر سے طوائف بنا دیا تھا۔

''میں ایسا چکر چلاؤں گی کہ وہ بار بار یہاں آئے گا۔ پرستار کی حیثیت سے نہیں بھکاری کی حیثیت سے۔ اب محبت نہیں، اس کوٹھے پر تجارت ہوگی۔ سرفراز علی دیکھے گا کہ ایک طوائف کا انتقام کہاں تک انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ یہاں نواب آتے ہیں بھکاری جاتے ہیں۔ میں نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر سرفراز علی کو نواب رہنے دیا تھا مگر اب میں اسے بھکاری بنا دوں گی۔ اس کی دولت بھی چھینوں گی اور اس کی عزت بھی۔ اس کے دل میں بھی آگ لگاؤں گی اور اس کے گھر میں بھی۔''

وہ طوائف کے کوٹھے پر پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ شریفوں کو جھکانے کے لیے کس داؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ صرف ایک مرتبہ سرفراز اس کے کوٹھے پر آجائے۔ یہ کام لاڈلا کر سکتا تھا۔

''یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اگر تم اسے یہاں لے آئے تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔''

''اس دروازے سے دولت تو مجھے بہت ملی ہے۔ میں تو وہ چاہتا ہوں جس کے تقاضے اب تک کرتا رہا ہوں۔''

''بوڑھے ہوگئے مگر ٹھرک نہیں گئی۔ میں اسے بھی سرفراز سے انتقام سمجھوں گی۔ تم سرفراز کو یہاں لے آؤ۔ میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔''

لاڈلا باتونی آدمی تھا اور پھر سرفراز کے بہت سے رازوں سے واقف تھا۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ سرفراز بندۂ بے دام بن کر ستارہ کے حضور حاضر ہوگیا۔

''ستارہ، میں شرمندہ ہوں کہ تم سے شادی نہیں کر سکا لیکن اسے میری بے وفائی نہیں مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا۔''

''شرمندہ ہو کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ غلطی تو میری تھی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے بڑے خواب دیکھ لیے تھے۔ میں شریفوں کی مجبوریوں سے واقف ہوں۔ آپ مجبور کر دیے گئے ہوں گے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ کی دنیا میں عزتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ میں آپ کی شادی سے نہیں آپ کی عزت کی طرف سے پریشان ہوں۔''

''اس عزت کو بچانے کے لیے ہی تو میں تمہارے سوا کسی اور سے شادی پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔''

''اسی لیے پریشان ہوں کہ اب آپ اپنی عزت کس طرح بچائیں گے۔''

''ستارہ، میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میری کوکھ میں آپ کا بچہ یا بچی پرورش پا رہی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد میں اسے آپ کے دروازے پر چھوڑنے ضرور آؤں گی۔ بس یہ سوچ کر پریشان ہوں۔''

''آج سے پہلے تو تم نے یہ تذکرہ کبھی نہیں کیا۔''

''اس لیے نہیں کیا کہ اس کی پیدائش اس کے باپ کے گھر میں ہونی تھی لیکن اب یہ پیدائش کوٹھے پر ہوگی۔ شریفوں کی اولاد کوٹھے پر پلتی کیا اچھی لگے گی۔''

''ستارہ مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اس حمل کو ضائع کرا دو۔''

''اپنے گناہوں کو شریفوں میں چھپایا جاتا ہے ہم طوائفوں میں نہیں۔''

''میری خاطر۔ میری عزت کی خاطر۔''

''آپ کی عزت کے لیے میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کروں۔ یہاں ویسے بھی کوئی کسی کے باپ کا نام نہیں پوچھتا۔ آپ کی اولاد میرے پاس پلتی رہے گی لیکن اس کا خرچ ماہ بہ ماہ آپ مجھے پہنچاتے رہیں گے تاکہ وہ یہاں کی حرام کمائی پر نہ پلے۔''

''مجھے منظور ہے۔ جب تک تم اس راز کو راز رکھو گی۔ میں خرچ تمہیں پہنچاتا رہوں گا۔''

''ایک اور شرط ہے اور وہ یہ کہ اس بچے کا خرچ یہاں آ کر میرے ہاتھ میں دو گے۔''

''مجھے یہ بھی منظور ہے۔ بس یہ بات میرے گھر تک نہ جائے۔''

''نہیں جائے گی۔ بس آپ یہاں آتے رہیں۔ ایک نظر میں بھی آپ کو دیکھ لوں گی۔''

سرفراز علی نے شکر بھیجا کہ جان چھوٹی۔ اسے یہ آس بھی تھی کہ گزرنے والا وقت کس نے دیکھا ہے۔ پیدائش ہوگی پھر بچی یا بچہ بڑا ہوگا۔ میں کہاں ہوں گا ستارہ کہاں ہوگی۔ اس عرصے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ستارہ سے دوسری شادی کر لوں۔

انسان کا قاعدہ ہے کہ وقتی فائدے پر شاکر ہو جاتا ہے سرفراز علی نے بھی یہی کیا۔

اس کے جاتے ہی ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن پھر گھبرا کر آنسو پونچھ بھی لیے۔ طوائف کی آنکھ میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ آنسو تو تماش بینوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔

سازندوں میں سے ایک سازندہ چاند خاں خود کو ستارہ کا عاشق کہتا تھا لیکن سرفراز کی موجودگی میں اس کا چراغ جلتا نہ تھا۔ اب جو سرفراز کا پتا صاف ہوا تو چاند خاں آگے بڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ستارہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

افشاں بیگم اس کھیل کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں لیکن اس لیے برداشت کرنے پر مجبور تھیں کہ ستارہ مجرا کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ محبت میں ناکامی کے بعد اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ افشاں بیگم سوچتی تھیں کہ اگر اس نے اپنی دلچسپی کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ لیا ہے تو کیا حرج ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی رہیں۔ ان کی آنکھیں تو اس وقت جھپکیں جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ستارہ کا پاؤں بھاری ہوگیا ہے۔ اب وہ مجرا کرنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔ آمدنی نے ہاتھ کھینچا تو افشاں بیگم نے قیامت کھڑی کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس آفت سے پیچھا چھڑا لے۔ حمل ضائع کرا دے۔ وہ ستارہ کی ضد کے سامنے صرف اصرار کر سکتی تھیں۔

''کم بخت، یہ تو سوچ کہ اگر لڑکا ہوگیا تو کیا زندگی بھر اسے بٹھا کر کھلائے گی۔'' افشاں بیگم نے ایک دن اس سے کہا۔

''میں یہی چاہتی ہوں کہ لڑکا ہو۔''

''توبہ بچی۔ تو دنیا کی پہلی طوائف ہے جو لڑکا ہونے کی دعا کر رہی ہے۔''

''یہی لڑکا بڑا ہو کر سرفراز علی کے سامنے تن کر کھڑا ہوگا۔ میرے انتقام کی قسطیں وصول کرے گا۔''

''سرفراز علی درمیان میں کہاں سے آگیا۔ یہ تو میرے خیال میں چاند خاں میراثی کا گناہ ہے جو تیرے پیٹ میں پل رہا ہے۔''

''یہ تو تمہیں معلوم ہے سرفراز علی تو نہیں جانتا۔ اسے میں نے یہی بتایا ہے کہ میرے پیٹ میں اس کی اولاد پل رہی ہے۔''

''تو بڑی بھولی ہے۔ اس کے جوان ہونے کا انتظار کرے گی۔ سرفراز علی کو بتا ہی دیا ہے تو اسے بلیک میل کر۔ اسے مجبور کر کہ وہ اس کا خرچہ باندھے۔''

''اماں، میں تمہاری ہی تو بیٹی ہوں۔ میں نے یہ سودا پہلے ہی طے کر لیا ہے۔ میں اس سے صرف خرچہ وصول نہیں کروں گی بلکہ مجرے کا نقصان بھی اس سے وصول کروں گی۔''

''شاباش! میں سمجھوں گی میری تربیت رائگاں نہیں گئی۔'' افشاں بیگم نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''اچھا تو یہی ہوتا کہ سرفراز علی تجھ سے شادی کر لیتے۔''

''اماں تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ شریفوں سے وفا کی امید مت رکھنا۔''

''وفا مل تو گئی۔ چاند خاں تجھ پر جان فدا کرنے کو تیار رہتا ہے۔''

افشاں بیگم کو پہلی مرتبہ نقصان کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ شاندار بستر پر لیٹی ان کانٹوں کی چبھن محسوس کر رہی تھیں جو شوہر کی بے وفائی سے لے کر اب تک ان کے جسم میں پیوست ہوتے رہے تھے۔ اپنے گناہ یاد آئے تو لرز کر رہ گئیں۔ شوہر سے انتقام لینے کے اور بھی طریقے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے جسم فروشی اختیار کی تھی۔ اب انتقام کا یہ دائرہ پھیل کر ان کی بیٹی تک آگیا تھا۔ اگر انہوں نے یہ راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج ان کی بیٹیاں کوٹھے پر نہ ہوتیں۔ ستارہ کو اس حال تک پہنچانے کی گناہ گار بھی وہی تھیں۔

وہ خاندانی طوائف نہیں تھیں۔ ایک حادثے نے انہیں طوائف بنا دیا تھا۔ اگر وہ کسی کوٹھے پر ہی پیدا ہوئی ہوتیں تو یہ خیالات ہرگز انہیں نہ ستاتے۔ انتقام کی جس آگ نے مجھے جلا دیا اب وہی آگ ستارہ کا تعاقب کر رہی ہے۔ میں شرافت کی زندگی گزار رہی تھی۔ انتقام کے راستے پر چلی تو طوائف بن کر رہ گئی۔ طوائف بننے کے بعد وہ اور کتنی گرے گی۔ اس کا انتقام سرفراز علی کو کہیں کا نہ چھوڑے گا۔ وہ ستارہ کو اس انتقام سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی یہ سوچتے ہی وہ ستارہ کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔

''تو اس بچے کو گرا دے۔''

''اماں، میں نے آج تک آپ کا ہر حکم مانا ہے لیکن یہ حکم نہیں مانوں گی۔ سرفراز علی نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ مجھے اپنی پاکیزہ دنیا میں لے جائے۔ اب میں اسے بتاؤں گی انتقام کیا ہوتا ہے۔ اس کا بیٹا اس غلیظ دنیا میں طوائفوں کے پاؤں دبائے گا۔ یہ تماشا دیکھنے سرفراز علی ہر مہینے میرے پاس آیا کرے گا۔''

''ستارہ، میں نے بھی کسی سے انتقام لینا چاہا تھا لیکن

اس انتقام کا نشانہ میں خود بن گئی۔ تو بھی اسی راستے پر چل نکلی ہے۔ یہ آگ کہیں تجھے جلا نہ دے۔"

"میں طوائف تو بن گئی۔ اب اس سے زیادہ اور اپنا کیا نقصان کروں گی۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر میرے بیٹی ہوئی تو اسے کسی گھر کی بہو بنا دوں گی۔"

"سرفراز علی کی جان بخش دے۔"

"یہ تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی۔ وہ مجھے طوائف بنا کر چھوڑ گیا ہے اور طوائف اپنے عاشق کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی۔ میں اسے امیر سے فقیر بنا دوں گی۔ آپ درمیان میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ آپ نے مجھے تنگ کیا تو میں چاند خاں کے ساتھ بھاگ بھی سکتی ہوں۔"

یہ دھمکی ایسی تھی کہ افشاں بیگم کو چپ لگ گئی۔ ستارہ بیگم ان کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ ایک بیٹی نیلما بھی تھی لیکن اس کی آنکھ میں فرق تھا۔ آواز بھی بس واجبی سی تھی۔ افشاں بیگم کے کوٹھے کی شان و شوکت تو ستارہ کے دم سے تھی۔ اگر اس کی شادی ہو جاتی تو الگ بات تھی لیکن وہ کسی میراثی کے ساتھ بھاگ جائے اور گھر میں فاقے ہونے لگیں، یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ نو مہینے رقص نہیں کرے گی لیکن بیٹھ کر تو گا لے گی۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اسے برداشت کرتی رہیں۔

ایک لمبی سی کار گلی کے باہر آکر رکی تھی۔ سرفراز علی اس کار سے اتر کر پیدل گلی میں داخل ہوتا تھا۔ ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتا تھا۔ یہ تمام راستہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن ان راستوں کے لیے اب وہ خود اجنبی ہوگیا تھا۔ اب وہ تماش بین نہیں تماشا تھا۔ یہ تماشا دیکھنے ستارہ خود دروازے پر آتی تھی اور نوٹوں سے بھرا لفافہ لے کر اندر چلی جاتی تھی۔ ہر ملاقات میں یہ عہد ضرور کر لیتی تھی کہ وہ اس راز کا کسی پر انکشاف نہیں کرے گی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر بار یہ دھمکی دے دیا کرتی تھی کہ اگر یہ پیسے پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی تو وہ اس کی عزت کا جنازہ نکال سکتی ہے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ سرفراز علی حسب معمول اپنے دفتر پہنچا تھا کہ اس کی سیکریٹری نے اطلاع دی۔

"سر، کوئی لاڈلا نام کا شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے آپ اسے جانتے ہیں۔"

لاڈلا کا دفتر میں آنا اسے ناگوار گزرا تھا۔ پہلے اس نے سوچا ملنے سے انکار کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ وہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔ وہ انتظار کرنے کو بھی نہ کہہ سکا۔ فوراً بلا لیا۔

لاڈلا اپنے حلیے ہی سے اوباش دکھائی دے رہا تھا۔ سفید ململ کا کرتا، ٹانگوں میں آڑا پاجامہ۔ پیلے رنگ کا رومال گلے میں پھندے کی طرح پڑا ہوا۔ سر پر چھدرے بال، ڈاڑھی مونچھ صاف، ہونٹوں پر ہنسی جمائے کمرے میں داخل ہوا۔

"سرفراز میاں، قسم اللہ کی! اگر تمہارے دفتر والوں کا خیال نہ ہوتا تو مٹھائی لے کر آنے کو جی کر رہا تھا۔ ایسی خبر لایا ہوں۔ ستارہ کے بیٹی ہوئی ہے۔ اس کا باپ کون ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

اگر اس وقت کوئی دیکھنے والا ہوتا تو دیکھتا' سرفراز علی کا چہرہ ہلدی سے زیادہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ اس دن کا منتظر تو یقیناً تھا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔ لڑکی کا سنتے ہی اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کی رگوں میں میرا خون ہوگا لیکن وہ طوائف بننے پر مجبور کر دی جائے گی۔ ذرا بڑی ہوگی تو اس کے پیروں میں گھنگرو باندھ جائیں گے۔ ایک لمحے کو تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اپنی ساری دولت دے کر اسے اپنے گھر لے آئے لیکن اپنی عزت انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اپنی عزت کتنی عزیز ہوتی ہے یہ وہ نومولود بچے بتاتے ہیں جن کو اکثر نادیدہ ہاتھ قتل کر کے کچرا کنڈیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ ناجائز بچوں کی مائیں بننے والی لڑکیاں اپنی عزت بچانے کے لیے اپنی ممتا کو مار دیتی ہیں۔ یہ بچی بھی تو ناجائز ہے۔ ستارہ سے میرا نکاح کب ہوا تھا اگر میں اسے گھر لے آؤں تو کیا فرزانہ اس کی ماں کا نام نہیں پوچھے گی؟ کیا میں بتا سکوں گا کہ اس بچی کی ماں ایک طوائف ہے جس سے میرے تعلقات تھے۔ کیا یہ صدمہ امی جان برداشت کر لیں گی؟ کیا والد صاحب کی نیک نامی برقرار رہ سکے گی؟ کیا میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق رہوں گا۔

سرفراز علی کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ لاڈلا گھبرا گیا۔ میز پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گلاس اٹھا کر سرفراز کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"سر، میرا مطلب آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو اس لیے یہ خبر سنانے آگیا تھا کہ مجھے انعام مل جائے گا۔ دو تین دن کی شراب کا خرچ نکل آئے گا۔"

"تیری یہ ہمت کیسے ہوئی کہ میرے دفتر میں چلا آئے۔"

"میں چلا جاتا ہوں لیکن یہ یاد رکھو اگر ستارہ خود یہ خبر دینے یہاں یا آپ کے گھر پہنچ جائے تو کیا ہوگا۔"

"اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"آپ صرف چند دن ایک کوٹھا چڑھے اترے ہیں۔ میری عمر گزر گئی ہے۔ میں ان طوائفوں کو بھی جانتا ہوں اور ان کے وعدوں کو بھی۔ ذرا سوچیں اگر میں جا کر یہ کہہ دوں کہ آپ نے خرچ دینے سے انکار کر دیا ہے تو ستارہ کو اپنا عہد توڑتے دیر نہیں لگے گی۔ میں تو آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا کہ مجھ سے بنا کر رکھیں۔ آپ کی سیکریٹری مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کس لیے حاضر ہوا ہوں۔ اگر میں اسے بتا دیتا تو سوچیے کیا ہوتا یا میں دفتر آنے کے بجائے آپ کے گھر آتا تو؟"

سرفراز علی اس چھپی ہوئی دھمکی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر لاڈلا کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تو میرا انعام ہوگیا۔" لاڈلا نے کہا۔ "اب جو کچھ ستارہ کو دینا ہو وہیں آکر دیجیے گا۔"

لاڈلا ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سرفراز علی کا اب دفتر میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ ضروری کام نمٹائے اور دفتر سے اٹھ گیا۔ احمد علی نے اس کی شادی کے بعد ایک دفتر اس کے حوالے کر دیا تھا لیکن مہینے دو مہینے بعد حساب کتاب خود آکر چیک کر لیا کرتے تھے۔ ستارہ اسے بہانے بہانے سے خوب لوٹ رہی تھی لیکن وہ اس خوبی سے حساب کتاب میں گڑبڑ کر رہا تھا کہ ابھی تک اس کی چوری نہیں پکڑی گئی تھی البتہ وہ ڈرتا ضرور رہتا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ ستارہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے لیکن اس سے پیچھا چھڑانا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کا ایسا راز ستارہ کے ہاتھ میں تھا کہ اگر کھل جاتا تو بڑی بدنامی ہوتی۔

وہ دفتر سے گھر پہنچا تو بخار کی آگ میں اس کا بدن جل رہا تھا۔ فرزانہ نے فوراً ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ وہ دوا دے کر چلا گیا۔ سرفراز نے نیند کا بہانہ کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دوا نے اثر دکھایا اور کچھ دیر میں بخار کی شدت میں کمی آگئی۔ اب اس کا ذہن سوچنے کے قابل ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر لاڈلا کی طرف چلا گیا۔ اس کے دھمکی آمیز فقرے یاد آنے لگے۔ اگر ستارہ کے دل میں انتقام کی آگ روشن ہوگئی اور وہ بچی کو لے کر یہاں آگئی تو کیا ہوگا۔ کیا میں اسے جھٹلا سکوں گا؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر فرزانہ کو بلا لے اور اپنے گناہ کا اقرار کر لے۔ اپنی بیٹی کو جا کر لے آئے اور فرزانہ کی گود میں ڈال دے۔ اس معصوم نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسے طوائف بننے کے لیے ستارہ کے پاس چھوڑ دے۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ ہونے والی بچی اس کی ہے بھی یا نہیں۔ کسی اور کا گناہ ہو جو ستارہ نے اس کے سر تھوپ دیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اسے سکون سا مل گیا۔

انسان اپنی پردہ پوشی کے لیے مختلف جواز تلاش کر لیتا ہے۔ یہی حال اس وقت اس کا تھا لیکن وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا تھا کہ ستارہ سے اس کا جسمانی تعلق رہ چکا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر بے سکون ہوگیا۔ اس بے سکونی میں مظلومیت نہیں گناہ کا احساس تھا۔ میری اولاد طوائف بنے گی؟ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ بدنامی کا طوق گلے میں ڈال لوں گا۔ لیکن اعلانیہ کہوں گا کہ ستارہ کی کوکھ سے جنم لینے والی بچی میری بیٹی ہے۔ میں اسے ستارہ کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ کیا اسے وہ عزت مل سکے گی جو جائز اولاد کو ملتی ہے؟ وہ بڑی ہو کر ان طعنوں کو برداشت کر سکے گی کہ وہ اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہے؟ کیا وہ مجھ سے نہیں پوچھے گی کہ جوانی میں آپ کے قدم کسی کوٹھے کی طرف اٹھے تھے۔

فرزانہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر فرزانہ گھبرا گئی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ دلاسا ملا تو اس کے آنسو اور بھی بے قابو ہوگئے۔ وہ فرزانہ کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

"فرزانہ تم جانتی ہو میں کتنا بڑا گناہ گار ہوں؟"

"مجھے یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان تو نام ہی گناہوں کا ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اپنی غلطیاں دوسروں پر نہ ظاہر ہوں۔ اسی لیے میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ کوئی اعتراف میرے سامنے کریں۔ مجھے آپ کے ماضی سے نہیں حال سے غرض ہے اور میں یہ قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ مخلص ہیں۔"

"تم نہ چاہو لیکن میں اپنے ایک جرم میں تمہیں ضرور شریک کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"اگر میری مدد درکار ہے تو ضرور بتاؤ۔"

اس سے پہلے کہ سرفراز جذبات کی رو میں آکر سب کچھ بتا دیتا ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بڑی بیگم صاحبہ سرفراز کو دیکھنے کے لیے آرہی ہیں۔ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

☆☆☆

طوائفوں کے گھر بیٹی پیدا ہوجائے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی پوشیدہ خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔لیکن ستارہ تو یوں پریشان ہوگئی جیسے اس نے سانپ کو جنم دے دیا ہو۔اسے لڑکے کی آرزو تھی۔وہ اس کے لیے کمائی کا ذریعہ نہ بنتا لیکن اس کی امنگوں کا سہارا ضرور بنتا۔اس کے عزائم میں شامل تھا کہ جوان ہونے کے بعد وہ اسے سرفراز علی کے مقابل کھڑا کرے گی۔وہ اس سے اپنا حق بھی مانگے گا اور بڑھاپے میں اسے رسوا بھی کرے گا لیکن چال الٹی پڑ گئی تھی۔افشاں بیگم تو اسے مبارک باد دے رہی تھیں کہ بڑھاپے کا سہارا پیدا ہوگئی ہے لیکن ستارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''طوائف کی گود میں بیٹی آجائے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ذرا سوچ تو نہ ہوتی تو میں کب کی مرکھپ گئی ہوتی۔''

ستارہ سن رہی تھی اور پیچ وتاب کھا رہی تھی۔پھر وہ کسی خیال سے قہقہہ مار کے ہنس پڑی۔اس کے قہقہے تھے کہ تھمنے میں نہ آتے تھے۔افشاں بیگم اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔

''میری بچی ہوش میں آ۔کیا پاگل ہوگئی ہے۔''

''پاگل تو اب سرفراز علی ہوگا۔میں نے سوچ لیا ہے مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کیا کرے گی تو۔کچھ ایسا ویسا مت کر بیٹھنا اس بچی کے ساتھ۔''

''مجھے جو کرنا ہے وہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ سرفراز علی کی غیرت کا جنازہ سرعام نیلام کروں گی۔''

''چھوڑ دے اس شریف آدمی کا پیچھا۔''

''اماں،کمال ہے!یہ تم کہہ رہی ہو۔طوائف جب کسی کا پیچھا کرتی ہے تو قبر تک نہیں چھوڑتی۔اس کی نسلوں تک کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔''

''میں تو یوں کہہ رہی تھی کہ سرفراز میاں خرچ پہنچا تو رہے ہیں۔''

''دولت والوں کی دولت میں کوئی کمی نہیں آتی۔انہیں اپنی مفلسی کا احساس تو اس وقت ہوتا ہے جب ان کی عزت کا سرمایہ لٹتا ہے۔میں سرفراز علی کو اسی مفلسی سے دوچار کروں گی۔''

''یہ نادانی مت کرنا کہ بچی کو لے کر اس کے گھر پہنچ جاؤ۔خرچے سے بھی جاؤ گی۔''

''میں اتنی نادان نہیں ہوں۔جو کام کروں گی وقت آنے پر کروں گی۔میں نے سوچ بھی لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

سرفراز علی کا بخار ابھی اترا نہیں تھا صرف کم ہوا تھا لیکن ہمت کر کے اٹھ گیا تھا۔اسے ستارہ کی طرف جانا تھا۔وہ لاڈلا کے دفتر آنے سے گھبرا گیا تھا۔ستارہ سے جانے کیا الٹی سیدھی لگا دے۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اب ستارہ کے تیور کیا ہیں۔

ایک لمبی سی کار ستارہ کی گلی کے باہر آ کر رکی۔شام ہوگئی تھی۔گلی میں چہل پہل دن کے مقابلے میں کچھ بڑھ گئی تھی۔سرفراز علی پیدل چلتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ایک مکان کی سیڑھیاں چڑھیں اور دستک دے دی۔چاند خاں دروازے پر آیا اور الٹے پاؤں لوٹ گیا۔اس کے جاتے ہی ستارہ بیگم دروازے پر آگئی۔

''اماں،سرفراز صاحب آئے ہیں۔میں صدقے میں قربان۔آیئے اندر آیئے۔''

''نہیں شکریہ۔میں بس یہ لفافہ تمہیں دینے آیا تھا۔ویسے بھی تمہارے مجرے کا وقت ہونے کو ہے۔''

''تو اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔مجرا تمہاری بیٹی تو نہیں کرے گی۔ابھی تو خیر سے بہت دن ہیں اس کے گھنگرو باندھنے میں۔''

''ستارہ،میرے سامنے تمہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔''

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔اس کی پرورش یہاں ہوگی تو مجرا ہی کرے گی۔لڑکیاں تو لوکی کی بیل ہوتی ہیں،دیکھتے دیکھتے جوان ہوجائے گی۔اتنی غیرت ہے تو میں تیار ہوں۔کل ہی جا کر تمہاری بیوی کی گود میں ڈال آتی ہوں۔''

''نہیں ستارہ ہرگز نہیں۔ایسا ہرگز مت کرنا۔''

''اپنی بیٹی کو دیکھو گے نہیں۔''

''میں تو اسے دیکھ لوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیکھے۔''

''ٹھیک ہے یہ پردہ بھی رکھ لیتے ہیں۔ایک گزارش اور ہے۔جتنا خرچ آپ دیتے ہیں اگلے مہینے سے اس کا دوگنا کر دیجیے۔ہمارے گھروں میں بچیوں پر خرچ بہت کیا جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں رقم بڑھا دوں گا۔''

وہ اس کے دروازے سے ہٹا تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ بیٹی کی پیدائش پر نہیں اسے دفن کرنے آیا ہو۔اس کے لیے وہ مر ہی تو گئی تھی۔وہ ایک ایسا بدنصیب باپ تھا جو اپنی بیٹی کو اس خوف سے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کہیں

اس کے دل میں بیٹی کی محبت پیدا نہ ہو جائے۔

☆☆☆

پانچ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران سرفراز علی کئی نشیب و فراز سے گزرا۔ کئی تبدیلیوں کا منہ دیکھا۔ فرزانہ نے اس کو ایک بیٹے کا تحفہ دیا جس کا نام اس نے ایاز علی رکھا۔ والدہ کا انتقال ہو گیا اور والد احمد علی ایسے بیمار پڑے کہ اپنا تمام کاروبار سرفراز علی کے حوالے کر کے بستر سے لگ گئے۔

ایاز علی کی پیدائش کے بعد سرفراز کو نکبی سکون ملا تھا۔ اب تک وہ خود کو مفلس سمجھ رہا تھا مگر اب وہ بھی مالدار تھا۔ اسے اب اپنی بیٹی کا خیال بہت کم آتا تھا لیکن اب وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ستارہ بلیک میلنگ پر اتر آئی ہے۔ اس کے مطالبات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ بچی کے خرچ کے نام پر پورے گھر کے اخراجات سرفراز ہی کو اٹھانے پڑ رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے کوڑی کوڑی کو محتاج کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کئی دنوں سے لاڈلا نے یہ وتیرا اختیار کر لیا تھا کہ وہ اس سے ملنے اس کے گھر چلا آتا تھا۔ کہتا کچھ نہیں تھا لیکن یہ ظاہر کرتا تھا کہ کچھ کہنے کے لیے ہی آسکتا ہے۔ شکر یہ ہوا تھا کہ فرزانہ اسے پہچان نہیں سکی تھی کہ یہ وہی آدمی ہے جو شادی سے پہلے اس وقت ملا تھا جب وہ سرفراز کے ہمراہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہی تھی اور بڑی بدتمیزی سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی لیکن وضع قطع سے عجیب سا لگا تھا۔ اس نے سرفراز سے کہا بھی تھا کہ اس نے کیسے کیسے دوست بنا رکھے ہیں۔ سرفراز نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ بزنس میں ہر قسم کے لوگوں سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔

اس نے فرزانہ کو چپ ضرور کرا دیا تھا لیکن اس بلا سے خود بھی پریشان تھا۔ یہ کیسے کہتا کہ وہ گھر نہ آیا کرے۔ اس کا دفتر میں آنا اور بھی خطرناک تھا۔ نہ جانے کس کے سامنے کیا بک دیتا۔ وہ اس زیادتی کو سہتا رہا لیکن یہ سوچ کر کانپ بھی جاتا تھا کہ لاڈلا نے گھر دیکھ لیا ہے۔ فرزانہ کی والدہ نے ایک کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ ان کا بیٹا بھی آسٹریلیا سے آگیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کوٹھی میں منتقل ہو گئی تھی۔ پہلے اس نے سوچا وہ بھی فرزانہ کو لے کر وہاں منتقل ہو جائے لیکن پھر خود ہی اپنے فیصلے کی تردید کر دی۔ یہ کوئی حل نہیں تھا۔ لاڈلا حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ وہاں کا پتا بھی لگا لیتا۔ ایک شہر میں رہ کر وہ کب تک چھپ سکتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر بیرون ملک منتقل ہو جائے تو ستارہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا لیکن باپ کی بیماری سے مجبور تھا۔ ساتھ لے جانے کے قابل وہ تھے نہیں اور چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔ رسوائی کے خوف سے ستارہ کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کے لیے دولت لٹاتا رہا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ احمد علی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سعادت مند اولاد کی طرح ان کی تیمار داری میں دن رات ایک کر رہا تھا لیکن وہ انہیں بچا نہ سکا۔ احمد علی کا انتقال ہو گیا۔

اس کے اپنے حالات کی طرح ملک کے حالات بھی دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ لاقانونیت بڑھتی جا رہی تھی۔ جان و مال سلامت نہیں رہے تھے۔ جرائم پیشہ افراد کی بن آئی تھی۔ بڑے پیمانے پر بھتا وصول کیا جا رہا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کھلے عام فیکٹریوں اور کارخانوں میں داخل ہوتے یا پرچیاں بھیجتے کہ اتنی رقم کا بندوبست کر لو ہمارا آدمی آکر لے جائے گا۔

سرفراز یہ وحشت ناک خبریں سن ضرور رہا تھا لیکن جب ایک دن ایک گم نام فون اس کے نام بھی آگیا تو اسے یقین ہو گیا۔ اس نے فون کرنے والے کو جھڑک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ خاموشی سے ان لوگوں کے مطالبات پورے کر دیتے ہیں اسی لیے ان کی اتنی ہمت ہو گئی ہے۔ ان کے سامنے کوئی ڈٹ جائے تو یہ نوبت نہ آئے۔ اس نے فون کرنے والے سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی حالت میں اس کا مطالبہ پورا نہیں کرے گا بلکہ پولیس کو اطلاع بھی کرے گا۔ اس نے اس فون کی اطلاع اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن پر درج بھی کرا دی لیکن کوئی خاطر خواہ کارروائی نہیں ہوئی۔

دو چار دن بعد وہی فون پھر آیا۔ اس فون کو سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ فون کرنے والا اس کے بیٹے ایاز کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

”تمہارے بیٹے کا نام ایاز ہے۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔ ابھی نیا نیا اسکول جانے کے قابل ہوا ہے۔ جس اسکول میں پڑھتا ہے وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اگر کوئی اسے راستے میں سے اغوا کر لے تو تمہیں کیسا لگے گا۔“

”کون ہو تم کیا چاہتے ہو؟“

”کروڑوں کماتے ہو ہم نے صرف چند لاکھ مانگے تھے۔ تم نے انکار کر دیا۔“

”فون بند مت کرنا۔ میں رقم دے دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہمارا آدمی پہنچ جائے گا۔ سلیم مردار نام بتائے گا۔ پچاس لاکھ اسے دے دینا پولیس

بلانے کی غلطی مت کرنا۔ پولیس تمہارے بیٹے کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔“

فون بند ہوتے ہی سرفراز نے ایک آدمی کو بینک بھیجا اور رقم منگوالی۔ اسے اپنی بے عزتی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ میں اس ملک میں اتنا بے وقعت ہو گیا کہ ایک گمنام فون پر اتنی بڑی رقم دینے پر مجبور ہوں۔ ابھی ایک غنڈا میرے دفتر میں آئے گا اور رقم لے کر چلا جائے گا۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔ یہی ہوا۔ اس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پہلے اس کی سیکریٹری سے ملا جاتا ہے۔ وہ بڑی بدتمیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

”میرا نام سلیم مردار ہے۔“

سرفراز نے رقم اس کے حوالے کر دی۔ وہ جیسے آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

”ہیلو، فرزانہ۔“ سرفراز اپنی بیوی کو فون کر رہا تھا۔

”ڈرائیور سے کہو، ایاز کو اسکول سے لے آئے۔“

”ابھی سے؟ ابھی تو چھٹی کا وقت نہیں ہوا۔“

”جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ چھٹی سے پہلے لے آؤ۔“

”خیریت تو ہے سرفراز۔ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔“

”میں گھر پہنچ رہا ہوں۔ گھر آکر بتاؤں گا۔“

وہ گھر پہنچا تو ایاز علی اسکول سے آچکا تھا۔ فرزانہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

سرفراز نے آتے ہی بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ اس طرح اسے چوم رہا تھا جیسے برسوں بعد ملاقات ہو رہی ہو۔

”ایاز کو کل سے میں اسکول چھوڑنے اور لینے جاؤں گا۔ ڈرائیور نہیں جائے گا۔“

”آپ ہی چھوڑ آئیے گا مگر بتائیے تو بات کیا ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔

سرفراز نے فرزانہ کو تفصیل بتائی تو اس کے ہوش بھی اڑ گئے۔ وہ عورت تھی، ماں تھی۔ کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی۔

”ایاز آج سے اسکول نہیں جائے گا۔ آپ بھی اسے چھوڑنے نہیں جائیں گے۔“

”جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے اسکول نہ بھیجوں لیکن کب تک۔“

”کچھ بھی ہو جائے۔ میں اپنے بچے کو گھر میں پڑھا لوں گی۔ مجھے تو آپ کی فکر بھی لگی ہوئی ہے۔“

”میں نے ان کا منہ بند کر دیا ہے۔ اب وہ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ سوچنا تو یہ ہے کہ میں کب تک اپنی کمائی لٹاتا رہوں گا۔ یہاں تو کوئی کہنے سننے والا ہی نہیں ہے۔ حکومت نام کی تو کوئی چیز یہاں ہے ہی نہیں۔“

”آپ نے ایک مرتبہ بیرون ملک جانے کا بھی ارادہ کیا تھا۔“

”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ بہت سے مل مالکان ملائیشیا اور بنگلادیش میں اپنا سیٹ اپ لگا رہے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں بھی پرواز کے لیے پر کھولوں۔ ایسا کب تک چلے گا۔“

اس نے خوب اچھی طرح غور کیا۔ ایک طرف ستارہ کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ دوسری جانب بھتا خوری کی وبا پھیل رہی تھی۔ لوڈشیڈنگ کا عذاب الگ تھا۔ اتنے محاذوں پر میں اکیلا کیسے لڑ سکتا ہوں، اس نے سوچا۔ یہ بھی یقین نہیں ہے کہ جان کب تک بچی رہتی ہے۔ ٹارگٹ کلنگ کا بازار گرم ہے۔ اچھا تو یہی تھا کہ میں اپنے ملک کی خدمت کرتا۔ اس کی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا لیکن زندہ رہوں گا تو یہ کردار ادا کروں گا۔ کس وقت کون سی گولی میری زندگی کے چراغ کو گل کر دے۔ کون سا ہاتھ میرے بچے کو اٹھا لے جائے۔ وہ وقت آنے سے پہلے بہتر ہے کہ میں یہ ملک چھوڑ دوں۔ اس نے خاموشی سے کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے ایک دوست ملائیشیا چلے گئے تھے۔ اس نے ان کے توسط سے اپنا سرمایہ منتقل کرنا شروع کر دیا۔ خود بھی ملائیشیا گیا۔ ایک بار نہیں کئی چکر لگائے۔ اس دوران وہ ستارہ کو پابندی سے خرچ پہنچاتا رہا۔ لاڈلا کئی مرتبہ آیا۔ اسے بھی خبر نہ ہونے دی کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو اس نے ملک چھوڑ دیا۔ جہاز میں بیٹھتے ہوئے اسے اپنی بیٹی کا خیال آیا جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نام تک اسے معلوم نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں فرط جذبات سے بھیگ گئی تھیں۔

”آپ کیوں اداس ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی ہم پھر یہاں آجائیں گے۔ ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔“

”تمہیں کیا معلوم میں یہاں کیسی کیسی انمول یادیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

جہاز نے اڑان بھری۔ سرفراز علی نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

”ارے لڑکی، تو اب تک یونہی پھر رہی ہے۔ محفل کا

وقت ہونے کو ہے۔ گھنگرو تو رہی دور کی بات ہاتھوں میں پھولوں کے کنگن تک نہیں ڈالے۔ اپنے حسن پر ہمیں بھی ناز تھا لیکن مردوں کو رجھانے کے لیے روپ سنگار تو ہم بھی کر لیتے تھے۔''

''تو کیا میں نہیں کرتی۔ آج ایسی کیا بات ہے جو یوں بوکھلا رہی ہو اماں۔''

''آج تیری نہیں میری فتح کی رات ہوگی۔ وہ آرہا ہے جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔''

''سچ اماں، بتاؤ تو سہی کون ہے وہ۔ پھر تو میری جگہ آپ سنگار کریں۔''

''شکار میرا ہے لیکن گردن تو تیرے ہاتھ میں ہوگی۔ تجھ سے آج تک کوئی بچا ہے جو وہ بچے گا۔''

''خالی پر نوچوں یا چونچ بھی توڑنی ہے۔''

''اے ہے، مرغا ہے، پروں پر چاندی لپیٹ کر آئے گا۔ بس چھری پھیرنے کے سوا سب کچھ ایسا کرنا کہ جیبیں خالی کرتا رہے۔''

''سچی اماں، تم ہو بڑی چالاک۔''

''پیار کا ایسا ناٹک کرنا کہ لیلیٰ مجنوں یاد آجائیں۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے وہ رفتہ رفتہ تجھے خود پتا چلتا جائے گا۔''

''یہ بات ہے تو یوں گئی اور یوں تیار ہوگی۔''

''اور دیکھو ویسا ہی کرنا جیسا تجھے بتایا ہے۔''

اس کے جاتے ہی چاند خاں اندر آگیا۔

''اب تو خوش ہو۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ بیس سال بعد سرفراز علی دوبارہ دریافت ہوگیا۔ میں نے بھی ایسے بندے کو اس کے بیٹے کے پیچھے لگایا کہ اس نے اس غریب کو شیشے میں اتار ہی لیا۔''

''واقعی کمال ہوگیا۔ اس سے بڑا کمال یہ ہوا کہ ایاز علی یہاں آنے پر تیار بھی ہوگیا۔''

''ہوتا کیسے نہیں۔ باتوں کے جادو میں تو اچھے اچھے گرفتار ہو جاتے ہیں۔''

''اب تم دیکھنا میں کرتی کیا ہوں۔ باپ بیٹے کو آمنے سامنے کھڑا نہ کردوں تو ستارہ چمارن نام رکھ دینا۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے ایاز علی کا کیا حال ہونے والا ہے۔''

''ایاز علی تو یونہی درمیان میں آگیا۔ مجھے تو سرفراز علی کا حساب بے باق کرنا ہے۔ یہ سوچ کر ملک سے باہر چلا گیا تھا کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔''

ستارہ بیگم وقت سے پہلے بوڑھی ہوگئی تھی۔ شاید انتقام کی آگ نے اسے جھلسا دیا تھا۔ افشاں بیگم اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اس کی یادگار لاڈلا تھا جو اب تک زندہ تھا لیکن بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔ شراب کے علاوہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ البتہ اس کے مشورے اب بھی کام آجاتے تھے۔ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ کوٹھے پر آنے والے ایک وکیل نے ایاز علی سے دوستی گانٹھی اور پھر ستارہ بیگم کی بیٹی دلشاد بیگم کے حسن کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ اسے دیکھنے بازار حسن تک آنے کو تیار ہو گیا اور بقول چاند خاں، بس آنے ہی والا ہے۔

بیس سال ملائیشیا میں گزارنے کے بعد سرفراز علی کو وطن کی یاد آئی تھی۔ ستارہ کا نام تک اس کے ذہن سے نکل گیا تھا، خطرہ کیسا۔ اس کا بیٹا ایاز علی جوان ہو چکا تھا۔ اس کی شادی بھی کرنی تھی۔ یہ کام اپنے وطن ہی میں ہو سکتا تھا۔ سرفراز نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کی اور پاکستان آگیا۔ اب وہ بیمار رہنے لگا تھا لہٰذا تمام کاروبار بیٹے کے سپرد کر کے مطمئن ہو گیا لیکن بدقسمتی ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ایک روز وہ چاند خاں کو نظر آگیا۔ اس نے جا کر ستارہ کو خبر کر دی۔ ستارہ نے آدمی پیچھے لگا دیے کہ اس کے بارے میں معلومات جمع کریں۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس نے پھر سے اپنا کاروبار جما لیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کاروباری دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ستارہ کے شیطانی دماغ نے منصوبہ بنا لیا۔ اس منصوبے کے مطابق ایاز کو باپ کے مقابل کھڑا کرنا تھا۔ اب ستارہ کے نشانے پر سرفراز علی نہیں ایاز تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ ستارہ جیسی عورتوں کے محلے دن میں سوتے ہیں رات کو جاگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ گناہ اندھیرے میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ بازار بھی اندھیرا ہوتے ہی روشن ہو گیا۔ کھڑکیاں سج گئیں۔

وقت پیچھے کی طرف چلنے لگا تھا مگر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ۔ گلی کے موڑ پر ایک لمبی کار آ کر رکی جیسے بیس سال پہلے آ کر رکتی تھی لیکن اس میں سرفراز علی نہیں اس کا بیٹا ایاز علی بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ وہ وکیل بیٹھا تھا جو اسے یہاں تک لے کر آیا تھا۔

''ایاز علی، یہاں سے ستارہ کے گھر تک پیدل چلنا ہوگا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ڈر لگ رہا ہے۔ ایسی جگہوں پر میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو لوٹ چلو۔ پھر کسی دن آجائیں گے۔''

''ڈر کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر دلشاد سے میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ انتظار کر رہی ہوگی۔''

''کسی نے دیکھ لیا تو۔''

''یہاں کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ بس تم گاڑی لاک کرو۔ ایک مرتبہ دلشاد کو دیکھ لو گے تو میرے بغیر ہی آیا کرو گے۔ وہ طوائف نہیں لڑکی ہے۔ کچی کلی ہے جو پھول بننے کے انتظار میں ہے۔''

''یار میں......''

''مرد ہو کر شرما رہے ہو۔'' وکیل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف چل دیا۔

ستارہ کے کوٹھے پر تمام انتظامات مکمل تھے بس مہمان کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ انتظار بھی ختم ہوا۔ پہلے وکیل اندر داخل ہوا پھر پچیس چھبیس سال کا ایک نوجوان شرماتا ہوا اندر آیا۔ یہ ایاز علی تھا۔

ہال نما کمرے میں دور تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ جہاں کمرا ختم ہوتا تھا باریک پردے پڑے ہوئے تھے ایاز علی ایک گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی گھبرا رہا تھا کہ ابھی اور لوگ بھی آئیں گے۔ کیا خبر ان میں کوئی جاننے والا بھی ہو۔ اگر بات گھر تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا۔

''ابھی اور لوگ بھی آئیں گے؟'' ایاز نے قریب بیٹھے ہوئے وکیل سے پوچھا۔

''گھبراؤ مت۔ محفل تو یہاں خوب سجتی ہے لیکن تمہارے لیے میں نے خاص اہتمام کرا دیا ہے۔ سب کا داخلہ بند ہے۔ آج کی محفل میں صرف تم ہی تم ہو گے۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ لوگوں کا سامنا کرنا واقعی میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پردے کو جنبش ہوئی اور ستارہ اندر آئی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ایاز علی تک آئی اور ہاتھوں کی کٹوری بنا کر سلام پیش کیا۔ ایاز علی گڑبڑا گیا تھا کہ جواب میں کیا کہے لیکن وکیل نے صورت حال سنبھال لی۔ اس نے ستارہ کا تعارف کرایا۔ ایاز علی کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس کے پاس اسے لایا گیا ہے بلکہ اسی لڑکی کی ماں ہے۔

''حضور کو بس چند گھڑیوں کی زحمت ہوگی۔ بچی تیار ہو رہی ہے۔''

''حضور کو تابِ انتظار کہاں ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''بڑی مشکل سے تو یہاں تک آئے ہیں۔''

''آپ سے زیادہ ہمیں ان کی فکر ہے۔ اللہ قسم جب سے وکیل صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے ہماری آنکھیں دروازے پر ہیں۔ میں نے تو منت بھی مان لی تھی۔ ایاز میاں آئیں گے تو گھی کے چراغ روشن کروں گی۔''

پردوں کو ایک مرتبہ پھر جنبش ہوئی۔ سازندے اندر آگئے۔ ابھی انہوں نے اپنی نشست سنبھالی تھی کہ چھم چھم کی آواز نے کمرے میں پھول بکھیر دیے۔ پردے کو پھر جنبش ہوئی۔ ایک لڑکی سولہ سنگار سے آراستہ آدھی پنڈلیوں تک گھنگرو باندھے چھم چھم کرتی آئی اور ایاز کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ایاز اپنی جگہ سے کھسکنے لگا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بیٹھے بیٹھے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''حضور کیا سننا پسند کریں گے۔''

ایاز کی عجیب حالت تھی۔ آنکھیں بند ہو گئی تھیں، ہونٹ خاموش تھے۔ دوسری جانب سے پھر پوچھا گیا۔

''بتائیے ناں، کیا سننا پسند کریں گے؟''

''جو آپ کا جی چاہے۔'' ایاز نے بڑی مشکل سے کہا۔

''اللہ ہم قربان جائیں آپ کے اس شرمانے پر۔'' دلشاد نے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سازندوں نے ساز ملائے۔ دلشاد نے غزل چھیڑ دی۔

ہم تو حیران ہوئے جاتے تھے آجانے پر
اور قربان ہوئے آپ کے شرمانے پر

غزل ایسی حسب حال تھی کہ ہر شعر ایاز کی حالت زار کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دلشاد کی ادائیں اور والہانہ رقص اس پر مستزاد تھا۔ عجیب سماں بندھ گیا۔

ایاز علی بھول گیا تھا کہ وہ کسی طوائف کے کوٹھے پر ہے۔ اسے ایسے ماحول کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا وہ تو بس یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی ہے جو صرف اس کے لیے نغمہ سرا ہے۔ عجیب سی لذت تھی جو اس کی رگوں میں اتر رہی تھی۔

غزل ختم ہوئی پھر دوسری غزل شروع ہوئی۔ ستارہ نے ایک کے بعد ایک کئی غزلیں سنائیں۔ ایاز کو نہ شاعری سے دلچسپی تھی نہ ان کے مفہوم کو سمجھ رہا تھا لیکن کوئی بات ایسی تھی کہ ہر غزل کے بعد اس کا جی چاہتا تھا یہ لڑکی اسی طرح ناچتی رہے۔

مجرا ختم ہوا۔ وکیل نے ایاز کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ایاز کو یاد آگیا کہ آتے وقت وکیل نے اس سے کیا کہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑے نوٹوں کی ایک گڈی دلشاد کی طرف بڑھا دی۔ دلشاد

نے جھک کر تین سلام کیے اور نذرانہ قبول کرلیا۔

ستارہ نے وکیل کو اشارہ کیا۔ اشارے کا مطلب یہ تھا کہ سیر ہو کر پانی نہ پینے دو۔ پیاسے کو پیاسا ہی اٹھا دو۔

''یار، تم بیٹھو۔ میں زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب جانا ہوگا۔''

''میں...... اکیلا...... یہاں۔ چلو پھر میں بھی چلتا ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

ایاز علی اٹھ کر کھڑا ہوا تو دلشاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بیٹھیے نا، کچھ دیر باتیں کریں گے۔''

''نہیں اب میں چلوں گا۔''

''ایک شرط پر جانے دوں گی۔ آپ پھر آئیں گے۔ آپ کو میں نے تماشائی نہیں سمجھا ہے۔ آپ تو میرے دل میں اتر گئے ہیں۔''

نوخیز ایاز علی کی سماعت نے کسی لڑکی کی زبانی ایسا بھرپور اصرار کبھی نہیں سنا تھا۔ جب اس سے یہ اصرار کیا جارہا تھا وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہ لڑکی ایک طوائف بھی ہے۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ پھر آئے گا۔

''ہاں ہاں میاں، پھر آنا۔ اس گھر کے دروازے تم پر بند تھوڑی ہیں۔'' ستارہ نے اس وعدے کو مزید پختہ کردیا۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اسے دلشاد کی یاد آنے لگی لیکن وہ وکیل غائب تھا جو اسے دلشاد کے گھر لے کر گیا تھا وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ غالباً یہ بھی منصوبے کا حصہ تھا کہ ایاز کی آتشِ شوق کو بھڑکایا جائے۔ یہ آگ واقعی اتنی بھڑک گئی تھی کہ تیسرے دن ہمت کر کے ایاز علی خود دلشاد کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بھول گیا تھا کہ وہ دلشاد سے نہیں دلشاد بائی سے ملنے آیا ہے۔ یہ کسی لڑکی کا گھر نہیں طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہ مجرے کا وقت تھا۔ محفل عروج پر تھی۔ اس نے اندر قدم رکھا اور دلشاد کی نظر اس پر پڑی تو وہ بے تال ہوگئی۔ سارنگی کی روں روں ہوتی رہی لیکن دلشاد کے پاؤں رقص کرنا بھول گئے۔ پھر اس نے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے دائرہ سا بن کر گھومنے لگی۔ اس کی پشواز کا دامن حلقہ بنا کر بلند ہوا اور اس کی کمر تک آگیا۔ وہ دائرہ وار آگے بڑھی اور وہاں تک آگئی جہاں ایاز علی کھڑا تھا۔ اس نے ایاز علی کا ہاتھ پکڑا اور ایک خالی جگہ پر بٹھادیا۔ اس بھری محفل میں وہ اسے اتنی ہی اہمیت دے سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک من چلے تماشائی نے اس کی کلائی پکڑلی تھی اور اس پر نوٹ نچھاور کررہا تھا۔ ایاز تلملا کر رہ گیا۔ وہ تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ پہلے دن کی طرح اس وقت بھی ستارہ اس کے لیے گائے گی لیکن وہ تو شمع محفل بنی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے فقرے اچھالے جارہے تھے۔ اس سے یہ سب برداشت نہیں ہورہا تھا لیکن مجبور تھا۔ اٹھ کر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

مجرا ہوتا رہا۔ وہ جھنجلاتا رہا مگر جبر کر کے بیٹھا رہا۔ مجرا ختم ہوا اور لوگ رخصت ہوئے لیکن ایاز بیٹھا رہا۔ دلشاد اس کے قریب آکر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کردیں۔ ستارہ نے خونخوار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''دلشاد، تماشائیوں سے اتنی بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔''

''یہ کوئی تماشائی تھوڑی ہیں۔''

''میں جو کوئی بھی ہوں شاید آئندہ نہ آسکوں۔''

''بندی کا قصور۔''

''مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ تم اتنے لوگوں کے سامنے ناچو۔''

دلشاد کیا جواب دیتی لیکن ستارہ بول پڑی۔ ''میاں، ابھی تک بچے ہو۔ یہ شریفوں کا گھر نہیں طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ انہی لوگوں سے ہمارا رزق وابستہ ہے۔ میں کس برتے پر تمہاری خاطر ان سب کو روک دوں۔''

''میرے جو جذبات تھے ان سے میں نے آپ کو آگاہ کردیا۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو خرچ اٹھانے کا وعدہ کرو۔ دلشاد صرف تمہارے لیے ناچ لیا کرے گی۔''

''مجھے منظور ہے۔ میں اتنا خرچ دوں گا جتنا سب تماشائی مل کر بھی نہیں دے سکتے۔''

''اے میں قربان لیکن میاں ایک شرط میری بھی ہے۔ تمہیں دن کے وقت آنا ہوگا۔''

''مجھے یہ بھی منظور ہے۔''

''آپ کتنے اچھے ہیں۔'' دلشاد نے کہا۔ ''تو پھر کل انتظار کرلو۔ اللہ قسم میرے لیے رات کاٹنا مشکل ہوجائے گا۔''

ایاز وہاں سے یوں اٹھا جیسے فتح کا پروانہ ہاتھ میں لے کر اٹھا ہو۔

پھر یوں ہوا کہ وہ دن کے وقت دلشاد کے پاس جانے لگا۔ اس وقت اتنے بڑے مکان میں ایسا سناٹا ہوتا تھا کہ سانسوں کی آواز گن لو۔ تھکے ہارے سازندے بے دلی سے

ساتھ دیتے رہتے پھر ان کی بھی چھٹی کردی جاتی۔ دونوں کو باتیں کرنے کا خوب موقع مل جاتا۔ ستارہ بیگم کبھی کبھی آکر جھانک جایا کرتی تھیں ورنہ وہ ہوتا اور دلشاد۔ وہ پابندی سے آنے لگا۔

اس تنہائی نے تماشائی کے رشتے کو محبت کے تعلق میں تبدیل کردیا۔ ستارہ بیگم اسے دلشاد کی اداکاری سمجھ رہی تھیں لیکن دلشاد اس پر دل و جان سے فدا ہوگئی تھی۔ یہی حال ایاز کا تھا۔

گرمیوں کی دوپہریں دلشاد نے اس کے نام کردی تھیں لیکن ایاز کے دل میں ایک خلش اب بھی باقی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ دلشاد دن کے وقت بے شک میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن رات کو تو مجرا ہوتا ہوگا۔ میری آنکھوں کے سامنے نہ سہی لیکن وہ سب کے سامنے ناچتی تو ہوگی۔ کیسے کیسے گندے فقرے اس کی طرف اچھلتے ہوں گے۔ اس نے یہ سوچ کر صبر بھی کرلیا تھا کہ دلشاد بہرحال ایک طوائف ہے۔ وہ اسے مجرا کرنے سے نہیں روک سکتا۔

تجربہ کار ستارہ بیگم اس کی کیفیت کا بخوبی مشاہدہ کررہی تھی۔ گاہے گاہے ایسے جذباتی جھٹکے دیتے رہتی تھی کہ ایاز علی تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ وہ دلشاد سے محبت کرنے لگا تھا اور ہر محبت کرنے والے کی طرح یہ چاہتا تھا کہ دلشاد صرف اس کی ہوکر رہے۔ ستارہ بیگم اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس کی جیبیں خالی کرتے بہت دن ہوگئے تھے اب اس نے ایسا جذباتی جھٹکا دینے کا سوچا کہ ایاز ضد میں آجائے۔ دلشاد کے مزید قریب بھی آئے اور نوٹوں کی برسات بھی کردے۔ یہ جذباتی جھٹکا یہی ہوسکتا تھا کہ اس کی محبوبہ کچھ دیر کے لیے کسی اور کی بانہوں میں ہو اور ایاز کو اس کا علم بھی ہوجائے۔ بہت سوچ سمجھ کر ستارہ نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ ایاز دلشاد سے ملنے اس کے گھر پہنچا تو دلشاد کے بجائے ستارہ نے استقبال کیا اور اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ایاز نے اسے اپنی توہین سمجھا کہ اسے انتظار کرایا جارہا ہے۔ کچھ دیر بعد ستارہ اندر آئی تو اس نے دلشاد کے بارے میں پوچھا۔

''وہ کچھ مصروف ہے۔ فارغ ہوتی ہے تو آپ کے پاس آتی ہے۔'' ستارہ نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔

''اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے انتظار کرنا پڑا ہو۔''

''اب آپ نے اسے خرید تو نہیں لیا ہے۔ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت ہیں جو دلشاد کو پسند کرتے ہیں اور اس پر بہت کچھ خرچ کرتے ہیں۔ اس وقت وہ آئے ہوئے ہیں۔ دلشاد ان کے پاس بیٹھی ہے وہ چلے جائیں گے تو دلشاد آپ کے پاس آجائے گی۔''

''آپ نے تو کہا تھا میں دن کے وقت آیا کروں۔ دن میں کوئی نہیں آتا۔''

''میاں یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ کوئی اگر دن کے وقت آگیا تو میں اسے روک نہیں سکتی۔''

''میں دلشاد سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے اگر میرے سوا کوئی اس کے پاس بیٹھے۔''

''طوائف سے محبت کی نہیں جاتی، خریدی جاتی ہے۔ جو نوٹ دے گا دلشاد اس کے پاس بیٹھے گی۔''

''یہ رہی قیمت!'' ایاز نے نوٹوں کی ایک گڈی ستارہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''دلشاد کو میرے پاس بھیج دیجیے۔''

''یہ ہوئی نا بات۔ دلشاد ابھی حاضر ہوتی ہے۔''

دلشاد کے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ بہانہ صرف اس لیے کیا گیا تھا کہ ایاز کی عزتِ نفس کو زخمی کیا جائے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ دولت خرچ کرے۔ ستارہ کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر گئی اور دلشاد اندر آگئی۔ جتنی دیر میں دلشاد آتی ایاز علی سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

''دلشاد، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم صرف مجھ سے ملو، کسی اور سے نہ ملو۔''

''ایاز، میں تو خود یہی چاہتی ہوں لیکن میں طوائف ہوں۔ میرے بہت سے خریدار ہیں۔ میں کس کس کو منع کروں گی۔''

''میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر خریدار کو خرید لوں گا۔''

''تم کس کس کو خریدو گے۔''

''پھر میں تمہیں خرید لوں گا۔''

''اماں نہیں مانیں گی۔''

''انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ بھاگ چلو۔''

''مجھے اس سے بھی انکار نہیں لیکن تمہارے گھر والے مجھے قبول نہیں کریں گے۔ مجبور ہو کر تم مجھے پھر یہیں چھوڑ جاؤ گے۔''

''میں سب سے بغاوت کرلوں گا لیکن تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو اماں تیار ہو جائیں گی؟ میں ان کے لیے سونے کی کان ہوں۔''

''میں اپنی ساری دولت انہیں دینے کو تیار ہوں۔''

''بات کر کے دیکھ لو لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر تمہارے یہاں آنے پر بھی پابندی لگ جائے گی وہ تمہیں تماشائی سمجھ کر لوٹ رہی ہیں۔ راز کھل گیا تو تمہیں تماشا بنا دیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم یہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ بھول جاؤ مجھے۔''

''اب میں تمہیں بھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''تمہاری ضد ہے تو اماں سے بات کر لو۔''

اس نے ستارہ سے بات کی۔ خلاف توقع اس نے انکار نہیں کیا لیکن یہ شرط رکھ دی کہ یہ شادی صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے باپ کو لے کر یہاں آئے۔ اس نے ستارہ سے تو وعدہ کر لیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس شرط کا پورا ہونا محال ہے۔ کون باپ ہوگا کہ بیٹے کا رشتہ لے کر طوائف کے کوٹھے پر جائے گا۔

ایاز نے بہت دن سوچنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ستارہ سے بات کی۔

''میرے والد کبھی تیار نہیں ہوں گے کہ یہاں آئیں۔ میں شادی کر لیتا ہوں اس کے بعد انہیں بتا دوں گا۔ اگر انہوں نے اس کے بعد بھی قبول نہیں کیا تو میں گھر والوں کو چھوڑ دوں گا۔''

ستارہ بیگم کا تو منصوبہ ہی یہ تھا کہ سرفراز یہاں آئے اور وہ اسے ذلیل کرے۔ اس کا سر جھکا دے۔ پھر وہ کیوں ایاز کی بات مانتی۔ مصیبت یہ تھی کہ دلشاد بھی یہی اصرار کر رہی تھی کہ اس کا باپ رشتہ لے کر آئے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب سرفراز علی کے سامنے بھی یہ مرحلہ آیا تھا لیکن انہیں یہ ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ اپنے باپ احمد علی کے سامنے اپنی شادی کی بات کر سکتے لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ ایاز علی نے ہمت کر لی۔

''ڈیڈی میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں چاہتا تھا پہلے تم کاروبار کے نشیب و فراز اچھی طرح سمجھ لو اس کے بعد تمہارے لیے ایک اچھی سی لڑکی تلاش کی جائے۔ اب تم کہتے ہو تو میں تمہاری ماں سے بات کروں گا۔''

''لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ڈیڈی۔ لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔''

''ارے واہ! یہ تو اور اچھی بات ہے۔ اب ذرا جلدی سے بتا دو کہ وہ لڑکی ہے کون۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمیں اس کے گھر کب جانا ہے۔''

''ڈیڈی، وہ لڑکی شاید آپ کے معیار پر پوری نہ اترے۔''

''مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے بیٹا۔ غریب ہونا کوئی جرم نہیں۔ اچھا ہے تم کسی غریب کا سہارا بنو گے۔''

''وہ لڑکی غریب نہیں۔''

''معمولی شکل و صورت کی ہے؟''

''ہے تو بہت خوب صورت۔''

''پھر ایسی کیا کمی ہے اس میں کہ بتاتے ہوئے ڈر رہے ہو۔''

''وہ لڑکی طوائف ہے۔''

''کیا؟'' سرفراز کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ ایاز کو ان کی صحت کی فکر ہونے لگی۔ ''تم اپنی آوارگی کی سند اس طرح پیش کر رہے ہو۔ میری تربیت کا اس طرح مذاق اڑا رہے ہو۔ اب اس گھر میں طوائف آئے گی۔ اس کے رشتہ دار میراثی ہوں گے، اس کی ماں نائکہ ہوگی۔''

''مجھے کسی سے غرض نہیں۔ کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ میں اس لڑکی کو اس گندے ماحول سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہاں کا کوڑا یہاں لانا چاہتے ہو۔''

''اگر آپ اس کوڑے کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتے تو میں اسے کہیں اور لے جاؤں گا۔ بس آپ میری ایک خوشی پوری کر دیں۔ میرے ساتھ چلیں اور اس لڑکی کی ماں سے مل کر میرا رشتہ مانگ لیں۔ اس کی یہی شرط ہے۔''

''میرے بچے میں یہ کبھی نہیں کر سکوں گا۔ تو یہ خیال ہی دل سے نکال دے۔ میں کبھی جوانی میں ایسی جگہوں پر نہیں گیا۔ اب کیا جاؤں گا۔''

''اگر آپ نے قسم ہی کھا لی ہے تو میں کوئی اور راستہ تلاش کروں گا۔ اس لڑکی سے شادی ضرور کروں گا۔''

''جو جی میں آئے کرتے پھرو۔ مجھے تمہاری خوشی ضرور عزیز ہے لیکن خاندان کا وقار اس سے زیادہ عزیز ہے۔''

ایاز علی کا اس جواب کے بعد بھی کچھ بولنا گستاخی کے مترادف تھا۔ بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اس نے کہہ دیا تھا۔ اب تو یہ انتظار کرنا تھا کہ باپ کے اس فیصلے میں کوئی لچک آتی ہے یا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اتنے بڑے انکشاف کے بعد اس کے والد اس کا تذکرہ

والدہ سے ضرور کریں گے۔ ممکن ہے ان کے سمجھانے کے بعد ان کا فیصلہ تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ والدہ بھی اس سلسلے میں اس سے ضرور بات کریں گی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا لیکن یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ کوشش کرے گا کہ دلشاد کی ماں اپنی شرائط میں نرمی پیدا کر دیں۔

اس کی توقع کے عین مطابق اس کی ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ باپ کی شرافت کا واسطہ دیا۔ خاندان کے وقار کا سوال درمیان میں رکھا۔ طوائفوں کی بداعمالیوں اور فریب کاریوں کے قصے سنائے۔ ان میں کون سی ایسی نئی بات تھی جو ایاز علی نے پہلے نہ سنی ہو لیکن وہی بات کہ وہ جوانی ہی کیا جو دیوانی نہ ہو۔ اسے نہ باپ کی عزت کا خیال آیا نہ ماں کے آنسو دیکھ سکا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

دوسرے کیا سوچ رہے ہیں، ایاز کو اس کا علم تو نہیں تھا لیکن خود اس کا حال یہ تھا کہ دوراہے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف گھر والے تھے دوسری طرف دلشاد تھی۔ دلشاد کی طرف بڑھتا تھا تو گھر والے چھوٹتے تھے۔ گھر والوں کی بات مانتا تھا تو دلشاد ہاتھ سے جاتی تھی۔ اسے دونوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ اس کشمکش نے اسے بے حال کر دیا۔ اس نے گھر میں رہنا کم کر دیا تھا۔ کاروبار کی طرف سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ کئی کئی دن دفتر کی شکل بھی نہیں دیکھتا تھا۔ تمام کام ملازموں پر چھوڑ دیا تھا۔ جس کے دل میں جو آتا، کرتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ اپنی حالت کو بہ غور دیکھا۔ اسے خود پر ترس آنے لگا تھا۔ ماں باپ کو دیکھتا تو ان پر بھی رحم آتا تھا۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ وہ دلشاد سے شادی کا ارادہ ترک کر دے تو تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے گی لیکن ہر بار اسے شکست ہوتی تھی۔ دلشاد کی محبت اس کے ہر ارادے کو توڑ دیتی تھی۔ لگتا تھا دلشاد کے بغیر زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

ستارہ نے بڑی ہوشیاری سے چاند خاں کو اس کا ہمدرد بنا کر اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ چاند خان نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دلشاد سے شادی کے لیے اس کی مدد کرے گا۔ ستارہ کو سمجھائے گا کہ وہ اپنی شرط تبدیل کر دے۔ اس کے والد کی شرکت کے بغیر اس کی شادی پر رضامند ہو جائے۔

چاند خاں کے ذریعے ستارہ کو ایاز کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ یہ سن کر اس کا کلیجا ٹھنڈا ہوا تھا کہ ایاز علی اپنے باپ کا گھر چھوڑنے والا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ جب اکلوتی اولاد باپ سے باغی ہو جائے تو باپ کے دل پر کیا گزرتی

ہے۔ وہ سرفراز کو اسی طرح کی صورت حال سے دوچار کرنے کے خواب دیکھا کرتی اور اب اس کے خواب کی تعبیر اسے مل رہی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ طوائف جب ایک مرتبہ کسی آدمی کی زندگی میں داخل ہو جائے تو قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سرفراز خوش قسمت تھا کہ ابھی تک قبر کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

اس وقت بھی چاند خاں کے سامنے بیٹھی وہ یہی باتیں کر رہی تھی۔

''تم تو کہہ رہی تھیں کہ ایک دن تم مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگاؤ گی۔ سرفراز کے خاندان کا وقار اپنے پیروں تلے روند دو گی۔ دلشاد کو اس گھر کی بہو بناؤ گی۔ یہ تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔ سرفراز اس شادی پر تیار نہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔ میں تو کہتا ہوں، یہ شرط ختم کر دو۔ دلشاد کا ہاتھ ایاز کے ہاتھ میں دے دو۔ اس خاندان کی بہو تو وہ اس طرح بھی بن جائے گی۔''

''آدمی کو ایک دم مار دو تو مزہ نہیں آتا۔ سرفراز کو ماروں گی مگر تڑپا تڑپا کر۔''

''سرفراز کے بیٹے کو اس کے مقابل تو لے آئی ہوں لیکن ابھی میرے ترکش میں کئی تیر اور بھی ہیں وہ بھی تو چلانے ہیں۔ ابھی تو اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا ہو گا کہ اس کی بربادی کے پیچھے ہے کون۔''

''یہ بتانے کا وقت آئے گا کب۔''

''شاید وہ وقت اب آ گیا ہے۔ میں نے ایاز کے یہاں آنے پر پابندی لگا دی تھی مگر اب یہ پابندی اٹھا رہی ہوں۔ تم کل دن کے وقت اسے یہاں لے آؤ۔ اس کے سامنے اپنا یہ احسان بھی جتانا کہ میری ضد کا پتھر تمہاری کوششوں سے موم ہوا ہے۔''

''میں کل اسے یہاں لے کر آ جاؤں گا۔ تمہارا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔ اب اپنا وعدہ بھی پورا کرو۔''

''کیسا وعدہ۔''

''تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دلشاد میری بیٹی ہے سرفراز کی نہیں لیکن میں نے اپنا منہ بند رکھا ہے۔ صرف اس لیے کہ تم سرفراز کو بلیک میل کرتی رہو۔ اس کا صلا مجھے کیا ملا۔ میری جوانی بھی گزر گئی تمہاری بھی۔ میں اب تک شادی کے لیے ترس رہا ہوں۔ تم نے بیٹی حاصل کرنے کے لیے مجھ سے تعلقات قائم کیے اور پھر مجھے فراموش کر دیا۔''

''مرے کیوں جاتے ہو۔ ابھی کچھ کام باقی ہے۔ بس وہ ہو جائے شادی بھی کر لوں گی حالانکہ میں صرف سرفراز سے شادی کر سکتی تھی۔ خیر تم سہی۔''

چاند خاں کمرے سے نکلا تو ستارہ نے دلشاد کو بلا لیا کیونکہ اب وہ جو کچھ کرنے والی تھی اس کے لیے اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

دلشاد سے چپکے چپکے کچھ باتیں کرتی رہی۔ دلشاد کبھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ لیتی کبھی اثبات میں گردن ہلا دیتی تھی۔

''بس یہ کام ہو جائے پھر میرا وعدہ میں تیری شادی ایاز سے کر دوں گی۔ مجھے تم دونوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں تو ایاز کے باپ سے انتقام لینا چاہتی ہوں جو میری دنیا میں آیا اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ذرا سوچ، سرفراز کا بیٹا جب اسے ذلیل کرے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''تجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے میری جان۔ بس جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کر لینا۔''

دوسرے دن چاند خان ایاز کو لے آیا اور دلشاد کے حوالے کر کے گھر کے کسی کمرے میں غائب ہو گیا۔ اب یہاں سے دلشاد کو کرنا تھا جو کچھ کرنا تھا۔ اس نے ایاز کا ہاتھ پکڑا اور ایک کمرے میں لے آئی۔

''آج یہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

ایاز کا یہاں تقریباً ایک مہینے کے بعد آنا ہوا تھا۔ دلشاد کو بھی وہ اتنے دنوں بعد ہی دیکھ رہا تھا۔ دلشاد کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن دیوار پر لگی ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی سب کچھ نظر آنے لگا۔ یہ اس کے باپ سرفراز علی کی جوانی کی تصویر تھی لیکن صاف پہچانی جا رہی تھی۔ ایسی ہی ایک تصویر اس نے گھر کی البم میں بھی دیکھی تھی۔ اس وقت وہ حیران تھا کہ یہ تصویر یہاں کیسے!

''یہ تصویر کس کی ہے دلشاد۔''

''تم جانتے ہو اس آدمی کو؟''

''اگر جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا البتہ ایسا لگتا ضرور ہے کہ جس کی یہ تصویر ہے اسے میں نے دیکھا ہے۔''

''تم بھی کن باتوں میں الجھ گئے۔ چھوڑو اس تصویر کو۔ اتنے دن بعد تو ہم ملے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔ اپنی باتیں کرتے ہیں۔''

ایاز اس کے کہنے سے بیٹھ تو گیا۔ دلشاد سے باتیں بھی کرنے لگا لیکن اس کا ذہن اس تصویر ہی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ

بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار تصویر کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ دلشاد اس کی اس کیفیت کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ تصویر کس کی ہے جو تم اتنی دلچسپی لے رہے ہو۔ میری باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔''

''یہی تو مجھے نہیں معلوم کہ یہ تصویر کس کی ہے۔ میں تو تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ اماں کو کچھ معلوم ہو تو ہو۔ ٹھہرو میں ان کو بلاتی ہوں۔''

ستارہ فاتحانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ ایاز اس وقت بھی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے نہیں، شرمندگی کے آثار تھے۔

''دلشاد کہہ رہی ہے اس تصویر میں چھپے آدمی کو جانتے ہو۔''

''جانتا تو اب ہوں البتہ پہچاننا ضرور ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تصویر یہاں کیوں ہے۔ اس آدمی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''وہی جو تمہارا دلشاد کے ساتھ ہے۔ یہ کبھی میرے عاشق ہوتے تھے۔ پھر جب مطلب نکل گیا تو ایسے غائب ہو گئے کہ میں آج تک ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''اگر میں انہیں آپ کے سامنے پیش کر دوں؟''

''میری آنکھیں تمہارے احسان کا بوجھ اٹھانے کے لیے جھک جائیں گے۔''

''اور دلشاد سے میری شادی۔''

''شاید اب میں اپنی شرط واپس لے لوں۔''

''نہیں شرط واپس لینے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ اپنے والد کو راضی کر لوں گا۔''

''پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

وہ گھر پہنچا تو خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ سرفراز علی لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ چائے کا کپ سامنے رکھا تھا اور سگار ان کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ وہ اندر گیا تو معلوم ہوا اس کی والدہ ڈرائیور کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور باپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مہینوں بعد اس نے باپ کا سامنا کیا تھا۔ سرفراز علی کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تھا۔

''ایاز کیسے ہو اور آج کل کہاں غائب ہو۔''

''ڈیڈی، میں آپ کے سامنے ہوں اور خوش بھی ہوں۔''

''میری دعا ہے کہ تم اسی طرح خوش رہو۔''

''ڈیڈی، آپ سے ایک بات پوچھوں۔''

''پوچھو بیٹا۔''

''آپ کسی ستارہ نامی عورت کو جانتے ہیں جو آپ کی جوانی میں آپ کو کہیں ملی تھی۔''

''ایاز، جوانی ہم سے اتنی پیچھے رہ گئی ہے کہ یہ نام اگر حافظے میں ہو گا بھی تو اب مٹ چکا ہے۔ مجھے تو اس نام کی کوئی لڑکی یاد نہیں۔ پھر بات یہ ہے کہ ہم اڑتے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔ کاروبار میں الجھے رہے پھر تمہاری ماں سے شادی ہو گئی۔ کالج کے زمانے میں کوئی ستارہ ملی ہو تو ایسا تعلق نہیں رہا ہو گا کہ ہم نام بھی یاد رکھتے۔ ویسے تمہیں یہ عورت کہاں مل گئی۔ اس نے بتایا نہیں کہ وہ مجھے کیسے جانتی ہے؟''

''میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بڑا دلچسپ انکشاف کیا۔ وہ کہہ رہی تھی آپ اس کی محبت میں گرفتار تھے۔''

''بہت خوب! ہم محبت میں گرفتار ہوئے تھے اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔ وہ محترمہ یک طرفہ عشق کرتی ہوں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میاں ہم خوب صورت ہوا کرتے تھے اس زمانے میں۔''

''اس عورت کو آپ نے اس لیے تو فراموش نہیں کر دیا کہ وہ طوائف ہے۔''

''یہ وہی عورت تو نہیں ہے جس کی بیٹی سے تم شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''آخر آپ نے پہچان ہی لیا۔ اگر آپ نے اس عورت سے شادی کر لی ہوتی تو وہ گناہوں سے نکل چکی ہوتی اب میں اس کی بیٹی کو گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں تو آپ مجھے بھی روک رہے ہیں۔''

''کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تم ان طوائفوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں جانتے۔ اس نے یہ کوئی نئی چال چلی ہے۔ وہ تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ تم کسی پاکباز باپ کے بیٹے نہیں ہو۔ میں اسے جانتا تک نہیں، وہ مجھ پر تہمت لگا رہی ہے۔''

''میں نے آپ کی تصویر اس کے کمرے میں دیکھی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ بہت ہی شاطر ہے۔ اس نے میری تصویر کہیں سے حاصل کر لی ہو گی اور اب تمہیں بلیک میل کر رہی ہے۔''

''ڈیڈی میں آپ سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو

بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور اس کی بیٹی سے میرا رشتہ طے کر دیں۔"

سرفراز علی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن بیٹے پر اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے اپنا غصہ اپنی شفقت میں چھپالیا۔

"بیٹا جب وہ عورت اتنی چالیں چلنے لگی ہے تو ہمیں بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میں تمہیں اپنا فیصلہ کل سناؤں گا۔ اس وقت تو مجھے اپنے ایک دوست کی طرف جانا ہے۔"

ایاز بھی اب انہیں زیادہ شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جو کہنا تھا کہہ ہی چکا تھا۔ باپ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

فرزانہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ان کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ ایاز سے کہہ ہی چکے تھے کہ اپنے کسی دوست سے ملنے جارہے ہیں۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کیے پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ گاڑی نکالی اور ستارہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

انہیں اس کا گھر ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ شہر میں سب کچھ بدل گیا تھا لیکن اس محلے کا جغرافیہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ گاڑی اسی طرح گلی کے باہر پارک کی جو ان کا کبھی معمول رہا تھا۔ کوٹ میں رکھے پستول کا جائزہ لیا اور گاڑی سے اتر گئے۔

پیدل اس کے گھر تک گئے اور دروازے پر دستک دے دی۔ گھر کے کسی ملازم نے دروازہ کھولا اور اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ان کی محبت پروان چڑھی تھی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر پہروں محبت کی باتیں کی تھیں آج وہی جذبۂ محبت، نفرت میں بدل گیا تھا۔ وہ آج اس ارادے سے آئے تھے کہ ستارہ کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں گے۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے کوٹ کی جیب پر ہاتھ مار کر پستول کا جائزہ لیا۔

ستارہ اندر داخل ہوئی۔ کچھ دیر کے لیے وہ طوائف سے عورت بن گئی۔ ٹکٹکی باندھ کر سرفراز کو دیکھتی رہی۔ سرفراز کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ ان کا دل بھی کہہ رہا تھا۔ "کبھی اس شکل کو ہم پیار کیا کرتے تھے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں اپنی اپنی حالتوں پر واپس آگئے۔

"زہے نصیب! سرفراز علی آئے ہیں۔ شاید گھر میں آگ لگ چکی جو یوں گھبرائے ہوئے آئے ہیں۔"

"ذلیل عورت! میں آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" سرفراز نے کہا اور جیب سے پستول نکال لیا۔

"ٹھہرو سرفراز! ابھی گولی مت چلانا۔ مجھے ایک اہم راز تم پر ظاہر کرنا ہے۔ میں مرگئی تو یہ راز کبھی ظاہر نہ ہوسکے گا اور تمہارے بیٹے کا نقصان ہوجائے گا۔"

"حرافہ عورت! اب کوئی اور چال چلنے والی ہے۔ میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گا۔" انہوں نے کہا اور پستول کا رخ ستارہ کی طرف کر دیا۔

"راز تو تم ظاہر کر چکیں۔ تم نے میرے بیٹے پر ظاہر کر دیا کہ میرا تم سے کبھی کوئی تعلق تھا۔ میں نے تم پر کتنی دولت خرچ کی۔ صرف اس لیے کہ راز کو راز رکھو گی مگر تم نے عہد شکنی کی۔ تمہیں معلوم تھا کہ ایاز میرا بیٹا ہے اس کے باوجود تم نے اپنی بیٹی کو جو دراصل میری بیٹی ہے ایاز کے سامنے پیش کر دیا۔ تم کتنے بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو۔"

"دلشاد تمہاری بیٹی نہیں ہے۔"

"جو پہلے کہا تھا وہ جھوٹ تھا یا اب جھوٹ بول رہی ہو۔"

"سرفراز، ہم بازار میں بیٹھنے والے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کس آدمی کا علاج کس دوا سے ہوگا۔ میں اگر دلشاد کو تمہاری بیٹی نہ کہتی تو تم مکڑی کے جالے میں مکھی کی طرح تڑپنے پر بھی تیار نہ ہوتے۔ تم نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ تمہیں سبق سکھانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ تم برسوں میرے دروازے پر بھیگی بلی کی طرح آکر کھڑے ہوتے رہے اور اب بھی میرے ایک اشارے پر بھاگے چلے آئے ہو۔"

"اگر دلشاد میری بیٹی نہیں تو کس کی اولاد ہے۔"

"خبردار! کوٹھے پر پیدا ہونے والیوں کے باپ کا نام نہیں پوچھتے۔ اس بازار میں بیٹیاں باپ سے نہیں ماں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہوگی کسی حرامی کی اولاد۔ میں نے تم سے شادی کا خواب دیکھا تھا۔ میرا خواب تو تم نے پورا نہیں کیا لیکن میں اپنی بیٹی کے ذریعے تمہارے خاندان کی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر رہوں گی۔ تمہاری بیوی نہ بن سکی اس کا مجھے افسوس رہے گا لیکن تمہاری سمدھن بن کر تمہیں شکست ضرور دوں گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایاز میرا بیٹا ہے۔ وہ میری مرضی کے بغیر شادی نہیں کرے گا۔"

"یہ تمہارا دور نہیں ہے کہ تم اپنے باپ کے ازار بند سے بندھ گئے تھے۔ وہ تمہیں چھوڑ دے گا، دلشاد کو نہیں چھوڑے گا۔ وہ اب تک شادی کر بھی چکا ہوتا۔ وہ تو میں نے ڈھیل دینا بند کر دی تھی۔ میں چاہتی تھی دست سوال لے کر میرے دروازے پر تم آؤ۔"

"میں نے اب بھی تم سے بھیک نہیں مانگی۔"

"بھکاری بن کر آئے تو ہو۔ شریف بھکاری زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ دل ہی دل میں بھیک تو اب بھی مانگ رہے ہو گے کہ ستارہ میرے بیٹے کی جان چھوڑ دو۔ میں جواب میں یہ پوچھوں گی، کسی طوائف کو فریب دینے کا نتیجہ دیکھا؟"

"میں ایاز کو اپنے ہاتھ سے مار دوں گا لیکن تم سے بھیک نہیں مانگوں گا۔"

سرفراز علی کا غصہ ابھی اترا نہیں تھا لیکن اس نئی صورت حال میں ایک اور ترکیب ان کے ذہن میں آچکی تھی۔ یہ بات تو صاف ہوچکی تھی کہ دلشاد ان کی بیٹی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ اگر وہ ان کی بیٹی ہوتی تو ستارہ لاکھ طوائف سہی بھائی بہن کی شادی پر کبھی آمادہ نہ ہوتی۔ بہت پہلے ایاز کو آگاہ کر چکی ہوتی۔ اگر ایاز کو یہ بتا دیا جائے کہ دلشاد اس کی بہن ہے تو وہ خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔ یہ یقین تو اسے ہوچکا کہ ستارہ سے میرے تعلقات تھے۔ اس روشنی میں اسے یہ ماننے میں دیر نہیں لگے گی کہ دلشاد اس کی بہن ہے۔ میں اس کی نظروں میں گر جاؤں گا لیکن خاندان کی عزت تو بچ جائے گی۔ میری نسلیں تو محفوظ ہوجائیں گی۔ میں ستارہ کو قتل کر کے پھانسی کیوں چڑھوں۔ حکمت سے کیوں نہ کام لوں۔ اس نے درست فیصلہ کیا اور ستارہ کو کمرے میں چھوڑ کر اس کے گھر سے نکل گیا۔

جب ستارہ کے پاس کوئی ہوتا تھا تو گھر میں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ اس کمرے کا رخ بھی کرتا لیکن چاند خاں کسی سے نہ دبتا تھا۔ وہ اس وقت بھی دروازے سے لگا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس نے یہ سن لیا تھا کہ ستارہ نے سرفراز کو حقیقت بتا دی ہے۔ اب تک تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سرفراز علی چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ دلشاد ان کی بیٹی ہے اس لیے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سن کر اسے غصہ آگیا کہ ستارہ نے ان کا ذہن صاف کر دیا۔ اب یا تو وہ شادی پر رضامند ہوجائیں گے یا ایاز خود شادی کرلے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ راز کسی اور پر ظاہر ہو ستارہ کا منہ بند ہوجانا چاہیے کیونکہ اگر دلشاد اس گھر سے چلی گئی تو کوٹھا ہی بند ہوجائے گا۔ دلشاد میری بیٹی ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔ اس کی کمائی کو کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔

سرفراز علی جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے چاند خاں کمرے میں پہنچ گیا۔ ستارہ صوفے پر بیٹھی تھی اور غالباً کچھ دیر پہلے ہونے والی گفتگو پر غور کر رہی تھی۔ چاند خاں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس کی نظر ایک پستول پر پڑی جو بستر پر رکھا تھا۔ سرفراز علی جاتے جاتے اپنا پستول میز پر رکھا چھوڑ گئے تھے۔ پستول دیکھتے ہی چاند خاں کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

"ارے سرفراز علی اپنا پستول یہیں چھوڑ گئے۔" چاند خاں نے کہا اور جیب سے رومال نکال کر یہ پستول اٹھالیا تاکہ انگلیوں کے نشان نہ آئیں۔

ستارہ نے گردن اٹھا کر دیکھا اور اسی وقت چاند خاں نے یکے بعد دیگرے تین فائر نہایت قریب سے کر دیے۔ ستارہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔

چاند خاں نے رومال جیب میں رکھا۔ پستول زمین پر پھینکا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ گولی کی آواز سن کر گھر کے تمام لوگ جمع ہوگئے۔ چاند خاں چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ سرفراز علی ستارہ کو قتل کر کے بھاگ گیا۔

"میں نے خود سرفراز علی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔"

پورے بازار میں شور مچ گیا۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے سرفراز علی کو مکان سے نکلتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کون ہے لیکن یہ بتا سکتے تھے کہ کوئی سیڑھیاں اتر کر گلی سے باہر گیا تھا۔ چاند خاں نے حلیہ بتایا تو سب نے تصدیق بھی کی۔ کچھ لوگ تھانے گئے اور سرفراز علی کے نام کی ایف آئی آر کٹوا دی۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی آگئی۔ آلۂ قتل یعنی پستول قبضے میں کرلیا گیا۔ ستارہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کر دی گئی۔ کمرے میں لگی سرفراز علی کی تصویر ایک بڑا ثبوت بن گئی کہ سرفراز علی کے تعلقات ستارہ سے رہ چکے تھے۔ چاند خاں نے نمک مرچ لگا کر اپنا بیان پولیس کو لکھوا دیا۔

سرفراز علی گھر پہنچے۔ غصے میں تو تھے ہی جاتے ہی ایاز کے بارے میں پوچھا۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ ورنہ وہ اسے اسی وقت بتا دیتے کہ دلشاد ان کی بیٹی ہے اس لیے اس سے شادی نہیں ہوسکتی۔ ان کا یہ حربہ کامیاب ہوجاتا لیکن ستارہ کے کوٹھے پر کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔

ایاز رات کو بہت دیر سے آیا۔ سرفراز علی نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس وقت بات چھیڑی جائے۔ ان کے ذہن میں اب بھی وہ باتیں گردش کر رہی تھیں جو ان کے اور ستارہ کے درمیان ہوئی تھیں۔ انہیں یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ایاز ان باتوں سے لاعلم ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ ستارہ سے میرا کبھی کوئی تعلق رہا ہے۔ اگر میں اسے یہ بتاؤں کہ دلشاد اس کی بہن ہے تو کیا وہ اس خبر کو برداشت کر سکے گا۔ اس کا ردعمل کیا

ہوگا؟ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ کوئی بات ہی نہ کی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ایاز، دلشاد سے شادی کرلے گا۔ میری عزت بچ جائے گی لیکن خاندان کی عزت کا کیا ہوگا۔ ستارہ جیسی عورت اور اس کے رشتہ داروں کا میرے گھر آنا جانا ہوجائے گا۔ دلشاد ایاز کی صرف بیوی نہیں ہوگی اس کے بچوں کی ماں بھی ہوگی۔ ان بچوں ہی سے ایاز کی نسل چلے گی۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان خدشات سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ ایاز کو اس شادی سے روک دیا جائے۔ میں اس سے کہہ دوں کہ دلشاد میری بیٹی ہے۔ میں گھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا لیکن خاندان کی عزت تو محفوظ ہوجائے گی۔ انہیں اب اپنی غلطی کا بھی احساس ہورہا تھا۔ اگر ستارہ سے میرے مراسم نہ رہے ہوتے تو مجھے یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ میں نے جو بویا تھا وہی کاٹنا پڑ رہا ہے۔ یہ میرے گناہ ہیں جو میری اولاد کے آگے آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ اگر اب بھی نہیں رکا تو ایاز کی اولاد کے آگے آئے گا۔ میں ایاز کو اس شادی سے روکوں گا۔ میرے پاس دلیل اتنی مضبوط ہے کہ ایاز کو قائل ہونا پڑے گا۔ اسے جذباتی صدمہ ضرور پہنچے گا لیکن میں دلشاد کو بہو کہنے سے بچ جاؤں گا۔

وہ اسی ادھیڑبن میں تھے۔ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ انٹرکام پر چوکیدار نے اطلاع دی کہ دو پولیس موبائلیں آئی ہیں پولیس والے آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔ سرفراز علی نے گھڑی دیکھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ ان کا ذہن فوراً ایاز کی طرف گیا۔ یہ لڑکا تو کہیں کوئی ایسی ویسی حرکت کرکے نہیں آرہا ہے۔ انہوں نے فرزانہ کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ پاؤں میں سلیپر ڈالے اور باہر نکل آئے۔

''سر، ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

''مجھے؟ کس جرم میں۔''

''قتل کے الزام میں۔ ایک طوائف ستارہ بیگم کا قتل ہوا ہے۔ ایف آئی آر میں آپ کا نام درج کرایا گیا ہے۔''

''ستارہ کا قتل ہوگیا!''

''جی ہاں۔''

''میں اس سے ملنے ضرور گیا تھا لیکن قتل میں نے نہیں کیا ہے۔''

''آپ اپنی بے گناہی عدالت میں ثابت کیجیے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کو حراست میں لے رہے ہیں۔''

''میں اپنے وکیل کو فون کرلوں؟''

''آپ تھانے جاکر وکیل سے رابطہ کرلیجیے گا۔ ہم آپ کو بھاگنے کا موقع نہیں دے سکتے۔''

اتنی دیر میں ایاز بھی باہر آگیا۔ اس نے بھی سنا کہ ستارہ کا قتل ہوگیا ہے اور الزام اس کے باپ کے سر آیا ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ الزام جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ ڈیڈی نے اپنے گواہ کو راستے سے ہٹایا ہے۔

پولیس سرفراز کو لے کر چلی گئی۔

ایاز نے اپنے فیملی وکیل کو فون کردیا۔

سرفراز علی نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے جرم سے انکار کیا تھا لیکن وہ اس سے انکار نہیں کرسکتے تھے کہ پستول ان کا نہیں ہے۔

انہوں نے عدالت میں بھی جرم سے انکار کیا۔ پستول پر ان کی انگلیوں کے نشان تھے۔ اس بات کو انہوں نے قبول کیا تھا کہ ستارہ ان کی پرانی واقف کار تھی۔ یہ بات بھی سامنے آگئی تھی کہ ان کا بیٹا ستارہ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مقتولہ کے وکیل نے یہی نکتہ اٹھایا تھا کہ سرفراز علی نے یہ شادی رکوانے کے لیے ستارہ کو راستے سے ہٹادیا۔

سرفراز کے وکیل نے اعتراض کیا۔ ''اگر قتل کا یہی مقصد تھا تو سرفراز علی دلشاد کو قتل کرتے نہ کہ ستارہ کو۔ شادی تو اب بھی ہوسکتی ہے۔''

''شادی نہیں ہوسکتی۔'' مقتولہ کے وکیل نے انکشاف کیا۔ ''دلشاد دراصل سرفراز علی کی ناجائز بیٹی ہے اور ایاز کی بہن ہے۔ ستارہ نے دولت کے لالچ اور انتقام کے لیے اس رشتے کا پاس نہیں کیا۔ سرفراز علی کو یہی غصہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ستارہ کو قتل کیا۔''

اس کے ثبوت میں چاند خاں کو پیش کیا۔ چاند خاں نے بھی دعویٰ کیا کہ دلشاد، سرفراز علی کی بیٹی ہے اور یہ اس کا خرچ اٹھاتے رہے ہیں۔

اس انکشاف نے عدالت پر سناٹا طاری کردیا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی۔

''ستارہ بیگم کے قتل میں مبینہ ملزم سرفراز علی کے بیٹے ایاز علی نے خودکشی کرلی۔''

سرفراز علی کے مقدمے کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ایاز نے اپنا فیصلہ خود کرلیا۔

سرفراز علی خاندان کی عزت بچانے کے لیے زندگی بھر مصروف عمل رہے لیکن نہ عزت بچاسکے، نہ بیٹا۔ صرف خون ہی رنگ نہیں لاتا، گناہ بھی رنگ دکھاتا ہے۔